

سیرتِ اقبال

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید



اقبال اکادمی پاکستان

۹۰-بی-۲-گلبرگ ۳ ○ لاہور

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.**

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ



سگزشت اقبال

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید



نیشنل کمیٹی برائے سائنس و تفریبات و لادیت علامہ محمد اقبال

اقبال اکادمی پاکستان

۹۰-بی-۲-گلبرگ ۳ ○ لاہور

130343

ناشر : ڈاکٹر محمد معزالدین

ڈائریکٹر ، اقبال اکادمی ، پاکستان ، لاہور

طابع : علی محمد برق

مطبع : ڈائریکٹری پرنٹنگ پریس - برق چمبرز ، لاہور

طبع اول - - - - - ۱۹۷۷ء

تعداد - - - - - ۱۱۰۰

حرفِ تعارف

علامہ اقبال کے جشنِ صدی کے سلسلے میں مرکزی اقبال کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ منجملہ اور کتابوں کے ، حیاتِ اقبال پر چند ایک تالیفات مرتب کرائی جائیں۔ جن اہلِ قلم حضرات کو اس کام پر مامور کیا گیا ان میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید بھی شامل ہیں۔ سالِ اقبال کا خاصہ حصہ گذر چکا تھا جب یہ ذمہ داری انہیں سونپی گئی لیکن انہوں نے بطیبِ خاطر اسے قبول کیا اور بڑی مستعدی سے کام کا آغاز کر دیا۔ اس کام کی نگرانی راقم کے سپرد ہوئی۔ طے پایا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی نگرشات بالاقساط مجھے بھیجواتے جائیں گے اور جب کبھی بالمشافہ گفتگو کی ضرورت محسوس ہوئی ، وہ میرے ہاں تشریف لائیں گے۔ راقم نے انہیں چند ایک تحریری مشورے پیش کئے جو پسند خاطر ہوئے اور کسی زبانی گفت و شنید کی نوبت نہ آئی۔

یہ تالیف جس کا عنوان ڈاکٹر صاحب نے "سرگزشتِ اقبال" تجویز کیا ہے ، اڑتیس ابواب پر مشتمل ہے۔ جہاں تک راقم اندازہ لگا سکا ، تالیف کے متن میں حیاتِ اقبال کے ضروری فوائد اجاگر ہوئے۔ علامہ اقبال جیسی نابغہ روزگار اور مہر دار شخصیت کا حیات کے لیے ان کی تالیفات نظم و نسق اور یہ حیثیت مجموعی یہ عنصر و ٹھکانہ ضروری ہے۔ ڈاکٹر خورشید اس نکتہ سے کہ حقہً "انہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے علامہ کی تصنیفات کے علاوہ ان سے متعلق اس سوانحی ادب کے بیشتر حصہ سے استفادہ کیا ہے جو اب تک منظرِ عام پر آجائے ہیں۔ اس سے

کی تالیف میں افکارِ اقبال کی نسبت ضمناً اشارے ہی کئے جا سکتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اس بارے میں مناسب اختصار سے کام لیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ علامہ کی شخصیت کی متعدد جہتیں ان کی نظم و نثر اور ان کے ملفوظات میں ابھرتی نظر آتی ہیں اور عصرِ جدید کے تناظر میں ان کے مرتبہ و مقام کا تعین ان کے افکار ہی کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افکارِ اقبال پر سیرِ حاصل تبصرہ ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے۔ اس تالیف کا حلقہ ایسی وسیع بحث کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنا کام ایک قابلِ مدت میں بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے اور اس لحاظ سے ان کا گارنامہ، آمید ہے کہ لائقِ تحسین سمجھا جائے گا۔

ایس اے رحمان

۱۷ اگست ۱۹۷۷ء

(ت)



علامہ محمد اقبالؒ

(۱۸۷۷ — ۱۹۳۸)

•

پیش لفظ

جب مجھے حکم ملا کہ اقبال کے سوانح قلم بند کرو تو میں خوش بھی ہوا اور پریشان بھی۔ خوش اس لیے کہ حضرت علامہ کا سوانح نگار بننا میرے لیے باعثِ فخر و مباہات ہے۔ اور پریشان اس لیے، کہ اتنا بڑا کام مختصر عرصے میں کیسے کر سکوں گا۔ بہر حال میں نے اللہ کا نام لے کر یہ کام شروع کر دیا۔ یونیورسٹی ملکی حالات کی وجہ سے بند تھی۔ اس لیے مکمل خانہ نشینی ممکن تھی اور میں دنیاوی کاموں سے آزاد ہو کر اپنی 'جملہ' مساعی اس نیک کام پر مرتکز کرنے کے قابل تھا۔ شب و روز کی محنت کے بعد بڑے عجز و نیاز اور انکسار کے ساتھ "سرگذشتِ اقبال" اہل نظر کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور ملتجی ہوں کہ مجھے خامیوں سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان کا ازالہ کر سکوں۔

یہ کتاب صرف میری کوششوں کا نتیجہ نہیں۔ اس میں ان نامی گرامی ماہرینِ اقبالیات اور دوسرے محققین کی مدد بھی شامل حال ہے، جنہوں نے حضرت علامہ کی بے شمار تحریروں، تقریروں، بیانات اور مکتوبات کو ہی تلاش اور کراید کے بعد مجموعوں کی صورت میں یک جا کر دیا۔ میں نے ان سے پورا استفادہ کیا اور ان پر مستزاد اقبال کے ہم عصر اخباری مآخذ کی چھان بین خود بھی کی، اور کوشش کی کہ حضرت علامہ کی زندگی کا کوئی پہلو نظر سے اوجھل نہ رہے۔ بہر حال میرا پرکڑ بہ دعوتے نہیں کہ یہ کتاب اقبال کے سوانح پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے اور

(ٹ)

سچ پوچھئے تو علم کی دنیا میں کوئی کاوش بھی حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ تحقیق کا عمل جاری رہے تو نئے نئے آفاق سامنے آتے رہتے ہیں۔

مجھے اپنی علمی بے مائیگی کی وجہ سے اس عظیم کام میں ہاتھ ڈالنے میں حجاب تھا۔ یہ حجاب ٹوٹا تو اس بلند پایہ اور دلاویز علمی شخصیت کی بدولت، جسے دنیا ڈاکٹر ایس۔ اے۔ رحمان کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ اور جس کی حضرت علامہ سے عقیدت، لگاؤ اور وابستگی کے بین ثبوت اہل علم کے سامنے موجود ہیں۔ میرے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ موصوف نے پورا مسودہ نہایت غور سے پڑھا، بعض مقامات پر نصیح فرمائی اور اپنے بیش قیمت مشوروں سے نوازتے رہے۔ میں اس شفقت اور سرپرستی کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

عبدالسلام خورشید

۱۰۔ سالک روڈ

مسلم ٹاؤن

برلم نہر

لاہور

۳ جولائی ۱۹۷۷ء

(ث)

فہرست مضامین

صفحہ	ابواب	نمبر شمار
۱		۱ - خاندان
۱۰		۲ - تعلیم و تربیت کا پہلا مرحلہ
۲۰		۳ - لاہور میں : تعلیم کا دوسرا مرحلہ
۳۰		۴ - تحقیق و تدریس -
۴۰		۵ - دیارِ فرنگ میں -
۵۰		۶ - ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک : کشاکشِ روزِ دار -
۶۰		۷ - ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک : اقبال اور دو قومی نظریہ -
۱۰۰		۸ - ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک : مسلم قومیت شعر کے روپ میں -
۱۱۰		۹ - عزت نشینی اور اسرارِ خودی -
۱۲۰		۱۰ - ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک : سیاست سے دلچسپی -
۱۳۰		۱۱ - ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک : سر کا خطاب اور سوشلزم -
۱۴۰		۱۲ - ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک : ادبی مسائل ، تصنیف و تالیف اور انجمنِ حمایتِ اسلام -
۱۵۰		۱۳ - انتخابی معرکہ -
۱۶۰		۱۴ - اقبال ، مجلسِ قانون ساز میں -
۱۷۰		۱۵ - جداگانہ انتخاب کے لیے جدوجہد -
۱۸۰		۱۶ - نہرو رپورٹ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس -
۱۹۰		۱۷ - دینی تفکر کا اندازِ جدید -

صفحہ	ابواب	نمبر شمار
۲۶۹	ہندو مسلم کشیدگی ، افغانستان اور فلسطین -	۱۸ -
۲۸۹	اپر انڈیا مسلم کانفرنس -	۱۹ -
۳۰۷	خطبہ اللہ آباد : ایک تجزیہ -	۲۰ -
۳۲۳	خطبہ اللہ آباد کا فوری ردِ عمل -	۲۱ -
۳۳۷	بھوپال کانفرنس ، تحریک کشمیر کا آغاز اور بین اسلامزم -	۲۲ -
۳۵۱	گول میز کانفرنس : علمی اور تہذیبی سرگرمیاں -	۲۳ -
۳۶۵	گول میز کانفرنس : سیاسی کردار ، اٹلی اور فلسطین کے دورے -	۲۴ -
۳۷۷	نیا لائحہ عمل : سرحد اور کشمیر -	۲۵ -
۳۹۳	حقوق کی جنگ اور کمیونل ایوارڈ -	۲۶ -
۴۰۷	تیسری گول میز کانفرنس اور آخری دورہ یورپ -	۲۷ -
۴۲۷	قرطاس ابیض ، کشمیر کمیٹی اور بین اسلامزم -	۲۸ -
۴۳۹	افغانستان کا دورہ -	۲۹ -
۴۴۹	علاقت اور سیامت میں محدود دلچسپی -	۳۰ -
۴۶۵	دو علمی معرکے : احمدیت اور وطنیت -	۳۱ -
۴۷۷	اعلان جنگ ، دور حاضر کے خلاف -	۳۲ -
۴۸۹	علمی عزائم ، جو پورے نہ ہو سکے -	۳۳ -
۵۰۳	تحریک مسجد شہید گنج -	۳۴ -
۵۱۳	مسلم لیگ ، انتخابات ، یوم اقبال -	۳۵ -
۵۳۱	قائد اعظم کے نام خطوط -	۳۶ -
۵۴۵	عظمت موت کے دروازے پر -	۳۷ -
۵۵۷	اقبال کے شب و روز -	۳۸ -
۵۷۱	کتابیات -	۹۳ -
۵۷۷	اشاریہ -	۰۴ -
	اغلاط نامہ -	۱۴ -

(ج)

پہلا باب

خانہ دان

”میں نے دیکھا ، ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ ٹھہرے ہیں۔ اوپر فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگا رنگ کے پروں والا پرندہ اڑ رہا ہے۔ اُس کی دل کشی اور دل فوجی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بڑے آٹھانے پر اس پرندے کو حاصل کرنے کے لیے جہ و جہد کر رہے ہیں۔ آخر وہ سراپا جہاں پرندہ ایک دم فضا سے اترتا اور میری گود میں اُن گرا۔“

یہ تھا وہ خواب جو حضرت علامہ کے والد شجاع پوری نے اپنے کی ولادت سے پہلے دیکھا اور اس کی تعبیر خود ہی بیان کی تھی۔ یہ کہ باں کوئی بچہ پیدا ہوگا جو خلافت اسلام میں اسی دور میں آئے گا۔

حضرت علامہ نے اپنے ہاں نفس والد کے درمیانی مزاج پر غور کیا اور اس میں احباب سے ایک واقعہ یوں بیان کیا کہ جب میری عمر تین سال تھی ، ادھی رات کو سوتے میں ایک نور سا سن لیا تو میں نے کہا ”کنہل کٹی“۔ میں نے اپنی والدہ کو زہنی سے کہنے کہا کہ ”میرے والد نے اپنی والدہ کے پیچھے چلتے چلتے مسافری دروازے کے پاس پہنچا اور ادھ کھلا تھا اور اس میں سے روتنی اندر آ رہی تھی۔ والدہ اس دروازے سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے اُسے بڑھ کر دیکھا اور والدہ نے دیکھے

صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ آن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔
 میں نے والد کے پاس جانا چاہا لیکن والد نے مجھے روکا اور مجھے سمجھا
 بیٹھا کر پھر سلا دیا۔ صبح ہوئی تو میں سب سے پہلے والد کے پاس
 پہنچا تاکہ آن سے رات کا سا جرا دریافت کروں۔ والد پہلے ہی وہاں
 موجود تھیں اور والد انہیں اپنا ایک رؤیا سنا رہے تھے، جو رات
 انہوں نے بہ حالت بیداری دیکھا تھا۔ والد نے بتایا کہ کابل سے ایک
 قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر
 مقیم ہوا ہے۔ اس قافلے میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی
 نازک حالت پر کی وجہ سے قافلہ تھہر گیا ہے۔ لہذا مجھے ان لوگوں کی
 مدد کے لیے فوراً پہنچنا چاہیے۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے
 تاکہ سنگھ، مجھے بھی ساتھ بٹھایا لیا اور چل دئے۔ چند گھنٹوں میں
 قافلہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں کارواں کا ڈیرا تھا۔ ہم نے دیکھا
 کہ وہ قافلہ ایک دولت مند اور ذی اثر خاندان پر مشتمل ہے جس کے
 افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرنے کے لیے پنجاب آئے ہیں۔ والد نے
 قافلے سے اترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ہے؟ جب
 وہ صاحب آئے تو والد نے کہا، مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو۔
 سالار نے مند سے تعجب ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو ہمارے مریض کی
 بیماری سے مطلع ہے اور فوراً اس کے پاس بھی پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن
 وہ مرغوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب والد مریض
 کے بستر کے پاس پہنچے تو کہا دیکھا کہ مریض کی حالت بے حد
 خراب ہے اور اس کے بعض اعضاء اس مرض کی وجہ سے بولناک طور
 پر متاثر ہو چکے ہیں۔ والد نے ایک چیر نکالی جو بہ ظاہر را کھ نظر آتی
 تھی۔ وہ را کھ مریض کے گئے سڑے اعضاء پر مل دی اور کہا کہ
 اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفا حاصل ہوگی۔ اس وقت نہ مجھے

یہیں آیا ، نہ مریض کے لواحقین ہی نے اس پیش گوئی کو اہمیت دی ۔
 لیکن چوبیس گھنٹے ہی گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں اذوقہ ہو گیا
 اور لواحقین کو یقین ہونے لگا کہ مریض صحیحیاب ہو جائے گا ۔ ان
 لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش
 کی جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم ٹوٹ و اسر سیالکوٹ پہنچ
 گئے ۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہو گیا اور معلوم ہوا کہ
 وہ مایوس العلاج مریض صحیحیاب ہو چکا ہے ۔

روحانیت اس خاندان کی کہانی میں تھی اور آج کے زمانے میں
 آئی تھی ۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس کے بارے میں کچھ پوری
 معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے آغاز پر روشنی ڈالیں ۔ حضرات !

مرا بنکر نہ در ہندوستان دیکر تم جانی
 برہمن زادہ اسے رمز آشنائے روم و تبریز است
 تم نے ز خیابان حنات شمشیر
 دل از حریت حجاز و نو ز شہر آس
 میر و مرزا بد سماعت دل و دین ساختہ است
 جز برہمن ہنرے محرم اسرار کج است

یہ شمشیری خاندان اصلاً برہمن تھا ۔ اس خاندان سے ۱۸۰۰ء
 صدی کے آغاز میں اسلام پہل لیا ۔ اس کے بعد یہ بھی جس کی
 وجہ تسمیہ انہوں نے اپنے والد مرحوم کے حوالے سے کیا ہے :

”جب مسلمانوں نے شمشیر میں دور دورہ ہوا تو برہمن
 شمشیر مسلمانوں کے علوم و زبان کی طرف ہمت رہیں“

کسی اور وجہ کے باعث توجہ نہ کرتے تھے۔ اس لیے جس گروہ نے سب سے پہلے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل کر کے حکومت اسلامیہ کا اعتماد حاصل کیا، وہ سب سے پہلے کہلایا۔ اس لفظ کے معنی ہیں، وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کر دے۔ اس، تقدم کے لیے کئی زبانوں میں آتا ہے اور 'پیر' کا روٹ وہی ہے جو ہمارے مصدر 'پڑھنا' کا ہے۔ والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے آن بھائی بنوں کو از راہ تعریف و تحسین دیا تھا جنہوں نے قدیم رسوم و تعصبات نبوی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان اور علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا۔ جو رفتہ رفتہ ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا۔“ ۳

انہما کے جہ اعلیٰ حضرت بابا لولی حج تھے۔ اس سلسلے میں اقبال نے ۱۹۲۵ء کو اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے نام ایک مکتوب کے دوران میں لکھا: ”آپ اور والد مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔ حضرت بابا لولی حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ ان کا ذکر خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر میں اتفاقاً مل گیا ہے۔ والد مکرم نے جو بیچ اپنے بزرگوں سے سنا تھا، وہ ہم حیثیت مجموعی درست ہے۔ ان کا اصلی گاؤں لوہیر نہیں تھا، بلکہ موضع چکو برگنہ آڈون تھا۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے، اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے، اس واسطے ترک دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔ واپس آنے پر اشارہ غیبی پا کر حضرت بابا نصر الدین

کے مرید ہوئے جو حضرت نور الدین ولی کے مرید تھے۔ بقیہ عمر انہوں نے بابا نصر الدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں۔“

حضرت بابا نے لولی حج کا لقب بابا جس کا مطلب ہے، عاشق حج۔ لقب ملنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے کئی مرتبہ ہجرل جا کر حج کیا۔ ان کا مدفن موضع چرار شریف میں ہے جو سری نگر کے جنوب مغرب میں بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اقبال نے یہ بتایا ہے کہ حضرت بابا ان کے جد اعلیٰ تھے لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان سے کس پشت میں اقبال کا رشتہ منسلک ہوتا ہے۔ سلسلہ نسب کی درمیانی لڑکیاں گم ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت بابا کی اولاد میں سے سب سے پہلے کون سیالکوٹ میں آ کر آباد ہوا، اور کب اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت علامہ کا بیان ملاحظہ ہو۔

”ہارنے والد کے دادا یا بڑدادا میں تھے۔ ان کا نام تھا، شیخ الدبر۔ انہیں پیری اس طرح ملی کہ سن ڈھترہ میں سادات کا ایک خاندان تھا جسے لوگ سید نہیں مانتے تھے اور اس لئے ان پر ہمیشہ طعن و ستم ہوا کرتی رہی۔ ان خاندان کے سربراہ کو ایک روز جو شخص آیا تو اہل سیر نے اسے پوزہ کر آگ میں پھینک دیا، جس کے متعلق روایت ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی یادگار ہے۔ اس کی مرمت سے آگ نے ان پر کوئی اثر نہ کیا۔ محائفوں نے اسے سزا دیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ فی الواقع سید ہیں۔ ان کا انتقال ہوا تو شیخ الدبر نے ان کے مریدوں کو سنبھالا اور خاندان کی خدمت کرنے لگے۔“

سن کھترا سیالکوٹ کا ایک کوٹن ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے شیخ اکبر ہی نے ترک وطن کیا اور سیالکوٹ میں مقیم ہوئے۔

دوسری تاویل فقیر سید وحید الدین کی ہے جو منقوضات و نوادر کی بنا پر علامہ کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد سے منسوب کی گئی ہے۔
ملاحظہ فرمائیے :

”قرائن یہ ہیں کہ اٹھارویں صدی کے آخر میں یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یہ ہجرت ہوئی ہوگی اور ہجرت کرنے والے بزرگ یا تو علامہ کے دادا کے باپ شیخ جہاں دین تھے، یا آن کے چار بیٹے، جنہ کے نام شیخ عبدالرحمن، شیخ محمد رمضان، شیخ محمد رفیق اور شیخ محمد عبداللہ تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ شیخ جہاں دین نے اپنے چاروں بیٹوں کو ساتھ لے کر ترک وطن کیا ہو۔ بہر حال یہ تو ثابت ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چاروں بھائی سیالکوٹ میں سکونت پذیر تھے۔“

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ اکبر علامہ کے والد شیخ نور محمد کے دادا نہیں، بلکہ دادا تھے۔ اور چونکہ ترک وطن اٹھارویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوا، اس لئے بعض سوانح نگاروں کا یہ اندازہ نا درست ہے کہ اس خاندان نے افراد نے ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد ترک وطن کیا۔

شیخ جہاں دین کے فرزند شیخ محمد رفیق علامہ کے دادا تھے۔ عام
 کشمیری رواج کے مطابق شیخ رفیق کا کہلاتے تھے۔ کشمیری دھرموں کی
 تجارت کرتے تھے، اور علامہ کے بیان کے مطابق سکھوں کی فوج میں
 ملازم تھے اور وہ سکھوں کی طرف داری میں گجرات میں انگریزوں سے
 لڑے تھے ۸۔ یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ ان کا پیشہ بھارت تھا
 یا سپہ گری۔ بہر حال عین ممکن ہے کہ پہلے سپہ گری کرتے ہوں اور
 اس کے بعد تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا ہو۔

شیخ محمد رفیق کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک شیخ نور محمد جو علامہ
 کے والد تھے، دوسرے شیخ غلام محمد جو محکمہ اخباروں میں ملازم تھے۔
 شیخ نور محمد مہارت و جہاد و شکیں بزرگ تھے، رنگ سیر و کاروبار منجانبہ
 لباس صاف۔ چھوٹی ہاتھ میں نے لڑ لکھے تھے۔ ذہن پر فطرت صاف ہے، لکھنے
 سے انداز آدھر نہیں لکھتے تھے۔ عمر ۷۰ سال کی مصیبت میں آ گیا۔ وہ بزرگ
 کی عادت ہائی تھی، تصدیق میں خصوصاً سڑک پر تھے، گھر پر بھی
 عالم تھا، لوگ صرف کی کتابوں میں بعض مطالب کے ترجمے لکھتے
 ہوتے، وہ شریح نے اس کے پاس آئے تھے، حیرت انگیز لکھتے تھے۔
 ہائی تھی اور اس کے دو حریف عالم تھے، اس نے وہ حریف نہیں کی تھی
 فلسفی کا خطاب دیتے تھے، جب بھی لکھنے کا تعلق تھا، وہ
 شائع ہوتا، وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس کو حیرت انگیز
 حائس طور سے شہادتیں ایسا لکھتی تھیں، اس نے وہ حریف نہیں
 لکھتے تھے، وہ بڑے بڑے تھے، اس کی عمر میں ان کی
 زیادہ تعداد ہو گئی تھی ۱۲۔

شیخ نور محمد کی مصیبت کی ایک مثال یہاں جس طرح لکھی گئی ہے،
 اس سے واضح ہے کہ اور واقعہ علامہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

”میرے والد ایک روز گھبرا کر آ رہے تھے۔ ہاتھ میں رومال تھا، رومال میں تھوڑی سی مٹھائی۔ اٹھائے راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتا بھوک کے مارے دم توڑ رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر آن سے رہا نہ گیا۔ مٹھائی سمیت رومال اس کے آگے ڈال دیا۔ کتے نے مٹھائی کھانا شروع کر دی۔ مٹھائی کھا چکا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے پانی کی طلب ہے۔ والد ساجد نے اسے کسی نہ کسی طرح پانی بھی پلا دیا۔ رات کو سوئے تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتان ہے جس میں مٹھائی کے طبق کے طبق رکھے ہیں۔ صبح آنکھ کھلی تو اس احساس کے ساتھ کہ یہ اس نیک عمل کا ثمرہ تھا جو کل آن سے سرزد ہوا۔ چنانچہ اس روز سے انہیں یقین ہو گیا کہ ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔“

جس خاندان کی خدمت شیخ اکبر نے کی تھی۔ ”اُمّی دنوں اس خاندان کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا، آپ دھسوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے۔ والد ماجد نے دو چار سو دھسے تیار کئے، تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب کے سب اچھے داموں پر بک گئے، حالانکہ فی دھسہ آٹھ آنے سے زیادہ لاگت نہیں آئی تھی۔ دو چار سو دھسے فروخت ہو گئے تو کافی روپیہ جمع ہو گیا۔ بس یہی ابتدا تھی، ہمارے دن پھرنے کی۔“

شیخ نور محمد کی رفیقہ حیات محترمہ امام بی بی اگرچہ رسمی طور پر خواندہ نہیں تھیں، لیکن دینی اوامر و نواہی سے خوب باخبر تھیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب سیالکوٹ میں مقیم ایک ناسور شخصیت ڈپٹی وزیر علی بلگرامی نے شیخ نور محمد کو اپنے

ہاں کپڑے سینے پر ملازم رکھا تو محترمہ امام بی بی نے اس بنا پر اپنے شوہر کی تنخواہ کو ذاتی مصرف میں لانے سے انکار کر دیا کہ آن کے نزدیک ڈپٹی وزیر علی کی آمدن کا غالب حصہ شرعاً جائز نہیں تھا۔ اس پر کچھ عرصہ بعد شیخ نور محمد نے نوکری چھوڑ دی اور برقعوں کی ٹوپیاں سینے لگے۔ یہ ٹوپیاں خوب صورت بھی تھیں اور مضبوط بھی، اس لئے بہت جلد مقبول ہو گئیں اور کاروبار اتنا بڑھا کہ انہوں نے بہت سے درزی ملازم رکھ لئے ۱۵۔ محترمہ امام بی بی کے بارے میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بڑی زیرک، معاملہ فہم اور مدبر خاتون تھیں۔ برادری کے جھگڑوں کو خوش اسلوبی سے نپٹاتی تھیں۔ غریب گھرانوں کی لڑائیوں کو پالتی تھیں، انہیں مناسب تربیت دے کر بیاہ دیتی تھیں۔ ذی غریب عورتوں کی خفیہ امداد کرتی تھیں اور محلے کی بعض عورتیں کن سر اتنا بھروسہ کرتی تھیں کہ اپنے زیورات اور نقدی آن کے پاس امانت رکھ جاتی تھیں ۱۶۔

اسی نابغہ روزگار ہستی کے آنہ نے میں بہت سے عناصر شریعت ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب علم و فن میں بہت کچھ بہت دخل ہوتا ہے، لیکن خاندانی روایات، سچوں اور تربیت میں بہت اثر ڈالتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال نے جو مدعی تھے بہت بڑے بزرگ تھے، جنہوں نے صاف و صفا میں بڑا نام لیا ہے۔ اقبال کے والد صوفی منش اور دین دار بزرگ تھے۔ آن کی والدہ نے دیانت و امانت، غریب پروری، ایام و نیابت سے آگاہی اور خدمت خاق کا مجسمہ تھیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو ماحول انہیں ملا، وہ کیا تھا؟ اس کے لئے ہمیں آن کے والد سیالکوٹ کی تاریخ پر ایک مختصر سی نظر ڈالنی ہوگی۔ سیالکوٹ پنجاب کے قدیم ترین شہروں میں

شہار ہوتا ہے ، پورن بھگت کی صوفیانہ داستان کا مرکز ہے ۔ دور مغلیہ میں اعلیٰ درجے کے کاغذ ، ریشم اور تلے کی کشیدہ کاری اور شامیانہ سازی کے لئے مشہور تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اہل علم و دانش کا سامن اور مرجع تھا ۔ اکبر کے عہد میں مولانا کمال نے علم پروری کی مثال قائم کی ۔ شاہ جہان کے زمانے میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے مدرسہ العلوم سے فیض حاصل کرنے کے لئے دور دراز مقامات سے تشنگان علم آتے اور اپنی پیاس بجھاتے تھے ۔ ان کے فرزند مولوی عبداللہ نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا ۔ علم پروری اس علاقے میں اس درجہ رچی بسی ہوئی تھی کہ الحاق پنجاب کے فوراً بعد سیالکوٹ کے نو سو پچاس دیہات پر جو تعلیمی محصول عائد کیا گیا ، اس کی ادائیگی ہوگئی ۔ اور تمام مجوزہ مدارس فوراً کھل گئے ۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے لاہور کے مقابلے میں پنجاب میں کوئی صحافتی مرکز تھا تو سیالکوٹ ۔ ۱۸ جہاں سے چند اخبار اور رسالے جاری ہوئے ۔ ظاہر ہے ، پڑھنے والے موجود تھے تو اخبار اور رسالے نکلے ۔ عمومی تعلیم کے پہلو بہ پہلو دینی تعلیم کے مراکز بھی قائم تھے ۔ انیسویں صدی کے اواخر میں مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کے بیان کے مطابق سیالکوٹ کے مراکز درس و تدریس چار تھے ۔ مولوی غلام مرتضیٰ کا مکتب ، مولانا ابو عبداللہ غلام حسین کی درسگاہ ، مولوی مزمل کا مدرسہ اور مولانا سید میر حسن کا مدرسہ العلوم ۔ اول الذکر تین درسگاہوں میں صرف عربیات اور دینیات کی تدریس ہوتی تھی اور سوخرالد ثر میں عربی اور فارسی ادب کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ ۱۹ علامہ کے والد ماجد شیخ نور محمد کی زیادہ رسم و راہ مولانا غلام حسین کے ساتھ تھی اور وہ انہی کے ہاں معارف دین کی سماعت کے لئے جایا کرتے تھے ۔

اسی علم پرور ماحول میں شیخ نور محمد جیسی علم کی پیاسی شخصیت کے ہاں دو لڑکے ہوئے۔ ایک شیخ عطا محمد، جو ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ دوسرے حضرت علامہ، جو ۳ ذی قعد ۱۲۹۳ ہجری مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو عالم وجود میں آئے اور وہ خواب پورا ہوا کہ ”سرایا جہاں پرندہ ایک دہ فضا سے آترا اور میری گود میں آن گرا،“۔

حوالے

- ۱ - ”ذکر اقبال“ ص ۱۰ -
- ۲ - ”ذکر اقبال“، صفحات ۱۳-۱۲ -
- ۳ - ”تاریخ اقوام کشمیر“، صفحات ۲۳-۲۲ -
- ۴ - ”خطوط اقبال“، صفحات ۷۷-۷۶ -
- ۵ - ”اقبال کے حضور میں“، ص ۷۰-۶۹ -
- ۶ - ”روزگار فقیر“ (جلد دوم)، ص ۱۱۵ -
- ۷ - ”ذکر اقبال“، ص ۸ -
- ۸ - ”اقبال کے حضور میں“، ص ۹ -
- ۹ - ”ذکر اقبال“، ص ۸ -
- ۱۰ - ”روزگار فقیر“ (جلد دوم)، ص ۱۱۶ -
- ۱۱ - ”ذکر اقبال“، ص ۸ -
- ۱۲ - ”روزگار فقیر“ (جلد اول)، ص ۱۹۵ -
- ۱۳ - ”اقبال کے حضور میں“، ص ۱۶۹ -
- ۱۴ - ایضاً، ص ۱۷۰ -
- ۱۵ - ”ذکر اقبال“، صفحات ۸۰-۷۹ -
- ۱۶ - ”روزگار فقیر“ (جلد دوم)، صفحات ۳۵-۳۳ -

۱۷ - "خلاصۃ التواریخ" بحوالہ THE PUNJAB UNDER

THE MUGHALS ، صفحات ۲۹۷-۳۰۰ -

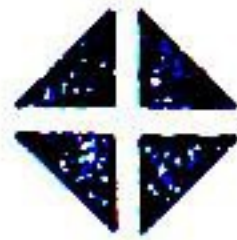
۱۸ - گارساں دتاسی بوساطت "صحافت پاک و ہند میں" ،

صفحات ۱۲۱-۲۳ -

۱۹ - "ذکر اقبال" ، صفحات ۱۰-۱۱ -

۲۰ - "روزگار فقیر" (جاد اول) ، صفحات ۲۲۹-۳۷ -

۷



دوسرا باب

تعلیم و تربیت کا پہلا مرحلہ

سیالکوٹ کا سب سے پرانا بازار، بازار چوڑی گراں کے نام سے مشہور تھا۔ اب اسے اقبال سٹریٹ کہتے ہیں۔ اقبال منزل یہیں واقع ہے، اس میں پندرہ کمرے اور سات دکانیں شامل ہیں۔ گلی کی جانب اس کے پچھلے حصے میں اقبال پیدا ہوئے۔ ”اس زمانے میں یہ ایک منزلہ، لچھو کچا اور کچھ بکا، پرانے فیشن کا مکان تھا جس میں گلی کی طرف ایک ڈیوڑھی، دو کوٹھڑیاں، ان کے ساتھ ایک دالان اور اس کے آگے چھوٹا سا صحن تھا۔“ اسی چھوٹے سے مکان میں اقبال نے بچپن گزارا اور شباب کی منزل میں قدم رکھا۔

پانچ چھ برس کے ہوئے تو انہیں ایک مکتب میں داخل کرانا لیا۔ یہ مکتب محلہ شوالہ کی مسجد کے خطیب اور امام مولوی غلام حسین نے جاری کر رکھا تھا۔ ایک دن سیالکوٹ کے نامی گرامی عالم شیخ مولوی میر حسن شاہ مولوی غلام حسین سے ملنے آئے جو اس وقت مدرسہ میں پڑھا رہے تھے۔ مولوی میر حسن کی نظر اقبال پر پڑی اور پوچھا، اس کا بچہ ہے، اس کا کیا نام ہے؟ جواب ملا، شیخ نور محمد کا لڑکا ہے۔ اقبال ہے۔ ایک دو دن بعد مولوی میر حسن کی ملاقات شیخ نور محمد سے ہوئی۔ انہوں نے شیخ صاحب سے کہا، آپ اپنے لڑکے کو شوالہ کے مدرسے میں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہیں۔ اب آئے میرے پاس بھیجیں، میں آئے پڑھاؤں

گا۔ شیخ نور محمد مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اقبال کو شوالہ کے مکتب سے اٹھایا اور مولوی میر حسن کے مکتب میں داخل کرا دیا۔

یہ مولانا میر حسن مجمع البحرین استاد تھے جنہوں نے حقیقت میں اقبال کو اقبال بنایا۔ وہ عالم دین ہی نہیں تھے، بلکہ ادبیات، لسانیات، ریاضیات اور تفسیر قرآن کے بھی بہت بڑے ماہر تھے۔ سالک رقم طراز ہیں: حضرت شاہ صاحب نے کچھ شیخ نور محمد کی دوستی کی وجہ سے اور کچھ اقبال کی طباعی اور بونہاری کے باعث ان کی تعلیم و تدریس کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ اس زمانے کا عام معمول یہ تھا کہ اس قسم کے معلمین بچوں کو گلستان، بوستان، منکدر نامہ، یوسف زلیخا، جامی، صرف بہائی، صرف سیر، ہدایۃ النجو، کافیہ، کنزالدقائق، قدوری وغیرہ پڑھایا کرتے تھے۔ شاہ صاحب کے ہاں بھی یہی قاعدہ تھا لیکن ان کے اسلوب تدریس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ محض رٹانے پر اکتفا نہ کرتے تھے، بلکہ اپنے طلبہ میں فارسی اور عربی کا صحیح لسانی ذوق پیدا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ فارسی کا ایک شعر پڑھاتے تو اس کے مترادف اشعار اردو اور پنجابی میں بھی پڑھ دیتے اور اس وقت تک سمجھاتے رہتے، جب تک اس کا مطلب پوری طرح طالب علم کے ذہن نشین نہ ہو جاتا۔ انہیں عربی، فارسی، اردو، پنجابی کے ہزاروں اشعار یاد تھے اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ موقع پر انہیں ہر محل اشعار فوراً یاد آ جاتے۔ اس میں کسی تکلف و تردد کی ضرورت نہ پڑتی۔ کچھ مدت تک اقبال صرف شاہ صاحب سے پڑھتے رہے۔ آخر شاہ صاحب ہی نے ان کو سکاچ مشن ہائی سکول میاںالکوٹ میں داخل کرا دیا جس میں وہ خود مدرس مقرر ہو گئے تھے۔ اس کے بعد معمول یہ ہو گیا کہ اقبال

مدرسے میں تو عام کورس پڑھتے لیکن وہاں سے واپس آ کر انہی تدریسات میں مصروف ہو جاتے جو شاہ صاحب نے شروع کرا رکھی تھیں۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک نہایت باقاعدگی سے جاری رہا جب وہ سکاچ مشن کالج سے ایف۔ اے پاس کر کے مزید تعلیم کے لئے لاہور چلے آئے۔ چونکہ شاہ صاحب نے سال با سال تک اقبال کو عربی، فارسی، علم و حکمت، ادبیات، تصوف وغیرہ کی تعلیم دے کر ان کو صحیح راستے پر لگا دیا تھا اور ان میں علوم قدیمہ و اسلامیہ کے لئے بے پناہ تشنگی پیدا کر دی تھی، اس لئے اقبال جب لیبی سونف پاتے، سیالکوٹ آ کر شاہ صاحب سے اپنے شکوک رفع کراتے، مزید سبق لیتے اور غوامض علوم پر اپنے امتداد کی ہدایت و رہنمائی سے غور و فکر کرتے۔

اقبال میں حصول علم کے لئے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ رات دو نیند میں اٹھ اٹھ کر پڑھتے رہتے۔ ایک دفعہ نصف شب کے وقت والدہ اقبال کی اچانک آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہیں کہ اقبال دے کے قریب بیٹھے سکول کا کام کر رہے ہیں۔ خالد نظیر صوفی اقبال کی سڑی بھاوج بیگم شیخ عطا محمد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اقبال کی والدہ نے

”دو ایک آوازیں سنیں مگر وہ نس سے نس نہ ہونے۔۔۔ ہوں نے اٹھ کر شانوں سے پکڑ کر بلایا اور کہا، اقبال! اس وقت آدھی رات دو لیا پڑھ رہے ہو؟ اٹھو، سو جاؤ۔ صبح کام کر لینا۔ نانا جان (اقبال) سمسائے اور جواب دیا، ”جی جی! سویا ہوا تو ہوں۔ اب تو آن کی والدہ دو وہم ہو گیا۔ روز رات دو لٹی لٹی بار اٹھ کر دیکھتیں اور اللہ! یہیں اس حالت میں پاتیں اور اٹھا کر سالابیں۔ صبح دو

جب آپ سے اس کے متعلق استفسار کیا جاتا تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ریاضی کے جو سوالات وہ نیند میں حل کرتے، وہ بالکل درست ہوتے۔ آہستہ آہستہ ماں کی توجہ سے ان کی یہ عادت چھوٹ گئی۔“

اقبال کے ایک ہم جماعت سے یہ بیان منسوب دیا گیا ہے کہ

”جن دنوں سکاج مشن سکول کی چوتھی یا پانچویں جماعت میں تھے، ایک روز آن کی جماعت میں ایک مرد قلندر، اونچے لمبے اور سرخ و سپید، اپنے حال میں مست آن وارد ہوئے۔ بڑی شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا، بیشانی کو بوسہ دیا اور بغیر کچھ کہے سنے واپس چلے گئے۔ استاد نے آپ سے ان کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بالکل لاعلمی کا اظہار کیا۔ بعد میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ اس مرد درویش نے کسی سے بھی آن کے متعلق دریافت نہیں کیا تھا اور خود ہی سیدھے آن کے پاس جا پہنچے تھے۔“

شعر کا ذوق بھی بچپن میں شروع ہو گیا۔ شیخ عطاء محمد کی اہلیہ محترمہ کا بیان ہے کہ شعروں سے ان کی طبیعت کو مناسبت تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں بعض دوسری عورتوں کے ساتھ رات کے وقت بازار بند بنا کرتی تھی اور اقبال بازار سے منظوم قصے لا کر ہمیں لحن سے سنایا کرتے تھے۔ ان کی آواز بہت شیریں تھی۔ اکثر اوقات قصہ سناتے سناتے اپنی طرف سے بھی کوئی مصرع اس میں جڑ دیتے اور ان کا مصرع ایسا پر اثر اور خوبصورت ہوتا کہ ہم سب انہیں بے ساختہ داد دیا کرتیں۔ اس وقت ان کی عمر بمشکل دس بارہ برس تھی۔

۱۸۹۱ء میں مدلل کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۹۳ء میں انٹرنس کا۔
 انٹرنس کا امتحان سیالکوٹ میں نہیں دیا ، کیونکہ وہاں امتحان کا سنٹر
 نہیں تھا ، اس لئے گجرات کے سنٹر میں امتحان دیا ۔ امتحان کے دوران
 میں گجرات کے ایک دولتمند بزرگ ڈاکٹر عطا محمد خان نے انہیں دیکھا
 تو پسند فرمایا اور اپنی بڑی بیٹی کے لئے رشتہ دیا ۔ گفتگو کے بعد
 رشتہ طے پا گیا ۔ اقبال نہیں چاہتے تھے کہ کچھ سنی ہوں شادی کر لیں۔
 لیکن بزرگوں کا حکم بھی نہیں ٹال سکتے تھے ، اس لئے مان گئے ۔ جب
 برات سیالکوٹ سے گجرات جانے کے لئے تیار ہوئی ، میرا ہاتھ لگا ، انہیں
 گھوڑے پر سوار ہو گئے تو امتحان میں دستیابی نہ ہو سکی ۔ اس وقت سے
 دو بچے ہوئے ۔ لڑکی کا نام معراج ہو گیا تھا ۔ اور لڑکے کا اقبال تھا ۔
 معراج بیگم اٹھارہ سال کی عمر میں فوت ہو گئیں ۔ اقبال کے سب سے
 تعلیم پائی اور بیسٹری کی سند حاصل کی ۔ ویسے یہ شادی کی وجہ سے
 رہی ۔ فریقین ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے اور یہ شہر کی طرف
 دم تک رہا ۔

انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اقبال سکول مشیل میں داخل
 داخل ہوئے ۔ اس کالج کی تاسیس ۱۸۸۸ء میں ہو چکی تھی ۔ ان کے
 تعلیم کے زمانے میں یہ کالج گورنمنٹ سکول کی عمارت میں واقع تھا ۔
 کالج کا تدریسی عملہ پانچ افراد پر مشتمل تھا ، جن میں ڈاکٹر
 جان ڈبلیو پنکسن ڈی ۔ ڈی (پرنسپل) ، فرینک ڈاوس بی ۔ ایچ ۔ ڈی ،
 بی ۔ اے ۔ پنڈت تیرتھ راہ اور موہانی بی ۔ جی ۔ ڈی ، جس کے بعد
 کالج میں یہ مضامین پڑھائے جاتے تھے : انگریزی ، فارسی ، عربی ،
 سائنس ۔ عربی ۔ فارسی اور فلسفہ ۔ اقبال نے انگریزی کے علاوہ
 کون کون سے مضامین لئے ۔ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ۔ کالج کے

زمانے میں اقبال کیسے طالب علم تھے؟ اس سلسلے میں کوئی دستاویزی ثبوت تو موجود نہیں، البتہ دو شواہد ان کی ذہانت اور قابلیت کے غماز ہیں۔ اول یہ، کہ انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ وظیفہ بھی حاصل کیا اور تمغہ بھی۔ ظاہر ہے۔ یہی رنگ ایف۔ اے میں رہا ہو گا۔ دوم یہ کہ اقبال کی جو درسی کتابیں محفوظ ہیں، ان پر جا بہ جا تشریحی نوٹ ان کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے موجود ہیں، جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں، کہ وہ شدید محنت کے عادی تھے۔

کالج کے زمانے میں بھی ایک طرف میر حسن شاہ سے مسلسل رابطے اور دوسری طرف اپنے صوفی منشا والد ماجد کے زیر اثر اقبال کو دین سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں ایک پرتاثر واقعہ خود اقبال کی زبانی ملاحظہ ہو:

”میں نے کہا تھا، قرآن مجید دل کے راستے بھی شعور میں داخل ہوتا ہے۔ یہ حقیقت یوں سمجھ میں آئے گی کہ یہ کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میرا معمول تھا، ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا، کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے، والد ماجد حسب معمول مسجد سے واپس آئے۔ میں تلاوت میں مصروف تھا۔ مگر وہ جیسے کسی خیال سے میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

کہنے لگے۔ تم کیا پڑھا کرتے ہو؟ مجھے آن کے سوال پر نہایت تعجب ہوا، بلکہ سلال بھی۔ انہیں معلوم تھا، میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہر حال میں نے مؤدبانہ عرض کیا، قرآن پاک۔ تمہارے لگے، تم جو لکھتے پڑھتے ہو، سمجھتے بھی ہو؟ میں نے کہا۔ کیوں نہیں؟ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں۔ کچھ نہ لکھتے سمجھ لیتا ہوں۔ انہوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور آٹھ کر اپنے ٹھرنے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا، آخر اس سوال سے آن کا مطلب کیا ہے؟ لکھتے دن گذر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ کو چھٹا روز تھا۔ کہ صبح سویرے میں حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ والد صاحب مسجد سے واپس آئے۔ اور میں نے تلاوت ختم کی تو انہوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے تمہارے لکھے، بیٹا! قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جس پر اس کا نزول ہو۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن پاک کیسے لکھی ہو سکتا ہے۔ وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے، تمہارے لکھے۔ تمہیں کیسے یہ خیال گذرا کہ اب قرآن مجید لکھی ہو نازل نہیں ہو سکتا کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو، جیسے تمہارے نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو تمہاری رت و گوشت میں سرایت کر جائے گا۔ میں ہمہ تن گوش واد ماجد کی بات سنتا رہا بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت ویسے ہی کروں، جیسے آن کا ارشاد ہے، کہ انہوں نے کہا، سنو! اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو

جس معراج مکمل تک پہنچانے کا تھا ، اُس کا آخری اور کامل
 و مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرمؐ محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ
 علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ستودہ صفات میں ہمارے سامنے
 پیش کر دیا ۔ لہذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام سے
 حضور رسالت سب صلعم تک ، کہ خاتم الانبیاء ہیں ، جتنے
 بھی نبی مبعوث ہوئے ، اُن میں سے ہر ایک کا گذر مدارج
 محمدیہ ہی میں سے ہو رہا تھا ۔ وہ گویا ایک سلسلہ تھا ۔
 جس کا خاتمہ ذات محمدیہ کی تشکیل ہو گیا ۔

”والدِ ساحد نے پھر خود ہی اپنے اس ارشاد کی تشریح کی ۔
 انہوں نے کہا ، شعور انسانی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بالآخر
 جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پا لے ۔
 تو ذات محمدیہ بھی اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہو گئی ۔ حضور
 رسالت سب صلعم تشریف لائے ۔ باب نبوت بند ہوا ۔ انسانیت
 اپنے معراج مکمل کو پہنچی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
 کا آسودہ حسنہ ، سلسلہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لئے محبت ، مثال
 اور نمونہ ٹھہرا ۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا
 چلا جائے گا ، اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا ۔
 یہ مطالب تھا ، میرے اس ٹہرنے کا ، کہ قرآن مجید اسی کی
 سمجھ میں آسکتا ہے جس پر اُس کا نزول ہوا ۔“ ۱۲

اس وقت اقبال کا سین سولہ سترہ برس کا ہوگا ، لیکن یہ لاجواب نکتہ
 اُن کے دل میں ترازو ہو گیا ۔ اور دیا شاعری اور دیا شعر نگاری اور کیا
 خطابت ۔۔۔ سبھی میں آخری دم تک جاری و ساری رہا ۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ سومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

باقاعدہ شاعری کا آغاز لب ہوا؟ خان بہادر محمد مسیح پال کا بیان ہے کہ اقبال کالج کی کلاسوں میں پڑھتے تھے اور میں سکول میں تھا۔ مجھے یاد ہے۔ کہ ایک دفعہ وہ سکول کے ایک جلسے میں شریک ہوئے اور اپنی نظم پڑھی۔ لیکن سر عبدالقادر کا بیان ہے کہ ”ابھی سکول ہی میں پڑھتے تھے کہ کلام سوزوں زبان سے نکلنے لگا۔ پنجاب میں اردو کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ ہر شہر میں زبان دانی اور شعر و شاعری کا چرچا دم و پیش موجود تھا۔ سیالکوٹ میں بھی شیخ بہار اقبال کی طالب علمی کے دنوں میں ایک چھوٹا سا شاعرہ ہوتی تھی۔ اس کے لئے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کر دی۔ شعرائے اردو میں ان دنوں نواب مرزا خان صاحب داغ دہلوی کا بہت شہرہ تھا اور نظام دکن کے استاد ہونے سے ان کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔۔۔ سینکڑوں آدمی ان سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے۔۔۔ شیخ بہار اقبال نے بھی انہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لئے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کو اردو زبان دانی کے لئے بھی ایسے استاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اس وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فن غزل میں کتنا سمجھا جاتا تھا۔ تو اس ابتدائی غزل لکھنے میں وہ سب سے نو موجود نہ تھے۔ انہیں اس سے پہلے از ان اقبال نے شہرت پائی مگر جناب داغ دہلوی ان کے پنجاب کے ایک دور افتادہ شیعہ زید صاحب علیہ السلام کے معمولی غزل گو تھے۔ انہوں نے جلد شہرت دیا کہ کلام میں اصلاح کی کوشش بہت کم ہے۔ اور اس سلسلہ تلمذ کا بہت دیر قائم نہیں رہا۔ البتہ اس کی یاد دوریں طرف رہ گئی۔ داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے کہ اقبال کے

دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جس کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔ ۱۳۴

دین سے بے پناہ محبت، علم و ادب سے گہری دلچسپی، درسی کتب کے مطالعہ میں انہماک اور شعر و شاعری میں درک سے یہ تاثر لینا مناسب نہیں ہوگا کہ اقبال پر بچپن اور عنفوان شباب کے زمانوں میں ایک گھمبیر سنجیدگی طاری تھی اور وہ تفریحات سے نفور تھے، یا ان میں شوخی موجود نہیں تھی۔ اس زمانے میں پرندے پالنے اور ان سے کھیانے کا مشغلہ عام تھا اور اقبال نے بھی اس میں دلچسپی لی، اور وہ بھی مولانا میر حسن شاہ کے صاحبزادے سید محمد تقی کی رفاقت میں۔ بلکہ یہ روایت بھی عام ہے کہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا: تم بخت، اس میں تجھے کیا سزا ملتا ہے؟ تو اقبال نے اسی وقت جواب دیا: حضرت! ذرا اسے پکڑ کر دیکھئے۔ ۱۵ ایک مصنف نے اسے سراسر زیادتی اور بے انصافی سے تعبیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ بے حد اطاعت گزار شاگرد ایسی ”گستاخانہ دیدہ دلیری“ کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اس واقعہ کے راوی خود حضرت علامہ تھے۔ اور اتنی بات کا تو راقم الحروف بھی چشم دید گواہ ہے کہ حضرت علامہ نے میاں نظام الدین کے آسوں کے باغ میں لاہور کے اہل علم سے خوش گپیوں کے دوران میں بٹیر بازی کے فن پر گفت گو فرمائی اور ہاتھ سے بٹیر کو

130343

”مٹھیانے“ کا طریقہ بتایا۔ رہی استاد کے سامنے شاگرد کی جسارت کا مسئلہ تو یہ جسارت نہیں، ایک طفلانہ شوخی تھی، جس کی اچھے اساتذہ قدر کرتے ہیں۔ اور پھر اگر شاگرد کی ”جسارت“ اتنی ہی قابل اعتراض ہے تو اس واقعہ کو کیوں خوشی سے بیان کر دیا جاتا ہے کہ استاد نے سکول میں دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا تو اقبال بولے۔ کہ اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ذومعنی بات ہے، لیکن ہے تو ”جسارت“۔

علامہ کا اصل تفریحی مشغلہ ڈبوتر بازی تھا۔ جس مصنف کو سیر بازی کے ”الزام“ پر اعتراض تھا، وہی فرماتے ہیں، کہ اقبال کو ”بڑکپن سے لے کر بڑے ہونے تک ڈبوتر پالنے کا شوق رہا۔“ خانہ اقبال کے ایک فرد بزرگوں کی روایت سے بتاتے ہیں۔ کہ جب شیخ نور نے اقبال کا شوق دیکھا تو انہیں گھڑیر ہی ڈبوتر رکھنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ ڈبوتروں کے شوق میں غلط صحبت میں نہ پڑ جائیں اقبال کوٹھے پر سے اپنے ڈبوتر اڑاتے اور کھینچوں خاموش بیٹھے ان کی سانس سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ ڈبوتروں کا شوق انہیں کافی عرصے تک رہا۔ لاہور میں انارکلی میں بھی ان کے پاس ڈبوتر تھے، جب میلادِ روزِ مبارک ہونے تو ڈبوتروں کے لئے خاص دڑے بنوائے، لیکن جب شاہد اقبال نماز پڑھتے تو انہوں نے یہ شوق خم کر دیا اور تمام ڈبوتر گھیر کر اٹھائے، تاکہ شاہد اس شغل سے محفوظ رہیں۔ شاہد اقبال نے ان ڈبوتروں کو تیار کر کے لڑے ہوئے جو دلچسپ واقعہ بیان کیا اور جو اس واقعہ کا سبب بنا، وہ اس قابل ہے کہ بیس خدمت ہو جائے۔ ملاحظہ فرمائیے :

”حضرت علامہ کو ڈبوتروں سے بڑی دلچسپی تھی، علامہ ایک زمانے میں انہوں نے خوب خوب ڈبوتر پال رکھے تھے۔“

شوق انہیں بچپن ہی سے تھا۔ جس میں راقم الحروف کے برادر
 عم زاد سید محمد تقی مرحوم بھی ان کے شریک تھے۔ اس
 سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف جب
 قیام دہلی میں پہلی مرتبہ مولانا عبدالسلام نیازی مرحوم و
 مغفور کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ سلسلہ تعارف ان سے
 حضرت علامہ سے میرے نعتیہ کا ذکر کیا گیا تو لہنے
 لگے، میں ان کے علم و فضل کا قائل ہوں۔ لیکن یہ خودی
 کیا چیز ہے؟ میں خودی کو نہیں سمجھتا۔ تم سمجھاؤ،
 خودی ہے کیا؟ میں نے عرض کیا، میں یہ جرات کیسے
 کر سکتا ہوں کہ آپ کے سامنے زبان کھولوں۔ یوں بھی جب
 یہ ابن علم و فضل آپ نہیں سمجھے کہ خودی کیا ہے تو
 مجھ جیسا کہ علم انسان سے کیا سمجھے گا؟ اس پر مولانا
 مسکرا کر کہنے لگے، اقبال نے جب اسرار خودی نکلتی تو
 اس کا ایک نسخہ ہمیں بھیجا تو ہم نے اس کی بڑی تعریف
 کی اور ہم واقعی سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں ان کے
 علم و فضل کو کوئی نہیں پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو
 بصیرت دی ہے، کسی کو نہیں ملی۔ لیکن جب ہم نے
 انہیں لکھا کہ یہ جو آپ نے بار بار خودی کی طرف اشارہ
 کیا ہے تو ہم نہیں سمجھے خودی کیا ہے؟ ہمیں سمجھا
 دیجئے۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا، ہمارے پاس
 کہوتروں کا ایک نہایت اعلیٰ جڑا ہے۔ اجازت ہو تو آپ
 کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ انکا کہہ کر مولانا نے
 سامعین کی طرف دیکھا اور کہنے لگے ہم ان کا مطلب
 سمجھ گئے۔ مولانا شدت سے وحدت الوجود کے قائل تھے۔

حضرت علامہ شاید انہیں یہ سہجھا رہے تھے کہ جس چیز کے بارے میں آپ تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں، وہی بار بار اور نئے سے نئے روپ میر آپ کے سامنے آتی رہتی ہے۔ یہی خودی ہے۔ ۱۸۶۶

موسیقی سے دلچسپی کا آغاز بھی بچپن میں ہوا۔ اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے۔ اس کا پتہ یوں ملتا ہے کہ سیالکوٹ کی اقبال منزل میں اقبال کی جو درسی کتب محفوظ ہیں، ان میں نوین جہانت کی کتاب READINGS IN POETRY میں دو مقامات پر اپنے ہاتھ سے راگ کے بول تحریر کیے۔ ایک جگہ یہ بول لکھے ہیں :

۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱
سا	لی -	دھا -	پا -	ما -	گا -	رے -	ما -
	نکھاد	دھیوت	پنچم	مدھم	گندھار	رکھب	خرج

دوسری جگہ یہ بول درج ہیں :

						۲
						دھا
			ری		خرج (خاص)	
						۱
			ری	ری	کا (خاص)	پا
		۱۹۵				

۱۸۹۵ء میں اقبال نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر لیا۔

سکاج مشن کالج میں اس وقت تک بی۔ اے۔ کی تدریس نہ اجراء نہیں ہوا تھا، اس لیے اقبال کو اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور بھیج دیا گیا اور وہیں ان کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

حوالے

- ۱ - ”اقبال درون خانہ“، صفحات ۱۳-۱۱ -
- ۲ - ”روزگار فقیر“، (جلد اول) ، صفحات ۱۱-۲۱۰ -
- ۳ - ”ذکر اقبال“، ، صفحات ۲۵-۲۷۳ -
- ۴ - ”اقبال درون خانہ“، ، صفحات ۸-۹ -
- ۵ - ایضاً ، صفحات ۱-۹ -
- ۶ - ”ذکر اقبال“، ، ص ۱۱ -
- ۷ - ”اقبال درون خانہ“، ، ص ۱۰ -
- ۸ - ”ذکر اقبال“، ، ص ۱۵-۱۳ -
- ۹ - ”اقبال درون خانہ“، ، صفحات ۱۱-۱۲ -
- ۱۰ - ”کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ“، ، ص ۳۱۰ -
- ۱۱ - ”روزگار فقیر“ (جلد دوم) ، ص ۱۹ -
- ۱۲ - ”اقبال درون خانہ“، ، صفحات ۲-۱۰۳ -
- ۱۳ - ”اقبال کے حضور میں“ ، صفحات ۶۱-۶۰ -
- ۱۴ - ”ذکر اقبال“، ، ص ۱۵ -
- ۱۵ - ”اقبال درون خانہ“، ، ص ۱۲ -
- ۱۶ - ”روزگار فقیر“، (جلد اول) ، ص ۲۴۲ -
- ۱۷ - ”اقبال درون خانہ“، ، ص ۱۱ -
- ۱۸ - ”اقبال کے حضور میں“، ، صفحات ۳۹-۱۳۸ -
- ۱۹ - ”اقبال درون خانہ“، ، ص ۱۰۵ -

تیسرا باب

لاہور میں : تعلیم کا دوسرا مرحلہ

اقبال لاہور کی کھلی فضاؤں میں آئے تو ابک نئی دنیا سے آشنا ہوئے جو سیالکوٹ کی دنیا سے بہت مختلف تھی۔ یہ شہر مشرق و مغرب کا امتزاج پیش کرتا تھا۔ ایک طرف اندرون شہر کی گہما گہمی، جس کے سینے میں مشرقی روایات اور انداز زندگی سے پیار کا جذبہ موجزن تھا۔ دوسری طرف چھاؤنی سے لے کر گورنمنٹ ہاؤس تک کا علاقہ، جو دونڈ ٹاؤن کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور جہاں سفید فام صاحبان عالی مقام آباد تھے۔ اس کے پہلو میں لارنس باغ اور چڑیا گھر، جو سیر و تفریح کے مراکز تھے اور پھر مال روڈ — جس پر لارنس ہال اور منٹکمری ہال میں گوری نسل کے لوگ رقص و سرود اور ناؤ نوٹس کی محفلیں کرم کرتے تھے۔ اس شاہراہ کو ٹھنڈی سڑک کہتے تھے۔ یورپی تاجروں نے درزیاں لگا رکھی تھیں۔ گوری نسل کے لوگ یہیں خرید و فروخت کرتے تھے۔ نیلہ گنبد سے مشرقی زندگی کا آغاز ہوتا تھا۔ انارادی بازار موجود تھا لیکن اس میں رونق بہت کم تھی۔ مال روڈ اور برائے شہر کے درمیان تعلیمی دنیا آباد تھی۔ پنجاب یونیورسٹی وجود میں آچکی تھی۔ اس کا بن چکا تھا اور گورنمنٹ کالج کی موجودہ عمارت اس سال مکمل ہو چکی تھی جس سال اقبال نے سیالکوٹ میں جنم لیا۔ اورینٹل کالج اور لاء سکول بھی اسی عمارت میں مرتکز تھے۔ نیلہ گنبد کے قریب ہی میڈیکل کالج اور فورمن کرسچین کالج واقع تھے اور عجائب گھر کے قریب میو سکول آف آرٹس موجود تھا۔

جن دنوں اقبال گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے ، اس کالج میں ان مضامین کی تدریس کا بندوبست موجود تھا : انگریزی زبان و ادب ، عربی ، فارسی اور سنسکرت ، تاریخ و معاشیات ، ریاضی ، فلسفہ اور طبی علوم ۔ تین کورس ہوتے تھے ۔ اول : دو سالہ انٹرمیڈیٹ کورس ، جس میں کم از کم چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ دوم : بی ۔ اے کا دو سالہ کورس ، جس میں تین یا چار مضامین پڑھائے جاتے تھے ۔ سوم : ایم ۔ اے کا یک سالہ کورس ، جس میں ادب یا سائنس کی کسی ایک شاخ میں تھنص مطلوب تھا ۔ ۲ کالج میں یہ اساتذہ کام کرتے تھے :

(۱) پی ۔ جی ۔ ڈالنجر ، پرنسپل ۔ (۲) جی ۔ بی ۔ اوشر (فلسفہ) ۔

(۳) لالہ جیہا رام (تاریخ و فلسفہ) ۔ اقبال نے بی ۔ اے میں فلسفہ لالہ جیہا رام اور پروفیسر اوشر سے پڑھا ۔ انگریزی کی تعلیم ڈالنجر سے حاصل کی ہوگی ۔ السنہ شرقیہ کی تدریس اورینٹل کالج کے اساتذہ کے سپرد تھی ۔ اس لیے اقبال نے عربی کی تعلیم مولوی محمد دین سے حاصل کی جو اس کالج میں عربی کے استاد تھے ۔ مارچ ۱۸۹۷ء میں اقبال نے بی ۔ اے کا امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن حاصل کی ۔ یونیورسٹی کے کل امیدواروں میں ان کی پوزیشن گیارھویں تھی لیکن یہ کہنا نادرست نہیں کہ اقبال نے بی ۔ اے کے امتحان میں امتیازی حیثیت حاصل کی کیونکہ انہیں دو تحفے ملے ۔ اول : جہاں الدین میڈل ، جو عربی کے امتحان میں اول آنے پر ملا ۔ دوم : خلیفہ محمد حسین اچھی سن میڈل ، جو انگریزی اور عربی کے امیدواروں میں سب سے زیادہ نمبر لینے پر حاصل ہوا ۔ ۳

بی ۔ اے کے امتحان میں کامیابی کے بعد اقبال نے اسی سال ایم ۔ اے فلسفہ میں داخلہ لیا ۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ، اس زمانے میں ایم ۔ اے کورس ایک سال کا ہوتا تھا ۔ اس اعتبار سے اقبال کو

۱۸۹۸ء میں ایم۔ اے کر لینا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا، وہ یا تو ناکام رہے یا انہوں نے امتحان ہی نہ دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی بتاتے ہیں کہ امتحان میں نہ بیٹھنے کا بہ ظاہر کوئی قرینہ نہیں۔ راقم الحروف کو اس سے اختلاف ہے چونکہ دستاویزات سے یہ تو ظاہر ہے کہ آس زمانے میں ایم۔ اے کے ساتھ ساتھ لاء میں داخلہ بھی مل جاتا تھا اور یہ دونوں امتحان ایک ہی سال دینے کی اجازت تھی۔ انہوں نے بھی ۱۸۹۷ء میں بیک وقت ایم۔ اے فلسفہ اور لاء میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۸ء میں لاء کے امتحان دیا۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے دو امتحانوں کو بڑبڑ سمجھ کر کے صرف ایک امتحان دیا ہو اور اس طرح ایم۔ اے فلسفہ کے امتحان میں نہ بیٹھے ہوں۔

یہ اقبال کی خوش نصیبی تھی کہ فلسفے کے مشہور افسق پروفیسر ٹاس آرٹلڈ نے علی گڑھ کالج سے قطع نعلق کر لیا اور گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر ہو گئے۔ ان کا تقرر ۱۱ فروری ۱۸۹۸ء کو ہوا۔ اور اقبال ان سے درس لینے لگے۔ ”پروفیسر آرٹلڈ چند ہی روز میں اقبال کی صلاحیتوں سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اقبال سے دوستی شروع کر دیا۔ وہ اپنے اصیاب سے اقبال کی تعریف لیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسا ناکرد استاد دو محقق اور محقق دو محقق اور محقق دو محقق ہے“۔ ۱۵ سالانہ امتحان میں زیادہ سے زیادہ ایک ماہ یہ لایا۔ اقبال نے سوچا ہوا کہ امتحان میں ناکام رہنے سے مراد یہ ہے کہ اس آس سال بیٹھا ہی نہ جائے۔ پروفیسر آرٹلڈ کے ہر سالانہ رسالے کے بعد اقبال نے ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے کا امتحان دیا۔ اس سال صرف ایک ہی امیدوار کامیاب ہوا، وہ اقبال تھے۔ اس لیے ٹھہرے دوروں کا حال ٹوٹنے کے باوجود انہیں اول پوزیشن کا ملاتی تھی، مگر معاملہ ہو۔

اقبال سے پروفیسر آرنلڈ کے رشتے کے بارے میں سر شیخ عبدالقادر نے ۱۹۲۴ء میں جو سطور قلمبند کیں ، وہ اقبال کی شخصیت کی تعمیر کے بارے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیے :

”انہیں علم فلسفہ کی تحصیل کا شوق تھا اور انہیں لاہور کے اساتذہ میں ایک نہایت شفیق استاد ملا جس نے فلسفے کے ساتھ ان کی مناسبت دیکھ کر انہیں خاص توجہ سے پڑھانا شروع کیا ۔ پروفیسر آرنلڈ ۔۔۔ غیر معمولی قابلیت کے شخص ہیں ۔ قوت تحریر ان کی بہت اچھی ہے اور وہ علمی جستجو اور تلاش کے طریقِ جدید سے خوب واقف ہیں ۔ انہوں نے چاہا کہ اپنے شاگرد کو اپنے مذاق اور اپنے طرز عمل سے حصہ دیں ۔ پہلے انہوں نے علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانے میں اپنے دوست مولانا شبلی مرحوم کے مذاق علمی کے پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی ۔ اب انہیں یہاں ایک اور جوہر قابل نظر آیا جس کے چمکانے کی آرزو ان کے دل میں پیدا ہوئی اور جو دوستی اور محبت استاد اور شاگرد میں پہلے دن سے پیدا ہوئی وہ آخرش شاگرد کو استاد کے پیچھے پیچھے انگلستان لے گئی ۔ اور وہاں یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا اور آج تک قائم ہے ۔ آرنلڈ خوش ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور میرا شاگرد علمی دنیا میں میرے لیے بھی باعث شہرت افزائی ہوا ۔ اور اقبال معترف ہے کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی تھی اور جسے درمیان میں داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا ، اس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہونے لگے ۔ لاء کے امتحان میں اقبال

کامیاب نہ ہو سکے ، شاید اس لیے کہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھا ہوا تھا، ایم۔ اے میر بھی اور لاء میں بھی۔ ایم۔ اے کا امتحان مارچ ۱۸۹۹ء میں ہوا اور لاء کا دسمبر ۱۸۹۸ء میں۔ ایم۔ اے پر زیادہ توجہ رہی ، اس لیے اس میں کامیاب ہو گئے۔ لاء پر توجہ میں کمی رہ گئی ، اس لیے پانچ پرچوں میں تو کامیاب ہو گئے اور فقہ کے پرچے میں ناکام رہے۔ سید محمد ترمذی نے ہائیکورٹ کی پرانی دستاویزات کی چھان بین کے بعد انکشاف کیا کہ جون ۱۹۰۰ء میں اقبال نے پنجاب کی عدالت عالیہ کو اس مضمون کی درخواست بھیجی کہ مجھے لیکچروں میں دوبارہ حاضری دینے کے بغیر اجازت دی جائے کہ دسمبر ۱۹۰۰ء کے لاء کے امتحان میں بیٹھ جاؤں لیکن یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ یہ انکار اقبال کی زندگی میں ایک نئے موڑ کا آغاز ثابت ہوا ، کیونکہ انہوں نے اپنے ملک کے اندر لاء کے مطالعہ کی تکمیل کا ارادہ ترک کر دیا اور فیصلہ کیا کہ سمندر پار جائیں۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا عرصہ باہر گزارا اور اس دوران میں نابغہ روزگار فضلاء کی صحبت سے فیض حاصل کرتے رہے۔

تکمیل تعلیم کے بعد گرتے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اقبال نے مشاغل زمانہ تعلیم میں کس نوعیت کے تھے اور وہ کون سے مسائل سے جنہوں نے اقبال کو اقبال بننے میں مدد دی۔ لیکن اس سے بے ضروری ہے کہ اس زمانے کے شہر لاہور کی ثقافت و تہذیب کا ایک ہلکا سا نقشہ پیش کر دیا جائے۔ اس زمانے کا لاہور روشنیوں سے جگمگ جگمگ کرتا شہر نہیں تھا کہ ابھی بجلی نہیں آئی تھی۔ گھروں اور دروازوں میں روشنی

کا ذریعہ پیتل کے پرانے شمعدان یا مٹی کے چراغ تھے۔ مٹی کے تیل سے
 جلنے والی لالٹین اور گلوب نما لالٹین کا نیا نیا رواج چلا تھا۔ انہیں پہلے
 ریلوے سٹیشن میں نصب کیا گیا اور پھر کچھ مرفع الحال گھرانوں نے
 بھی اپنا لیا۔ لاہور کی کل آبادی ایک لاکھ چھتر ہزار سے کچھ زیادہ
 تھی جس میں ایک لاکھ سوا دو ہزار مسلمان تھے، باسٹھ ہزار ہندو، سات
 ہزار تین سو سکھ، چار ہزار سات سو عیسائی اور باقی دوسرے فرقوں سے
 تعلق رکھنے والے لوگ۔ انہوں نے شہر میں تفریحات کا یہ عالم تھا کہ
 چھوٹے بچے گولیاں کھیلتے تھے۔ نوجوان اکھاڑوں میں جاتے، ڈنڈ نکالتے
 اور کشتی لڑتے تھے۔ جا بجا مرغ، بلبیل، بٹیر اور بھیڑ اڑانے کے مقابلے
 ہوتے جنہیں دیکھنے کے لیے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ پتنگ بازی کا
 شوق بھی عام تھا۔ بیرون شہر کالجوں اور سکولوں میں کرکٹ محبوب
 کھیل تھا یا طلبہ انگریزی آلات کی مدد سے ورزش جسمانی کا شغل اختیار
 کرتے تھے۔ کوئی تھیٹر نہیں تھا، کوئی سنیما نہیں تھا، کوئی نمائش نہیں
 ہوتی تھی اور کسی قسم کے ثقافتی شو کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔
 مسلمانوں اور ہندوؤں کی انجمنیں الگ الگ تھیں۔ مسلمانوں کی انجمنوں میں
 انجمن اسلامیہ سرفہرست تھی جو ۱۸۶۹ء میں قائم ہوئی اور جو مساجد کی
 نگرانی کرتی تھی۔ دوسرے درجے پر انجمن حمایت اسلام تھی جو ۱۸۸۶ء
 میں قائم ہوئی اور جس کے اہتمام میں ایک اسلامیہ ہائی سکول چل رہا تھا۔
 سید امیر علی کی قائم کردہ مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت سنٹرل نیشنل
 محمدن ایسوسی ایشن کی ایک شاخ موجود تھی جس کے صدر فقیر سید
 جمال الدین اور سیکرٹری مواعی محرم علی چشتی تھے لیکن یہ شاخ سیاسی
 کم تھی اور تہذیبی زیادہ۔ ان انجمنوں کا کام کج امرائے کرام چلانے
 تھے۔ عوام کو ان میں کوئی خاص عمل دخل حاصل نہیں تھا، سوائے اس
 کے کہ چندہ دے دیا یا کبھی کوئی عام اجتماع ہوا تو اس میں شرکت

کر لی۔ مباحثوں، مناظروں اور تقریری مقابلوں کے لیے نوجوانوں کی ایک انجمن ینگ مین محمدن ایسوسی ایشن کے نام سے ۱۸۹۱ء سے قائم تھی۔ اس کے ارکان کی تعداد اٹھانوے تھی اور میاں شاہ دین بار ایٹ لاء اور سید خورشید انور سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ اس انجمن کی تقریبات شاذ ہی ہوتی تھیں۔ کچھ اور انجمنیں بھی قائم تھیں جن کا مقصد تھا، محدود دائرے میں اصلاح معاشرہ کے لیے سعی۔ یہ انجمنیں مشاعرے بھی برپا کیا کرتی تھیں۔ اخبارات موجود تھے لیکن بہت کم۔ لاہور کا واحد انگریزی روزنامہ ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ تھا لیکن یہ سفید فام حضرات کی دلچسپی کی چیز تھا، اس لیے اشاعت چودہ سو کے لگ بھگ تھی۔ انگریزی کا واحد ہفت روزہ ”ٹریبیون“ تھا جو ہندوؤں کے جذبات کی عکسی کرتا تھا۔ اردو روزنامے دو تھے: ”اخبار عام“ اور ”پیسہ اخبار“، موخر الذکر مسلمانوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ ان اخباروں کو اخبار کہنا شاید مناسب نہ ہو، اخبارچے کا لفظ شاید زیادہ موزوں ہو، اس لیے اشاعتیں زیادہ نہیں تھیں۔ البتہ ”پیسہ اخبار“ کا ہفت روزہ ایڈیشن اشاعت تھا۔

ان حالات میں بڑھے لکھے لوگوں کے لیے فرحت کے مشغلے تین ہی ہو سکتے تھے: سیر، احباب کی محفلوں میں گپ زنی یا کتابوں اور اخباروں کا مطالعہ۔ ادیبوں کے لیے مشاعروں میں شرکت بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہو سکتی تھی۔ علامہ اقبال سیر یا گھومنے پھرنے کے قائل نہیں تھے۔ بقول میر غلام بھیک نیرنگ ”اقبال کی طبیعت میں اسی وقت سے ایک گونہ قطبیت تھی اور وہ ’قطب از جا نہ می جنبدہ‘ کا مصداق تھے۔“ اس لیے دو ہی مشغلے تھے، محفل احباب میں گپ زنی اور مطالعہ۔ جب لاہور آئے تو سب سے پہلے بھائی دروازے کے اندر شیخ کلاب دین مرحوم کے مکان میں سکونت اختیار کی۔ انہی دنوں مولوی غلام بھیک

نیرنگ سے ملاقات ہوئی - وہ یوں کہ ایک دوست نے سر راہے تعارف کرا دیا - نیرنگ نے جب سنا کہ وہ سادہ وضع ، گورا چٹا ، کشیدہ قامت جوان رعنا شاعر بھی ہے تو مشترکہ دوست کی وساطت سے 'مونہ' کلام منگایا جس کے دو شعر یہ تھے :

بر سر زینت جو شمع محفل جانانہ ہے
شانہ اس کی زلف پیچاں کا پر پروانہ ہے
پائے ساقی پر گرایا جب گرایا ہے تجھے
چال سے خالی کہاں یہ لغزش مستانہ ہے

اقبال نے بھی نیرنگ کا کلام دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا نو موصوف نے اپنی ایک غزل بھیج دی جس کا ایک شعر یہ تھا :

حرم کو جانا جناب زاہد یہ ساری ظاہر پرستیاں ہیں
سین آس کی رندی کو مانتا ہوں جو کام لے دیر سے حرم کا

اتنے میں اقبال کو گورنمنٹ کے آس دارالاقامہ میں ایک کمرہ مل گیا جو آج کل کواڈرینگل ہوسٹل کے نام سے مشہور ہے - نیرنگ اقبال سے جونیئر تھے اور اسی ہوسٹل میں مقیم تھے - نیرنگ آس زمانے کا ذکر یوں کرتے ہیں :

"میں اور کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں جو جو آن کے دوست
نہیے ، سب انہی کے کمرے میں آن کے پاس جا بیٹھتے تھے -
وہ وہیں میں فرش بنے بیٹھے رہتے تھے - حقہ جینھی سے آن کا
ہم دم و ہمہ نفس تھا - برہنہ سر ، بنیان در بر ، نخنے نک کا
تہ بند باندھے ہوئے اور اگر سردی کا موسم ہے تو کعبیل
اڑھے ہوئے بیٹھے حقہ پیتے رہتے تھے اور ہر قسم کی گپ

اڑاتے رہتے تھے۔ طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ پھبتی زبردست
 کہتے تھے۔ ادبی مباحثے بھی ہوتے تھے۔ شعر کہے بھی
 جاتے اور پڑھے بھی جاتے تھے۔“

جب اقبال نے ایم۔ اے کر لیا اور نیرنگ نے بی۔ اے کر لیا تو
 دونوں نے ہوسٹل چھوڑ دیا اور یوں شب و روز کی محفلیں ختم ہو گئیں۔
 اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے غلام بھیک نیرنگ بتاتے ہیں :

”اس ابتدائی زمانے میں کسی کو بھی اقبال میں ایک اچھے
 شاعر، مگر عام معیار کے شاعر کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ یا
 اگر آپ ایازت دیں تو یہ کہوں کہ دیکھنے والوں کی دوتابہ
 نظری نہ تھی بلکہ اُس وقت وہ چیز وجود ہی نہ تھی جو
 بعد میں بن گئی۔ شمس العلماء سید میر حسن مرحوم و مغفور کی
 تربیت سراسر ادبی تھی۔ پروفیسر آرنلڈ کا فیض تعلیم مطالعہ
 فلسفہ و تحقیق علمی کا رہنا ہوا۔ تصوف کی بنیاد کبیر میں پڑ
 چکی تھی کہ اقبال کے والد ایک صرفی منس بزرگ تھے۔ مجال
 سرچشمہ، جہاں سے اقبال نے تلاش حق کی، ابھی نہ نچھنے
 والی پیاس کو بار بار تسکین دی، قرآن حکیم ہے، رسول کریم
 صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔“

۱۸۹۰ء کا ذکر ہے۔ حکیم احمد شجاع مرحوم نے اس حکیم

شجاع الدین خد نے بوائی دروازے کے اندر بازار حاکم میں انجمن التعلیمی
 بنیاد ڈالی جس کے زیر اہتمام مجالس مشاعرہ برپا ہوتے تھے۔ یہ مشاعرہ ہر
 ہفتے حکیم امین الدین بیرسٹر نے دواتِ ندک پر منعقد ہوتا تھا اور جو
 طرحی اور غیر طرحی دلام پڑھا جانا تھا، ماہ نامہ ”سور بخار“ میں

شائع ہو جاتا تھا۔ شعراء میں رقابت کا بازار بھی گرم تھا۔ مرزا ارشد گورگانی دبستان دہلی کے حاسی تھے اور میر ناظر حسین فاظم دبستان لکھنؤ کی نمائندگی فرماتے تھے۔ ”دونوں کی ٹولیاں جب اس بزم مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جانے کے لیے مصروف غزل خوانی ہوتی تھیں تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کی رقابت کا نقشہ کھینچ جاتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی میر اور میرزا ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھے اور اس زمانے میں بھی پنجاب کے شعراء میر اور میرزا کے زیر قیادت میدان سخن طرازی میں ایک دوسرے سے مصروف پیکار رہتے تھے۔“ اقبال نے اپنی پہلی غزل اسی مشاعرے میں پڑھی ۱۲ اور جب یہ شعر سنایا:

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
فطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو مرزا ارشد گورگانی اچھل پڑے اور کہنے لگے: اقبال! اس عمر میں یہ شعر ۱۳؟ یہاں سے اقبال کی شاعرانہ شہرت کا آغاز ہوا اور وہ وقتاً فوقتاً اس مشاعرے میں اپنا کلام سناتے رہے۔ ایک محفل میں داغ کی شاگردی پر یوں اظہارِ فخر کیا:

نسیم و نشہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخن داں کا

اس دن منشی محمد الدین فوق سے اقبال کی ملاقات ہوئی۔ ”ذوق و مشرب سے یگانگی کی بناء پر دونوں کی طبیعت سل گئی اور ان میں کچھ ایسی الفت و محبت ہو گئی جسے جیتے جی زمانے کی دست برد کوئی گزند پہنچا نہ سکی۔“ ۱۴ منشی محمد الدین فوق ہی نے اقبال کو ۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری سہانان ہند کی پہلی مجلس میں بلایا اور انہی کی تحریک پر

اقبال نے پچیس اشعار کی ایک نظم پڑھی جس کا پہلا مصرع تھا : ” کیا تھا
گردش ایام نے مجھے محزون“۔ ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام کے
سالانہ اجتماع میں اقبال نے اپنی نظم ”نالدہ یتیم“ ترمیم کے ساتھ سنائی
تو اس پر ہزاروں سامعین اشک بار ہوئے اور دور دور تک اس نظم کی
دھوم مچ گئی۔ ۱۵۔

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید احمد خان اللہ کو پیارے ہوئے۔
مولانا حالی لکھتے ہیں۔ ”اگرچہ سرسید کی وفات کی بے شمار تاریخیں لکھی
گئیں لیکن دو عربی مادے عجیب و غریب نکلے ہیں : ایک غفرلہ اور
دوسری قرآن مجید کی یہ آیت : انی متوفیک و رافعیک والی مظہرک۔“
اس سلسلے میں سالک ، سید ذکی شاہ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ جب
سرسید فوت ہوئے تو اقبال چند دنوں کے لیے سیالکوٹ میں آئے ہوئے تھے۔
مولانا میر حسن نے سرراہ اقبال سے کہا ، ذرا تاریخ کی فکر کرنا۔ اقبال
نے ذکی شاہ کے ہاتھ یہ تاریخ وفات لکھ بھیجی : انی متوفیک و رافعیک
والی مظہرک۔ میر حسن نے سنی تو کہا خوب ہے۔ میں نے بھی ایک
تاریخ نکالی ہے : غفرلہ۔ ”حیات جاوید“ میں دونوں تاریخیں تو آگئیں لیکن
نام کسی کا بھی درج نہیں ہوا۔ میر حسن نے حالی کو شکایت کی
تو انہوں نے معذرت کر بھیجی اور کہا ، مجھے ناموں کا علم نہ ہو سکا
اب انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں نام ضرور لکھ دوں گا۔ مظہرک
وعدہ ایسا نہ کر سکے۔

سر عبدالقادر انیسویں صدی میں اقبال کی شاعری کے بارے میں
فرماتے ہیں :

” ۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے انہیں پوری شاعری
لاہور کے ایک شاعرہ میں دیکھا۔ اس بزم میں ان کے ہاں

ہم جماعت کھینچ کر لائے تھے اور انہوں نے کہہ سن کر ایک غزل بھی آن سے پڑھوائی۔ اس وقت تک لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے۔ چھوٹی سی غزل تھی، سادہ سے الفاظ، زمین بھی مشکل نہ تھی مگر کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن موجود تھا، بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ پھر اسی مشاعرہ میں انہوں نے غزلیں پڑھیں اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ ایک ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے۔ مگر یہ شہرت پہلے پہلے لاہور کے کالجوں کے طلبہ اور بعض اور ایسے لوگوں تک محدود رہی جو تعلیمی مشاغل سے تعلق رکھتے تھے۔ اتنے میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی جس میں مشاہیر شریک ہونے لگے اور نظم و نثر کے مضامین کی اس میں مانگ ہوئی۔ شیخ محمد اقبال نے اس کے ایک جلسہ میں اپنی وہ نظم، جس میں کوہ پہاڑ سے خطاب ہے، پڑھ کر سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات تھے اور فارسی بندشیں، اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اس میں موجود تھی، مذاق زمانہ اور ضروریات وقت کے موافق ہونے کے سبب بہت مقبول ہوئی۔ ۱۸۔

انیسویں صدی اپنی بساط لپیٹنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ بیسویں صدی کی آمد آمد تھی۔ وہ جوان رعنا، جو اٹھارہ برس کی عمر میں لاہور آیا تھا، دنیاوی اعتبار سے کامیاب تھا کہ تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ شعر و شاعری میں نکھار آنے لگا اور ادبی حلقوں میں جان پہچان ہو گئی۔ اب وہ پورے اعتقاد کے ساتھ زندگی کے ایک نئے موڑ پر کھڑا تھا۔

حوالے

1 - LAHORE : Its history, architectural remains and antiquities. (مختلف مقامات سے)

2 - ایضاً - ص ۳۰۳ -

3 - "کلاسیکی ادب میں تحقیقی مطالعہ" - صفحات ۱۷ - ۳۱۲ -

یہ معلومات یونیورسٹی کی دستاویزات پر مبنی ہیں -

4 - ایضاً - ص ۳۱۷ -

5 - "ذکر اقبال" - ص ۱۷ -

6 - "بانگ درا" کا دیباچہ - ص ، "ح" -

7 - ص ، ۳۰ - ۳۶ Letters and Writings of Iqbal

بحوالہ مقالہ مطبوعہ "پاکستان ٹائمز" - ۲۱ اپریل ۱۹۵۵ء)

8 - LAHORE : Its history, architectural remains and antiquities.

صفحات ۲۵۳ ، ۲۶۱ ، ۲۶۵ - ۲۸۰ -

9 - "حجرات پاکستان و ہند میں" - صفحات ۲۲ - ۳۰۶ -

10 - "مطالعہ اقبال" - ص ۲۲ -

11 - ایضاً - صفحات ۲۷ - ۱۶ -

12 - "خوں بہا" - ص ۶۷ - ۱۹۶ -

13 - "ذکر اقبال" - ص ۱۸ -

14 - "مطالعہ اقبال" - ص ۸۶ - ۸۵ -

15 - "ذکر اقبال" - ص ۱۸ -

16 - "حجرات جاوید" - ص ۳۳۳ -

17 - "ذکر اقبال" - ص ۱۹ -

18 - "بانگ درا" کا دیباچہ - ص "ح" -

۷

چوتھا باب

تحقیق اور تدریس

صدی ۱ پلٹنے کو تھی کہ پروفیسر آرنلڈ کی نگہ انتخاب نے اقبال کو ایک ایسے منصب پر فائز کیا جہاں شعر و شاعری کے پہلو بہ پہلو تحقیق، تصنیف و تالیف، ترجمے اور تدریس کے باب بھی کھل گئے۔ گویا مشاغل میں ایک بے پناہ تنوع پیدا ہو گیا۔ اور اقبال کا کمال یہ تھا کہ یورپ سے ریاض سے کام لے کر جملہ مشاغل سے بیک وقت عہدہ برآ ہوتے رہے۔ جس وقت انہوں نے ایم۔ اے کیا، اس وقت حسن اتفاق سے اورینٹل کالج کی پرنسپل شپ پر پروفیسر آرنلڈ عارضی طور پر متمکن تھے۔ انہوں نے اقبال کو میکلوڈ عربک ریڈر کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ یہ ایک ریسیرچ فیلوشپ تھی جس کا معاوضہ ایک سو روپے ماہانہ تھا۔ یہ ملازمت ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو شروع ہوئی، ۱۲ مئی ۱۹۰۳ء کو ختم ہوئی۔ اس دوران میں چھٹی لے کر انہوں نے چھ ماہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کی اور چھ ماہ اسلامیہ کالج میں۔ گویا میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے اورینٹل کالج میں تین سال کام کیا۔

فیلوشپ کے فرائض یہ تھے: اول، عربی کتب و تصانیف کی چھٹی کی نگرانی۔ دوم: عربی یا انگریزی کتابیں اردو میں ترجمہ کرنا۔ سوم: اورینٹل کالج میں تدریس۔ اس فیلوشپ کے دوران میں اقبال ۵ سال سے پہلا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے چودھویں صدی عیسوی کے مشہور صوفی اور فلسفی عبدالکریم الجیلی کے نظریہ 'توحید و حقائق پر انگریزی زبان میں

ایک بھرپور مقالہ تیار کیا جو بمبئی کے مجلہ INDIAN ANTIQUARY کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۰ء میں چھپا۔ عبدالکریم الجیلی نے علاوہ دوسری کتب کے ایک کتاب لکھی تھی --- ”الانسان الکامل فی معرفت الاواخر و الاوائل۔ اقبال نے اس کتاب کے مطالب بھی بیان کیے اور ان کا محاکمہ بھی کیا۔ انہوں نے آخر میں لکھا :

”اس (الجیلی) کے نظریہٴ انسان کامل کی تلخیص کے دوران میں ہم نے دیکھا کہ اگرچہ اس نے جدید جرمن فلسفے، بالخصوص ہیگل کے فلسفے کے بہت سے بڑے بڑے نظریات کی پیش بندی کی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک باقاعدہ مفکر نہیں ہے۔ وہ سچائی کو دیکھتا ہے لیکن ایک صحیح اور مناسب فلسفیانہ طریق کار کے ذریعے سے لیس نہ ہونے کی وجہ سے اپنے موقف کے حق میں مثبت شواہد پیش نہیں کر سکتا۔ تصوف کے اندر رہتے ہوئے اس نے کچھ ایسے اشارے کئے ہیں جنہیں آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور ان سے ایک فلسفیانہ نظام وجود میں آ سکتا ہے۔ لیکن یہ افسوس کا مقام ہے کہ اس قسم کا مثالی تفکر بعد میں آنے والے مسلمان مفکرین نے اختیار نہیں کیا۔“ ۲

عبدالکریم الجیلی کی کتاب میں انسان کامل کا جو تصور پیش ہوا۔ اقبال نے اس پر مزید تفکر کیا۔ اسی کتاب میں ”شعور خویشتن“، ”شعور دیگرے“ اور ”شعور ذات حق“ کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے تفکر کا آغاز اسی مقالے سے ہوا۔ اقبال نے یہ مقالہ کیوں لکھا؟ اس کا جواب مقالے کے ابتدائی حصے میں ملتا ہے، ملاحظہ فرمائیے :

”جہاں یورپی فضلاء نے قدیم ہندو فلسفے پر تحقیق میں ان تھک جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے ، وہاں انہوں نے اسلامی فلسفے کو محض ارسطو اور افلاطون کے نظریات کی غیر ترقی پسندانہ تکرار قرار دیا ہے ۔ اگرچہ حالیہ سالوں میں عربی ادب کے اس حصے پر کچھ توجہ دی گئی ہے لیکن جتنا کام کیا گیا ہے ، وہ اس کام کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا جو کیا جا سکتا ہے ۔ عربی فلسفے کی جانب نسبتاً غافلانہ طرز عمل غالباً اس وقت سے ظاہر ہے جب منسکرت ادب دریافت ہوا ۔ ہم فلسفیانہ فرامت میں ہندوؤں کی برتری تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم وہاں مفکرین کی ذہنی آزادی کو نظر انداز کر دیں ۔ ۳

پس آگے چل کر اقبال نے جو فلسفیانہ تفکر کیا ، اس کا ایک مفہوم یہ بھی تھا کہ جو خلاء پیدا ہو چکا تھا اسے پر لیا جائے ۔

میکلوڈ عربیک ریڈر کی حیثیت سے اقبال نے ایک نو STUBB کی کتاب EARLY PLANTAGENETS کی تلخیص و ترجمہ کا نام لیا ۔ یہ تاریخ کی کتاب تھی اور اس میں ہنری دوم سے رچرڈ سوم تک کے برطانوی پادشاہوں کے ادوار کا احاطہ لیا لیا تھا ۔ دوسرے ، WALKER کی کتاب POLITICAL ECONOMY (معاشیات کے اصول) کا نام لیا ۔ یہ کتاب اور ترجمہ لیا ۔ تیسرے ”علم الاقتصاد“ کے نام سے ایک کتاب تصانیف کی ۔ علامہ نے اس کے دیباچے میں بتایا کہ اس کتاب کے لکھنے کی تحریک پروفیسر آرنلڈ کی طرف سے ہوئی اور شبلی نعمانی نے اس کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی ۔ اقبال نے یہ بھی لکھا

کہ ”یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ کیے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے مگر صرف اس صورت میں، جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا۔“ ۴

تحقیق و ترجمہ کے پہلو بہ پہلو میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے تدریس بھی آن کے سپرد تھی۔ ہر روز تین لیکچر دیتے تھے۔ انٹرمیڈیٹ کے سال اول اور سال دوم کے طلبہ کو ہر روز ایک ایک لیکچر فلسفے پر دیتے تھے اور بی۔ او۔ ایل کی کلاسوں کو ہفتے میں چار لیکچر تاریخ انگلستان پر دیتے تھے اور دو معاشیات پر۔ اس ملازمت کے دوران میں کچھ وقفے بھی آئے۔ یکم جنوری ۱۹۰۱ء سے ۳ اکتوبر ۱۹۰۱ء تک اقبال بلا تنخواہ چھٹی پر تھے۔ اس وقفے میں انہوں نے ایک تو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے لیے مقابلے کا امتحان دیا، اس میں کامیاب ہوئے لیکن جب طبی معائنہ ہوا تو غیر موزوں قرار دیے گئے حالانکہ بہ ظاہر آن کی صحت نہایت اچھی تھی، سرخ و سفید تھے اور اکھاڑے میں ڈنٹر پیلا اور مگدر ہلایا کرتے تھے۔ اس بے انصافی کے خلاف ”پیسہ اخبار“ اور ”کشمیری گزٹ“ نے احتجاجی نوٹ لکھے۔ ۵ بہر حال :

اس میں کچھ شائبہ خوبیٰ تقدیر بھی تھا

کہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بن جاتے تو زندگی کا رخ بالکل مختلف ہو جاتا۔ اسی وقفے کے دوران میں انہیں اسلامیہ کالج میں چند مہینے کے لیے پروفیسری کا موقع ملا، جس کا تذکرہ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے یوں کیا : ”شیخ عبدالقادر ان دنوں اخبار آبرور (دی پنجاب آبرور) کے ایڈیٹر اور اسلامیہ کالج میں ادبیات انگریزی کے پروفیسر تھے۔“

انہیں چند روز کی رخصت لینے پڑی تو ان کی جگہ اقبال مرحوم یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ میں ان دنوں ایف اے کا طالب علم تھا۔ نصاب میں SEEKERS AFTER GOD یعنی متلاشیان حق کے نام سے ایک کتاب شامل تھی جس میں زمانہ قبل از مسیح کے تین حکماء کی سرگزشتیں درج تھیں۔ عیسائی مصنف نے ان متلاشیان حق کے بعض اقوال کا موازنہ انجیل کی آیات سے کیا۔ لیکن علامہ مرحوم نے کلام پاک کی ان آیات سے ان اقوال کی تشریح کی جو ان کے ساتھ مطابقت رکھتی تھیں۔ موازنے کے دوران آپ نے بھی ثابت کرتے جانے تھے کہ قرآن کی آیات ان اقوال سے بدرجہا افضل اور بہتر نوع اکمل ہیں۔ اسلامیہ کالج کی چند روزہ پروفیسری نے ہی آپ کے تبحر علمی کا سکہ بٹھا دیا۔“

تقریباً ایک سال بعد اقبال گورنمنٹ کالج یو اینگریزی کے ایڈیشنل پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہ اسامی چھ مہینے کے لیے تھی، اس لیے فراغت کے بعد اصل ملازمت پر لوٹ آئے۔ ۳ جون ۱۹۰۳ء کو آپ اس کالج میں اسٹنٹ پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ یہ مستقل ملازمت تھی اور آپ فیسفے کی تدریس کا کام سونپا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں اسی ملازمت سے چھٹی لے کر اقبال یورپ گئے۔ جوانی کے دوران ہی میں اقبال نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ نہایت متنوع موضوعات میں دسترس رکھتے ہیں۔ تصنیف و تالیف کی تو معاشیات، فلسفے اور تاریخ پر۔ تدریس کی تو تاریخ، معاشیات، فلسفے اور انگریزی ادب میں۔ طرہ یہ کہ شعر و شاعری کا مشغول بھی جاری رہا اور اس میں بڑا نام پایا۔ یہی نہیں، اس دور میں اردو رسائل میں جو مضامین لکھے وہ بھی متنوع موضوعات میں دسترس کا ایک اہم ثبوت ہیں۔

اس زمانے میں علم و ادب کی دنیا میں ماہ نامہ "مغزن" کا طوطی بولتا تھا جو شیخ عبدالقادر نے جنوری ۱۹۰۱ء میں جاری کیا۔ "مغزن"

محض ایک رسالہ نہیں تھا ، ایک ادبی تحریک کا بھی داعی تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ پڑھا لکھا طبقہ اردو ادب کو تازہ بہ تازہ اور نوع بہ نوع خیالات اور اصناف سے مالا مال کرے۔ شیخ عبدالقادر اور اقبال کے درمیان دوستانہ مراسم استوار ہو چکے تھے۔ چنانچہ اقبال نے بھی ”مخزن“ میں مضمون نگاری فرمائی اور نئے خیالات کی تخلیق اور نمو میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ جب بعض لوگوں نے اقبال کی شاعری میں یہ کہہ کر کیڑے ڈالے کہ ان کی زبان میں محاوروں کی غلطیاں ہیں تو اقبال نے ایک مفصل مقالہ لکھا جس میں اعتراضات کا جواب دیا لیکن زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ انہوں نے زبان کے مسئلے پر چند کھری کھری باتیں کہہ ڈالیں۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

”جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورات و الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتاً اختراع کیے جا رہے ہوں، اس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدم صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ اردو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک حدود تھی مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا، اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کر دیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگین ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو، وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کیے بغیر رہے۔ عام السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی

تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے اسکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے تعجب ہے کہ سیز ، ڈمرہ ، کچھری ، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے کو بلا تلافی استعمال کرو لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پر معنی پنجابی لفظ استعمال کر دے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو۔ اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو لیکن یہ مذہب منحور ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے۔ یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے۔

پورے دو سال بعد اقبال نے ”بخرن“ ہی میں فوسہ زندگی کے موضوع پر ایک مقالے میں لکھا :

”جس طرح اس وقت ہمیں تائید اصول مذہب کے لیے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے ، اسی طرح قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا ساتھ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسائل کی بناء پر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید ہر رائے میں مرتب و منظم کر سکے ، بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ضروریات پر حاوی ہو“۔

گویا تشکیل فقہ جدید اور اجتہاد کے بارے میں اقبال نے بعد میں جو لکھا لکھا ، اس کی بنیاد ۱۹۰۳ء ہی میں ڈال دی۔

اس دور میں شاعری میں ایک نیا نکھار اور آمد ۱۹۰۵ء میں شروع ہوا۔ شیخ عبدالقادر بتانے ہیں کہ اقبال دن رات عین مسجھوں اور

مشاغل میں بسر کرتے تھے۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے، ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم، جو پاس ہوتے، پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اس زمانے میں انہیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکر سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ آبلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً ان پر طاری رہتی تھی۔ اپنے اشعار سربلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ ابتدا میں اپنا کلام تحت اللفظ مناتے تھے۔ ایک جلسہ عام میں ترنم کی فرمائش قبول کی تو ایسا سا بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا اور لوگ جھومنے لگے، اور یہاں سے ترنم کا سلسلہ چل نکلا۔ حافظہ ایسا پایا تھا کہ جتنے شعر زبان سے نکلیں، اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظے میں محفوظ ہوتے جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے۔ شیخ عبدالقادر بتاتے ہیں کہ مجھے بہت سے شعراء کی ہم نشینی کا موقع ملا اور بعض کو میر نے شعر کہتے بھی دیکھا اور سنا، مگر یہ رنگ کسی اور میں نہیں دیکھا۔ ۱۰

لوگ جس ذوق و شوق اور انہماک سے کلام سنتے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے عزیز دوست نواب ذوالفقار علی خان نے لکھا کہ جب اقبال بڑے بڑے اجتماعات میں اپنا کلام سناتے تو لوگ تحسین و ستائش کے ڈونگرے برساتے اور ناقابل بیان جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے تھے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ صاحب ذوق حاضرین نے اتنا کلام سنا کہ اقبال پر نقابہت کا عالم طاری ہو گیا۔ جہاں اقبال جاتے، وہاں کسی اور کا چراغ نہ جلتا۔ یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ ایک نوجوان شاعر اچانک اتنی ہر دل عزیز حاصل کرے کہ عوام کا محبوب بن جائے۔ ۱۱

انجمن حمایت اسلام مسلمانوں کا قومی ادارہ تھا۔ اس کا سالانہ جلسہ ایک قومی میلے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں شرکت کے لیے دور دور سے علماء، فضلاء اور شعراء آتے تھے۔ اقبال اتنے ہردلعزیز تھے کہ انہیں تقریباً ہر سالانہ اجلاس میں بلایا گیا اور ان سے کلام سنا گیا۔ ایک دفعہ الطاف حسین حالی نظم سنانے لگے لیکن مجمع بہت زیادہ تھا اور ان کی آواز سب تک نہیں پہنچتی تھی۔ اس پر تقاضا ہوا کہ یہی نظم اقبال سے پڑھوائی جائے۔ چنانچہ اقبال کو مشیخ پر بلایا گیا۔ انہوں نے نظم پڑھنے سے پہلے یہ فی البدیہہ رباعی پڑھی :

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مٹے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا
جاری ہے مرے لب پہ کلام حالی

اس کے بعد حالی کی نظم نہایت پر تاثیر لے میں سنائی۔ ۱۲

سر سید احمد خاں اور سید جمال الدین افغانی کی طرح اقبال کو بھی اپنے عہد کے مولویوں سے حسین ظن نہیں تھا، یعنی ایسے مولویوں سے جو ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ایک قطعہ پڑھا جس کے ابتدائی اشعار یہ تھے :

بھائی دروازے کی جانب ایک در جاتا تھا میں
شام دو گھر بیٹھے رہتا قابل الزام ہے
خضر صورت مولوی صاحب لہڑتے تھے اک وہاں
ہم مسلمانوں میں ایسی مولویت عام ہے

وعظ کرتے تھے نہ مسلم کوئی انگریزی پڑھے

کفر ہے آغاز اس ہولی کا کفر انجام ہے ۱۳

اسی سال ایک مقالے میں انہوں نے لکھا کہ ”آٹے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام نوع انسان کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔۔۔ مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے دو جمع ہو جائیں تو۔۔۔ بالعموم بحث چھڑ جاتی ہے۔ ایسی جوتیوں میں دال بٹی ہے کہ خدا کی پناہ۔ پرانا علم و فضل، جو علمائے اسلام کا خاصا تھا، نام کو بھی نہیں۔ ہاں مسلمان کافروں کی ایک فہرست ہے کہ اپنے دست خاص سے اس میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں۔“ ۱۴

اس زمانے کی شاعری میں دو باتیں نمایاں ہیں۔ اول : ”مظاہر فطرت، بنگامہ کائنات اور حسن و جمال کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے اقبال سراپا استفہام و استفسار ہے۔ اس کے دل میں ایک تڑپ ہے کہ کسی نہ کسی طرح حقائق اشیا میں ڈوب کر ان کا سراغ لگا لے۔۔۔ دوم : اقبال متحدہ قومیت کی طرف مائل تھے۔ وطنیت کے اس تصور کے حامی تھے جس سے بعد میں واضح انحراف کیا۔ ہیئت کے اعتبار سے اقبال کی شاعری اس بنا پر منفرد تھی کہ اس نے اظہار کے لیے جدید اسلوب اختیار کیا اور اس میں انگریزی شاعری سے بھی اثر قبول کیا۔ زبان کے سلسلے میں دو رجحان نمایاں تھے۔ بعض نظموں میں فارسی تراکیب کی فراوانی اور بعض میں سادہ اور آسان زبان کا استعمال۔

۱۹۰۴ء میں پروفیسر آرنلڈ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر عازم

انگلستان ہوئے۔ روانگی کے وقت اقبال نے ”نالمہ فراق“ کے عنوان سے

ایک نظم لکھی جس میں استاد کی عظمت کا ذکر تھا ، علم کی تشنگی کا اظہار تھا اور انگلستان جانے کا عزم بھی شامل تھا ۔ اگلے سال اللہ تعالیٰ نے اس آرزو کی تکمیل کے اسباب پیدا کر دیے ۔ کچھ پیسہ پس انداز کر رکھا تھا ، کچھ بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے فراہم کر دیا ۔ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو دہلی پہنچے ۔ خواجہ حسن نظامی اور میر غلام بھیک نیرنگ کی رفاقت میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دی ۔ سارا دن وہاں بسر کیا ۔ ”التجائے مسافر“ کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جس میں گزارش کی :

چلی ہے لے کے وطن کے نگارخانے سے
 شراب عام کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
 فلک نشین صفت مہر ہوں زمانے میں
 تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
 مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
 کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو
 مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
 کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو
 دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جس کا اثر
 تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

شام کے وقت مزار سے رخصت ہونے کو تھے ۔ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے ۔ اقبال لکھتے ہیں ۔ ”خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویراں سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنج معانی مدفون ہے جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ نار شہے گی ۔ حسن

اتفاق سے آس وقت بہارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام
موجود تھا۔ اس ظالم نے مزار کے قریب بیٹھ کر :

دل سے تری نگاہ جگر تک آتر گئی

کچھ ایسی خوش الحانی سے گئی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں۔
بالخصوص آس نے جب یہ شعر پڑھا :

وہ بادۂ شبانہ کی سرستیاں کہاں
اٹھیں بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، آنکھیں پر نم ہو گئیں اور بے اختیار لوح
مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کندہ سے رخصت ہوا۔ ”شمہ شاہ بہایوں
کے مقبرے میں فاتحہ پڑھی۔ دارا شکوہ کے مزار پر گئے اور ۳ ستمبر کی
صبح کو احباب کو الوداع کہہ کے بھٹی کو روانہ ہو گئے،“ - ۱۵

۷ ستمبر کو آن کا جہاز منزل کی طرف روانہ ہوا۔ بھانت
بھانت کے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ جب عدن قریب آیا تو اقبال کے دل
پر جو واردات گذری، وہ انہی کی زبانی ملاحظہ ہو :

”ساحل عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت دل میں
پیدا کر دیا ہے، اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی
چاہتا ہے کہ زبارت سے اپنی آنکھوں کو منور کرود، :

اللہ رے خاک پاک مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو آدھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر
تھی جس کو دنیا کے معاروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک

یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ سوچو وہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور مسلمانوں کو تہمت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کنارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا آس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی دیوں میں بلال رضا کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔“ ۱۶

اقبال کسی مجبوری کے سبب سے عدن میں آئے نہ سکے لیکن جب مسلمان تاجروں کی کثیر تعداد نے تختہ جہاز پر بازار لگا دیا تو اقبال دو سلیمان اعظم یاد آ گیا ”جس کی وسعت تجارت نے افوام یورپ کو دبا دیا۔ ان کو ہندوستان کی ایک نئی راہ دریافت کرنے کی تحریک کی تھی۔ وہ دکان داروں کو جب معلوم ہوا کہ اقبال مسلمان ہیں تو ان کے گرد حصار باندھ کر ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہنے لگے اور دعائیں دینے لگے۔ پھر سوئٹزر سے گذرتے ہوئے آس وقت بہت متاثر ہوئے جب ارباب کے گھر سے ہوئے جہاز میں سپاہی ترکی ٹوپیاں پہنے نہایت خوش الحانی سے عربی غزل کا رعبے قہے۔ پورٹ سعید پہنچے تو آتر در اس شہر کی سیر کی اور اس بات پر افسوس ہوا کہ انگریزی کا حصہ صاف ہے اور مسلمانوں کا مٹا۔ جہاز دو لوٹے ہو ایک اور نظارہ دیکھنے میں آیا جو انہی کی زبانی ملاحظہ ہو:

”نختہ“ جہاز پر تین اطالین عورتیں اور دو مرد وائٹن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا۔ ان عورتوں میں ایک لڑکی، جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہوگی، نہایت حسین تھی۔ مجھے دیانت داری سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس کے حسن نے تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر سخت اثر کیا لیکن جب اس نے ایک چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہو گیا کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن، جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو، بدصورتی سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔“

جہاز بحیرہ روم میں داخل ہوا تو سمندر کے نظارے نے شعر پر مائل کیا اور آپ نے وہ غزل لکھی جس کا مطلع ہے :

مثال پرتو سے طوف جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

اٹلی کا ساحل نظر آیا تو یہ شعر ہو گیا :

ہرے رہو وطن مازنی کے میدانو
جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

فرانس کی مشہور بندرگاہ میں آٹھ دس گھنٹے کا وقفہ مل گیا، اس لیے خوب سیر کی۔ اقبال لکھتے ہیں : ”مارسیلز کا نوٹر ڈام گرما نہایت اونچی جگہ پر تعمیر ہوا ہے اور اس کی عمارت دیکھ کر دل پر یہ بات منقوش ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مذہبی تاثیر ہی حقیقت میں تمام علوم و فنون کی محرک ہوئی ہے“۔ مارسیلز سے ڈوور اور ڈوور سے لندن پہنچے۔ شیخ

عبدالقادر پذیرانی کے لیے موجود تھے۔ دور سے دیکھا اور دوڑ کر بغاگیر ہو گئے۔

حوالے

۱۔ اس مقالے میں میکلوڈ عربیک ریڈر شپ اور پروفیسر شب کے بارے میں جو معلومات پیش کی گئی ہیں، وہ ڈاکٹر وحید قریشی کے مقالے ”علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات“، اور ”علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج“، مندرجہ ”کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ“، (لاہور، ۱۹۶۵ء) اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مقالہ ”اقبال“، اورینٹل کالج میں، مندرجہ ”مطالعہ اقبال“، مرتبہ گوہر نوتسابی (لاہور، ۱۹۷۱ء) سے لی گئی ہیں۔ دونوں حضرات نے اصل دستاویزات کے مطالعے کے بعد یہ پیش فیصحت مقالے لکھے۔

- ۲۔ THOUGHTS AND REFLECTIONS OF IQBAL صفحات ۲۶-۲۷۔
- ۳۔ ایضاً۔ ص ۳۔
- ۴۔ آثار اقبال۔ صفحات ۳۰۱-۳۰۲۔
- ۵۔ ”ذکر اقبال“۔ ص ۲۳ (بحوالہ کشمیری گزٹ ماہ اکتوبر ۱۹۰۱ء)۔
- ۶۔ REV. F. W. FARRAR, D. D., F. R. S., SEEKERS AFTER GOD, (London) 1902.
- ۷۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ۔ ص ۳۳۸۔
- ۸۔ ”مقالات اقبال“۔ صفحات ۲۰-۲۱ (مطبوعہ ”نخن“ اکتوبر ۱۹۰۱ء)۔
- ۹۔ ایضاً۔ ص ۵۵ (مطبوعہ ”نخن“ اکتوبر ۱۹۰۳ء)۔
- ۱۰۔ ”بانگ درا“ کا دیباچہ۔ صفحات ی۔ ک۔ ل۔
- ۱۱۔ A VOICE FROM THE EAST۔ ص ۹۔
- ۱۲۔ ”ذکر اقبال“۔ صفحات ۲۳-۲۵ (خواجہ فیروز الدین احمد کی زبانی)۔
- ۱۳۔ ایضاً۔ ص ۲۵ (روزانہ جلسہ انجمن حمایت اسلام ۱۹۰۳ء)۔

۱۴ - "مقالات اقبال" - صفحات ۵۱-۵۲ - (۵۱-۵۲) -

۱۵ - "ذکر اقبال" - صفحات ۴۳-۴۴ - "مقالات اقبال" - صفحات ۶۳-۶۴ -

"مطالعہ اقبال" - ص ۳۰ -

۱۶ - "مقالات اقبال" - صفحات ۷۵-۷۶ - (اخبار "وطن" لاہور ۶ اکتوبر

۱۹۰۵ء) -

۱۷ - "مقالات اقبال" - صفحات ۸۳-۸۵ - ("وطن" مورخہ ۲۲ دسمبر

۱۹۰۵ء میں مطبوعہ مقالے کی تالیف) -

۷



پانچواں باب

دیار فرنگ میں

لندن پہنچ کر اقبال کو اجنبیت کا احساس نہ ہوا نہ ان کے برائے دوست شیخ عبدالقادر پذیرائی کے لیے موحود تھے۔ - ڈیچہ دن ان کے پاس رہے۔ - بھولی بسری یادیں تازہ ہیں۔ - ہر عظم سے آنے والے دھیرے طہید کے ساتھ محفلیں گرم ہوئیں اور اس کے بعد وہ کیمبرج کو روانہ ہوئے۔ - شراب علم سے لذت اندوز ہونے کے لیے پہلی منزل وہی تھی۔ - کیمبرج لندن کے شمال مشرق میں چھین میل دور واقع ہے۔ - لہو و لعب سے کھیل اور پرسکون تعلیمی فضا کے لیے ان دنوں مشہور تھا۔ - یونیورسٹی کے محکمہ کالج اور اقامت گاہیں دریائے ایم کے آ پار پھیلی ہوئی ہیں۔ - مغربی - مشرقی پر ٹرنٹی کالج واقع ہے جس میں اقبال نے بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ - کیمبرج اور آکسفورڈ میں اصل ڈگری بی۔ اے کی ہوتی تھی۔ - ایم۔ اے کا امتحان نہیں ہونا تھا اور ایم۔ اے کی ڈگری داخلہ سزا رکھنے کی صورت میں چند سال بعد بغیر کسی امتحان کے دی جاتی تھی۔ -

ٹرنٹی کالج کی علمی روایات کا نمونہ شمار نہیں تھا۔ - اس کالج میں قانم ہوا۔ - اس کے در و دیوار میں بڑی بڑی شخصیات کے آثار کی دنیا میں نمو پائی۔ - سولہویں صدی میں مسکن نے یہاں پائی اور ایک فلسفی، سیاستدان اور انشائیہ نگار کی حیثیت سے جارج ڈانک عالم میں مشہور ہوا۔ - سترھویں صدی میں نیوٹن نے یہاں معلم بنائی اور سات سال کے اندر اندر کالج کا فیلو بن گیا اور سائنس کی دنیا میں بہت بڑا کردار

ادا کیا۔ آنیسویں صدی میں ہائرن اور ٹینی سن جیسے طالب علم آئے۔ ہائرن کی شاعری کا آغاز ٹرنٹی کالج ہی سے ہوا۔ ٹینی سن کے شعری ذوق نے بھی اسی درس گاہ میں پرورش پائی۔ فٹز جیرالڈ بھی انہی کا ہم عصر تھا جس نے عمر خیام کی رباعیات کو نہایت خوبصورتی سے انگریزی زبان میں منتقل کر کے ساری دنیا میں متعارف کرا دیا۔ اقبال پہلی ایشیائی شخصیت تھے جس نے علم کی غیر محتم پیاس کی بدولت بڑا نام پیدا کیا اور اس درس گاہ کے لیے باعث فخر و مباہات بنے۔

اس زمانے میں کیمبرج یورپی فلسفے کے مطالعہ کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ فلسفے کی تدریس پر ٹرنٹی کالج میں مشہور ہیگلی فلسفی میک ڈاگرٹ فائز تھے۔ وہ خود بھی صوفی منش بزرگ تھے۔ اقبال نے نہ صرف ان کی نگرانی میں تعلیم پائی بلکہ تصوف کے مسائل پر ان کے ساتھ طویل مکالمے بھی کیے۔ اسی زمانے میں پروفیسر واٹس ہیڈ اور پروفیسر وارڈ کی شخصیات بھی کیمبرج ہی میں تھیں۔ انہوں نے مغربی فلسفے کی تاریخ میں بڑا نام پایا تھا اور اقبال نے ان سے بھی فیض حاصل کیا۔ کیمبرج فارسی اور عربی کے مطالعہ کا بھی ایک عظیم مرکز تھا۔ اس زمانے میں دو فضلا بہت نامور تھے، ایک پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن، دوسرے پروفیسر نکسن۔ دنیا بھر کے مستشرقین ان دونوں کی صلاحیتوں سے آشنا تھے۔ اقبال کے ان دونوں کے ساتھ دوستانہ روابط تھے جو آخری دم تک جاری رہے۔

بی۔ اے کینٹب کے طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال نے قانونی تعلیم کے لیے لندن کے مڈل ٹمپل میں داخلہ لے لیا۔ اس کی روایتی شہینہ دعوتوں اور امتحانات میں شرکت کے لیے اقبال اکثر لندن جاتے رہتے تھے۔ جب جاتے، اپنے پرانے استاد، دوست اور رہنما پروفیسر ٹامس آرنلڈ

کے ہاں قیام فرماتے جو اس وقت لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ اقبال نے بی۔ اے کینٹب کر لیا تو لندن میں مستقل قیام کی سبیل پیدا ہوئی۔ پروفیسر آرنلڈ چھ مہینے کے لیے چھٹی پر گئے تو انہوں نے اپنے قائم مقام کی حیثیت سے اقبال کو مقرر کرا دیا۔ ۲ چنانچہ اقبال چھ مہینے تک لندن یونیورسٹی میں عربی کی تدریس فرماتے رہے۔ کیا بات تھی ان کی متنوع صلاحیتوں کی؟ لاہور میں فلسفہ، تاریخ اور معاشیات کی تدریس فرمائی، لندن میں عربی کی، اور فارسی شاعری کی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۶ء تک اقبال کیمبرج میں رہے۔ اس زمانے میں حیدر آباد دکن کے سید علی بلگرامی، جو ”تمدن عرب“ اور ”تمدن ہند“ کے تراجم کے لیے مشہور تھے، کیمبرج میں مرہٹی زبان کے استاد تھے۔ ان کا مکان برعظیم سے آنے والے تمام طبیبہ کی معاشری اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اقبال بھی ان میں پیش پیش تھے اور سید علی بلگرامی اور ان کی ذہین بیوی ان کی پذیرائی کرتے رہے۔ ۳

اقبال نے ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے کینٹب کیا۔ ۱۹۰۸ء میں ایل ایمپل سے بیرسٹری کی سند حاصل کی اور درمیانی وقفے میں میونخ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ اس کے لیے انہوں نے ”ایران میں مابعدالطبیعیات کے نشو و ارتقا“ پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا، اور اس میں وہ فلسفہ شامل تھا جو انہوں نے میلاود عربیک ریڈر کی حیثیت سے سنا کرتے الجیلی کے نظریہ انسان کامل پر لکھا تھا۔ تین سال کے اندر اندر تینوں ڈگریوں کا حصول کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن اقبال نے اسے کر دیا اور اس طرح اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا ایک بین ثبوت فراہم کر دیا۔

لندن میں مسلم طلبہ کی اجتماعی سرگرمیوں میں بھی اقبال پیش پیش رہے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ انور بیگ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اسلام کے بارے میں برطانیہ میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں، کیونکہ برطانوی سیاستدان سمجھتے تھے کہ تحریک اتحاد عالم اسلامی (بین اسلامزم) یورپ کے لیے بالعموم اور مشرق وسطیٰ میں برطانوی مفادات کے لیے بالخصوص ایک عظیم خطرہ ہے۔ لندن میں ایک انجمن اسلام قائم تھی۔ حافظ محمود شبرانی اس کے سیکرٹری تھے۔ انجمن کا مقصد یہ تھا کہ جو ہندوستانی مسلمانانہ انداز میں آئیں، ان کے لیے معاشری سہولتیں فراہم کی جائیں۔ بعض نوجوانوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ انجمن کا نام بین اسلامک سوسائٹی رکھ دیا جائے۔ لیکن نوجوانوں کا ایک اور گروہ اس بناء پر مخالف تھا کہ اس سے انجمن سیاسی رنگ لے لے گی، حالانکہ سیاست اس کے مقاصد میں شامل نہیں ہے۔ عبداللہ سہروردی ”بین اسلامک“ کے الفاظ پر زور دیتے تھے۔ لیکن پروفیسر آرنلڈ اور سید امیر علی ایسے محض اسلامک سوسائٹی کا نام دینے کے حامی تھے۔ ابھی یہ بحث چل رہی تھی کہ سیکرٹری نے اقبال سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا: کیا آپ بین اسلامک کے الفاظ شامل کرنے کی تجویز میں میرا ساتھ دیں گے؟ اقبال نے اثبات میں جواب دیا۔ آخر کار سوسائٹی کے ارکان اس تجویز پر متفق ہو گئے۔ - مرزا حلال الدین بیرسٹر کا بیان اس سے قدرے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”اپنے زمانہ“ طالب علمی میں ہم نے لندن میں انہی مقاصد کے پیش نظر پان اسلامک سوسائٹی کے نام سے ایک نیم سیاسی جماعت قائم کر رکھی تھی جس کے جنرل سیکرٹری عبداللہ سہروردی تھے اور سلطان احمد اور میں جوائنٹ سیکرٹریز تھے، - ۵ بہرحال اتنی بات واضح ہے کہ اقبال اس انجمن کی سرگرمیوں میں شامل تھے۔ اور اتحاد عالم اسلامی کا قائل ہونے کی وجہ سے عجب

نہیں کہ اول الذکر بیان صحیح ہو اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال نے لندن میں اسلام پر جو پتہ لیکچر دیے، ان میں سے پہلا لیکچر اس سوسائٹی کے اہتمام میں کیکسٹن ہال میں ہوا۔

اقبال کے قیام یورپ کے دوران ہی میں آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آ چکی تھی۔ مئی ۱۹۰۸ء میں کیکسٹن ہال میں سید امیر علی کی صدارت میں لندن میں مسلم مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی برطانوی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سید امیر علی صدر چنے گئے اور علامہ اقبال کو مجلس عاملہ کا رکن منتخب کیا گیا، بلکہ قواعد و ضوابط کی ترمیم کے لیے جو کمیٹی مقرر ہوئی، اس میں بھی سید امیر علی اور سید حسن بلکرسٹی کے ساتھ علامہ اقبال شامل تھے۔

برطانیہ اور یورپ میں اقبال کے متاعن دیا تھے، اس کا جواب دینا مشکل نہیں لیونکہ جس شخص نے تین سال میں تین علمی ڈگریاں حاصل لیں، اس کے بارے میں یہ کہنا آسان ہے کہ اس کے ذہن پر اور برٹش میوزیم کے شعبہ خانوں کو کھینچا دالا اور بڑے بڑے فنکار و دانش کے ساتھ علمی مسائل پر مباحثہ خیالات کیا، کن اگر اس کے قریب سے دیکھتا ہو تو عظیم ہنرمند کے اس کتابچے کا مطالعہ ضروری ہے جس میں حیات اقبال کے علمی اور اخلاقی پہلوؤں کی دلچسپ داستان ہے اور اقبال کے بارے میں اسے تاثرات قلمبند کرنے کے لیے اس کتابچے سے چند اقتباسات دے جاتے ہیں :-

"بیدل ہائیدل برک میں اپنے اختیار کردہ تحقیقی کام کی تکمیل کے لیے مفہم رہا۔ ہائیدل برک میں ایسے تشنگانِ علم کے لیے ہر قسم کی سہولت میسر تھی۔ یہاں دنیا کے معلومہ علوم کی ہر شاخ کا علم پر مشتمل تھا

کر علم کے دلدادگان کی دسترس میں لایا جاتا تھا، اس لیے ارباب حزم و عزم اس مقام کو زیارت گاہ کا درجہ دیتے تھے۔ اس قصبے میں آن کا کام طالبان علم کے خیال و عمل کی رابوں کو بدل دیتا تھا۔ اقبال نے جرمن زبان پر عبور حاصل کرنے میں بہ مشکل تین سہینے لیے تھے۔ صرف اسی بات نے پروفیسروں کی نگاہوں میں اسے عجبوہ روزگار بنا دیا تھا۔ اس امر نے اس کے صوفیانہ افکار سے مل کر، آسے طلبہ کی عام سطح سے بلند و بالا متصور کرا دیا تھا۔

”لندن میں مس بیگ نے مکان پر، جہاں ہندوستانی طالب علم اور زائر اس غیر شاعرانہ اور بے رس ماحول سے جمع ہوتے تھے، میری اقبال سے ملاقات ہوئی۔ کھانے کی میز پر میں نے اقبال کو فارسی، عربی اور سنسکرت کا شناور پایا۔ حاضر جواب۔ دوسروں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھانے کو ہمہ وقت تیار اور حاضرین پر کٹیلے فقرے کسنے میں تیز و طرار۔ اقبال کو حسب دل خواہ اپنے آب کو خوشگوار اور عزیز خاطر بنانے کا ملکہ حاصل تھا۔ انجمن میں وہ انجمن آرا تھا۔ حاضر جوانی اور ثنا گسٹری میں کبھی پیچھے نہ رہا۔“

عطیہ بیگم نے بتایا ہے کہ اقبال حافظ کے بہت مداح تھے اور کہتے تھے کہ جب حافظ کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو اس کی روح میری روح میں حلول کر جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔ چند دن بعد ایک اور محفل میں علامہ نے موصوفہ کو بتایا کہ میں دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ باہر والا، عملی اور کاروباری۔ اندر والا، ایک خواب دیکھنے والا، فلسفی اور صوفی۔ ۲۲ اپریل ۱۹۰۷ء کو علامہ، شیخ عبدالقادر اور عطیہ بیگم کیمبرج گئے۔ دوپہر کے وقت کیمبرج میں سید علی بلگرامی کی قیام گاہ پر پہنچے۔ وہاں سارا دن تابناک اور عالمانہ

گفتگو میں گذرا۔ عطیہ کہتی ہیں کہ جب اقبال تھکے تھکے سے اور
 اچاٹ سے لگتے تھے تو حقیقت میں اس انتظار میں ہوتے تھے کہ کسی کی
 بانٹ پر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایسی نکتہ طرازی کریں کہ وہ لاجواب
 ہو جائے۔

یکم جون ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ نے دریائے ڈیم کے کنارے
 ایک درخت کے سائے میں پک نک کی ایک محفل آراستہ کی جس میں بہت
 سے فضلاء جمع تھے۔ پروفیسر آرنلڈ نے زندگی اور موت کے مسئلے پر
 ایک بحث چھیڑ دی، حاضرین نے اس میں بڑے چڑھ کر حصہ لیا لیکن اقبال
 خاموش رہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے ان سے پوچھا، آپ کی رائے کیا ہے؟
 علامہ نے مسکرا کر جواب دیا کہ زندگی موت کا آغاز ہے اور موت زندگی
 کی شروعات۔ یہ نکتہ بہت گہرا تھا کہ اس میں حیات بعد الموت کے
 تصور کو اہمیت دی گئی۔ آٹھ دن بعد پروفیسر آرنلڈ کے ہاں ایک اور
 محفل جسی۔ پروفیسر موصوف نے بتایا کہ جرمنی میں ایک نایاب عربی
 مخطوطہ دریافت ہوا ہے جس کی قرأت کی ضرورت ہے۔ پھر علامہ کو خطاب
 کرتے ہوئے کہا ”اقبال! اس کام کے لیے آپ بہت سوزوں ہیں، اس لیے
 میں آپ ہی کو جرمنی بھیجوں گا۔ علامہ بولے، میں تو اپنے استاد کے
 مقابلے میں بالکل مبتدی ہوں۔ لیکن پروفیسر آرنلڈ نے کہا، مجھے سو سوزا
 یقین ہے کہ اس دم میں شاگرد استاد پر بازی لے جائے گا۔ اس پر علامہ
 نے کہا، جناب! اگر آپ کی رائے یہی ہے تو میں استاد کی رائے کے سامنے
 سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

۲۷ جون کو ایک جرمن خاتون نے ہاں محفل طعام بھی۔ اس میں
 علامہ نے اپنی ڈاکٹریٹ کا مقالہ عطیہ یکم کو سنایا۔ عطیہ اسے سن کر

بہت متاثر ہوئیں کیونکہ ان کے نزدیک ”حرف حرف گواہی دے رہا تھا کہ اس پر کتنی تحقیق و تدقیق صرف ہوئی ہے۔“ یہ جولائی کو علامہ نے عطیہ کو ایک اور مقالہ سنایا جس کا عنوان ”تاریخ عالم“ تھا۔ یہ مقالہ جرمن امتحان کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس مقالے کے بارے میں رائے کا اظہار کرتے ہوئے عطیہ نے لکھا ہے کہ اقبال ”علم کے مخزن تھے ان کا حافظہ حیرت انگیز تھا۔“ عمیق تر مطالعات میں دلچسپی بڑھی تو جولائی کے وسط میں تین دن تک ہر روز دو دو گھنٹے کی نشستیں ہوئیں۔ ان میں ایک جرمن پروفیسر بھی شامل تھا۔ موضوع بحث فلسفے کے مختلف مسائل رہے۔ یہ محفلیں علمی گتھیوں کو سلجھانے میں بہت مددگار ثابت ہوئیں۔ اقبال نے کہا ”دوسروں سے تبادلہ خیالات کرنے سے ایک نئی دنیا وا ہوتی ہے۔ میں جو کچھ بھی جانتا ہوں، میں نے اسی طریقے سے حاصل کیا ہے۔“ اقبال نے عطیہ کو مشورہ دیا کہ اگر تم علم کے نسی شعبے میں وسعت نگاہ کی طالب ہو تو تمہاری منزل مقصود جرمنی ہی ہونی چاہیے۔

عطیہ بیگم بھی نے بتایا ہے کہ ہائیڈل برگ میں دو خوبصورت خاتون پروفیسروں—ویگے نامت WEGENAST اور سینے شل SENESHAL سے ادق مضامین میں سبق لیتے تھے۔ ہر طالب علم کو پڑھائی کھانی کے ساتھ ساتھ کشتی رانی، کلاسیکی موسیقی، گانے، باشعابی اور گروہ پھالی بھی سیکھنی پڑتی تھی۔ اقبال کی دو کمزوریاں تھیں۔ ایک یہ کہ انہیں گانا نہیں آتا تھا۔ دوسری یہ کہ ان سے پابندی اوقات نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اساتذہ نے ان کمزوریوں کو قبول کر لیا۔ اس یونیورسٹی میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ کیا طلبہ اور کیا اساتذہ، سب کا معیار زندگی برابر تھا۔ پروفیسروں کو ایک رعایت تھی کہ انہیں طعام و قیام ہر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ لیکچروں کے بعد طلبہ کا ایک گروہ دونوں پروفیسروں کو لئے کر کافی ہاؤس

جا بیٹھتا اور وہاں فلسفے کے مختلف پہلوؤں پر مذاکرے اور مکالمے ہوتے۔ اقبال سننے میں اس درجہ محو ہوتے کہ رخصت کے وقت یوں لگتا جیسے ابھی ابھی خواب سے بیدار ہو رہے ہیں۔ ہر تفریح میں تدریس کا پہلو بھی ہوتا تھا۔ کافی ہاؤس سے فارغ ہو کر سب لوگ پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے ایک ہزار قدم کی چڑھائی کرتے۔ سب سے کہا جاتا کہ چوٹی پر جو قلعہ واقع ہے، اس کی تاریخ بیان کرو۔ اقبال جو کچھ کہتے، وہ حرف بہ حرف درست ہوتا۔

۲۲ اگست ۱۹۰۷ء کو ایک پک نک کا اہتمام ہوا جو تعلیم و تفریح کا امتزاج تھی۔ مختلف مقامات سے طلبہ کو لیتے لیتے جب پروفیسر خواتین اقبال کی رہائش گاہ پر پہنچیں تو یہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گئیں کہ اقبال پر استغراق کا عالم طاری ہے۔ وہ گرد و پیش سے بالکل غائب اپنے سامنے ایک کھلی کتاب کو خالی نظروں سے گھور رہے تھے۔ سب طالب علم حیران تھے کہ اقبال کو کیا ہو گیا ہے۔ عطیہ بیگم ان کے قریب پہنچیں، انہیں بلایا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر عطیہ نے پروفیسر کی مدد سے انہیں جھنجھوڑا، تب کہیں ہوش کے آثار نمودار ہوئے۔ اقبال بڑبڑائے کہ انہیں کیوں ڈسٹرب دیا گیا ہے۔ عطیہ نے کہا، یہ ہندوستان نہیں، ایک حقیقت پسند جرمن شہر ہے۔ پھر اقبال اس کے بعد اقبال تفریح میں شامل ہو گئے۔ سب چل رہے تھے کہ وہ ویگے ویگے ناست وہ ہندوستانی گیت اپنے اپنی جو رات گزارنے میں سنا سکا تھا :

لجرا بیچن والی نادان یہ تیرا نخرہ

سب گیت میں شامل ہو گئے۔ "چلتے چلتے ہار بیرونے کے لیے جہان بھول بھی توڑتے جاتے تھے۔ اچانک قافلے نے ٹھہر کر مداف و فارغ میں

وہ ہار اقبال کے گلے میں یہ کہتے ہوئے ڈال دیے کہ ہم تمہیں نامعلوم کے بادشاہ کا تاج پہناتے ہیں۔“ عطیہ نے بہت سی اور تعلیمی تفریحات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے ہم اب صرف ایک واقعہ بیان کریں گے۔ ۲۸ اگست کو اقبال میونخ گئے جہاں پروفیسر ران کی بیٹی فراڈ لائن ران سے انہوں نے اولین اسباق لیے تھے اور جن کی نگرانی میں تھیسس لکھا تھا۔ عطیہ لکھتی ہیں کہ ہم پروفیسر ران کے گھر گئے۔ ان کی بیٹی نے ”اقبال کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کن عیق تر مطالعات میں مصروف ہے اور میونخ چھوڑنے کے بعد اس نے کتنا اکتساب کیا ہے۔ میں متحیر تھی کہ اس کا علم کتنا لے پایا ہے۔ متعدد بار اس نے اقبال کے طرز فکر میں جو اغلاط در آئی تھیں، ان کی اصلاح کی اور اس کی اس گم کردہ راہی پر ملامت سے اس کا محاسبہ بھی کیا۔ میں نے بہ مشکل اپنی حیرانی پر قابو پایا ہی تھا کہ اس دختر دلبر نے پیانو پر جا کر موسیقی کا ایک کلاسیکی قطعہ استادانہ تکنیک کے ساتھ بجایا اور اقبال سے پوچھا کہ یہ کس کی تالیف ہے؟ اقبال اس کے سامنے بالکل گم سم تھا۔ وہ سارا وقت ہمیں نظر افروز حیرانیاں دے رہی تھی۔ خود شاہکار تخلیق ہونے کے علاوہ وہ علم کے ہر شعبے میں کامل نظر آتی تھی۔ یہ سلسلہ پورے تین گھنٹے تک جاری رہا۔“

علمی مصروفیات کے بے پناہ ہیجوم میں شعر و شاعری کے لیے بہت کم وقت ملا۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک صرف چوبیس نظموں اور سات غزلیں لکھ سکے۔ اور ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ شاعری کو ترک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے شیخ عبدالقادر بتاتے ہیں کہ ”ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا۔ کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھا لیں کہ

شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے ، اسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے ۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں جسے ترک کرنا چاہیے ، بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درمندانہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے ۔ اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بے کار کرنا درست نہ ہوگا ۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے ، کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے ۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادہ ترک شعر کو بدل دیں ، اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترک شعر اختیار دیا جائے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق کیا ۔ اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں ۔ وہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے ۔"

اسی دور میں اقبال کی سوچ میں ایک تبدیلی یہ ہوئی کہ انہوں نے فارسی زبان میں شعر کہنے شروع کر دیے ۔ اس کا فوری سبب تو یہ ہوا کہ لندن کی ایک محفل میں ان سے پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی لکھتے ہیں یا نہیں ۔ انہوں نے بتایا ، ایک آدمی شعر تو فارسی میں لکھتا ہے اور فارسی شاعری کو اختیار کرنے کا خیال نہیں آیا ۔ محفل سے لوٹے ۔ انکیخت ہوئی کہ راتوں رات دو فارسی غزلیں ہو گئیں ۔ انہوں نے ان کی شیخ عبدالقادر کو سنائیں ۔ بہر حال اصل سبب شیخ عبدالقادر کے قول بیان کیا ہے کہ "جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے منہ ہی انہیں ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلے میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں انہی

فقرے اور جملے ساچھے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے متعلق اردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں۔ اس لیے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے۔“ ۹

بہر حال قیام یورپ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اقبال کے سیاسی فکر میں ایک نکھار کا آغاز ہوا۔ اُس نے وطنیت کے یورپی تصور کا کھوکھلا پن پہچان لیا۔ یورپی تہذیب کی ترقی کے وہ پہلو بھانپ لیے جو اسے زوال کی طرف لے جا رہے تھے۔ اور ان پر بین الاقوامیت کا رنگ غالب آیا۔ انہوں نے اسلامی دنیا کے مسائل کو سمجھا اور ان کا دل اسی چیز میں پایا کہ مسلمان قوموں اور ایشیائی قوموں میں یگانگت اور اتحاد پیدا ہو، اور وہ اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے سراپا عمل، سراپا جدوجہد بن جائیں۔ اقبال ایک چوڑھے، حساس اور ذہین طالب علم تھے، دل و دماغ کے دریچے کھلے تھے اور انہوں نے کھلی آنکھوں کے ساتھ حالات کا مشاہدہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسائل کے تجزیے میں کامیاب رہے۔ ان سے صحیح نتائج اخذ کر سکے اور پھر انہی کو آنے والی شاعری کی بنیاد بنا لیا۔

اقبال ۱۹۰۵ء میں یورپ پہنچے۔ یہ سال یورپی سیاست میں بہت بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اُس زمانے میں چھ بڑی طاقتیں موجود تھیں، برطانیہ، فرانس، روس، جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور اٹلی۔ جب تک ان میں باہمی رقابتیں چلتی رہیں، عالمی جنگ کا کوئی خاص خطرہ نہیں تھا لیکن اس کے بعد ان میں گروہ بندی ہوئی اور محاذ آرائی کا بازار گرم ہوا۔ ایک طرف برطانیہ، فرانس اور روس تھے۔ دوسری طرف جرمنی اور آسٹریا ہنگری سلطنت اور۔ اٹلی دونوں کے بین بین تھا۔ اس محاذ آرائی کے بیچ ۱۸۷۰ء سے ہوئے گئے جب ایک طرف پہلی بار متحدہ اٹلی وجود میں آیا

اور دوسری طرف درجنوں جرمن ریاستوں نے پرشیا کے جھنڈے تلے اور
 ہسپارک کی قیادت میں متحدہ جرمنی کا روپ لیا۔ اسی کے آخری تیس
 سالوں میں سامراجیت اپنے عروج پر تھی کہ یورپی طاقتیں زیادہ سے زیادہ
 افریشیائی خطوں پر غلبہ پاتی چلی گئیں۔ برطانیہ نے صرف افریقہ میں
 پچیس لاکھ مربع میل رقبے پر تسلط حاصل کیا۔ فرانس نے بھی وسیع خطوں
 پر قبضہ کیا اور دوسری پوزیشن حاصل کر لی۔ جرمنی پیچھے رہ گیا۔ اس
 نے افریقہ میں دس لاکھ مربع میل رقبہ حاصل کیا اور بحر الکاہل میں چند
 جزیرے۔ اٹلی نے اریٹریا اور صومالی لینڈ کا ایک حصہ ہتھیایا۔ بلجیم
 جیسی چھوٹی سی یورپی مملکت نے کانگو حاصل کیا جو دس لاکھ مربع میل
 رقبے پر مشتمل تھا۔ جاپان علاقائی سامراج پر صابر و شاکر تھا، اس نے
 فارسوسا اور کوریا پر قبضہ کر لیا اور چین میں نفوذ کیا۔ روسی سامراج
 اپنی سرحدات سے متصل خطوں میں پھیلا، اس نے دس لاکھ مربع میل سے
 زیادہ رقبہ اپنے قبضے میں کیا اور ایران، ماسچوریا اور منکولیا کے بیس
 لاکھ مربع میل رقبے کو اپنے حلقہ اثر میں شامل کیا۔

جرمنی اور اٹلی نئی نئی بڑی طاقتیں تھیں۔ انہیں اس بات پر بڑا
 اعتراض تھا کہ دوسری بڑی طاقتیں وسیع خطوں پر قبضہ جا کر عالمی
 طاقتیں بن گئی ہیں۔ جرمنی اور اٹلی کو بھی آرزو تھی کہ ان کا حرج
 دنیا کے وسیع خطوں میں لہرائے۔ اس کے لیے ایک زبردست سمندری قوت
 کی ضرورت تھی۔ جب جرمنی نے بڑے بڑے جنگی جہاز بنانے شروع
 کیے تو برطانیہ کو جنگی بخار چڑھا لیونکہ ملکہ بیچر کی حشمت رکھتا
 تھا اور اس کی اس حیثیت کو لالچا جا رہا تھا۔ فرانس نے ۱۸۷۰ء میں
 جرمنی سے شکست کھائی تھی اور آلسیس لورین کے بیش قیمت علاقے
 لہو بیٹھا تھا۔ وہاں ایک تو انعام کی آگ بھڑکی، دوسری آلسیس لورین

کی بازبانی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اٹلی چاہتا تھا کہ آسٹریا ہنگری سلطنت سے ٹرینٹینو اور ٹریسٹ کے علاقے واپس لے۔ بلقانی ریاستوں میں مختلف قومیتیں اپنی آزادی کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ روس سلاوی قوموں کے اتحاد کی آڑ لے کر سربیا اور آسٹریا ہنگری سلطنت کے درمیان کشمکش کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس خطے میں جنگ ہو تو وہ درِ دانیال پر ہاتھ صاف کرے۔

جنگ، جنگ، جنگ! یہ تھا وہ نعرہ جو ہر قوم بلند کر رہی تھی۔ ہر بڑے ملک میں ایسا عوام پسند ادب وجود میں آ چکا تھا جس کی بنیاد عسکریت کا فروغ تھی اور فضا میں جنگی جذبہ اس درجہ رچ بس چکا تھا کہ بڑے بڑے امن پسند سیاستدان بھی مجبور ہو گئے کہ جارحانہ پالیسیاں اختیار کریں۔ اسلحہ بندی بہت بڑے پیمانے پر ہو رہی تھی اور صنعت کی ترقی نے اسے خاص طور پر فروغ دیا۔ سیاستدان کہتے تھے کہ ہتھیار بنای ہی امن کی بہترین ضامن ہے کیونکہ جب ہر قوم کیل کانٹے سے لیس ہوگی تو پھر سب محفوظ رہیں گے۔ کوئی بین الاقوامی تنظیم تو موجود نہیں تھی اس لیے وطنیت کے ایک انتہا پسندانہ تصور نے نمو پایا۔ اس کے پہلو بہ پہلو خفیہ ڈپلومیسی نے جنم لیا اور دوغلے پن کا بازار گرم ہوا۔ یہی نہیں مسلسل کشمکش اور جنگ آزمائی کے طرز عمل سے آئے دن بین الاقوامی سیاسی بحران ابھرتے تھے اور ہر لمحہ خطرہ تھا کہ یورپی قومیں ایک دوسرے سے برسرا پیکار ہو جائیں گی اور جب یورپی قوموں میں کھلی دھڑے بندی منظر عام پر آگئی تو یہ خطرہ اور بھی حقیقی بن گیا۔ یہی وہ حالات تھے جنہوں نے اقبال کے خیالات کو متاثر کیا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
 کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
 تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
 جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، نا پائدار ہوگا ۱۰

جن دنوں اقبال لاہور میں تعلیم پا رہے تھے، سید جمال الدین افغانی
 دنیائے اسلام میں سامراج دشمنی اور تحریک اتحاد عالم اسلامی کے بیج
 بو چکے تھے۔ خلافت عثمانیہ کو یورپی طاقتیں ”مرد بیمار“ قرار دیتی تھیں
 اور اُس سے علاقوں پر علاقے ہتھیائے چلی جا رہی تھیں لیکن ۱۹۰۸ء میں
 نوجوان ترکوں کے انقلاب نے خلافت عثمانیہ کے رگ و پے میں ایک نئی
 زندگی سرایت کر دی۔ اس سے پہلے ایرانی عوام تحریک مشروطیت کو
 کامیاب بنا چکے تھے اور وہاں ایک باقاعدہ آئین نافذ ہو چکا تھا۔ اقبال
 محسوس کرتے تھے کہ دنیائے اسلام ایک نئی دروٹ لینے کے لیے ہر تون
 رہی ہے۔ اسی احساس نے ان اشعار کا روپ لیا:

کہنہی جو آوارہ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
 برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خارزار ہو گا
 سنا دیا گوش منتظر دو حجاز کی خامشی نے آخر
 جو عہد صحرائیوں سے باندھا کیا تھا پھر آستوار ہو گا
 نکل گئے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو آلت دنا بنا
 سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شہر پھر ہوشیار ہو گا
 میں ظلمات شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درمائدہ سروان کو
 سرر فشاں ہو کی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہو گا ۱۱

لیکن جو انقلاب اقبال کے پیش نظر تھا، اُس میں وطنیت کے یورپی
 تصور کا کوئی مقام نہیں تھا۔ اُس کے مجوزہ انقلاب کی بنیاد اسلام کا اسی

تصور تھا ، وطن کا سیاسی تصور نہیں تھا ۔ انہوں نے کہا :

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے
کہاں کا آنا ، کہاں کا جانا ، فریب ہے امتیاز عقبی
نمود ہر شے میں ہے ہماری ، کہیں ہمارا وطن نہیں ہے ۱۲

قیام یورپ کے دوران میں اقبال نے جتنی نظمیں اور غزلیں لکھیں ،
ان میں سے بیشتر اسی انقلاب کے لیے جدوجہد کی تلقین کرتی تھیں ۔
غم جاناں نے غم روزگار کا روپ لیا اور وہ بھی بھرپور انداز میں اور جب
وہ یورپ سے لوٹ رہے تھے تو بحیرہ روم میں سسلی کے ساحل کو دیکھ
کر مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی یاد تازہ ہو گئی اور ان کا دل بھر آیا کہ
کسی زمانے میں یہ خطہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز تھا اور وہ
پکار اٹھے :

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر
آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی
غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا
درد اپنا مجھ سے کہہ ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستان لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا ۱۳

حوالے

- ۱ - ”اقبال ریویو“، - اپریل ۱۹۷۶ء ص ۱ -
- ۲ - ایضاً - ص ۲ -
- ۳ - ایضاً - ص ۲ -
- ۴ - THE POET OF THE EAST ص ۱۸-۱۷ -
- ۵ - ”مذفوظات اقبال“، - ص ۱۰۰ -
- ۶ - ”ذکر اقبال“، - ص ۵۷ -
- ۷ - اقبال پر عطیہ بیگم کے کتابچے سے جتنے اقتباسات لئے گئے ہیں، وہ عبدالعزیز خالد کے ترجمہ دیئے ہوئے ہیں -
- ۸ - ”بانگ درا کا دیباچہ“، - صفحات ل، م -
- ۹ - ایضاً - صفحات م، ن -
- ۱۰ - ”بانگ درا“ - ص ۱۵۰ -
- ۱۱ - ایضاً - ص ۱۵۰-۱۵۲ -
- ۱۲ - ایضاً - ص ۱۳۳ -
- ۱۳ - ایضاً - ص ۱۳۲ -



۷

چھٹا باب

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک : کشاکش روزگار

تین سال کی مسلسل غیر حاضری کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو حضرت علامہ لاہور پہنچے ، تو ریلوے اسٹیشن پر ان کی پندہرائی کے لیے احباب ، معززین شہر اور عواد موجود تھے۔ اس کے بعد پانچ بیرون بھائی دروازہ پہنچے جہاں احباب نے ایک دعوت چانے کے لیے انہیں منہ سے نصب کر رکھے تھے۔ کچھ مقامی شاعروں نے خبر مقدمہ کے سلسلے میں اپنا کلام سنایا۔ عقیدت کے پھول لچھا اور گئے۔ اس کے بعد اقبال نے روائہ ہوئے ، وہاں بھی ریلوے اسٹیشن استقبال کرنے والوں سے ملے۔ تھا۔ پھولوں کے بار اتنی کثیر تعداد میں پہنائے گئے کہ علامہ نے شہر پھولوں میں چھپ گیا۔ شہریوں کی طرف سے ٹیافوں ہال میں اسٹیشن دیا گیا۔ ۲ چند دن بعد اقبال نے فیصلہ کیا کہ ولایت کا ہمیشہ اقبال کے گے۔ گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کا عہدہ موجود تھا۔ اس کے لیے چھٹی پر تھے لیکن انہوں نے اس سے استعفیٰ دے دی اور آزاد زندگی کے لیے زمین ہموار ہو گئی۔

اقبال کے بڑے بھائی لاہور پہنچے۔ ان کے دوست میر جواد نے بیرسٹر سے ملے۔ ان کی وساطت سے اس سڑک پر ایک دفتر حاصل کیا۔ اب آردو بازار کے نام سے مشہور ہے۔ قانونی کاموں کی ایک چھوٹی سی لائبریری تیار ہو گئی۔ منشی ماہر الدین نے دفتر کا نام منہوالا۔ علامہ نے دو تین مہینے ضلعی عدالتوں میں پریکٹس کی۔ پھر عدالت عاید میں پریکٹس

کرنے کی ٹھانی اور انارکلی بازار میں وہ مکان حاصل کیا جس میں سر محمد شفیع مدت تک رہ چکے تھے۔ وہیں دفتر بنایا، وہیں سکونت اختیار کی اور یہ سلسلہ ۱۹۲۲ء تک جاری رہا۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو آن کا نام عدالت عالیہ کے وکلاء کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح اقبال اس بار روم میں داخل ہوئے جو میاں محمد شفیع، میاں شاہ دین، میاں فضل حسین، لالہ لاجپت رائے، لالہ شادی لال اور پنڈت شیو نارائن جیسے وکلاء کی بدواعت مشہور تھا۔ اقبال اپنے مقدمات کی تیاری میں بہت محنت سے کام لیتے۔ اتنی محنت سے، کہ شعر و شاعری کے شغل سے بھی کچھ دیر دور رہے۔ ابھی پریکٹس شروع نہیں کی تھی کہ جناب شاطر مدرسی کے نام ایک مکتوب میں لکھا: آپ میرے مجموعہ کلام کی نسبت دریافت کرتے ہیں۔ میں کیا اور میرا کلام کیا؟ نہ مجھے ان اوراق پریشاں کے جمع کرنے کی فرصت ہے، نہ حقیقت میں ان کی ضرورت ہے۔ محض دوستوں کے دل بہلانے کے لیے کبھی کبھی لکھتا ہوں اور وہ بھی مجبوراً۔ گذشتہ تین سال سے بہت کم اتفاق شعر گوئی کا ہوتا ہے اور اب تو میں پیشہ ہی اس قسم کا اختیار کرنے کو ہوں جس کو شاعری سے کوئی نسبت نہیں۔ ۵۔ تلوک چند محروم کو لکھا: ”فسوس ہے کہ میں بوجہ مصروفیت فی الحال شعر گوئی سے محروم ہوں۔“ ۶۔ ۱۹۱۳ء تک یہی کیفیت تھی۔ سرکشن پرشاد شاد کے نام لکھتے ہیں: ”آج کل شعر و شاعری کا شغل بھی کم ہے۔“ ”بھائی گدھا“ یعنی پیٹ دم بھر کے لیے مہلت نہیں دیتا۔ ”لاؤ چارا لائو چارا، خدا اسے غارت کرے۔“ ۷۔ ایک اور مکتوب میں لکھا: ”فانونی مشاغل میں اشعار کے لیے کہاں سے وقت نکالے۔ دل اور دماغ دونوں کم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پیٹ کا حکم ہے کہ بہاری رضا کے بغیر ایک خیال یا ایک تاثر اپنے اندر نہ داخل ہونے دو۔ عجب کشمکش کی حالت ہے مگر شکایت نہیں کہ بہارے مذہب میں شکایت ہی کفر ہے۔“ ۸۔

ابھی وکالت کا پیشہ شروع ہوئے چند مہینے گزرے تھے کہ اقبال کو وکالت کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج میں فلسفے کی پروفیسری سنبھالنی پڑی۔ بات یہ ہوئی کہ فلسفہ کے پروفیسر جیمز انتقال کر گئے اور سوائے اقبال کے کوئی اور شخص موجود نہیں تھا جو اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتا۔ علامہ اقبال نے عارضی طور پر یہ عہدہ قبول کر لیا، کیونکہ حکومت نے عدالت عالیہ سے اس کی اجازت لے لی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۱ء تک جاری رہا۔ اقبال صبح چھ بجے سے نو بجے تک لیکچر دیتے اور اس کے بعد وکالت کے فرائض انجام دیتے۔ ۹ کچھ عرصہ بعد یہ پیش کش ہوئی کہ وکالت چھوڑ دیں اور شعبہ فلسفہ کی صدارت قبول کر لیں۔ علامہ نے دوستوں سے مشورہ کیا اور بقول مرزا جلال الدین ”ہم سب نے یہی رائے دی کہ سرکاری ملازمت میں اول تو قوت عمل کے سلسلے ہونے کا احتمال ہے۔ دوسرے محکمہ تعلیم میں وسعت کے امکانات بہت محدود ہیں۔ چنانچہ اگر سرکاری ملازمت ہی پر نگاہ ہو، تو وکالت ہی کیوں نہ رکھی جائے، جس میں ترقی کے جملہ مدارج میں جج کا عہدہ بھی ہے۔ اس پر انہوں نے کالج سے تعلقات منقطع کر لیے اور وکالت پر اکتفا کی۔“۔ ۱۰

بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ پریکٹس تسلی بخش نہیں تھی۔ اس لیے اقبال ملازمت کو خارج از بحث نہیں فرار دیتے تھے۔ چنانچہ جب سرکار نے امام نے سہارا جہ انور سے ان کی ملاقات کا بندوبست درایا، تو امام نے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدے کے لیے بات ہو جانے پر اقبال رضی ہو گئے اور ملاقات کے لیے انور گئے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو سہارا جہ انور کے بارے میں بعض ناگفتہ بہ باتیں سن کر طبیعت مکدر ہوئی، دوسرے سہارا جہ سے معلوم ہوا کہ تنخواہ صرف چھ سو روپے ہوئی۔ اس لیے واپس آ گئے۔ ۱۱ سر ڈیشن پرشاد شاد کے نام لکھا: ”انور کی ملازمت نہ کرنے کی

ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تنخواہ قلیل تھی۔ سات آٹھ سو روپے ماہوار تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں۔ اگرچہ میری ذاتی ضروریات کے لیے تو اس قدر رقم کافی، بلکہ اس سے زیادہ ہے تاہم چونکہ میرے ذمے اوروں کی ضروریات کا پورا کرنا بھی ہے، اس واسطے ادھر ادھر دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ گھر بھر کا خرچ میرے ذمے ہے، بڑے بھائی جان، جنہوں نے اپنی ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا، اب پنشن پا گئے۔ ان کے اور ان کی اولاد کے اخراجات بھی میرے ذمے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں۔“ - ۱۲

احتیاج کے اس عالم کے باوجود اقبال کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ کوئی وظیفہ قبول کر لیا جائے۔ شاد نے ایک ایسے وظیفے کی پیش کش کی تھی جو انہیں فکر معاش سے آزاد کر دے۔ لیکن اسی خط میں انہوں نے نہایت سلاست کے ساتھ یہ پیش کش مسترد کر دی۔ انہوں نے لکھا: ”آپ کی فیاضی، کہ زمان و مکان کی قیود سے آشنا نہیں ہے، مجھ کو ہر شے سے مستغنی کر سکتی ہے۔ مگر یہ بات مروت اور دیانت سے دور ہے کہ اقبال آپ سے ایک بیش قرار تنخواہ پائے اور اس کے عوض میں کوئی ایسی خدمت نہ کرے، جس کی اہمیت بقدر اس مشاہرے کے ہو۔“ - ۱۳

اس دور میں اقبال پر یاسیت کا عالم بھی طاری رہا اور انہوں نے اس کیفیت کا اظہار کیا تو صرف دو افراد کے نام خطوط میں۔ ایک، لسان العصر اکبر الہ آبادی، دوسرے، عطیہ بیگم۔ اکبر الہ آبادی کے نام خطوط کے دوران میں لکھا: ”لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔“

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سے مشکل راز داں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں : جتنا بڑا شہر ہو ، اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی
ہے ۔ سو یہی حال میرا لاہور میں ہے ۔ اس کے علاوہ گذشتہ ماہ میں بعض
معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور
طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور انہی میں طبع سلیم سیرے لیے شکنجے کا
کام دے گئی ۔ کیا خوب کہہ گیا ہے عرفی :

رستم ز مدعی بقبول غلط ولے
در تاہم از شکنجہ طبع سلیم خویش

(۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء)

اور ۹ نومبر ۱۹۱۱ء کو لکھتے ہیں : ”لاہور کی بستی میں ٹری بیگم
دیرینہ نہیں ۔ نام و نمود پر مرنے والے بہت ہیں ۔ قومی جسموں سے بھی
پہلو نہی کرتا ہوں ۔“ ۱۰

اس احساس تنہائی میں مختلف عناصر کارفرما تھے ۔ جن میں ایک ازدواجی
زندگی کی بے سکونی سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے ایک بحران کی صورت
اختیار کر رکھی تھی ۔ جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک جاری رہا اور جس
کے دوران میں یاسیت اس حد تک غالب رہی کہ عظیم بیگم کے ”میر“
میں اس نے ایک دردناک روپ لیے لیا ۔ اقبال کی پہلی شاعری ”میر“ میں
عمر میں ہوئی لیکن طبائع کا ملاپ نہ ہو سکا اور نہ شادی اس لحاظ سے
نا کام رہی کہ دونوں ایک دوسرے سے دور رہے اور جب اقبال یورپ
سے واپس آئے تو انہوں نے ازدواجی زندگی کا خلا پر کرنے کے لیے
چاہا کہ دوسری شادی کریں ۔ خاندان میں اس نے خلاف ابرویت احتجاج

ہوا اور بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے بھی اصرار کیا کہ اقبال پہلی بیوی کو باقاعدہ طور پر بسا لیں اور دوسری شادی نہ کریں۔ یہ بات، ایک ایسے شخص کے لیے قدرتی طور پر بہت ناگوار تھی، جو جدید ترین علوم کی تحصیل کے بعد اور ایک اونچی تہذیبی اور علمی سطح پر پہنچنے کے باوجود اس بات پر قادر نہیں تھا کہ ازدواجی زندگی کے سلسلے میں اپنی مرضی پر چل سکے۔ اس لیے قدرتی طور پر مایوسی کا عالم طاری ہوا اور جب اقبال نے اپنے اعزہ کو بہ صد مشکل منا لیا تو اس کے بعد اتفاقات زمانہ کے طفیل حالات نے ایک ناپسندیدہ شکل اختیار کر لی۔ یہ ۱۹۱۰ء کا ذکر ہے کہ اعزہ اور احباب نے لاہور کے ایک شریف کشمیری گھرانے کی ایک لڑکی سے رشتہ کرایا۔ نکاح پڑھا گیا لیکن رخصتی نہ ہوئی۔ ادھر اس کشمیری گھرانے سے عداوت رکھنے والے ایک صاحب نبی بخش وکیل نے علامہ کے نام گمنام خطوط بھجوائے، جن میں اس نیک دل لڑکی کے خلاف نامناسب باتیں درج تھیں۔ اقبال کو پس پردہ سازش کا علم نہیں تھا اس لیے رخصتی کا معاملہ ملتوی ہو گیا۔ اس پر قدرتی طور پر ذہنی پریشانی سے سابقہ پڑا۔ اتنے میں علامہ کے ایک دوست لدھیانے کے ایک دولت مند خاندان کی لڑکی کا رشتہ لائے۔ رشتہ طے ہو گیا، تو علامہ برات لے کر لدھیانہ گئے۔ بڑے تزک و احتشام سے استقبال ہوا۔ شادی بخیر و خوبی ہو گئی اور اقبال نے دونوں بیویوں کو گھر میں رکھا، یعنی نئی بیوی کے ساتھ ساتھ پہلی بیوی کو بھی، جس کے ساتھ سولہ برس کی عمر میں شادی ہوئی تھی۔ اب ایک نیا بھران پیدا ہوا۔ مختلف وسائل سے اس سازش کا پردہ چاک ہوا جو لاہور کے کشمیری گھرانے کی لڑکی کے خلاف ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ لڑکی کا دامن پر اعتبار سے پاک ہے۔ لڑکی نے علامہ کو ایک خط خود بھی لکھا، جس میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ علامہ نے ایک بہتان پر یقین کر لیا اور ساتھ ہی لکھ دیا

کہ ”میرا نکاح آپ سے ہو چکا ہے ، اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی ۔ اس حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی اور روز قیامت آپ کی دامن گیر ہوں گی ،“ ۔ ۱۵۔ اب اقبال مجبور تھے اور اخلاقاً بھی پابند تھے کہ اس خاتون سے شادی کریں ۔ چنانچہ علماء سے مشورہ لے کر دوبارہ نکاح کر لیا ۔ اس شادی کے غالباً دو ماہ بعد اقبال نے سرکشن پرشاد شاد کے نام مکتوب میں اس کا یوں تذکرہ کیا ۔ ۱۶۔ ”تیسری بیوی آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد کی ۔ ضرورت نہ تھی ، مگر یہ عشق و محبت کی ایک عجیب و غریب داستان ہے ۔ اقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرتناک ثابت قدمی کے ساتھ تین سال تک اس کے لیے طرح طرح کے مصائب اٹھائے ہوں ، اسے اپنی بیوی نہ بنائے ۔ کش ! دوسری بیوی درنے سے پیشتر یہ حال معلوم ہوتا ۔“ (۲۶ اکتوبر ۱۹۰۳ء) ۔ جاوید اقبال اور منیرہ اسی خاتون کی اولاد ہیں ۔

اس تناظر میں اگر عطیہ بیگم کے نام اقبال کے آن خطوط کا مطالعہ کیا جائے ، جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء تک کے عرصے میں لکھے گئے ، تو ان میں منعکس انتہائی یاسیت کو سمجھنا مشکل نہیں ۔ عطیہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ، عالی خاندان اور روشن خیال خاتون تھیں ۔ یورپ میں اُس نے ساتھ اقبال کی علمی دوستی کا آغاز ہوا ۔ ایسے میں قدامت پسندی کے پابندوں اقبال نے جو دکھ جھیلے ، قدرتی طور پر ان کے اظہار میں عطیہ نے اظہار کیا ۔ لیا اور عطیہ نے بھی تالیف قلب میں کوئی کسر روا نہ رکھی ۔ یاسیت کے عالم میں اقبال کے قلم سے جو قدرے تیز و توش فقرے نکلے ، ان میں حیرت کا کوئی مقام نہیں ، کیونکہ اقبال اپنے علم و فضل کے باوجود بہر حال ایک بتیس سالہ نوجوان تھے اور اس عمر میں جذباتیت ایک قدرتی چیز ہے ، بالخصوص ایسے حالات میں جو اقبال کو بے درجے پیش آئے ۔

بہر حال یاسیت کے اس عارضی دور میں بھی علامہ کی مجلسی زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جاری رہی اور احباب کے ساتھ محفل آرائی کی روایت قائم رہی۔ سالک رقمطراز ہیں: علامہ نے ایک گگ (چھوٹی بگھی) لے لی تھی۔ اسی میں کچھری جایا کرتے تھے۔ گھوڑے کی دیکھ بھال کے لیے ایک پوربیا سائیس ملازم تھا۔ اس زمانے میں مرزا جلال الدین صاحب کے علاوہ علامہ کے تعلقات نواب ذوالفقار علی خان، سر جگندر سنگھ، سردار اسراؤ سنگھ سے بہت گہرے ہو گئے تھے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ اکثر کچھری سے فارغ ہو کر اپنی گگ واپس بھیج دیتے اور میری کار میں بیٹھ کر میرے دفتر آ جاتے۔ شام وہیں گزارتے اور رات کے گیارہ بارہ بجے گھر واپس جاتے۔ بعض اوقات رات بھر میرے پاس ہی رہتے اور صبح نماز، تلاوت قرآن اور ناشتے کے بعد گھر جاتے۔ مولانا عبداللہ ٹونکی کا ایک رشتہ دار ظہور میرا بھرا تھا جسے ستار بجانے میں کہاں حاصل تھا۔ علامہ اس سے اکثر ستار سنتے، بلکہ کچھ مدت اس سے ستار بجانا سیکھتے بھی رہے۔ جب نواب ذوالفقار علی خان کے ساتھ تعلقات بڑھے تو ایک خاصی مدت تک میں اور علامہ روزانہ شام کی چائے نواب صاحب ہی کے ہاں پیتے، بلکہ جس دن کچھری میں تعطیل ہوتی، ہم دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھاتے۔ ۱۷

مرزا جلال الدین بتاتے ہیں کہ اقبال موسیقی میں دلچسپی لیتے تھے، اس لیے مرزا صاحب کے ہاں موسیقی کی جو محفلیں آراستہ ہرتی تھیں، ان میں شرکت کرتے تھے۔ بعض اوقات گاؤں سنتے سنتے ان کا قلب جذبات سے متاثر ہونے لگتا اور وہ دھیمی آواز میں گنگنانا شروع کر دیتے جس کے ساتھ ساتھ اپنے داہنے زانو کو ہاتھ سے تھپکتے جاتے۔ ایسے میں محفل موسیقی برخاست ہو جاتی اور سب ہمہ تن گوش ہو کر اقبال کی آواز کی طرف

منوجہ ہو جاتے ، جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ۔ سازندے نہایت مدہم سروں میں ایک قسم کی تال سی دیتے تھے جس کے ساتھ وہ اپنی مخصوص لے میں اشعار پڑھنا شروع کر دیتے ۔ ان کی آواز سازوں کی ہم آہنگی کی وجہ سے کچھ ایسی دل نواز ہو جاتی کہ ایک سہاں سا بندھ جاتا ۔ ”یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے“ والی نظم کی بنیاد بھی ایک ایسی ہی مجلس میں رکھی گئی تھی ۔ ۱۸

اس سے پہلے کہ ہم عصر حاضر کی سیاست پر اقبال کے رد عمل کا تجزیہ کریں ، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غیر سیاسی دوائر میں ان کی بعض اجتماعی سرگرمیوں کا جائزہ لے لیں ۔ انجمن کشمیری مسلمانان پنجاب سے اقبال ایک مدت سے وابستہ تھے ۔ دسمبر ۱۹۰۸ء میں اسی حوالے سے علامہ کا رابطہ خواجہ سلیم اللہ نواب آف ڈھا کہ سے ہوا ۔ وہ اس طرح کہ نواب آف ڈھا کہ بھی اصلاً کشمیری تھے کیونکہ ان کا خاندان کشمیر سے ترک وطن کر کے ڈھا کہ میں آباد ہوا تھا ۔ دسمبر ۱۹۰۸ء میں امرتسر کے شہر میں آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے لیے نواب آف ڈھا کہ تشریف لانے تو کشمیری مسلمانان پنجاب کے ایک وفد نے ان سے ملاقات کی تا کہ کشمیریوں کو زراعت ہمیشہ قرار دینے اور فوج میں ان کی نمائندگی کو مؤثر بنانے کی خاطر جو عرض داشت حکومت ہند کو بھیجی گئی تھی ، اس پر ہمدردانہ غور کے لیے نواب صاحب کو بلایا گیا ۔ وفد نے ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا ، جو حضرت علامہ نے پڑھا ۔ نواب موصوف نے انجمن کا سرپرست بننا منظور کیا اور جوابی تقریر میں کہا ۔ ”ڈھا کہ امرتسر سے سینکڑوں منزل پر واقع ہے ، مگر میں یقین کرتا ہوں اور یقین کرنے کی کافی وجوہ میرے پاس موجود ہیں کہ میں اپنے وطن میں ہوں ۔ میرا خیال ہے کہ امرتسر کی آبادی

پنجاب میں بلحاظ کشمیری آبادی کے بہت زیادہ ہے اور اپنے خواص اور پیداوار اور صنائع کے اعتبار سے ثانی 'سری نگر' ہے۔ اور شاید آپ حضرات واقف ہوں گے کہ میں کشمیری الاصل ہوں۔ اس حیثیت سے اپنے موجودہ وطن سے جس قدر آگے بڑھوں گا، اصلی وطن کشمیر مجھ سے قریب ہوتا جائے گا۔" ۱۹

۱۹۰۹ء میں علامہ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ اس سال انہوں نے کشمیری مسلمانوں کے نام ایک مراسلہ روانہ کیا، جس میں بتایا کہ حکومت پنجاب سے درخواست کی گئی ہے کہ کشمیری مسلمانوں کو سیالکوٹ اور گورداسپور کے علاوہ دوسرے اضلاع میں بھی زراعت پیشہ قرار دیا جائے۔ دوسری طرف نواب آف ڈھا کہ نے وعدہ کیا ہے کہ فوج میں زیادہ مؤثر نمائندگی کے لیے وہ کمانڈر انچیف سے مذاکرات کریں گے۔ لیکن یہ مذاکرات صرف اس صورت میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ کشمیری مسلمان فوج میں موجودہ حیثیت کے بارے میں اعداد و شمار فراہم کریں ۲۰۔ ۷ مارچ ۱۹۱۲ء کو اقبال نے ایک اور مراسلہ بھیجا جس میں انکشاف کیا کہ نواب آف ڈھا کہ نے وائسرائے کی کونسل میں کشمیری مسلمانوں کے مسائل پیش کیے۔ کمانڈر انچیف نے بتایا کہ فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کشمیری مسلمانوں کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کشمیریوں کی کوئی کمپنی یا سکواڈرن موجود نہیں ہے۔ یہ بھی بتایا کہ مختلف کمشنروں کو ہدایات جاری ہو چکی ہیں کہ وہ مختلف اضلاع میں کشمیری زمینداروں کی ایک فہرست مرتب کریں یا کہ اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ ہو سکے۔ علامہ اقبال نے کشمیری برادری کو مشورہ دیا کہ وہ اس کام میں سرکاری اہل کی مدد کریں تاکہ صحیح اعداد و شمار جمع ہو سکیں۔ ۲۱

انجمن حمایت اسلام سے اقبال کی وابستگی ایک روایت بن چکی تھی - وہ قریب قریب ہر سال اس کے سالانہ جلسے میں اپنا کلام سناتے تھے - لیکن ۱۹۱۰ء میں انہوں نے اس سے دیدہ و دانستہ احتراز کیا - اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انجمن میں دھڑے بندی ایک سنگین صورت اختیار کر چکی تھی - یہاں تک کہ اخبار ”وطن“ کے مدیر مولوی انشاء اللہ خان نے مقدمات بھی دائر کر رکھے تھے - اس سے علامہ کا دل کھٹا ہو چکا تھا - بہر حال جب مختلف دھڑوں میں صلح کرانے کے سعی ہوئی تو اقبال نے پورا تعاون کیا - ۲۲ اپریل ۱۹۱۰ء کو نواب فتح علی خان قزلباش کے مسکن پر میاں محمد شفیع ، میاں فضل حسین ، علامہ اقبال ، مولوی احمد دین ، شیخ گلاب دین ، ”پیسہ اخبار“ کے مدیر مولوی محبوب عالم ، میاں امیر الدین کے والد میاں نظام الدین اور دوسرے حضرات کا ایک اجتماع ہوا جہاں یہ فیصلہ کیا گیا کہ نواب فتح علی خان قزلباش کی صدارت میں ایک ثالثی بورڈ قائم کیا جائے جس میں فریقین کی طرف سے تین تین نمائندے لئے جائیں - اس میں علامہ اقبال بھی شامل تھے - ثالثی بورڈ نے جو فیصلہ دیا، وہ سب کو قبول ہوا اور مولوی انشاء اللہ نے مقدمات واپس لے لیے - اس طرح انجمن ایک سنگین بحران سے نجات پا گئی -

اگلے سال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں اقبال نے اپنی مشہور نظم ”شکوہ“ سنائی اور خوب داد پائی - چند مہینے بعد نواح میں سوچی دروازہ میں ایک بہت بڑے جلسے میں ”جواب شکوہ“ سنائی ، لیکن ترجم سے نہیں ، تحت اللفظ - لوگ ترجم کے عادی تھے ، انہوں نے اس کا تقاضا بھی کیا لیکن اقبال نے سختی سے انکار کیا اور کہا کہ یہ نظم تحت اللفظ ہی پڑھنی مناسب ہے - ۱۹۱۲ء میں انجمن اور محمدن ایجوکیشنل سوسائٹی نے اجتماعات بیک وقت ہونے - ہزارہا کا مجمع تھا - اقبال نے ”جمع و شاعر“

کے عنوان سے نظم سنائی تو اس سے لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے انجمن کو ہزاروں روپے چندے کے طور پر دیے۔ اسی اجلاس میں مولانا ظفر علی خان نے اپنی تقریر میں یہ تجویز پیش کی کہ علامہ کو تبلیغ اسلام کے لیے جاپان بھیجا جائے اور مصارف کا بندوبست یوں ہو کہ علامہ کی نظم کی دس ہزار کاپیاں چھاپ کر آٹھ آٹھ آنے میں بیچ دی جائیں، جس سے پانچ ہزار روپے جمع ہو جائیں گے۔ لاہور کے ”پیسہ اخبار“ نے لکھا کہ یہ تجویز محض جوش میں آ کر پیش کر دی گئی ہے۔ خود علامہ کا یہ خیال ہے کہ جب مولوی برکت اللہ بھوپالی تین سال جاپان میں رہ کر اخبار بھی نکالتے رہے اور دو تین سے زیادہ جاپانیوں کو مسلمان نہ بنا سکے تو میں دو مہینے میں کیا کر لوں گا۔ ”پیسہ اخبار“ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ علامہ اس ملک میں رہ کر اپنی قوم کی بہترین خدمت کر سکتے ہیں۔ ۲۲

۴

اس زمانے میں دو بڑے واقعات نے برعظیم کی مسلم سیاست کو بہت متاثر کیا۔ اول : تقسیم بنگال کی تہنسیخ۔ دوم : ساحہ کانپور۔ انگریزی حکومت نے نظم و نسق میں سہولت کی خاطر ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو صوبوں میں منقسم کر دیا۔ ایک مغربی بنگال، دوسرا مشرقی بنگال و آسام۔ دوسرے صوبے میں مسلمان غالب اکثریت میں تھے اور بے حد پس ماندہ بھی۔ مسلمانوں کو اس پر قدرتی طور پر خوشی ہوئی کیونکہ الگ صوبہ بننے سے یہ اسکان پیدا ہوا کہ ان کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ ہندوؤں کو اس فیصلے پر سخت غصہ آیا، کیونکہ کلکتے کے مارواڑیوں کے ہاتھوں مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے استحصال کے دروازے بند ہو گئے۔ بنگالی عصبیت بھی اس مخالفت میں کارفرما تھی اور کہا گیا کہ سونار بنگلہ کو توڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس اور ہندوؤں نے اس فیصلے کے خلاف

نہ صرف جلسے ، جلوس اور مظاہرے کرائے بلکہ برطانوی مصنوعات کے
 مقاطعہ کی تحریک بھی چلائی - یہی نہیں ، ہندوؤں کی خفیہ جماعتیں وجود میں
 آگئیں جنہوں نے سارے مشرقی بنگال میں دہشت انگیزی کا بازار گرم
 کر دیا - یہ ایک خالص ہندو تحریک تھی اور اسے مقبول کرنے کی خاطر
 دیوی دیوتاؤں کے واسطے بھی بڑے شراںگیزانہ انداز میں دیے گئے -
 مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ اس اعتبار سے مبارک ثابت ہوا کہ انہوں نے
 سیاست سے کنارہ کشی کی روایت ترک کر دی - اگلے سال ہندوستان بھر
 کے ممتاز مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد وائسرائے سے ملا اور اس سے یہ یقین
 دہانی حاصل کی کہ نمائندہ اداروں کی تشکیل کے لیے جو آئینی اصلاحات
 نافذ کی جائیں گی ، ان میں جداگانہ انتخاب کا اصول رائج کیا جائے گا - اس
 کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھ دی گئی - ۱۹۰۹ء کی مارچ مہینے
 اصلاحات کے ذریعے جداگانہ انتخاب حزوی طور پر رائج کر دیا گیا۔ مسلمان تقسیم
 بنگال کے خلاف ہندو ایچی ٹیشن سے جب مشوش ہوئے ، انگریزی حکومت
 نے یقین دلایا کہ یہ فیصلہ اٹل ہے لیکن جب ہندوؤں کا دباؤ بہت بڑھ
 گیا تو ۱۹۱۱ء میں حکومت نے تقسیم بنگال کی تفسیح کا اعلان کر دیا
 اور مسلمانوں کی اشک شونی کے لیے ایک تو اس فیصلے کا اعلان دیا کہ
 ڈھا کہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے گی ، دوسرے دارالحکومت دو
 کلکتے سے دہلی منتقل کر دیا تا کہ مسلمان خوش ہوں کہ ان کے تہذیبی
 اور ثقافتی مرکز کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے - بہر حال مسلمانوں کی
 بہت شدید تھا اور انہوں نے بڑے تلخ انداز میں اس کے خلاف احتجاج
 کیا - اس میں ایک استثنیٰ بھی تھی اور وہ تھی سر آغا خان کی رائے - انہوں
 نے اشک شونی کی حامل تجاویز کو تفسیح کا نعم البدل قرار دیا اور مسلمانوں
 کو مشورہ دیا کہ وہ اسے قبول کر لیں - اقبال عملی سیاست میں شرکت
 سے گریزاں تھے لیکن ان کی رائے سر آغا خان کی رائے سے ملتی جلتی تھی -

چنانچہ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کو عطیہ بیگم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

”بنگال کی تقسیم -- مسلم بنگال کی ہندو بنگال سے علیحدگی --
بنگالی ہندو کے خیال میں ایک کاری زخم تھا جو حکومت نے
بنگالی قومیت کے قلب پر لگایا -- مگر حکومت نے کمال
ہوشیاری سے دہلی کو دارالحکومت بنا کر اپنے کیے پر خط
تسنیخ کھینچ دیا ہے۔“

”بنگالی اسے اپنی عظیم فتح سمجھتا ہے لیکن اسے نہیں معلوم کہ
اس سے اس کی اہمیت صفر ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نکتے پر
دو شعر ملاحظہ ہوں :

سندس زخم دل پنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن ، گئی
تاج شاہی آج کلکتے سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی ۲۳

تقسیم کی تسنیخ کا اعلان شہنشاہ انگلستان نے بر عظیم میں آ کر خود
کیا تھا۔ وہ جب واپس چلے گئے تو پنجاب کے بعض مسلمان رہنماؤں نے
تجویز پیش کی کہ ملک معظم سے وفادارانہ جذبات کے اظہار کے لیے ہندوؤں
اور مسلمانوں کے مشترکہ جلسے کیے جائیں۔ چونکہ مسلمانوں کے دل دکھے
ہوئے تھے اور ان کے ایک طبقے کا خیال یہ تھا کہ مشترکہ جلسوں کے
انعقاد سے یہ مراد بھی لی جا سکتی ہے کہ مسلمان تقسیم بنگال کی تسنیخ کے
فیصلے پر صاد کرتے ہیں، اس لیے آخر کار یہ طے پایا کہ مسلمانوں کے جلسے
الگ ہوں اور ہندوؤں کے الگ۔ چنانچہ یکم فروری ۱۹۱۲ء کو مسلمانوں

کا ایک جلسہ عام باغ برون موچی دروازہ میں ہوا۔ صدارت کے ایسے علامہ کا نام تجویز ہوا لیکن انہوں نے ملک مبارز خان ٹوانہ کا نام تجویز کر دیا۔ مولوی غلام محی الدین قصوری نے تجدید وفا کی قرارداد پیش کی۔ علامہ نے رسمی طور پر اس کے حق میں دو چار فقرے کہہ کر ارشاد فرمایا: ”مسلمانوں کو اپنی ترقی کے لیے خود ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔ ہندوؤں کو اب تک جو کچھ ملا ہے، محض اپنی کوششوں سے ملا ہے۔ اسلام کی تاریخ کو دیکھو، وہ کیا کہتی ہے؟ عرب کے خطے کو یورپین معزروں نے ردی اور بے کار پتھر کا خطاب دے کر یہ کہہ دیا تھا کہ اس پتھر پر کوئی بنیاد کھڑی نہیں ہو سکتی۔ ایشیا اور یورپ کی قومیں عرب سے نفرت لڑتی تھیں۔ مگر عربوں نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے کس بل سے کام لیا تو جہی پتھر دنیا کے ایوان تمدن کی محراب کی کھید بن گیا اور خدا کی قسم، روم، چین، باجروت سلطنت عربوں کے سیلاب کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جو اپنے بل پر کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔“ اس طرح کوئی اقبال نے مسلمانوں سے کہہ دیا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کی شنوائی ہو، تو اپنے بل پر کھڑے ہوں۔

۱۹۱۲ء کے آغاز میں کانگریس کے روشن خیال رہنما گوئیے نے امپیریل قانون ساز کونسل میں لازمی تعیم کا بل پیش کیا۔ اس بل کے پاس انگریزوں کا طرز عمل سنکی تھا، لیونیکہ وہ ایسے ناقابل عمل بل تھے۔ اس کے حق میں لاہور میں ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت مولوی نے فرمائی اور صدارتی خطبے میں اس کی مکمل تائید کی۔ انہوں نے کہا: ”لفظ جبر سے کسی کو لہٹکانا نہیں چاہئے۔ جس طرح جبر کا لفظ لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہو سکتا، جس کے ٹیکہ اٹایا جاتا ہے۔ ایسی طرح جبر یہ

تعلیم بھی قابل اعتراض متصور نہیں ہو سکتی۔ جبریہ تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکہ ہے۔ اسلام میں جبر کی تعلیم موجود ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے بچوں کو زبردستی نماز پڑھائیں۔۔۔“ ۲۵

سانحہ کانپور کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۱۳ء میں انگریزی حاکموں نے کانپور میں ایک سڑک سیدھی کرنے کی خاطر ایک مسجد کا ایک حصہ شہید کر دیا۔ اس سے مسلمانوں کے جذبات اتنے مجروح ہوئے کہ سارے برعظیم میں صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ مسجد کے سامنے مسلمانوں نے ایک مظاہرہ کیا تو آن پیر بڑی بے دردی کے ساتھ گولی چلا دی گئی۔ بہت سے مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا جن میں بچے بھی شامل تھے۔ یہی نہیں، اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس تحریک میں مجدد علی جوہر پیش پیش رہے۔ اقبال تحریک میں تو شامل نہیں تھے لیکن جب گرفتار شدگان کے لیے قانونی امداد کی اپیل ہوئی تو حضرت علامہ مرزا جلال الدین بیرسٹر کے ساتھ کانپور پہنچے اور رضاکارانہ طور پر قانونی امداد دی۔

۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو حضرت علامہ کی والدہ چھ سات مہینے کی علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ آپ نے ایک طویل مرثیہ لکھا جو اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں اس اعتبار سے یادگار رہے گا کہ یہ مرثیہ نگاری کی عام روش سے ہٹ کر لکھا گیا اور اس میں حیات بعد الموت کا تصور پیش کیا گیا۔ اقبال کو جو صدمہ ہوا، اس کی شدت سرکشن پرشاد شاد کے نام اس مکتوب سے ہوتی ہے: ”آہ انسان اپنی کمزوری کو چھپانے میں کس قدر طاق ہے۔ بے بسی کا نام صبر رکھتا ہے اور پھر اس صبر کو اپنی ہمت و استقلال کی طرف منسوب کرتا ہے۔ مگر اس حادثے نے میرے دل و

دماغ میں ایک شدید تغیر پیدا کر دیا ہے۔ میرے لیے دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دنیا میں بڑھنے کی خواہش کرنا صرف مرحومہ کے دم سے وابستہ تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ موت کا انتظار ہے۔ دنیا میں موت سب انسانوں تک پہنچتی ہے اور کبھی کبھی انسان بھی موت تک جا پہنچتا ہے۔ میرے قلب کی موجودہ کیفیت یہ ہے کہ وہ تو مجھ تک پہنچتی نہیں، کسی طرح میں اس تک پہنچ جاؤں۔ کیا خوب کہا ہے کسی استاد نے :

ہلاک شیشہ در خون نشہ خویشم
کہ آخرین نفس عذرخواہی سنگ است

حوالے

- ۱ - "کشہیری میگزین"، اگست ۱۹۰۸ء - صفحات ۳۳ - ۳۳
- ۲ - "روزِ در فقیر"، (جلد دوم) - ص ۱۵۱
- ۳ - "کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ"، ص ۳۲۹
- ۴ - "ذکر اقبال"، ص ۶۳ - ۶۳
- ۵ - "خطوط اقبال"، صفحات ۷۳ - ۷۳
- ۶ - ایضاً - ص ۱۰۵
- ۷ - "صحیفہ"، اقبال نمبر - حصہ اول - ص ۱۱۳
- ۸ - ایضاً - ص ۱۳۶
- ۹ - صفحات ۳۸ - ۳۷ Letters and Writings of Iqbal
- ۱۰ - "ملفوظات اقبال" - ص ۹۸
- ۱۱ - "ذکر اقبال" - ص ۸۳ - ۸۳
- ۱۲ - "صحیفہ"، اقبال نمبر - جلد اول : ص ۱۰۹

- ۱۳ - ایضاً - ص ۱۱۰
- ۱۴ - ”اقبال نامہ“ - جلد دوم - صفحات ۳۵ اور ۳۸
- ۵ - ”ذکر اقبال“ - صفحات ۷۰ - ۶۷
- ۱۶ - ”صحیفہ“ - اقبال نمبر - جلد اول - ص ۱۰۹
- ۱۷ - ”ذکر اقبال“ - ص ۶۶
- ۱۸ - ”ملفوظات اقبال“ - صفحات ۸ - ۱۰۷
- ۱۹ - ”صحیفہ“ - اقبال نمبر - جلد اول - صفحات ۳۴ - ۱۳۳
- ۲۰ - ”خطوط اقبال“ - صفحات ۱۰۹ - ۱۰۶
- ۲۱ - ”انوار اقبال“ - صفحات ۵۹ - ۵۶
- ۲۲ - ”ذکر اقبال“ - صفحات ۸۳ - ۸۲ ، ۸۰ - ۷۹
- ۲۳ - ”اقبال“ (عطیہ بیگم) مرتبہ عبدالغزیز خالد ، صفحات ۷۹ - ۷۸
- ۲۴ - ”گفتار اقبال“ - صفحات ۳ - ۱ ”زمیندار“ - ۴ - ۳ - فروری ۱۹۱۲ء
- ۲۵ - ایضاً - صفحات ۴ - ۳ (”زمیندار“ - ۲۰ فروری ۱۹۱۲ء)
- ۲۶ - ”صحیفہ“ - اقبال نمبر - جلد اول - صفحات ۳۲ - ۱۳۱



ساتواں باب

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک : اقبال اور دو قومی نظریہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان رہنماؤں میں سب سے پہلے سرسید احمد خان نے اس حقیقت کا برملا اعلان کیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں کیونکہ ان کی تاریخ ، روایات اور تہذیب ایک دوسرے سے مختلف ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کو ایسے جمہوری ادارے منظور نہیں ہیں جن کی بنیاد ووٹوں پر ہو کیونکہ تعداد میں بے پناہ غلبے کی وجہ سے ہندو قوم مستقل طور پر مسلمان قوم کو غلام بنا لے گی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جو مسلم قیادت ابھری ، اسے بھی دو قومی حقیقت کا احساس تھا۔ چنانچہ اس نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا اور اسے اصولی اعتبار سے منوا لیا۔ نیز اس نے آل انڈیا مسلم لیگ بنا لی۔ لیکن اس کی سوچ ایک تنگ دائرے میں مقید رہی۔ صرف اس دور ہی میں نہیں جس سے یہ باب تعلق رکھتا ہے بلکہ اس کے بعد بھی اس قیادت کا منہائے نظر یہ تھا کہ مسلمانوں کا قومی تشخص ہندوستانی قومیت کے دائرے کے اندر رہنے ہوئے برقرار رہے اور ایک ایسی دو قومی مملکت وجود میں آ جائے جس میں ہندو اور مسلمان برابر حیثیت کے مالک ہو نہیں ہو سکتے البتہ مسلمانوں کو ایسے تحفظات حاصل ہو جائیں جن کی مدد سے وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکیں۔ گویا یہ وطنیت کے مغربی تصور اور جمہوریت کے مغربی نظریے کے ساتھ مصالحت کی ایک دوش تھی جو آخر کار ناکام رہی۔

حضرت علامہ کی سوچ سکھ بند مسلم قیادت کی سوچ سے بنیادی طور پر مختلف تھی۔ وہ میدان سیاست کے کھلاڑی نہیں تھے بلکہ عملی سیاست سے مدتوں گریزاں رہے لیکن ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے ان کی سوچ سے اہل فکر و دانش متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ یہ اثر پذیری گہری ہوتی چلی گئی۔ قیام یورپ کے دوران میں انہوں نے وطنیت کے مغربی تصور کا کھوکھلا پن اپنی آنکھوں سے دیکھا اور چونکہ وہ مسلمان تھے اور صاحب فکر مسلمان تھے، اس لیے انہوں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں برعظیم کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل پر بھی گہرے غور و تہحص سے کام لیا اور جب واپس آئے تو یکے بعد دیگرے چند مقالات لکھے جن میں دو قومی حقیقت کو ایک باقاعدہ نظریاتی رنگ دیا اور اس طرح مسلمانوں کی فکری رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔

۴

یورپ سے واپسی کے ایک سال بعد انہوں نے ”اسلام، ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے“ کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جو ”ہندوستان ریویو“ کے جولائی، دسمبر ۱۹۰۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ انہوں نے اس میں مسلمانان ہند کے حالات اور مسائل کا بھرپور تجزیہ کیا اور ان کے لیے ایک راہ عمل تجویز کی۔ علامہ کے فکر کو سمجھنے کے لیے اس مقالے سے چند طویل اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے لکھا:

”اسلام کا اخلاقی نصب العین ہے، ایک مضبوط جسم میں ایک مضبوط قوت ارادی۔ لیکن مجھے ایک لمحے کے لیے یہ دیکھنے کی اجازت دیجیے کہ آیا ہندوستانی مسلمان اس پیمانے پر پورے آتے ہیں۔ کیا ہندوستانی مسلمان ایک مضبوط جسم میں ایک مضبوط قوت ارادی کا مالک ہے؟ کیا اس میں زندہ رہنے کا

عزم موجود ہے؟ کیا اس میں اتنی قوت کردار موجود ہے کہ وہ ان قوتوں کی مخالفت کر سکے جو اس کے معاشری نظام یا ہیئت اجتماعی کو پارہ پارہ کرنا چاہتی ہیں؟ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرے سوالات کا جواب نفی میں ہے۔

قارئین جانتے ہیں کہ زندہ رہنے کی عظیم جدوجہد میں تعداد ہی وہ بڑا عنصر نہیں جو ایک ہیئت اجتماعی کو برقرار رکھتا ہے۔ نہ صرف ایک مخالف قدرتی ماحول کے خلاف مساعی ہیں بلکہ ایک بہتر، مسرور اور بھرپور زندگی کی خاطر حریفوں سے مقابلے میں کردار ہی آخری اور قطعی لازمہ ہے۔ بہر حال ہندوستانی مسلمان کی قوت حیات افسوسناک حد تک کمزور ہو چکی ہے۔

کچھ دینی روح کے زوال کی وجہ سے، اور کچھ سیاسی نوعیت کے ان اسباب کی بناء پر جو اس کے اختیار سے باہر ہیں، ہندوستانی مسلمان نے کچھ ایسی عادتیں اختیار کر لی ہیں کہ اپنے قد و قامت کو خود گھٹاتا ہے۔ محتاجی محسوس کرتا ہے اور ایک ایسا تساہل اپنے اوپر طاری کرتا ہے جسے ایک کمزور قوم قناعت یا آسودہ خاطرگی کا باوقار نام دیتی ہے اور اس طرح اپنی کمزوری پر پردہ ڈالتی ہے۔ چونکہ ہندوستانی مسلمان تجارتی اخلاق سے بے خبر ہے اس لیے وہ معاشی کردار میں ناکام رہتا ہے۔ قومی مفاد کے حقیقی تصور کے فقدان اور اس ملک کی دوسری قوموں میں اپنی قوم کی موجودہ حالت کو ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ نجی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ایک ایسے راستے پر گمراہ ہے جو اسے تباہی کی طرف لے جائے گا۔ ہم اکثر مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ ایک حقیقی قومی نوعیت کے مفاد کی پس رفت سے محض اس

لیے گریز کرتا ہے کہ اس سے کسی ایسے بااثر ہندو کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے جس کے وسیلے سے وہ کسی ذاتی امتیاز کے حصول کی امید کرتا ہے۔“

جہاں تک معاشی پہلو کا تعلق ہے ، اقبال نے لکھا :

”ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا نصب العین زیادہ تر ملازمت ہے اور ملازمت بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں محتاجی کے احساس کو جنم دیتی ہے اور یہ احساس انسانی انفرادیت کی قوت کو کھوکھلا کر دیتی ہے ۔ ہم میں سے جو لوگ غریب ہیں ، ظاہر ہے ان کے پاس سرمایہ موجود ہی نہیں ۔ درمیانہ طبقے کے لوگ باہمی بداعتہادی کی وجہ سے مشترکہ سرمائے سے معاشی کاروبار کے اہل نہیں ہیں اور امراء تجارت کو اپنے وقار کے منافی پیشہ خیال کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشی محتاجی ساری خرابیوں کی جڑ ہے ۔“

[یہی بات اقبال پانچ سال پہلے ”قومی زندگی“ پر مقالے میں کہہ چکے تھے کہ :

”یہ بد قسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے ۔ صنعت کھو بیٹھی ہے ۔ تجارت کھو بیٹھی ہے ۔ اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے ۔“ [۲]

تعلیمی نظام کے بارے میں اقبال نے اس رائے کا اظہار کیا کہ یہ نہ ہندوؤں کے لیے مفید ہے ، نہ مسلمانوں کے لیے ۔ اور اس پر جو روپیہ صرف ہو رہا ہے ، وہ محض ضائع ہو رہا ہے ۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ، اقبال نے لکھا :

”موجودہ نظام تعلیم ہماری قوم کے لیے قطعی طور پر ناسوزوں ہے۔ یہ ہماری فطرت کے منافی ہے۔ یہ کردار کی ایک غیر مسلم قسم پیدا کرتا ہے۔ یہ ہماری قومی ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ ہمیں اپنے ماضی سے بالکل الگ تھلگ کرنا ہے اور اس غلط مفروضے پر مبنی ہے کہ تعلیم کا نصب العین قوت ارادی کی جگہ محض انسانی ذہن کی تربیت ہے... اگر ہمیں خود اپنا بننا ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے سکول بنائیں، اپنے کالج قائم کریں اور اپنی یونیورسٹیاں کھولیں جو ہماری معاشری اور تاریخی روایات کو زندہ رکھیں، ہمیں اچھے اور پراسن شہری بنائیں اور ہم میں وہ آزاد، لیکن یابند قانون روح پیدا کریں جس سے سیاسی راست بازی کی اعلیٰ ترین قسمیں ابھریں۔ مجھے پورا احساس ہے کہ ہمارے راستے میں کون کون سی مشکلات حائل ہیں لیکن میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم اپنی مشکلات پر قابو نہ پاسکے تو دنیا بہت جلد ہم سے چھٹکارا پا لے گی۔“

اسلام کے سیاسی دستور کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال نے لکھا کہ اس کے دو بنیادی اصول ہیں۔ اول یہ کہ قانون الہی پر چیز سے بالا ہے۔ دوسرے معاشری ڈھانچے میں ہیئت حاکمہ کا کام صرف یہ ہے کہ وہ قانون الہی کی تاویل کرنے۔ اسلام میں شخصی ہیئت حاکمہ کی کوئی جگہ نہیں۔ دوم: معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ اسلام میں طبقہ امراء کا کوئی وجود نہیں۔ اس میں نہ کوئی مراعات یافتہ طبقہ ہے، نہ سلاگری ہے، نہ ذات پات کا نظام۔ اقبال نے بتایا:

”تمام مسلمانوں کی برابری کا اصول ہی تھا جس نے ابتداء میں انہیں دنیا کی عظیم ترین سیاسی طاقت بنا دیا۔ اسلام معاشری اونچ نیچ کو ختم کرنے اور ایک ہموار معاشرے کی تخلیق کے لیے ایک قوت ثابت ہوا۔ اس نے فرد کو آس کی قوت کا احساس دلایا۔ اس نے ان لوگوں کو اونچا کیا جو معاشرے کی نیچلی سطح سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا راز بھی یہی تھا کہ مدتوں سے پسے ہوئے اور روندے ہوئے عناصر کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔“

اس کے بعد اقبال نے ملت اسلامیہ کی ایک اور بیماری کا تذکرہ کیا۔ ملاحظہ فرمائیے :

”کیا ہم ہندوستانی مسلمان اپنی معاشری معیشت کے اصول پر پورے اترتے ہیں؟ کیا اس سرزمین میں اسلام کی ہیئت اجتماعی کی وحدت محفوظ ہے۔ مذہبی مہم جو مختلف قسم کے فرقوں اور برادریوں کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں اور ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی ذاتیں اور گوتیں وجود میں آرہی ہیں۔ یقیناً اس معاملے میں ہم ہندوؤں سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں کیونکہ ہمارے ہاں ذات پات کا دوہرا نظام قائم ہے کیونکہ فرقہ بندی کی صورت میں ذات پات کا مذہبی نظام بھی موجود ہے، اور وہ معاشرتی نظام بھی موجود ہے جو ہم نے ہندوؤں سے ورثے میں حاصل کیا۔ یہ ان خاموش طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے جس سے مفتوح قومیں فاتح قوموں سے انتقام لیتی ہیں۔“

”اسلام ایک ناقابل تقسیم اکٹی ہے۔ اس میں امتیازات کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام میں نہ وہابی ہیں، نہ شیعہ، نہ سنی۔ جب سچائی خود خطرے میں ہو تو سچائی کی تاویلات پر نہ لڑو۔ رات کی تاریکی میں چلتے چلتے ٹھوکر کھانے کی شکایت محض حماقت ہے۔ آؤ ہم سب مل کر آگے بڑھیں۔ طبقاتی امتیازات اور فرقہ بندی کے بت ہمیشہ کے لیے توڑ ڈالیں۔“

اگر ہم اس مقالے کے مندرجات کا مطالعہ بیسویں صدی کے پہلے عشرے کی مسلم سیاست کے تناظر میں کرتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میدان سیاست میں دخیل نہ ہونے کے باوجود اقبال ہی تھے جنہوں نے ایک جاندار تحریک اور خیال افروز قیادت فراہم کی اور برعظیم کے مسلمانوں کے مسائل کا ایک مثبت تجزیہ کر کے اور مثبت نتائج اخذ کر کے ان پر ظاہر کر دیا کہ جس راستے پر وہ چل رہے ہیں، وہ انہیں ترقی کی طرف نہیں لے جائے گا۔

جہاں تک مسلم قومیت کے بارے میں اقبال کے تصور کا تعلق ہے، اس کا اولین عکس ان کا وہ مقالہ ہے جو ”ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر“ کے عنوان سے مشہور ہے۔ ۳ یہ مقالہ اصلاً انگریزی میں لکھا گیا تھا اور ۱۹۱۰ء کے موسم سرما میں علی گڑھ کے ایم اے او کالج کے سٹریٹیجی ہال میں پڑھا گیا تھا، بعد میں مولانا ظفر علی خان نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ ایک روایت کے مطابق اصل مقالے کا عنوان The Muslim Community ہے لیکن جناب ڈاکٹر ایس۔ اے رحمان کا بیان ہے کہ اصل انگریزی عنوان A CURSORY REVIEW OF THE ISLAMIC RELIGION تھا اور اس کا ترجمہ اسی رعایت سے مولانا ظفر علی خان نے کیا تو اس کا عنوان ”ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر“ دیا۔ مسلم قومیت کے تصور پر اقبال نے تین پہلوؤں سے نظر ڈالی۔ اول: حماقت مسلمان کی ہیئت

ترکیبی - دوم : اسلامی تمدن کی یک رنگی - سوم : اس سیرت کا نمونہ ، جو مسلمانوں کی قومی ہستی کے تسلسل کے لیے لازمی ہے - اقبال نے لکھا :

”مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن، نہ اشتراک اغراض اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں ، جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی ، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں ، وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزارى ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارہ مدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔۔۔

”مذہب کا مقصد یہ نہیں کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے۔ بلکہ اس کی اصل غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بہ تدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔ مذہب سیرت انسانی کا ایک نیا اسلوب یا نمونہ پیدا کر کے اس شخص کے اثر کے لحاظ سے ، جو اس سیرت کا مظہر ہے ، اس نمونے کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے اور اس طور پر چونکہ وہ ایک نئی دنیا کو نیست سے ہست کرتا ہے۔ لہذا اس پر مابعد الطبیعات کا اطلاق ہوتا ہے۔۔۔

”اسلام کی حقیقت ہمارے لیے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ہم اصول اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بہ الفاظ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔“

دوسرے نکتے کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال نے اس رائے کا اظہار کیا کہ دینی عقیدے اور ثقافتی یک رنگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ محض اسلام پر ایمان لانا کافی نہیں۔ اس یک رنگ ثقافت سے استفادہ بھی ضروری ہے جو ہمارے آباء و اجداد کی متفقہ عقلی تحریک کا ماحصل ہے۔ اسلامی ثقافت کے مختلف عناصر کا تجزیہ کر کے انہوں نے لکھا :

”صبغة الله کے اس خم میں غوطہ لگانے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان دو رنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جائیں۔ ان کا ذہنی منظر ایک ہو۔ وہ مظاہر آفرینش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں۔ اشیاء کی ماہیت اور قدر و قیمت کو اس انداز خاص سے سمجھیں جو جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کا ماہی الامتیاز ہے اور جو مسلمانوں کو ایک غایت مختصر و منحصہ معینہ کے پیرائے سے آراستہ کر کے انہیں ’ال موسن اخوة‘ کی کتاب کے اوراق بنا دیتا ہے۔“

تیسرا نکتہ سیرت سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال نے قوموں کے اخلاقی تجربے کی تاریخ میں دور شجاعت، دور مروت اور دور ضبط نفس کا تذکرہ کیا اور لکھا:

”اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ ہماری قومی ہستی کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہ آئے تو ہمیں ایک ایسا اسلوب سیرت تیار کرنا چاہیے جو اپنی خصوصیات مختصہ سے کسی صورت میں بھی علیحدگی نہ اختیار کرے۔ اور ’خذ ما صفا و دع ما کدر، کے زریں اصول کو پیش نظر رکھ کر دوسرے اسالیب کی خوبیوں کو اخذ کرتے ہوئے ان تمام عناصر کی آمیزش سے اپنے وجود کو کمال احتیاط کے ساتھ پاک کر دے جو آس کی روایات مسلمہ و قوانین منضبطہ کے منافی ہوں۔“

مروجہ تعلیم نے اقبال کے نزدیک تعلیم یافتہ مسلمانوں کو نیم مسلمان، بلکہ اس سے بھی کچھ کم بنا کر رکھ دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

”مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے۔ روحانی طور پر بہ منزلہ ایک بے جان لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال قائم رہی تو وہ اسلامی روح، جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے، ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔۔۔“

علامہ نے یہ بھی کہا کہ علماء اور واعظین کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ واعظ کو تاریخ، معاشیات

اور عمرانیات کے حقائق سے باخبر ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے ادب اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیے۔ علامہ کی رائے یہ تھی کہ نہ موجود دینی مدرسے اور نہ علی گڑھ کالج قوم کی بڑی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں۔ وہ ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی کا قیام چاہتے تھے ”جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دلکش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ تخیل، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کو تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔“

اقبال نے مسلمانوں کی معاشی حالت کو ”نہایت ہی افسوس ناک اور قابل رحم“ قرار دیا۔ انہوں نے پوچھا ”کیا ہم نے کبھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ہماری انجمنوں اور مجلسوں کا فرض یہ نہیں ہے کہ خاص خاص اشخاص کے کلاہ اعزاز و افتخار میں بیٹھے ہوئے طرے لگایا کریں۔ بلکہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی سطح کو اونچا کریں،“؟ اقبال نے اس رائے کا اظہار کیا کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو ان کا حصہ دلانا قابل ستائش ہے لیکن اس کا فائدہ محدود ہے۔ سرکاری ملازمت چند افراد کو ضرور خوشحال بنا دیتی ہے لیکن قوم کے تمام افراد اسی صورت میں آسودہ اور خوشحال ہو سکتے ہیں کہ ان کو معاشی آزادی نصیب ہو جائے۔ اس کے لیے صنعتی تعلیم کی ضرورت ہے ”جو میری رائے میں سب سے زیادہ ضروری ہے۔ صنعتی تعلیم سے عامہ خلائق کی اقتصادی حالت سدھرتی ہے اور یہی طبقہ قوم کے لیے بہ منزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے۔ بہ خلاف اس کے اعلیٰ تعلیم صرف ان چند افراد کو نفع پہنچاتی ہے جن کی دماغی قابلیت درجہ اوسط سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔“ اقبال نے صنعتی اور تجارتی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس اخلاقی تربیت پر بھی زور دیا جو اعتماد باہمی،

دیانت داری ، پابندی اوقات اور تعاون سے عبارت ہے اور جس کے بغیر کامیابی ناممکن ہے ۔

ان دو مقالات کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں برعظیم کی مسلم سیاست نرم و نازک حقوق طلبی ، برطانیہ سے وفاداری اور عرض داشتوں سے عبارت تھی اور اگر سیاسی فکر موجود تھا تو بڑے تنگ دائرے میں مقید تھا ۔ اقبال نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ مسلم قومیت کے تصور کو اجاگر کیا ۔ برعظیم کے مسلمانوں کے جملہ مسائل کا تجزیہ کیا اور ان کا مثالی حل پیش کیا اور اس طرح اہل علم طبقے کے خیالات کو مستنور کرنے کی سعی فرمائی اور وہ راستہ تجویز کیا جس پر چل کر مسلمان حقیقی ترقی کر سکیں ۔ اس وقت زمین عملاً بنجر تھی لیکن اقبال نے بیج ڈال دیے ، اس امید میں کہ کبھی تو پھوٹیں گے ، کبھی تو ایک ہری بھری فصل آگے گی !

اس زمانے میں دنیا ئے اسلام کے بعض خطوں میں ایک سیاسی انقلاب کے آثار نظر آ رہے تھے ۔ ایران کے عوام ایک طویل جد و جہد کے بعد بادشاہ سے مشروطہ (آئین) حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور ترکیہ میں انجمن اتحاد و ترقی کے نوجوان قائدین سالہا سال کی جد و جہد کے بعد سلطان عبدالحمید کی آمرانہ خلافت کا تختہ الٹ کر ایک پارلیمانی دستور کی طرح ڈال چکے تھے ۔ ایسے میں اقبال نے ضروری سمجھا کہ اسلام کے اصول ریاست کے خد و خال نمایاں کیے جائیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے ”اسلام میں سیاسی فکر“ کے موضوع پر انگریزی زبان میں ایک مقالہ لکھا جو ”ہندوستان ریویو“ نے دو اقساط میں چھاپا ۴ ۔ یہ بھی اس قابل ہے کہ اس کے نمایاں نقوش پیش کر دیے جائیں ۔ اقبال کے نزدیک دو نکتے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں ۔ اول : مسلم کامن ویلتھ اس اصول پر مبنی ہے کہ

قانون کی نظر میں تمام مسلمان ہر لحاظ سے برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوم : اسلامی قانون کی رو سے مذہب اور ریاست میں کوئی امتیاز موجود نہیں۔ پہلے نکتے کی تشریح کرتے ہوئے اقبال نے لکھا :

”اسلامی قانون نہ نسل کے بظاہر قدرتی اختلافات کو تسلیم کرتا ہے، نہ قومیت کے تاریخی اختلافات کو۔ اسلام کا سیاسی نصب العین ایک ایسی قوم کی تخلیق ہے جو تمام نسلوں اور قومیتوں کے ادغام کا نتیجہ ہو۔ اسلام کے نزدیک قومیت سیاسی نشو و ارتقاء کی بلند ترین حد نہیں ہے کیونکہ اسلامی قانون کے عمومی اصول فطرت انسانی پر قائم ہیں، نہ کہ کسی خاص قوم کی خصوصیات پر۔ ایسی قوم کی اندرونی پیوستگی کا انحصار نہ نسلی اور جغرافیائی اتحاد پر ہے، نہ زبان یا معاشری روایت کی یکسانیت پر۔ اس کا انحصار دینی اور سیاسی نصب العین پر ہے یا اس نفسیاتی حقیقت پر، کہ اس کے افراد میں ایک فکری یگانگت موجود ہے۔ چنانچہ اس قوم کی رکنیت ولادت، شادی، سکونت یا حقوق شہریت کی بنا پر معین نہیں ہوگی۔ اس کا تعین صرف یگانگت فکر کے اعلان سے ہوگا اور جب کوئی فرد اس یگانگت سے منحرف ہوگا تو اس کی رکنیت ختم ہو جائے گی۔ ایسی قوم کا مثالی علاقہ ساری دنیا ہی ہو سکتی ہے۔“

دوسرے نکتے کے بارے میں اقبال نے لکھا کہ ہمارے نزدیک ریاست دینی اور دنیاوی ہیئت حاکمہ کے امتزاج کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسی وحدت ہے جس میں ایسا کوئی امتیاز موجود نہیں۔ ضروری نہیں کہ خلیفہ اسلام کا ملائے اعظم HIGH-PRIEST بھی ہو اور وہ زمین پر خدا کا نمائندہ بھی نہیں ہے۔ اقبال نے لکھا :

”ہر مسلمان آزاد ہے کہ جو چاہے، کرے، بشرطیکہ وہ قانون شکنی نہیں کرتا۔ اس قانون کے عمومی اصول وحی کا نتیجہ ہیں۔ جہاں تک نسبتاً دنیاوی معاملات کا تعلق ہے۔ تفصیل کی تاویل پیشہ ور وکلاء پر چھوڑ دی گئی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلامی قانون کا پورا ڈھانچہ حقیقی عمل درآمد کے روپ میں ایک ایسا قانون ہے جو قاضیوں نے بنایا۔ پس اسلامی آئین میں قانون سازی کا فرض وکلاء انجام دیتے ہیں۔ بہر حال اگر کوئی بالکل نیا معاملہ اٹھے جس کا حل اسلامی قانون میں موجود نہ ہو تو ساری مسلمان قوم کی مرضی قانون کا ایک مزید مآخذ بن جاتی ہے۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اس مقصد کے لیے کبھی ساری مسلم قوم کی کوئی عمومی مجلس مشاورت منعقد ہوئی ہو۔“

گویا اقبال نے اس مرحلے پر اجتہاد کی طرف ایک اشارہ کر دیا جس کی مفصل تشریح سالہا سال بعد خطبات مدراس میں کی۔ اس کے بعد اقبال نے خلیفہ کے انتخاب، اس کے ابنے اور اس کے نائبین کے فرائض پر روشنی ڈالی۔ شیعہ نقطہ نگاہ بھی بیان کیا اور خوارج کے مختلف گروہوں کے نقطہ ہائے نگاہ کا بھی تذکرہ کیا۔ اقبال نے یہ رائے ظاہر کی کہ قرآن مجید میں خلافت کا جو بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے، وہ انتخاب کا اصول ہے لیکن اس کی جزئیات کا تعین دوسرے معاملات پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اقبال نے لکھا :

”بہر حال بدقسمتی سے تصور انتخاب کو خالص جمہوری خطوط پر آگے نہیں بڑھایا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان فاتحین ایشیا کی سیاسی بہتری کے لیے کچھ کرنے میں ناکام رہے۔“

انتخاب کی صورت یقیناً بغداد اور سپین میں قائم رکھی گئی لیکن عام لوگوں کی قوت بیدار کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ جمہوری ادارے نہ ابھر سکے۔ میرے نزدیک اسلامی ممالک میں سیاسی عمل کے اس فقدان کے دو بڑے سبب تھے۔

اول : جن دو بڑی نسلوں نے اسلام قبول کیا، ان میں ایک ایرانی تھے، دوسرے منگول اور انتخاب کا تصور ان دونوں کے مزاج کے منافی تھا۔

دوم : ابتدائی مسلمانوں کی زندگی فتوحات کی زندگی تھی۔ ان کی ساری قوت سیاسی توسیع پر مرکوز تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیاسی اقتدار چند ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور اس طرح ریاست غیر شعوری طور پر آمریت کی کنیز بن جاتی ہے۔“

آخر میں اقبال نے اس زمانے کی دنیا کے سیاسی رجحانات پر جس رائے کا اظہار کیا، وہی اس مقالے کی شان نزول معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :

”آج کے زمانے میں مغربی سیاسی تصورات کے غنیل مسلمان ملکوں نے سیاسی زندگی کے آثار کا مظاہرہ کیا ہے۔ مصر نے ترقی کی ہے۔ ایران نے شاہ سے آئین حاصل کیا ہے اور اچھن اتحاد و ترقی ترکیہ میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد، منصوبہ بندی اور سازش کرتی رہی ہے لیکن ان سیاسی مصائب کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے آئینی اصولوں کا گہرا مطالعہ کریں اور ایک نئی ثقافت کے پیغام پر بن کر اپنی

قوم کی قدرتی طور پر بدظن قدامت پسندی کے لیے صدمے کا باعث نہ ہوں۔ وہ اپنی قوم کو یقیناً اسی صورت میں متاثر کر سکیں گے کہ وہ اس بات کا مظاہرہ کریں کہ ان کا بظاہر مستعار سیامی آزادی کا نصب العین اصل میں اسلام کا نصب العین ہے اور آزاد اسلامی ضمیر کا صحیح مطالبہ ہے۔“

حوالے

۱ - Thoughts and Reflections of Iqbal - صفحات ۲۹-۵۵ -

مشہور ماہر اقبالیات جناب سید عبدالواحد معینی نے ”مقالات اقبال“ کے پیش لفظ میں بیان فرمایا ہے کہ مولانا ظفر علی خان نے اسی مقالے کا ترجمہ ”ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر“ کے عنوان سے کیا۔ یہ بیان صحیح نہیں۔ مولانا نے جس مقالے کا ترجمہ کیا، اس کا اصل انگریزی متن محفوظ نہیں ہے، البتہ اس کے چند انگریزی اقتباسات محفوظ ہیں۔ حوالے کے لیے دیکھیے :

Census of India Report 1911 (Punjab) : Part I : Lahore 1912

خود سید عبدالواحد صاحب نے اسی ذریعے سے اقتباسات لیے کر اپنی کتاب Thoughts and Reflections of Iqbal کے آخر میں درج کیے ہیں۔

۲ - ”مقالات اقبال“ - ص ۵۱ -

۳ - ”مقالات اقبال“ - صفحات ۱۱۵-۱۴۲ -

۴ - Thoughts and Reflections of Iqbal - صفحات ۵۶-۷۵ -

آٹھواں باب

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک : مسلم قومیت شعر کے روپ میں

اقبال دنیائے اسلام کی سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے اور مستقبل شناس تھے - ۱۹۱۱ء میں اپنی نظم ”غرہ شوال“ میں لکھا :

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایران میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھو
چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی فبا
سادگی مسلم کی دیکھو اوروں کی عیاری بھی دیکھو !

ایران میں ماتم کی تیاری کیوں؟ اس لیے کہ پہلے انگریزوں نے تحریک مشروطیت کی پشت پناہی کی ، پھر ۱۹۰۷ء میں روس کے ماتم ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے ایران کو دونوں نے حلقہٴ اثر کے اعتبار سے آس میں بانٹ لیا - نومبر ۱۹۱۱ء میں سینٹ پیٹرز برگ کے مقام پر روس اور جرمنی کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا جس کی رو سے جرمنی نے ایران کو روسی حلقہٴ اثر تسلیم کر لیا - اور ۱۹۱۳ء میں برطانیہ اور روس کی فوجوں نے ایران پر قبضہ جا کر آس کی آزادی کو سلب کر لیا -

دوسرے شعر کا پس منظر یہ ہے کہ جب انجمن علماء و مشرفین کے لئے ہونے انقلاب کی بدوات سلطان عبدالحمید دوم مسند خلافت پر محروم ہوا تو اس صورت حالات سے دشمنوں نے فائدہ اٹھایا - اس وقت پہلے بوسنیا اور ہرزگووینا پر آسٹریا ۵ فوجی قبضہ کر لیا لیکن روسی فوجوں نے اسے

آس کا جزو نہیں بنے تھے - اب آسٹریا نے اعلان کیا کہ یہ دونوں علاقے مستقل طور پر آس کے ہیں - دوسری طرف بلغاریہ نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور اس کے بعد جنگ طرابلس اور جنگ ہائے بلقان نے خلافت عثمانیہ کو پے در پے صدمات کا نشانہ بنایا خلافت کی قبا کو چاک کرنے سے ایک مراد یہ بھی تھی کہ انجمن اتحاد و ترقی نے اسلام کی جگہ دولت عثمانیہ کی بنیاد ”عثمانیت“ کو قرار دیا - وجہ تسمیہ یہ تھی کہ عثمان دولت عثمانیہ کا بانی تھا اور اس کے جواز میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ جب تمام شہری عثمانی قرار دے جائیں گے تو اقلیتوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا - جب عثمانیت کا سلسلہ نہ چلا تو تحریک اتحاد توراتی کا نعرہ بلند کیا تھا جو ایک خالص نسلی نعرہ تھا -

اٹلی نے دوسری یورپی طاقتوں سے عدم مداخلت اور غیر جانب داری کی یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد ۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ترکیہ کو چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دے کر طرابلس اور سیرے نائیکہ پر قبضہ جما لیا جو بعد میں لیبیا کے نام سے مشہور ہوئے - ترکیہ کے پاس ایک مضبوط جنگی بیڑہ نہیں تھا ، اس لیے وہ طرابلس کا دفاع نہ کر سکا - لیکن آس نے مقامی آبادی کو منظم کر کے اطالوی فوج کے خلاف برسر پیکار کر دیا اور کچھ علاقے واپس بھی لے لیے - ۹ نومبر ۱۹۱۱ء کو حضرت اکبر الہ آبادی کے ایک مکتوب کے جواب میں اقبال نے لکھا :

”ترکوں کی فتح کا مزہ جاں فزا پہنچا مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا - معلوم نہیں ، روح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے - میں ایک زبردست تمنا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں گو

اس تمنا کا موضوع مجھے اچھی طرح سے معلوم نہیں ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ”۲

اقبال کی تشویش بے جا نہیں تھی کیونکہ یورپ کی بساط سیاست پر شطرنج کے مختلف سہرے آگے بڑھ رہے تھے اور سب یورپ کے ”سرد بیمار“ کو مات دینے کے درپے تھے۔ جنگ طرابلس کے دنوں میں برعظیم کے مسلمانوں میں ترکیہ کے حق میں عظیم جوش و خروش موجود تھا۔ اقبال نے بھی عوام کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کیا اور ان کی ترجیحات کا حق ادا کیا۔ ۱۹۱۲ء میں جب طرابلس کے عوام نے آگ اور خون کے ایک ہولناک غسل سے گذر کر اطالوی فوجوں کو صرف ساحلی مقامات تک محدود کر دیا تو اقبال نے اپنی نظم ”حضور رسالت مآب،، میں لکھا :

حضور ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو ہو وہ کئی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جہلمکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں ۵ ہے لہو اس میں ۳

اور جب ایک تیرہ سالہ عچی فاطمہ بنت عبداللہ میدان جہاد میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہو گئی تو شاعر مشرق پکار اٹھے :

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
 ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
 اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
 بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابید، ہیں
 فاطمہ ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
 نغمہ، عشرت بھی اپنے نالہ، ماتم میں ہے
 رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
 ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
 ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
 پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں

ابھی یہ جنگ جاری تھی کہ چار بلقانی ریاستوں یونان، سربیا، مائٹی نیگرو
 اور بلغاریہ نے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ترکیہ کو الٹی میٹم دیا کہ وہ اصلاحات
 کا نفاذ کرے اور بلقانی ریاستوں میں ترکیہ کی فوجی لام بندی واپس لے۔
 اور جب ترکیہ نے ایسا نہ کیا تو جنگ چھڑ گئی یہ جنگ ترکوں کے
 لیے نہایت برباد کن ثابت ہوئی جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ترک فوج سیاسی
 اختلافات کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ اس دور میں برعظیم کے مسلمانوں میں
 بھی اپنے ترک بھائیوں کے لیے بے چینی نقطہ، عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔
 مولانا ظفر علی خان کا ”زمیندار“، مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفت روزہ
 ”الہلال“، محمد علی کا انگریزی ہفت روزہ ”کامریڈ“، اور روزنامہ ”ہمدرد“،
 اور دوسرے بے شمار مسلمان اخبارات اس بے چینی کے عکاس تھے۔ مسلمان
 رہنماؤں نے ترکوں کے لیے چندہ جمع کر کے بھیجا اور ڈاکٹر انصاری کی
 قیادت میں ایک طبی وفد بھی ترکیہ گیا۔ شاعر مشرق بھی قدرتی طور پر

اس صورت حال سے متاثر تھے اور وہ اپنے خیال افروز کلام سے مسلمانوں کے دلوں کو گرماتے اور تڑپاتے رہے۔ جب ترک فوج ادرنہ میں محصور ہو گئی تو محاصرے کے دوران میں جنگ کے اخلاقی پہلو سے تعلق رکھنے والے ایک واقعہ کو اقبال نے یوں اشعار کے قالب میں ڈھالا :

یورپ میں جس گھڑی حق و باطل کی چھڑ گئی
 حق خنجر آزمائی پہ مجبور ہو گیا
 گرد صلیب گرد قمر حلقہ زن ہوئی
 شکری حصار درنہ میں محصور ہو گیا
 مسلم سپاہیوں کے ذخیرے ہوئے تمام
 روئے امید آنکھ سے مستور ہو گیا
 آخر امیر عسکر ترکی کے حکم سے
 ”آذین جنگ“ شہر کا دستور ہو گیا
 ہر شے ہوئی ذخیرہ لشکر میں منتقل
 شایین گدائے دانہ، عصغور ہو گیا
 لیکن فقیہہ شہر نے جس دم سنی یہ بات
 گرما کے مثل صاعقہ طور ہو گیا
 ”ذمی کا مال لشکر مسلم نہ ہے حرام“
 فتوے تمام شہر میں مشہور ہو گیا
 چھوٹی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج
 مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا

اور جب بلغاریہ کی فوج قسطنطنیہ (استنبول) کی آخری دفاعی لائن پر پہنچ گئی تو اقبال نے قسطنطنیہ سے مسلمانوں کی جذباتی وابستگی کا یوں اظہار کیا :

خطہ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
 مہدی امت کی سطوت کا نشان پائدار
 صورت خاک حرم یہ سرزمین بھی پاک ہے
 آستان مسند آرائے شہ لولاک ہے
 نگہت گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
 تربت ایوب انصاری رض سے آتی ہے صدا

اے مسلمان ملت اسلام کا دل ہے یہ شہر
 سینکڑوں صدیوں کی کشت و خون کا حاصل ہے یہ شہر

قسطنطنیہ بیچ گیا لیکن ادرنہ چھن گیا۔ اور ادرنہ ہی نہیں بہت سے یورپی علاقوں سے ترکیہ محروم ہو گیا کیونکہ شکست کی وجہ سے اسے ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو معاہدہ لندن پر دستخط ثابت کرنے پڑے۔ بہر حال حالات نے ایک بہتر کروٹ لی۔ علاقوں کی تقسیم پر ایک مہینے بعد ہی بلقانی ریاستوں میں پھوٹ نے ایک اور جنگ کا روپ لیا۔ ترکیہ نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ادرنہ پر پھر قبضہ کر لیا اور بلغاریہ نے قسطنطنیہ میں ایک معاہدے پر دستخط ثابت کر کے اس قبضے کی تصدیق کر دی۔ بہر حال ابھی ترکیہ کی بد نصیبی کے دن ختم نہیں ہوئے تھے کیونکہ اسے ۱۹۱۳ء کی پہلی عالمی جنگ میں کودنا پڑا۔

برعظیم کے مسلمان رہنما عافیت کوشی کی روش پر چل رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز ان سے انصاف کرے گا اور وہ اس کے سائبہ

عاطفت میں چین کی بنسری بجائیں گے۔ لیکن تقسیم بنگال کی تفسیح اور سانحہ کانپور نے ان کے ذہن کو صدموں سے آشنا کیا اور ان پر یہ حقیقت منکشف کی کہ انگریز پر انحصار بے سود ہے۔ اور اگر مستقبل سنوارنا ہے تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ بین الاقوامی حالات سے بھی وہ نہایت مشوش تھے اور محسوس کرتے تھے کہ مسلمان برعظیم کے اندر اور باہر دونوں جگہ پٹ رہے ہیں۔ اس کا حل کیا ہو؟ اس سلسلے میں مسلمان رہنماؤں کی غالب اکثریت میں یہ رائے نشو و نما پانے لگی کہ انگریز سے لڑنے اور اپنا مقام حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ کوئی سیاسی مفاہمت ہو جائے تاکہ ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کی پالیسی نہ چل سکے۔ دوسرے لفظوں میں متحدہ قومیت کے حق میں رجحان ابھرا۔ اقبال عملی سیاست میں تو حصہ نہیں لیتے تھے لیکن سیاسی سطح پر موج کا مشاہدہ تو کرتے تھے۔ وہ اسلام کے تصور بین الاقوامیت یا دوسرے لفظوں میں مسلم قومیت کے قائل تھے۔ اور ان کی رائے یہ تھی کہ بین الاقوامی سطح پر مسلمان پسپائی پر مجبور ہو گئے تو محض اس لئے کہ مسلم قومیت پر ان کا ایمان متزلزل ہو گیا اور وہ نجات کے لیے وطنیت کے مغربی تصور کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ یا انہوں نے ”عشائیت“ یا اتحاد توراتی کے نسلی تصورات کو اپنا لیا۔ اور انہیں یہ بھی سمجھ نہیں ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی انفرادیت اور ملی تشخص کو گھوڑے اور متحدہ قومیت کے تصور کو اختیار کر لیں۔ اس لیے اس دور میں انہوں نے اپنی شاعری میں دو ہی چیزوں پر زور دیا۔ اول : وطنیت کے مغربی تصور کی مخالفت۔ دوم : مسلم قومیت کے تصور کی پیش رفت۔ مغربی تصور وطنیت کی مخالفت پہلے بھی درج کی تھی لیکن اب اس مخالفت میں زیادہ گہن گرج پیدا ہو گئی۔ انہوں نے کہا :

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
 ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
 مسلم نے بھی نعمیر کیا اپنا حرم اور
 تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
 ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
 جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
 یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
 غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے
 بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
 اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
 نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
 اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے
 اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
 تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
 خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
 کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
 اقوام میں مخلوق خدا بٹی ہے اس سے
 قومیت اسلام کی جڑ کٹی ہے اس سے

جس قومیت اسلام کی تشریح اقبال نے اپنی نثری تحریروں میں بڑی شرح
 وبسط سے کی اس کا شعری روپ ”ترانہ ملی“ ہے جو اس دور میں لکھا گیا
 اور جسے ہر مسلمان نے حرز جاں بنا لیا۔ یہی نہیں، اس دور میں اقبال نے

جتنی نظمیں لکھیں ان سب کا موضوع یہی ہے۔ ”شکوہ“ اور ”جواب شکوہ“ اور ”شمع و شاعر“، اور دوسری بے شمار نظموں میں انہوں نے مسلمانوں کی توجہ عظمت رفتہ کی طرف دلانی۔ انہیں اپنی قدروں اور معتقدات سے پیار سکھایا۔ انہیں مسلموں عمل کی تلتین فرمائی۔ سالک ان نظموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”یہ نظمیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ شاعر کے دل و دماغ میں اپنے مقدس نصب العین کو مقبول عام بنانے کا جوش بدرجہہ اتم پیدا ہو چکا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ نظمیں ہیں جن سے علامہ اقبال اسلامی بند کی آنکھ کا تارا بن گئے اور تمام مسلمان بلا امتیاز مسلک و عقیدہ ان کے فدائی ہو گئے۔ اس زمانے میں مائیکروفون نہ تھا لیکن اس کے باوجود پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار کے مجموعوں میں علامہ اقبال اپنی نظمیں اپنے آہنگ بلند و شیریں میں سناتے تھے۔ جو سن سکتے تھے وہ بے خود ہو جاتے تھے اور جو نہیں سن سکتے تھے وہ بھی مسحور ہو کر بے حس و حرکت اپنے محبوب شاعر کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے تھے۔“

حوالے

- ۱ - ”بانگ درا“، صفحات ۲۰۱-۲۰۰۔
- ۲ - ”اقبال نامہ“، جلد دوم صفحات ۳۸-۳۷۔
- ۳ - ”بانگ درا“، صفحات ۲۱۹-۲۱۸۔
- ۴ - ایضاً، صفحات ۳۰-۲۳۹۔
- ۵ - ایضاً، ص ۲۳۲۔
- ۶ - ایضاً، صفحات ۵۷-۱۵۶۔
- ۷ - ایضاً، صفحات ۳۳-۱۔
- ۸ - ”ذکر اقبال“، ص ۹۳۔

•

نواں باب

عزالت نشینی اور "اسرار خودی"

۱۹۱۴ء کے اواخر میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی اس نے مسلمانوں کو ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ برطانوی راج کی وجہ سے وہ مجبور تھے کہ جنگی ساعی میں تعاون کریں۔ لیکن دینی نقطہ نگاہ اس کے راستے میں حائل تھا کہ خلافت عثمانیہ جرمنی کی ساتھی تھی اور انگریزوں کی دشمن۔ اس لیے جنگی ساعی میں تعاون کا مطلب یہ تھا کہ خلافت عثمانیہ کو ضعف پہنچانے میں مدد دی جا رہی ہے۔ مولانا محمد علی نے جنگ میں شرکت کے کردار کا جواز پیش کیا تو ان کا ہفت روزہ "کامریڈ، زیر عتاب آ گیا۔ اور صورت یہ ہوئی کہ "بند مہینے کے اندر کیا" "کامریڈ، اور "المرال" اور کیا "زمیندار، اور کئی دوسرے اسلامی اخبار سبھی کو بند ہونا پڑا۔ حکومت برطانیہ نے مولانا محمود الحسن شیخ الہند، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیز گل کو گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ برعظیم کے اندر محمد علی اور شریعت علی اور ان کے بعد ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان اور حسرت موہانی پابند اور مقید لیے گئے۔ جو مسلمان ہیں آزاد رہے، ان میں بیشتر مسلمان لیک میں شامل تھے اور لچھ اسے بھی تھے جو بیک وقت مسلمان ایک اور لانگرس کے رہنے سے۔ انہوں نے سوچا کہ انگریز سے تو ایسی فلاح کی امید نہیں اس لیے جہاز بھی ہے کہ لانگرس کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ بنایا جائے۔ تا کہ جنگ کے بعد ایسی اصلاحات کے اجراء کے سلسلے میں انگریز یہ حذر نہ کر سکیں کہ ہندوؤں

اور مسلمانوں میں اختلاف ہے۔ ان رہنماؤں میں محمد علی جناح (قائد اعظم) سرفہرست تھے۔ اور انہی کی سعی سے پہلے بمبئی میں اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس بیک وقت ہوئے۔ اور ان دو بڑی سیاسی جماعتوں کے درمیان پہلی اور آخری مرتبہ اس مسئلے پر اتفاق رائے ہو گیا کہ مستقبل کے ہندوستان کا آئینی ڈھانچہ کیسا ہو۔ اور اس میں مسلمانوں کو کیسا مقام حاصل ہو۔ جس دستاویز پر طرفین کے رہنماؤں کے دستخط ثبت ہوئے اسے میثاق لکھنؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس میں اطمینان بخش پہلو یہ تھے کہ کانگریس نے ان کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول مان لیا۔ یہ طے پا گیا کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں حاصل ہوں گی۔ اور یہ فیصلہ ہو گیا کہ اگر کسی مسودہ قانون یا تجویز کو مجلس قانون ساز میں کسی قوم کے تین چوتھائی ارکان کی مخالفت پیش آئے تو وہ منظور نہیں ہو سکے گا۔ خواہ مجموعی طور پر اسے ایوان کی اکثریت کی تائید حاصل ہو۔ یہ بھی طے پا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں انہیں پاسنگ (ویٹنج) یعنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نیابت دی جائے گی۔ لیکن اس اصول کو جب غیر مسلم اقلیتوں پر لاگو کیا گیا تو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت برابری یا اقلیت میں بدل گئی۔ اس طرح ہندوستان میں کوئی ایسا صوبہ باقی نہ رہا جسے مسلم اکثریتی صوبہ کہا جا سکتا۔

میثاق لکھنؤ کو مقبول بنانے کے لیے مسز اینی بیسنٹ کی صدارت میں ہوم رول لیگ کے نام سے ایک عوامی جماعت قائم کی گئی۔ اور مختلف صوبوں میں ماتحت مجالس بنائی گئیں اور جا بہ جا جلسے ہونے لگے جن میں میثاق لکھنؤ پر صاد کیا گیا۔ تا کہ جونہی جنگ ختم ہو حاکموں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو کہ میثاق لکھنؤ کو عمل میں لا کر حکومت خود

اختیاری کے اصول کو رواج دے دیں۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں حالات نسبتاً سازگار تھے۔ لیکن پنجاب میں رسوائے زمانہ مائیکل اوڈوائٹر کا راج تھا۔ اور پنجاب کو انگریزوں نے ”ہندوستان کے بازوئے شمشیر زن“ کا نام دے رکھا تھا۔ کیونکہ فوج، بھرتی زیادہ تر اسی صوبے سے ہوتی تھی۔ مائیکل اوڈوائٹر ایک تو طبعاً فرعون صفت تھا۔ دوسرے، وہ چاہتا تھا کہ بھرتی کے اعتبار سے اس ”زرخیز علاقے“ میں آزادی اور خود مختاری کے خیالات پیدا نہ ہوں۔ اس لیے اس نے حکومت خود اختیاری کی تحریک کے راستے میں بہت سی دیواریں حائل کر رکھی تھیں۔ اور مختلف قسم کے مرئی اور غیر مرئی دباؤ سے سخت گھٹن کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ بھرتی کے بارے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جنگ کے پہلے دو سالوں میں پورے برعظیم میں جتنے رنگروٹ بھرتی کیے گئے ان میں نصف کے لگ بھگ پنجابی تھے اور آخری دو سالوں میں نصف سے زچہ کم۔ رسمی طور پر تو جبری بھرتی نافذ نہیں تھی لیکن پنجاب میں عملاً جبری بھرتی کی صورت تھی۔ اور اس کے نتیجے میں عوام اور عمال حکومت کے درمیان تصادم بھی ہوتے رہے۔ اور انہوں نے گھٹن کو گھنہیں بنا رکھا تھا۔

ان حالات میں حضرت علامہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ انہوں نے کسی کردار ادا کرتے۔ کیونکہ ایک تو طبعاً عملی سیاست سے گریزاں تھے۔ دوسرے، گھٹن بھی کسی سیاسی کردار کے راستے میں رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے میثاق لکینؤ کے سلسلے میں اقبال کی رائے میں بیان کی ہے کہ ”علامہ اقبال اس میثاق کے مخالف تھے کیونکہ اس کے ماتحت مسلم ادرت والے صوبوں میں مسلمانوں کو مؤثر اقتدار نہ ملتا تھا۔ اور مسلم اقلیت والے صوبوں میں پاسنگ کی وجہ سے ان کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا تھا۔ اس

کے علاوہ علامہ کا خیال یہ تھا کہ ایسا میثاق اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کی داغ بیل ڈالنا منظور ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کی تعمیر ناممکن ہے۔ نہ اس کے لیے کوشش کرنا مفید ہے۔ ۱، اس زمانے میں پنجاب کے مسلمان سیاسی رہنماؤں کی رائے یہی تھی۔ لیکن سالک نے یہ نہیں بتایا کہ علامہ نے اس رائے کا اظہار کب اور کہاں کیا۔ کیونکہ وہ تو سیاست سے کاملاً کنارہ کش تھے۔ بہر حال یہ ممکن ہے کہ اقبال نجی محفلوں میں اس رائے کا اظہار کرتے ہوں۔ اور چونکہ سالک کو آن سے شرف نیازمندی حاصل تھا اس لیے آن کے ساتھ بھی اس کا تذکرہ ہوا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سالک نے خطبہ "الہ آباد میں میثاق لکھنؤ پر اقبال کی نکتہ چینی کی بناء پر ایسا لکھا ہو۔

گھٹن کا آغاز تو جنگ کے ابتدائی دنوں ہی میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب مولانا شوکت علی نے علامہ کو علی گڑھ کالج کے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں مدعو کیا تو انہوں نے جواب دیا: "بھائی شوکت! اقبال عزت نشین ہے اور اس طوفان بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتی 'نوح سمجھتا ہے۔ دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر اس وجہ سے کہ روٹی کھانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلائے ہو۔ میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔" ۲، سیاست بلکہ عام اجتماعی سرگرمیوں سے علامہ کے گریز پر آن کے دوست مرزا جلال الدین کی یہ تحریر ہماری رہنمائی کرتی ہے:

"آن کی طبیعت کو فطری طور پر سیاست سے مناسبت نہیں تھی۔

نہ انہوں نے زندگی بھر کبھی قائد بننے کی کوشش کی۔ آن کا

خیال تھا کہ سیاسیات ہندی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مایوس کن ہے۔ غیر ملکی حکومت کے ارباب قضا و قدر سے جو سات سمندر پار بیٹھ کر اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، کسی قسم کے سیاسی ہنگامے سے متاثر ہونے کی کم امید ہے۔ اور جب تک ہندوستان کی حکومت کا سرچشمہ انگریز ہے، مسلمان اپنے مفاد کے لیے اس سے کچھ نہیں پا سکتا۔ اور اس کی تمام جدوجہد اپنے مفید جوہر کو رائیگاں کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ وہ ایسی سیاسی قیادت کو سوائے شور و شغب کے اور کچھ نہ سمجھتے۔ بلکہ وہ اس سلسلے میں اس قدر مایوس تھے کہ انجمن حمایت اسلام جیسے ادارے اور اسلامیہ کالج جیسے دارالعلوم کی مجلس انتظامیہ کے صدر ہونے کے باوجود ان کی کاروائیوں سے بڑی بے رخی ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حکومت سے امداد لینے کی وجہ سے دونوں کا دائرہ عمل محدود ہو چکا ہے۔ اور ان اداروں کی ترقی کے لیے کسی نئے لائحہ عمل کا تجویز کرنا ناممکن ہے۔ اقبال کا تذکرہ و تدبیر محض اس اسلامی سیاست تک محدود نہیں جس کا ذکر کلام پاک میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس سیاست کو انہوں نے اپنا موضوع سخن بنایا اور اسی نکتہ پر ان کے خیالات ابداء سے آخر تک مرکوز رہے۔ اور یہ نکتہ وحدت ملی تھا۔ اس کے سوا وہ کسی اور سیاست کو درخور اعتنا تصور نہ کرتے تھے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ان کو سیاست ہندی سے جس قدر لگاؤ ہو سکتا تھا۔۔۔ ۳

وقتی سیاست میں اجتناب مفید رہا۔ کیونکہ اقبال کی جملہ ساعی لمحے عرصے کی سوچ اور مسلمانان عالم میں ایک نئے شعور کی تخلیق پر مرکوز رہی۔

اور اسی سوچ کے بطن سے ”اسرار خودی“ نے جنم لیا۔ اور وہ فلسفہ خودی ابھرا جس کے شعور پر قوسوں بلکہ پوری نوع انسانی کی ترقی کا دارومدار ہے۔ ”من“ کی تخلیق پر انسان میں ہوتی ہے لیکن جن میں یہ احساس تیز ہوتا ہے ان میں خودی کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور ان کی زندگی سراپا جدوجہد ہو جاتی ہے۔ پہلا مرحلہ ”شعور خویشتن“ ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچان لے۔ دوسرا مرحلہ ”شعور دیگرے“ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں میں اپنی حیثیت معین کرے۔ تیسرا مرحلہ ”شعور ذات حق“ کا ہے۔ تاکہ اس خدا کے وجود کا احساس ہو۔ اس احساس کے تین اجزاء ہیں۔ نور، حیا اور عشق۔ ایک سنور قلب ظواہر کو نہیں، بلکہ حقیقت کو براہ راست دیکھ کر اس پر یقین کر لیتا ہے۔ حیا غلطی کا احساس دلاتی ہے، جس سے اصلاح ممکن ہو جاتی ہے۔ اور عشق عمل کا دوسرا نام ہے۔ اس میں ایمان بھی شامل ہے اور جہاد بھی۔ خودی کے تین مدارج ہیں۔ اطاعت، ضبط نفس اور نیابت اللہی۔ جب انسان کسی نظام کی مکمل اطاعت قبول کر لیتا ہے، اس کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار رہتا ہے تو پھر وہ مکمل ہے۔ نیابت اللہی کا حق دار ہے۔ اسی کتاب میں اقبال نے تصوف کے اس تصور کی مخالفت فرمائی جو ربانیت کا درس دیتا ہے۔ اور اس ادب کو غلط قرار دیا جو انسانوں کو حقیقت سے دور کرتا ہے اور اس طرح عمل کی قوتوں کو سلب کر دیتا ہے۔

۱۹۱۳ء سے اقبال اسرار خودی کی تحریر میں مصروف تھے۔ دو سال بعد یہ کتاب مکمل ہوئی تو شفاء الملک حکم فقیر مجدد چشتی کی مدد چاہی کہ علامہ کو کتابت و طباعت کے خلیجان سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے مشہور کتب منشی فضل اللہی مرغوب رقم سے کتابت کرائی اور ۱۹۱۵ء کے وسط میں چھپوا لی۔ جونہی کتاب منظر عام پر آئی، بہت

سوں نے اسے پسند کیا۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کسی نے تصوف کی مخالفت کا الزام لگایا۔ کسی نے حافظ شیرازی کی مخالفت پر نکتہ چینی کی۔ اقبال نے ان کے جواب میں مضامین لکھے۔ اور جب دوسرے ایڈیشن کی طباعت کا وقت آیا تو دیباچہ بھی حذف کر دیا اور حافظ کے خلاف اشعار بھی۔ اقبال کو مثنوی اسرار خودی لکھنے کی انگیخت کیسے ہوئی اور انہوں نے مخالفین کو کیسے جواب دے۔ اس سلسلے میں ان کے چند مکاتیب سے لچھ اقتباسات دینے ضروری ہیں۔ سرکشن پرشاد شاد کے نام لکھتے ہیں :

”یہ مثنوی جس کا نام ’اسرار خودی‘ ہے ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر وستی وے خودی کی طرف ہے۔ مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی، جس کے قبضے میں سبھی جان و مال و آبرو ہے میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا ضمنی لکھنے کے لیے کیوں انتخاب دیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ حتم نہ ہوئے تو میری روح کو چین نہیں آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا بھی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد ہی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی۔ لیکن ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں۔ اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ وہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے اشار (خواہ وہ اشار دعویٰ ہو خواہ فرد کی مدد میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بالخصوص

شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی
تصور کرتا ہے مگر :

من صدائے شاعر فردا ستم

ناامید ستم ز یاران قدیم

طور من سوزد کہ می آید کیم

اور

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا، نہ اقبال - یہ بیج، جو مردہ زمین میں اقبال
نے بویا ہے آگے گا - ضرور آگے گا اور علی الزعم مخالفت بار آور ہوگا - مجھ سے
اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے - الحمد للہ - ۵

اکبر الہ آبادی کو ایک مکتوب میں بتایا کہ اسرار خودی میں حافظ
پر جو کچھ لکھا گیا وہ محض اس ادبی نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں
میں کئی صدیوں سے چلا آتا ہے - نہ عولایت پر تنقید متصوف تھی نہ ان
کی شخصیت پر - ”چونکہ حافظ ولی اور عارف تصور کیے گئے ہیں، اس واسطے
ان کی شاعرانہ حیثیت عوام نے بالکل ہی نظر انداز کر دی ہے - اور میرے
ریمارک تصوف اور ولایت پر حملہ کرنے کے مرادف سمجھے گئے -“ حضرت
علامہ نے اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ عجمی تصوف سے ادب میں دلفریبی
اور حسن تو پیدا ہے لیکن ایسا، کہ طبائع کو پست کرتا ہے - اسلامی
تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر ادب پر ہوتا ہے -
اصل میں دنیا نے اسلام میں مسلمانوں کا ادب قابل اصلاح ہے - قنوطی ادب
کبھی زندہ نہیں رہ سکا - قوم کی زندگی کا تقاضا ہے کہ وہ خود بھی رجائی
ہو اور اس کا ادب بھی رجائیت کا مظہر ہو - ۶

یہی بات زیادہ تفصیل اور زیادہ عمق کے ساتھ مولوی سراج الدین پال کے
نام مکتوب میں لکھی - ملاحظہ فرمائیے :

”حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت SUBTLE طریق تفسیح کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار با ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا بہ الغافل دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بہ ظاہر دل فریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تفسیح کی ہے۔ اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً

غازی ز پے شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ تمہید عشق فاضل تر از پوست
دو روز قیامت این بہ او کے مانند
این شتم دشمن است و آن کشته دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابل تعریف۔ مگر انصاف سے دیکھئے تو جہاد اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دل فریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کہاں یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے۔ بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اب حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔“

اس دوران میں اقبال مکاتیب میں اپنے احباب کو بتاتے رہے کہ اسرار خودی کا دوسرا حصہ زیر ترتیب ہے۔ اور اس کے مضامین کی طرف بھی اشارات کرتے رہے۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں یہ دوسرا حصہ ”رموز بے خودی“ کے نام سے منظر عام پر آ گیا۔ اس میں اسرار حیات ملیہ اسلامیہ بیان کیے گئے۔ اور بتایا گیا کہ فرد کی خودی کس طرح ملت کی خودی میں گم ہو کر اجتماعی قوت کا باعث ہو جاتی ہے۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ اقبال پہلی عالمی جنگ کے دوران میں ”منقار زیر پر“ رہے۔ حقیقت میں انہوں نے آنے والے دور کے لیے ملت کی ذہنی قیادت کا سامان سرچہ وافر فراہم کیا۔ اور جو پیغام ان کے کلام میں آخری دم تک سرایت رہا اس کے لیے محکم زمین تیار کر دی۔ لاریب، یہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔

ادب کے بارے میں اقبال کا نظریہ ان کے اردو اور فارسی کلام سے بالکل ظاہر تھا۔ لیکن ادب برائے ادب اور ادب برائے مقصد کے مسئلے پر انہوں نے ایک مقالے میں خصوصی بحث کی۔ یہ مقالہ مولانا ظفر علی خان کے اخبار ”ستارہ صبح“ کے ۸ اگست ۱۹۱۷ء کے شمارے میں ”رسول اللہ صبح فن شعر کے مبصر کی حیثیت میں“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ حضور سرور کائنات نے زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر امراء القیس کے بارے میں کہا

تھا کہ وہ مشاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔ اقبال نے اس رائے کے جواز میں لکھا :

”امراء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شراب ارغوانی کے دور، عشق و حسن کی ہوش ربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ریتلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اور یہی عرب کے دور جاہلیت کی کل تخلیقی کاٹنات ہے۔ امراء القیس قوت ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے۔ اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنون لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن، یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے، لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافین کا تماشا دکھا دے۔“

اس کے بعد بتایا گیا کہ جب حضور سرور کاٹنات نے ایک بت پرست عرب شاعر عنترہ کا یہ شعر سنا۔ کہ میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ میں اکل حلال کے قابل ہو سکوں۔ تو انہوں نے شاعر سے ملنے کی آرزو کا اظہار کیا۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے اقبال نے لکھا :

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عورت عنترہ کو بخشی، اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی

جیتی جاگتی ، بولتی چالتی تصویر ہے ۔ حلال کی کہانی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں ، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں، ان کا نقش پردہ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے ۔ حضور خواجہ دوجہاں صائم (بابی انت و اسی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی ۔ اس سے صفت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صفت حیات انسانی کے تابع ہے ۔ اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔ “ ۸

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اقبال آزاد منش انسان ہونے کی وجہ سے ملازمت کے قائل نہیں تھے۔ لیکن ان کی ذمہ داریاں زیادہ تھیں اور آمدنی محدود ، اس لیے اگر کسی اچھی ملازمت کا امکان پیدا ہوتا تھا تو وہ اس میں حائل بھی نہیں ہوتے تھے ۔ بالخصوص ججی کے عہدے کے لیے ، کہ اس میں اپنی آزادی بھی برقرار رکھی جا سکتی ہے ۔ ۱۹۱۷ء کے اوائل کا ذکر ہے ، حیدرآباد دکن ہائی کورٹ کے جج سید ہاشم بلگرامی انتقال کر گئے ۔ پنجاب کے ایک اخبار ”میونسپل گزٹ“ نے تجویز پیش کی کہ اس عہدے پر حضرت علامہ کو فائز کیا جائے ۔ اخبار کے مدیر منشی دین محمد نے مہاراجہ کشن پرشاد شاد کو ایک نجی خط میں لکھا کہ وہ اس معاملے میں سعی کریں ۔ شاد نے جواب دیا کہ مجھے خود اقبال سے گہری عقیدت ہے ۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گا اور چند روز تک اس کا نتیجہ برآمد ہوگا ۔ منشی دین محمد نے یہ خط حضرت علامہ کو دکھایا اور انہوں نے شاد کو شکرے کا خط لکھ دیا ۔ اور اس کے بعد علامہ نے اپنے تعلیمی اوصاف اور تصانیف وغیرہ کے بارے میں ایک نوٹ بھی بھیج دیا ۔ ان دنوں اقبال کے دوست اور مشہور فارسی شاعر مولانا گرامی حیدرآباد دکن میں تھے اور ان سے مراسلت میں اس تجویز کا اکثر ذکر آتا رہا ۔

ایک خط میں علامہ نے لکھا کہ حیدرآباد کے مقامی لوگوں کو دوڑ دھوپ کے مواقع حاصل ہیں اور وہ مقامی اثرات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایک دور افتادہ آدمی اس اعتبار سے حصول مقصد کی کوئی بڑی امید نہیں کر سکتا۔ بہر حال جو خدا کو منظور ہوگا ہو رہے گا۔ اس کے بعد کافی دیر سکوت رہا۔ اقبال کے نام شاد کے مکتوبات میں بھی کوئی ذکر نہ ہوا۔ چند مہینے بعد قانون کی پروفیسری کی پیشکش ہوئی۔ اس کے ساتھ یراڈیویٹ پریکٹس کی اجازت بھی شامل تھی اور پوچھا گیا کہ آپ کتنی تنخواہ قبول کریں گے۔ سرکشن پر شاد شاد نے اس پیشکش کو قبول کرنے کا مشورہ دیا لیکن اقبال ججی کو ترجیح دیتے تھے۔ اب ہوا یہ کہ ججی کا معاملہ تو مشکوک تھا لیکن یہ افواہ بر جگہ پھیل گئی کہ علامہ حیدرآباد دکن جا رہے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور میں علامہ کی پریکٹس کو ضعف پہنچا۔ کیونکہ مقدمے لانے والے لوگ اس بنا پر ڈریز کرتے تھے کہ علامہ چلے گئے تو ان کے مقدمات بیچ میں رہ جائیں گے۔ جب علامہ کو معلوم ہوا کہ مولانا گرامی بھی اس خبر کی نشہیں کر رہے ہیں تو ان کو منع کیا اور لکھا: ”ایک دفعہ پہلے بھی اس قسم کی خبر مشہور ہوئی تھی اور اس کے بذریعہ اخبار مشہور کرنے والے مولوی نثار علی خان تھے۔ مجھے اس خبر کی تشہیر سے بہت نقصان ہوا۔ اور تعجب ہے کہ وہ میرے دوست تھے اور اپنے خیال میں انہوں نے میرے فائدے کے لیے اس امر کی تشہیر کی تھی۔ مہربانی کر کے اس امر کا خیال رکھیں۔ نثار علی خان واقع میں ہو جائے تو اس کی تشہیر میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تاہم جب سچہ اصلیت نہ ہو تو اس کی تشہیر سے نہ مجھے کوئی فائدہ ہے نہ حیدرآباد کے۔“

جماعت احمدیہ قادیان کے ترجمان ”الفضل“ میں ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو سید انعام اللہ شاہ سیالکوٹی کی ایک تحریر چھپی، جس میں لاہوری احمدیوں

اور قادیانی احمدیوں کے درمیان اختلافات پر علامہ سے یہ رائے منسوب کی گئی کہ قادیانی جماعت حق پر ہے۔ علامہ نے ”پیغام صلح“ کے نام ایک مکتوب میں اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا: ”یہ بات بدیہی ہے کہ ایک غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ صلعم کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں۔“ ۱۰

حضرت علامہ ابتداء سے خانہ نشین تھے۔ لاہور سے باہر نکلنا تو انہیں ہرگز مرغوب نہیں تھا۔ کوئی بہت بڑی مجبوری ہوتی تو چلے جاتے۔ ۱۹۱۶ء میں اس روایت سے انحراف ہوا۔ ہائی کورٹ میں موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو ان کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ لاہور کے شور و شغب سے نکل کر کوئی مقام تنہائی ڈھونڈیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ”میں چاہتا تھا کہ کسی جگہ جہاں لوگ میرے جاننے والے نہ ہوں چلا جاؤں اور تھوڑے دنوں کے لیے آرام کروں۔ پہاڑ جانے کے لیے سامان موجود تھا مگر صرف اسی قدر، کہ تنہا جا سکوں۔ تنہا جا کر ایک پر فضا مقام میں آرام کرنا اور اہل و عیال کو گرمی میں جھوڑ جانا بعید از سروت معلوم ہوا۔ اس واسطے ایک گاؤں چلا گیا جہاں ویسی ہی گرمی تھی جیسی لاہور میں، مگر آدمیوں کی آمد و رفت نہ تھی۔ اسی تنہائی میں مثنوی اسرار خودی کے حصہ دوم کا کچھ حصہ لکھا گیا اور ایک نظم کے خیالات یا پلاٹ ذہن میں آئے۔ جس کا نام ہوگا، اقلیم خاموشاں۔ یہ نظم آردو میں ہوگی اور اس کا مقصد یہ دکھانا ہوگا کہ کہ مردہ قومیں دنیا میں کیا کرتی ہیں۔ ان کے عام جذبات و خیالات و حالات کیا ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بس یہ دو باتیں میری تنہائی کی کائنات ہیں“ ۱۱۔ تنہائی کا یہ عرصہ ایک مہینہ تھا۔

علامہ کی خواہش تھی کہ سید سلیمان ندوی لاہور آجائیں۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے ارکان سے گفتگو کی۔ معلوم ہوا کہ اورینٹل کالج میں صدر مدرس فارسی کی اسامی خالی ہے، جس کی تنخواہ ایک سو بیس روپے ماہوار ہے۔ اگر سید سلیمان ندوی چاہیں تو یہ اسامی انہیں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس پر علامہ نے یکم نومبر ۱۹۱۶ء کو سید موصوف کے نام خط لکھ دیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ ملازمت قبول نہیں ہے اور وہ دارالمصنفین میں کام کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس پر علامہ نے سید سلیمان ندوی کے نام یہ خط لکھا: ”مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کوئی قبول نہ کریں گے لیکن سنڈیکیٹ کے بعض ممبروں کی تعمیل ارشاد میں آپ کو لکھنا ضرور تھا۔ کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط میں تھا۔ اور وہ یہ، کہ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح پنجاب والوں کو صوبہ متحدہ کے علماء و صفحاء سے اس سے پیشتر فائدہ پہنچا ہے۔ اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہاں رہنے سے بدستور جاری رہے۔ مولانا شبلی مرحوم کی زندگی میں میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مولانا مرحوم پنجاب میں مستقل طور پر اقامت گزریں ہو جائیں۔ مگر مسلمان امراء میں مذاق علمی مفقود ہو چکا ہے۔ میری کوشش بار آور نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ دارالمصنفین کے کام میں برکت دے اور آپ کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کرے۔“

علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھنا چاہتے تھے؟ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے سید صاحب کے نام ایک خط میں لکھا کہ ”مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ امتاذاکل ہیں۔۔۔ اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ”رسوز کے خودی“ کو بہت پسند کیا اور اس سلسلے میں اقبال کو خط لکھا تھا۔ ۱۳

۱۹۱۸ء میں اقبال کو ایک مرتبہ پھر عارضی طور پر مدرس نام سنہالنا پڑا۔ ہوا یہ کہ اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ ڈاکٹر ہیگ

چیچک کی بیماری سے اچانک انتقال کر گئے۔ انجمن حمایت اسلام نے اصرار کیا تو علامہ نے دو مہینے کے لیے ایم اے کی جماعت کو پڑھانا قبول کر لیا۔ لیکن اس شرط پر کہ علامہ کالج نہیں جائیں گے بلکہ طلباء ان کے مکان پر آیا کریں گے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اقبال اکبر الہ آبادی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ”یہ لڑکے شام کو ہر روز میرے مکان پر آ جاتے ہیں۔ دن میں جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے اس میں ان کے لیکچر کے لیے کتب دیکھتا ہوں۔ لیکچر کیا ہیں؟ انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے۔ جسے عرف عام میں تاریخ فلسفہ کہتے ہیں۔ ابھی کل شام ہی ان کو آپ کا یہ شعر سنا رہا تھا:

میں طاقت ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی

کہ ہوش مجھ کو ملا سے تل کر نظر بھی مجھ کو ملی ہے نپ کے

سبحان اللہ! کیا خوب کہا ہے۔ جزاک اللہ۔ بہرحال ان لیکچروں کے بہانے سے ان لوگوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ۱۴

اقبال اس حقیقت سے خوب آگاہ تھے کہ پہلی عالمی جنگ کن مقاصد کے لیے لڑی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں وہ بہت کم تقریبات میں شامل ہوئے۔ اور اپنی تمام تر فکری صلاحیتیں ”اسرار خودی“ اور ”رموز بے خودی“ پر مرکوز رکھیں۔ لیکن حالات سے مجبور ہو کر انہیں جنگ کے سلسلے میں منعقدہ دو تقریبات میں شریک ہونا پڑا۔ دہلی کی وار کانفرنس میں اپنے دوست نواب ذوالفقار علی خان کے اصرار پر شریک ہوئے۔ ایک نظم بھی پڑی لیکن اسے ”بانگ درا“ میں شامل نہ کیا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو لاہور میں سر مائیکل اوڈواٹر کی صدارت میں جلسہ فتح ہوا۔ تو اس میں بھی شامل ہونا پڑا۔ لیکن جنگ کے دوران میں ترکیہ پر جو بیٹا

پڑی تھی اس کے پیش نظر وہ فتح پر اظہارِ شادمانی نہیں کر سکتے تھے۔
 اس لیے انہوں نے دو تین ایسی نظمیں سنائیں جن کا جنگ یا فتح سے کوئی
 تعلق نہیں تھا۔ بلکہ ان کا پیغام بھی مضمحل تھا۔ ان میں ایک نظم ”شعاع
 آفتاب“ تھی، جس کے آخری اشعار یہ ہیں :

خفتہ ہنگامے ہیں سیری ہستی، خاموش میں
 پرورش پانی ہے میں نے صبح کی آغوش میں
 مضطرب ہر دم سری تقدیر رکھتی ہے مجھے
 جستجو میں لذت تنویر رکھتی ہے مجھے
 برق آتش خونہیں فطرت میں گو ناری ہوں میں
 سہر عالم تاب کا پیغام بیداری ہوں میں
 سرمہ بن کر چشم انساں میں سا جاؤں گی میں
 رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں

تیرے مستوں میں کوئی جو ہائے ہشاماری بھی ہے؟
 سوئے والوں میں کسی کو ذوق بیداری بھی ہے؟

حوالے

- ۱ - ”ذکر اقبال“ - ص ۱۰۲ -
- ۲ - ”اقبال نامہ“ جلد اول - ص ۲۵۵ -
- ۳ - ”ملفوظات اقبال“ - صفحات ۱۰۱-۱۰۳ -
- ۴ - ”ذکر اقبال“ - ص ۸۵ -
- ۵ - ”صحیفہ“ اقبال نمبر جلد اول - صفحات ۶۸-۶۹ -
- ۶ - ”اقبال نامہ“ جلد دوم - صفحات ۵۶-۵۳ -

- ۷ - ”اقبال نامہ“ جلد اول صفحات ۳۷-۳۵ -
- ۸ - ”مقالات اقبال“ - صفحات ۱۹۰-۱۸۷ -
- ۹ - ”سکاتیب اقبال بنام گرامی“ - صفحات ۱۳۷-۱۱۲ - مختلف خطوط اور تعلیقات سے تلخیص و ترتیب -
- ۱۰ - ”خطوط اقبال“ - صفحات ۲۶-۱۲۵ -
- ۱۱ - ”اقبال نامہ“ حصہ دوم - صفحات ۱۷۳-۱۷۲ -
- ۱۲ - ”اقبال نامہ“ جلد اول - صفحات ۷۶-۷۵ -
- ۱۳ - ایضاً - ص ۸۰ -
- ۱۴ - ”اقبال نامہ“ جلد دوم - صفحات ۷۴-۷۳ -
- ۱۵ - ”بانگ درا“، ص ۲۶۷ -



دسواں باب

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک : سیاست سے دلچسپی

پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی تو برعظیم کی سیاست پر جو سناٹا طاری تھا وہ قصہٴ ماضی بن گیا۔ مدتوں پرانے بند ٹوٹے اور سیاست کے بے پناہ سیلاب نے پورے برعظیم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ ایک طوفان خیز سیاست تھی جس میں دار و رسن کی آزمائش تھی اور آزادی پسندوں کے خون سے خاک وطن لالہ رنگ ہو گئی۔ اس زمانے میں تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت کا بازار گرم ہوا۔ اور ہزار ہا مسلمانوں نے خلافت کے تحفظ و بقاء اور آزادیٴ وطن کی خاطر قربانیوں کی ایک عظیم النظیر مثال پیش کر دی۔ پھر چشم فلک نے ان تحریکوں کا تیرازہ بکھرتے دیکھا۔ سر لید نے خلافت کو خیر باد کہا دیا۔ انہا پسند ہندو تحریکیں آئیں۔ شدھی اور سنگھن کے فتنے اٹھے اور وہ ہندو مسلم اتحاد ایک خواب بن کر رہ گیا جس کی بنیاد میثاق لکھنؤ نے رکھی۔ اور جو تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت میں نقطہٴ عروج پر پہنچ گیا تھا۔

جنگ ختم ہوتے ہی انگریزوں نے برعظیم کو مائٹیکو جمسٹوریہ اصلاحات دیں۔ لیکن عوام کی توقعات اور آرزوؤں سے عدم مطابقت کی بناء پر ہر طرف یہی چرچا ہوا کہ یہ ایک فریب ہے جو عوام سے لیا جا رہا ہے۔ اور ان مواعید کی خلاف ورزی ہے جو دوران جنگ میں حق خود ارادیت کی بنا پر کیے گئے تھے۔ عوام کی بے چینی اور اضطراب سے انگریزی راج کے لیے

خطرہ پیدا ہوا، تو رولٹ ایکٹ کے نام سے ایک قانون نافذ کیا گیا جس کے تحت انتظامیہ کو پکڑ دھکڑ اور تلاشوں کے وسیع اختیارات حاصل ہو گئے۔ اسپیریل قانون ساز مجلس کے تمام منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں نے اس کی مخالفت میں ووٹ دے۔ حکومت کو انتباہ کیا کہ اس کا نتیجہ بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا لیکن سامراجی نوکر شاہی نے کسی کی نہ مانی۔ اس پر قومی رہنماؤں نے اعلان کیا کہ ۶ اپریل ۱۹۱۹ء سے ایک ملک گیر لیکن پراسن احتجاجی ہڑتال شروع ہوگی۔ یہ ہڑتال بہت کامیاب رہی اور پنجاب میں نوکر شاہی کی بے تدبیری کے سبب حالات نے ایک خونیں روپ لے لیا۔ امرتسر میں دو سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کے لیے عوام نے ایک پراسن جلوس نکالا۔ اس پر گولی چلی، تو ہجوم پھرتا گیا۔ اس نے سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی، بنکوں کو لوٹ لیا اور چند یورپی باشندوں کو ہلاک کر دیا۔ اس پر شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ جلیانوالہ باغ میں ہزارہا ہندو، مسلمان اور سکھ جمع ہو گئے۔ اس جلسے پر بغیر کسی نوٹس کے اور یہ جانتے ہوئے کہ چار دیواری کے اندر ہونے کی وجہ سے لوگ باہر نہیں جا سکتے، نہایت سنگدلی سے گولی چلائی گئی۔ جس سے چار سو سے زیادہ انسان موت کے گھاٹ اتر گئے اور ہزارہا زخمی ہوئے۔ یہی نہیں شہر بھر میں پانی اور بجلی کی سپلائی بند کر دی گئی اور جس گلی میں ایک انگریز عورت ہلاک ہوئی تھی وہاں سے سب راہ گیروں کو رینگ کر گزرنے کا حکم ایک عرصے تک نافذ رہا۔

لاہور میں بھی ہڑتال مسلسل جاری رہی۔ ہر روز نوجوان ننگے سر جلوس نکالتے تھے۔ ۱۴ اپریل کو جب یہ خبر آئی کہ بعض رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا ہے تو عوام بے قابو ہو گئے۔ اور انہیں بے تحاشا گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس سانحہ سے حضرت علامہ کس طرح متاثر ہوئے؟ یہ

”اقبال درون خانہ“ کے مصنف کی زبانی سنئے :

”یہ ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔ میری والدہ محترمہ اُس وقت سات برس کی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں۔ اُن دنوں ہم انارکلی میں رہتے تھے۔ ایک روز بازار سے بڑا عظیم الشان جلوس نکلا۔ بے شمار نوجوان بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھے اور رولٹ بل ہائے ہائے کے فلک شکاف نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ ہم سب بے دریچوں سے اس کا نظارہ کیا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ بازار میں پھر شور اُٹھا۔ ہم سب کھڑکیوں کی طرف لپکے تو ایسا دل فگار منظر نظر آیا کہ روح کانپ کانپ گئی۔ چند فوجی گاڑیاں، جن میں خون سے لت پت لاشیں بڑی بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں، آہستہ آہستہ بازار میں سے گذر رہی تھیں۔ ہر طرف شور تھا کہ جلوس پیر گولی چل گئی۔ بڑے بڑے خوبصورت نوجوان، جو ابھی چند لمحے پیشتر رولٹ بل ہائے ہائے کے نعرے لگاتے ہوئے گذرے تھے، خون میں نہلا دے گئے تھے۔ جدھر سے ان شہیدوں کا جلوس گذرتا، لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے۔ یہ روح فرسا منظر دیکھ کر چچا جان (اقبال) کا چہرہ غصے اور ضبط سے تمتا رہا تھا اور اُن کا دلی کرب چہرے سے صاف عیاں تھا۔ سردار چچی جان (والدہ جاوید) زار و قطار رو رہی تھیں۔ انہوں نے روتے روتے چچا جان سے کہا۔ ظالموں نے کتنی ماؤں کے لال موت کے گھاٹ اتار دیے ہیں۔ چچا جان سر جھکانے خاموش بیٹھے تھے۔ آہستہ سے سر اُٹھا کر دلگیر لہجے اور گلوگیر آواز میں فرمایا : میرے مولا کو یہی منظور ہے۔ سرتابی کی مجال نہیں۔ وہ ان شہداء کی

قربانیاں ضرور قبول کرے گا ، جنہوں نے عروس آزادی کی مانگ کے لیے اپنا گرم اور نوجوان خون پیش کیا ہے ۔ اتنا کہا اور پھر سر جھکا لیا ۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے ۔“

اس رات مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ۔ اس کی سختی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ کوئی دو افراد اکٹھے نہیں چل سکتے تھے ۔ ہر بندوستانی اس بات کا پابند تھا کہ جہاں کسی گورے کو دیکھے اسے سلام کرے ۔ تمام مقامی باشندوں سے موٹر کاریں ، بائیسکائیں ، تانگے اور بجلی کے پنکھے لے کر گوروں کے حوالے کر دے گئے ۔ تمام سیاسی رہنماؤں، بالخصوص وکلاء کے مکانوں کے باہر مارشل لاء کے قواعد کے اشتہار چسپاں کیے گئے ۔ اور انہیں حکم ہوا کہ ان اشتہاروں کی حفاظت کرو ۔ طلبہ کو خاص طور پر ذلیل کیا گیا ۔ کالجوں میں ہر روز چار مرتبہ انہیں مشین گنوں کے پھرے میں سخت دھوپ میں کھڑا کیا جاتا اور ان کی حاضری لی جاتی ۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبہ اس بات کے پابند تھے کہ ہر روز سخت گرمی میں بستر سر پر اٹھائے شاہی قلعے تک سائیں ، حاضری لگوائیں اور اسی حالت میں پیدل کالج کو لوٹیں ۔ نیلا گنبد کے چوک میں ٹکٹکی لگی ہوئی تھی جس پر لوگوں کو ننگا باندھ کر سزائے تازیانہ دی جاتی تھی ۔ اور پکڑ دھکڑ تو بہر حال عام تھی ۔

اس دور میں دوسرے لوگوں کی طرح علامہ اقبال بھی خانہ نشین تھے ۔ دو مکتوبات سے ان کے تاثرات کا پتہ ملتا ہے ۔ لیکن اتنی بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ اس پر آشوب دور میں خطوط بھی سنسر ہوتے تھے ۔ مارشل لاء کے نفاذ کے پانچ دن بعد حضرت اکبر الہ آبادی کو لکھا :

”لاہور کے حالات آپ نے اخباروں میں دیکھ لیے ہوں گے۔ گاندھی صاحب کا خاموش مقابلہ یہاں تک رنگ لایا ہے کہ حکام لاہور اور پنجاب کے دیگر مقامات میں مارشل لاء (آئین عسکری) کے اجراء پر مجبور ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے۔ عجب زمانہ آ رہا ہے۔۔۔ آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ مگر یہ زمانہ گھر سے باہر نکلنے کا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس ملک کے لوگوں کی حالت پر رحم کرے۔

مومن کو چاہیے کہ خدا ہی کا پورے، ۳

اس کے دو دن بعد سرکشن پرشاد شاد کو لکھتے ہیں :

”آج آٹھ دن سے مارشل لاء یعنی قانون عسکری، یہاں جاری ہے۔ پنجاب کے بعض دیگر اضلاع میں بھی گورنمنٹ یہی قانون جاری کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ لوگوں نے قصور اور امرتسر میں قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان کو گرفتار کیا گیا ہے اور ان پر مقدمات چلائے گئے ہیں۔ کل سے ان کا ٹرائل بھی شروع ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کرے۔ مگر خواجہ حافظ کا شعر تسکین کا باعث ہے۔

ہاں مشو نو مید چوں واقف نہ از سر غیب

باشد اندر پردہ ، بازی ہائے پنہاں غم غور

لچھ عرصے کے بعد مارشل لاء اٹھ گیا۔ اسے میں برعظیم کے مسلمانوں کی تمام تر توجہ، ترکیب اور خلافت کے مسئلے پر مرکوز ہو گئی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ دوران جنگ میں حکومت مسلمانوں کو یقین دلانی رہی

کہ ترکیہ کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے گا۔ ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے ساسراجی عزائم سے انکار کیا۔ اور کہا کہ حکومت کا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ ایشیائے کوچک اور تھریس کے زرخیز ترک علاقوں پر تسلط جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ قسطنطنیہ بدستور ترکیہ کا دارالحکومت رہے گا۔ ان کے پورے بیان سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ عرب علاقے تو چھین لیے جائیں گے لیکن ترک علاقوں سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ لیکن جب ۳ نومبر ۱۹۱۸ء کو ترکیہ نے متارکے کے سمجھوتے پر دستخط کر دیے، تو برطانیہ سارے وعدوں کو بھول کر دھاندلی اور ظلم پر اتر آیا۔ اس نے اپنی فوجیں موصل میں داخل کر دیں۔ قسطنطنیہ پر بظاہر اتحادیوں کا، لیکن حقیقت میں برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو یونان نے برطانیہ سے شہ پا کر خالص ترک علاقے سمرنا میں داخل ہو کر نہ صرف ترک فوج کو غیر مسلح کیا بلکہ عام شہریوں پر ناقابل بیان مظالم توڑے۔ اور اس کے ساتھ ہی سارے یورپ میں ترکوں کے خلاف انتہائی زہریلا پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ ان حالات میں برعظیم کے مسلمانوں میں اتنی بے چینی پھیلی اور اتنا اضطراب پیدا ہوا کہ ان کی توجہ باقی سیاسی مسائل سے ہٹ کر ترکیہ اور خلافت ہی پر مرکوز ہو گئی۔ محمد علی اور شوکت علی کی رہنمائی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم ہو گئی۔ جس کا مقصد وحید یہ تھا کہ خلافت کے تحفظ و بقاء کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اور ترکیہ سے بے انصافی نہ ہونے دی جائے۔ اس کے علاوہ جمعیت العلماء ہند قائم ہو گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ علمائے کرام میدان سیاست میں اتر آئے۔ ان کے مقاصد خلافت کمیٹی کے مقاصد سے کمالاً ہم آہنگ تھے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو انہی مسائل پر احتجاج کے لیے برعظیم کے طول و عرض میں یوم خلافت منایا گیا۔ ادھر حکومت نے فیصلہ کیا کہ ۱۳ دسمبر سے

جشن صلح کا ہفتہ منایا جائے۔ مسلمانوں نے اس کا مکمل مقاطعہ کیا اور ہندوؤں نے بھی ان کے ساتھ تعاون کیا۔

حضرت علامہ کا نقطہ نگاہ وہی تھا جو اسلامیان ہند نے اختیار کر رکھا تھا۔ جشن صلح کے مقاطعہ کے سلسلے میں لاہور میں جو جلسہ عام منعقد ہوا، اس میں حضرت علامہ بھی شریک تھے۔ انہوں نے ایک دوست کے نام خط میں لکھا کہ ”پولٹیکل جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوا کرتا۔ اس جلسے میں اس واسطے شریک ہوا کہ ایک بہت بڑا مذہبی مسئلہ زیر بحث تھا۔“ ۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کے اواخر میں باغ بیرون موجی دروازہ (لاہور) میں ایک جلسہ عام ہوا جس کی صدارت میاں فضل حسین نے کی۔ اور علامہ اقبال نے نمایاں حصہ لیا۔ آپ نے یہ قرارداد پیش کی :

”مسلمانان لاہور اس جلسے میں اس عظیم پریشانی اور بے چینی کا اظہار کرتے ہیں جو پیرس کی صلح کانفرنس میں اب تک سلطنت عثمانیہ اور خلیفۃ المسلمین کے متعلق قابل اطمینان فیصلہ نہ ہونے سے لاحق ہوئی ہے۔ اور حکومت کو وہ وعدے یاد دلاتے ہیں جو مسٹر لائیڈ جارج وزیراعظم برطانیہ نے جنوری ۱۹۱۸ء میں تمام اسلامی دنیا سے سلطنت ترکی کے متعلق کیے تھے۔ اور پیرس کی صلح کانفرنس کو ان اصولوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو (امریکہ کے) پریذیڈنٹ ولسن نے اپنے اعلانوں میں قائم کیے تھے۔ اور جن کی بنا پر اس عظیم الشان جنگ کا خاتمہ کیا گیا۔ اور یہ اصرار تمام درخواست کرنے والوں پر ہے کہ جن اصولوں پر اتحادیوں نے اپنی عیسائی دشمن سلطنتوں سے قرارداد کی ہے، انہی اصولوں پر مسلمان سلطنتوں سے بھی صلح سرانجام پانی چاہیے۔ اور سلطنت عثمانیہ

کے کسی حصے پر صراحتاً یا اشارتاً کسی دوسری سلطنت کا قبضہ نہیں ہونا چاہیے۔“

حضرت علامہ نے اس قرارداد کے حق میں جو تقریر فرمائی ، اس کا متن ملاحظہ ہو :-

“صاحبان ! جس قوم نے دنیا میں آزادی اور حریت کی اشاعت کی تھی ، آج اس کی آزادی چھینی جا رہی ہے ۔ جب بنی نوع انسان کو پامال کیا جاتا تھا ، اس وقت اس قوم نے مساوات کا پرچار کیا ۔

”مسلمانو ! تم کو یاد ہے ۔ جب عرب میں نبیؐ آخر الزمانؑ پیدا ہوئے ، اس وقت دنیا کی کیا کیفیت تھی ۔ قسطنطنیہ میں قیصر کی سختی یورپ کی قوموں کا گلا گھونٹ رہی تھی ۔ اس وقت یہ امر واضح کیا گیا کہ خدا کی اطاعت کے سوا اور کسی کی اطاعت نہ کی جائے ۔ تمہارا مذہبی عقیدہ ہے کہ انسان کو آزادی ملنی چاہیے ۔ آج وہ قوم دوسری قوموں کے سامنے یہی کہہ رہی ہے کہ جن اصولوں کا اعلان کر کے میں نے بنی نوع انسان سے فیصلہ کیا تھا ، انہی اصولوں کو میرے ساتھ بھی برتا جائے ۔ ہو گا تو وہی ، جو نبیؐ آخر الزمانؑ فرما گئے ہیں ۔ مگر اس بات کا ترک کرنا بھی مناسب نہیں ۔ ہم کیوں کسی بندے کے سامنے شکایت کریں ۔ ہمیں خدا کے سامنے شکایت کرنی چاہیے ۔ خوشامد ، منت اور مانگے سے کبھی کچھ نہیں ملا ۔ خدا کے سوا کسی کی اطاعت ہمارے لیے واجب نہیں ۔ یاد رکھو ۔ کہ جو قوم ایک

بڑا مقصود لے کر پیدا ہوئی ہے وہ بونہی نہیں مٹ سکتی ۔
 بادشاہیاں مٹ رہی ہیں ۔ انسان نے اپنے فطری حقوق کا دعویٰ
 پیش کیا ہے ۔ تمہاری تاریخ قربانیوں سے بھری پڑی ہے ۔“

”پریزیڈنٹ ولسن نے چودہ اصول قائم کیے ۔ جن کے مطابق
 عالمگیر جنگ کا فیصلہ کیا جانا تھا ۔ ان میں سے ایک بات
 یہ تھی کہ ہر ایک قوم اپنے معاملے کو خود فیصلہ کر
 لیا کرے ۔ ہماری سرکار نے بارہا اس بات کا اعلان کیا ہے
 کہ ہم حق ، انصاف اور صداقت کے لیے لڑ رہے ہیں ۔ ہماری
 جنگ اس لیے ہے کہ بین الاقوامی معاہدے قائم رکھے جائیں ۔
 ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمارے حقوق کا خیال رکھا جائے
 اور ان کو پامال نہ کیا جائے ۔“

اس مہینے امرتسر میں انڈین نیشنل کانگریس ، آل انڈیا خلافت کمیٹی اور
 آل انڈیا مسلم لیگ نے قریب قریب بہ یک وقت اپنے سالانہ اجلاس
 منعقد کیے ۔ ان دنوں امرتسر میں بے حد رونق تھی ۔ گاندھی جی ، مسز
 اینی بیسنٹ ، موتی لال نہرو ، بال گنگا دھر تلک اور دوسرے بڑے بڑے
 رہنما آئے ۔ خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ کے رہنماؤں میں حکام اجمل خان
 کے علاوہ مولانا ظفر علی خان ، محمد علی اور شوکت علی بھی شامل تھے ۔
 علی برادران تو جیل سے رہا ہو کر میدھے امرتسر پہنچے تھے ۔ علاوہ ان کے
 نواب ذوالفقار علی خان اور مرزا جلال الدین بیسٹ کے ہمراہ پندرہ ہزار
 لاہور سے امرتسر آئے ۔ مالک لکھتے ہیں کہ ”وہاں پہنچ کر جب مسلم
 لیگ کے اجلاس میں داخل ہوئے اور علامہ اقبال علی برادران کے ساتھ
 بنگلہ گھر ہوئے ، تو جلسے میں جوش و خروش کا عجیب عالم تھا ۔ اثر

لوگ اشک بار تھے۔ علامہ نے دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے یہ اشعار آب دار فرمائے جو اسی دن سوٹر کے سفر میں سوزوں ہو گئے تھے :

ہے امیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند
 قطرہ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
 مشک ازفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
 مشک بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند
 ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
 کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
 شہپر زاغ و زعن در بند قید و صید نیست
 کیں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند“ ۸

امرتسر کے ان قومی اجتماعات کا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اور کانگریس، خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ کے درمیان زیادہ گہرا رشتہ استوار ہو گیا۔ فیصلہ ہوا کہ مائٹنگو چمسفورڈ اصلاحات کو مسترد کر دیا جائے۔ اور کوئی شخص ان اصلاحات کے تحت کونسلوں کے انتخابات میں حصہ نہ لے۔ ترکیہ کے ساتھ بے انصافی کے خلاف احتجاج اور خلافت کے تحفظ و بقاء کے حق میں خلافت کمیٹی نے جو موقف اختیار کیا، کانگریس نے اس پر صاف کر دیا۔ خلافت کمیٹی کے اس اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ ایک وفد وائسرائے سے ملے۔ اور ضرورت پڑے تو یورپ بھی جائے۔ تاکہ برطانیہ کو مجبور کیا جا سکے کہ وہ ترکوں سے انصاف کرے۔ اس وفد کے قائد محمد علی تھے اور ارکان میں سید حسین، حسن محمد حیات اور سید سلیمان ندوی شامل تھے۔ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ انہیں بتایا کہ خلافت اصلاً دینی ادارہ ہے۔ مسلمانوں کے لیے جزو ایمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا خاتمہ

نہ صرف ناقابل برداشت ہوگا بلکہ برباد کن بھی ہوگا۔ وفد نے وائسرائے کو حکومت برطانیہ کے وہ وعدے بھی یاد کرائے جو اس نے خلافت اور ترکیہ کے سلسلے میں مسلمانوں سے کیے تھے۔ وائسرائے نے بتایا کہ میں آپ کا نقطہ نگاہ بڑے زور کے ساتھ حکومت برطانیہ کو پہنچا چکا ہوں۔ اب میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ برطانوی کابینہ پر اپنا نقطہ نگاہ بالمشافہ طور پر واضح کرنے کے لیے برطانیہ جانا چاہیں، تو اس میں آپ کی اعانت کروں۔ چنانچہ وفد انگلستان گیا۔ لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اور سات مہینے کی تگ و دو کے بعد اکتوبر ۱۹۲۰ء کے آغاز میں وفد کو بے نیل مرام لوٹنا پڑا۔ بعض مصنفین وفد کی ناکامی سے اقبال کے ان اشعار کو منسوب کرتے ہیں :

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے
مگر آج ہے وقت خویش آزمائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے
مسلمان کو ہے تنگ وہ پادشائی
مرا از شکستن چنیں عار ناید
کہ از دیگران خواستن مومیائی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اشعار وفد کے تصور پر لاگو نہیں ہیں۔ لیکن علامہ نے یہ اشعار ۱۹۲۰ء میں نہیں، ستمبر ۱۹۱۹ء میں کہے۔ اور سب سے پہلے سید سلیمان ندوی کو ”معارف“ میں اشاعت کے لیے بھیجے تھے۔ اور غالباً یہ ممانع نہیں ہوئے تھے۔ جہاں تک وفد کی کارکردگی کا تعلق ہے، اقبال کی رائے اس مکتوب سے ملتی ہے جو ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو سید سلیمان ندوی کے نام بھیجا گیا۔ ملاحظہ فرمائیے :

”مراجعت مع الخیر مبارک - آپ نے بڑا کام کیا ہے - جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گذاری کی صورت میں مل رہا ہے - اور دربار نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا - وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا - انڈین بشپریں مشینا و قومسہا لہنا عبدون - تاہم مجھے یقین ہے ، کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا -“ ۱۰

بہر حال اقبال کا اندازہ درست نہیں تھا - کیونکہ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو اتحادیوں نے ترکیہ پر دباؤ ڈال کر معاہدہ میورے پر دستخط ثبت کرا لیے تھے - جس کی شرائط نہایت شرمناک تھیں - اس معاہدے کی رو سے خلافت عثمانیہ سے تمام عرب علاقے ، مشرقی تھریس ، ڈرڈیکنیز کے جزائر اور بحیرہ ایجیئن کے بہت سے جزائر چھن گئے - سمرنا کا شہر اور ضلع پانسال کے لیے یونان کے حوالے ہو گیا - ترکیہ نے آرمینیا کی آزادی تسلیم کر لی - کردستان کو بھی آزاد کرنے کا وعدہ کر لیا - آبنائے دردانیال پر بین الاقوامی کنٹرول مان لیا - مسلح افواج میں سخت کمی قبول کر لی - مالیات پر برطانیہ ، فرانس اور اٹلی کا کنٹرول تسلیم کر لیا - غیر ملکی مراعات میں اضافہ کر دیا - یہی نہیں ، برطانیہ ، فرانس اور اٹلی کے درمیان ایک معاہدے کی رو سے ان طاقتوں نے ترکیہ کے باقی علاقوں کو اپنے اپنے حلقہ اثر میں بانٹ لیا - ۱۱

مصطفیٰ کمال پاشا (کمال اتاترک) نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا - ایک نیشنل اسمبلی قائم کی - فوجی قوت کو اناطولیہ میں از سر نو منظم کیا - یونانیوں کو نکال باہر کیا - اٹلی اور فرانس کو مجبور کر دیا کہ اپنی فوجیں نکال لیں - مشرقی تھریس اور ادرنہ کے

علافے واپس لے لیے - اب اتحادی مجبور ہو گئے کہ معاہدہ سیورے کو منسوخ کر کے ایک نیا معاہدہ کریں - ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء سے جولائی ۱۹۲۳ء تک گفت و شنید جاری رہی - اور ۲۳ جولائی ۱۹۲۳ء کو معاہدہ لوزان پر دستخط ہو گئے - جس سے ترکیہ کی آزادی مسلم ہو گئی - اور وہ ہر قسم کی غیر ملکی مداخلت سے آزاد ہو گیا - ۱۲

معاہدہ 'سیورے' اور معاہدہ 'لوزان' کے درمیانی وقفے میں برعظیم میں تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کا بازار گرم رہا - اس مشترکہ تحریک کے مقاصد یہ تھے کہ خلافت کا وقار بحال ہو، ترکیہ کی آزادی بحال ہو اور حکومت خود اختیاری قائم کی جائے - ترک موالات اس سیاسی حربے کا نام تھا جو تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے استعمال کیا گیا - اس کا مطلب یہ تھا کہ تمام دوائر میں انگریزی حکومت سے ترک موالات یا عدم تعاون کا شیوہ اختیار کیا جائے - برطانوی مال کا مقاطعہ کیا گیا اور کھدر پہننے کا رواج عام کیا گیا - بہت سے سرکاری ملازمین نے نوکریوں پر لات مار دی - بہت سے وکلاء نے پریکٹس چھوڑ دی - ہزارہا طلبہ نے وہ تعلیمی ادارے چھوڑ دیے جنہیں سرکاری گرانٹ ملتی تھی - قانون شکنی کی سہم زور شور سے چلائی گئی - یہ سلسلہ جل رہا تھا کہ ایک مقام چوری چوراء پر ہجوم نے مشتعل ہو کر ایک تھانے کو آگ لگا دی اور کچھ سپاہی حل مرے - اس پر دندھی جی نے تحریک ختم کر کے اعلان کر دیا اور کہا کہ تحریک کی بنیاد عدم تشدد پر قائم بھی لیکن تشدد کے واقعات سے یہ بنیاد ختم ہو گئی ہے -

سالک رقمطراز ہیں کہ علامہ اقبال ان تمام ہندسوں سے الگ تھلک "پیام مشرق" کی ترتیب میں مصروف تھے - انہوں نے اس زمانے کی پر شور سیاسیات سے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا - بلاشبہ وہ اس سے

بے حد مسرور و مطمئن تھے کہ فرنگی کے مقابلے میں ہندی مسلمان کی خودی بیدار ہو رہی ہے۔ اور وہ طلب حریت میں قدم آگے بڑھا رہا ہے۔ لیکن انہیں ایک تو ”قومیت متحدہ ہند“ کے نصب العین اور وطنیت کے سیاسی تصور سے کوئی آسید خیر نہیں تھی۔ دوسرے وہ اس بات کے قائل بھی نہ تھے کہ ہندوستان میں کوئی ایسی قوم موجود ہے یا بن سکتی ہے، جس کو ہندوستانی قوم کہا جا سکے۔ چنانچہ صرف ایک ہی سال بعد اس تحریک کے خاتمے پر شدھی اور سنگھٹن اور تباہی و تنظیم کے ہنگاموں نے علامہ کے اس خیال پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ محض انگریز دشمنی کی بناء پر کسی قومیت کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لیے دوسرے عناصر و شروط ضروری ہیں۔ ۱۲

سالک کے ان تاثرات کے چار اجزاء ہیں۔ سامراج دشمنی۔ مسلمانوں میں طلب حریت پر مسرت۔ وطنیت کے سیاسی تصور سے ناامیدی اور سنگھٹن اور شدھی پر شدید رد عمل۔ سامراج دشمنی ہی نے انہیں مجبور کیا۔ کہ تحریک ترک موالات کے قائد، گاندھی جی پر، اختلافات کے باوجود یہ اشعار کہیں:

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے سالوی
 کمزور کی کمند ہے دنیا میں نارسا
 نازک یہ سلطنت صفت برگ گل نہیں
 لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا
 گاڑھا ادھر ہے زیب بدن اور ادھر زرہ
 صرصر کی رہ گذار میں کیا عرض توتیا
 پس کر ملے گا گرد رہ روزگار میں
 دانہ جو آسیا سے ہوا قوت آزما

بولا یہ بات سن کے کہاں وقار سے
 وہ مرد پختہ کار و حق اندیش و با صفا
 ”خارا حریف سعیٰ ضعیفاں نمی شود
 صد کوچہ ایست در بن دندان خلال را“
 ۱۳ (الف)

علامہ تحریک ترک موالات کو کتنی اہمیت دیتے تھے؟ اس سلسلے میں
 ۱۹۲۳ء کا یہ مکتوب بہاری رہنمائی کرتا ہے :

”ہندوستان میں بظاہر مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد امن و
 سکون ہے مگر قلوب کا ہیجان حیرت انگیز ہے۔ اتنے عرصے میں
 اتنا انقلاب تاریخ آسم میں بے نظیر ہے۔ ہم لوگ، جو انقلاب
 سے خود متاثر ہونے والے ہیں، اس کی عظمت اور اہمیت کو
 اس قدر محسوس نہیں کرتے۔ آئندہ نسلیں اس کی تاریخ پڑھ
 کر حیرت میں ڈوب جائیں گی۔“ ۱۴

علامہ نے درست فرمایا۔ کیونکہ اگر برعظیم کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالی
 جائے تو تحریک ترک موالات ایک اہم موڑ کی حیثیت سے نظر آئے گی۔
 کیونکہ اس میں عوام نے بے نظیر قربانیاں دیں اور برطانوی سامراج کو
 ایک بار ہلا کر رکھ دیا۔ مسلمانوں کے لیے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ
 تھی کہ عرصہ دراز کی عافیت کوش سیاست کے بعد اچانک بے خطر
 آتش نمرود میں کود پڑے۔ بہر حال اس کے ساتھ ہی علامہ نے مسلمانوں
 سے کہا :

اپنی ملت پر قیاس افوام مغرب سے نہ در
 خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
 ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
 قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی ۱۵

۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو اقبال نے ایک مکتوب میں لکھا :

”افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی رقابت بلکہ
عداوت بہت ترقی پر ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو آئندہ تیس
سال میں دونوں قوموں کے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی۔“ ۱۶

حالات نے اس پیش گوئی کو پورا کیا۔ اور وہ بھی تیس سال بعد نہیں،
سترہ سال بعد ہی مسلمانوں نے پاکستان کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ اور
مزید سات سال بعد مسلمانوں کی علیحدہ مملکت وجود میں آ گئی۔ ۱۹۲۳ء
ہی میں انہوں نے ایک اور مکتوب میں لکھا : ”چونکہ اس وقت ملکی اور
نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا میں آ رہی ہے۔ اور میرے نزدیک
انسان کے لیے یہ ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ اس واسطے بنی نوع انسان
کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس
کے حقیقی پیش نہاد پر زور دینا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں
اسلامی نقطہ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں۔ ابتداء میں میں بھی
قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید
سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔ لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے
میرے خیال میں تبدیلی کر دی۔ اور اب قومیت میرے نزدیک محض ایک
عارضی نظام ہے۔ جس کو ہم ایک ناگزیر زشتی سمجھ کر گوارا کرتے
ہیں۔“ ۱۷

اس زمانے میں برعظیم کے مسلمانوں پر دنیائے اسلام کی سیاست میں
دلچسپی غالب تھی۔ اور اس دلچسپی سے کچھ اختلافات بھی ابھرے،

کشمکش بھی ہوئی۔ لیکن اقبال نے اس کشمکش میں اول تو حصہ نہ لیا۔ اور اگر لیا تو صرف اس حد تک، کہ لوگوں کو تعمیری نقطہ نگاہ کی طرف راغب کیا جائے۔ ان مسائل کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ مسئلہ خلافت سے تھا۔ ترکیہ کی مجلس کبیر ملی نے نومبر ۱۹۲۲ء میں خلیفہ وحیدالدین کو برطرف کر دیا۔ کیونکہ انہی نے معاہدہ سیورٹ پر دستخط کیے تھے۔ ان کی جگہ عبدالمجید آفندی کو مسند خلافت پر بٹھایا گیا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ، کہ انہیں حکومت کے کاروبار سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ اور ان کی حیثیت محض روحانی قائد کی ہوگی۔ جب خلیفہ المسلمین عبدالمجید نے اپنے حدود سے تجاوز کیا تو نہ صرف انہیں بدکہ خاندان عثمانیہ کے جملہ افراد کو جلا وطن کر دیا۔ اور تہذیب خلافت کا بھی اعلان کر دیا۔ یہ فیصلہ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ہوا۔ برعظیم کے مسلمان اس پر بہت پریشان ہوئے۔ کیونکہ جس خلافت کے تحفظ اور بقاء کے لیے وہ لڑتے رہے، اس کا وجود ہی نہ رہا۔ لیکن انہوں نے ان مصالح پر غور کرنا پسند نہ کیا جن کی بناء پر ترکیہ ایسے فیصلے پر مجبور ہو گیا۔ حضرت علامہ نے اس فیصلے پر اظہار رائے سے احتراز کیا۔ اب مسلمان رہنا سوچنے لگے کہ سابق خلیفہ المسلمین سے کیا کام لیا جائے۔ ۱۹۲۴ء کے اواخر میں یہ تجویز ابھری کہ حجاز کا نظام حکومت ان کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن حجاز پر ان دنوں عملاً وہابیوں کا قبضہ تھا۔ جن کے والد والٹے نجد ابن سعود تھے۔ جب علامہ اقبال سے لاہور کے انگریزی رہنما ”مسلم آؤٹ لک“ کے نمائندے نے اس تجویز پر ان کا ردعمل دریافت کیا۔ تو انہوں نے اس بناء پر تجویز کی مخالفت فرمائی کہ عبدالمجید سنی ہیں اور حجاز پر وہابی غالب ہیں۔ اور اگر عبدالمجید کو حجاز کی والی مقرر کر دیا گیا تو مسلمانوں کے دو فرقوں میں ایک افسوسناک کشمکش شروع ہو جائے گی۔ انہوں نے کہا :-

”مسلمانان عالم اگر سابق خلیفہ المسلمین کی ذات سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ اشاعت اسلام کا ایک عظیم الشان نظام قائم کریں۔ اور سابق خلیفہ المسلمین کو اس نظام کا صدر بنا دیں۔ خلیفہ المسلمین کو اس امر پر آمادہ کیا جائے کہ وہ کسی اسلامی ملک میں سکونت اختیار کریں۔ اور تحریک اشاعت کی تنظیم فرمائیں۔ مبلغین کے لیے ایک وسیع بین المللی درس گاہ کا انتظام ہونا چاہیے۔ وہاں وہ ضروری تعلیم حاصل کریں پھر اسلام کی مشعل ہاتھ میں لے کر دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ جائیں۔ خاندان عثمان کے سلاطین نے مقاصد اسلام کی عدیم النظیر اور فقید المثال خدمات انجام دی ہیں۔ اگر اشاعت اسلام کی تحریک کو سابق خلیفہ المسلمین عبدالمجید خان کی سرپرستی میں شروع کیا جائے تو اس سے دنیا نے اسلام میں مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی ایک ہنگامہ خیز حرکت و جنبش پیدا ہو جائے گی۔“ ۱۸

جب علامہ سے پوچھا گیا۔ کہ آیا وہ حجاز کی صورت حالات سے مطمئن ہیں۔ تو انہوں نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ اور ابن سعود پر کامل اعتقاد کا اظہار کیا۔ اور کہا :

”سیری رائے میں سلطان نجد ایک روشن خیال آدمی ہیں۔ جو لوگ سلطان موصوف سے ملے ہیں یا انہوں نے نجد کو دیکھا ہے، وہ میری اس رائے کے موید ہیں۔ امریکہ کا ایک مصنف اپنی کتاب الاسلام میں سلطان نجد کو ایشیا کا بہترین حاکم اور سرزمین نجد کو زوال آمادہ دنیا نے اسلام کی صاف اور پاک ترین جگہ بتاتا ہے ...

”بہت ممکن ہے کہ عرب میں ابن سعود کے ماتحت ایک زبردست قومی تحریک نشو و نما پائے۔ اور اس کے آثار و علامت نظر آ رہے ہیں۔ اس احساس خودی کا ہمیں تو دل سے خیر مقدم کرنا چاہیے۔ اگرچہ اس کی تہ میں تجرد و تفرید کے مادہ کی نشو و نما کا بھی اندیشہ ہے۔ لیکن ہمیں کچھ مدت تک اس تجرد و تفرید کو بھی برداشت کرنا چاہیے۔ عرب فطرتاً جمہوریت پسند ہیں اور سرزمین عرب میں کوئی مطلق العنان حکومت زیادہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتی۔“ ۱۹

اقبال کی یہ پیش گوئی بھر آن کی وفات کے کئی سال بعد جزوی طور پر پوری ہوئی۔ کہ اسی خاندان کے ایک ممتاز فرد شاہ فیصل نے تحریک اتحاد عالم اسلامی کا پرچم بلند کیا۔ مستقل اسلامی سیکریٹریٹ کی بنیاد ڈالی اور جدہ کو اس کا صدر مقام بنایا۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد جب فلسطین برطانوی انتداب میں آ گیا تو معاہدے کی رو سے برطانیہ اس بات کا پابند ہوا، کہ ایک ایسا شاہی کمیشن مقرر کرے جو فلسطین کے مقامات مقدسہ کے بارے میں تمام مذاہب کے حقوق و دعاوی کا مطالعہ کرے۔ اور ان کی حد بندی اور تعین کر دے۔ فلسطین کے مقامات مقدسہ سے تین مذاہب کی خصوصی وابستگی ہے۔ اول: مسلمان۔ دوم: عیسائی۔ سوم: یہودی۔ اس کے فیصلہ ہوا کہ تینوں مذاہب کے نمائندے کمیشن میں شامل ہوں۔ حکومت ہند نے جنوری ۱۹۲۲ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے حضرت علامہ سے دریافت کیا کہ آیا وہ کمیشن کی رکنیت قبول کر سکیں گے۔ آپ نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔ ۲۰ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہی کمیشن کے ارکان کو صرف سفر کے اخراجات دے جائے تھے۔ معاوضے کا

دستور نہیں تھا۔ علامہ کے لیے مشکل یہ تھی کہ وہ قوت لایموت کے لیے وکالت کی پریکٹس کرتے تھے۔ اور یہ کام بہت وقت چاہتا تھا۔ کیونکہ دو تین سال کے دوران میں کمشن کے بہت سے اجلاس یروشلم میں ہونے تھے۔ اس مسلسل آمدورفت سے وکالت میں طویل وقفے آتے، اور ظاہر ہے علامہ کی آمدنی میں کمی واقع ہو جاتی۔ جس کی تلافی کے لیے کوئی سبیل نہیں تھی۔ بہر حال علامہ کو اس بات کا افسوس رہا کہ اس رکنیت سے زیارات کا جو موقع مل سکتا تھا، اس سے محروم ہو گئے۔ بعد میں اس شاہی کمشن کا تقرر ہی نہ ہوا۔

اسی سال چند مہینے بعد لاہور میں ایک اہم واقعہ ہوا۔ شاہ عالمی دروازے کے باہر ہندوؤں نے ایک مندر بنایا۔ مسلمانوں نے بلدیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ انہیں بھی ایک قطعہ اراضی دے۔ تاکہ اس پر ایک مسجد بنائی جا سکے۔ بلدیہ نے لیت و لعل سے کام لیا تو مسلمانوں نے اچانک خود ہی ایک قطعہ زمین پر قبضہ کر لیا۔ اور جوش و خروش کی یہ کیفیت تھی کہ سینکڑوں نوجوان نماز عشاء کے بعد وہاں پہنچے، عمارتی سامان فراہم کیا، بنیادیں کھودیں اور تعمیر شروع کر دی۔ راتوں رات پوری مسجد بنا لی۔ نچلی منزل پر دو دکانیں بنیں اور بالائی منزل پر مسجد۔ نماز فجر تک یہ کام مکمل ہو گیا۔ اس واقعہ سے حضرت علامہ بہت متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے وہ نظم کہی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں سے نمازی بن نہ سکا

مدتوں مسجد کی یہی کیفیت رہی۔ آخر انجمن اسلامیہ پنجاب نے کئی

سال بعد پلستر کرایا، مناسب آرائش کا بندوبست کیا اور مسجد کے جملہ

لوازم پورے کر دیے۔ ۲۱

حوالے

- ۱ - اس باب میں جو سیاسی پس منظر دیا گیا ہے ، اس کی بیشتر معلومات ڈاکٹر عبدالحمید کی کتاب MUSLIM SEPARATISM IN INDIA سے اخذ کی گئی ہیں ۔
- ۲ - ”اقبال درون خانہ“ - صفحات ۵۵-۵۶ ۔
- ۳ - ”اقبال نامہ“ جلد دوم - صفحات ۷۷-۷۶ ۔
- ۴ - ایضاً - ص ۱۹۶ ۔
- ۵ - ایضاً ص ۱۹۹ ۔
- ۶ - ”انوار اقبال“ - ص ۴۳ ۔
- ۷ - ایضاً - صفحات ۴۴-۴۳ ۔
- ۸ - ”ذکر اقبال“ - ص ۱۰۶ ۔
- ۹ - ”اقبال نامہ“ جلد اول - صفحات ۱۰۷-۱۰۵ ۔
- ۱۰ - ایضاً - صفحات ۱۱۳-۱۱۲ ۔
- ۱۱ - Middle East in World Affairs - صفحات ۱۰۶-۱۰۰ ۔
- ۱۲ - ایضاً - صفحات ۔
- ۱۳ - ”ذکر اقبال“ - صفحات ۱۰۹-۱۰۸ - ۱۳ الف - ”ذکر اقبال“ ص ۱۱۲ - (بحوالہ ”زمیندار“، ۱۳ نومبر ۱۹۲۱ء) ۔
- ۱۴ - ”اقبال نامہ“ جلد دوم - ص ۱۶۳ ۔
- ۱۵ - ”بانگ درا“ - ص ۶-۲ ۔
- ۱۶ - ”اقبال نامہ“ جلد دوم - ص ۲۰۴ ۔
- ۱۷ - ”خطوط اقبال“ - صفحات ۱۶۶-۱۶۵ ۔

- ۱۸ - ”گفتار اقبال“ - صفحات ۱۰-۱۲ -
۱۹ - ایضاً - صفحات ۱۰-۱۲ -
۲۰ - ”مکاتیب اقبال بنام گرامی“، - صفحات ۱۹۷-۱۹۳ -
۲۱ - ”ذکر اقبال“ - صفحات ۱۱۲-۱۱۳ -



گیارہواں باب

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک : سر کا خطاب اور سوشلزم

یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو حضرت علامہ کو ”سر“ کا خطاب ملا تو ان کے مداحین اور نیازمند چونک اٹھے۔ کہ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت برطانیہ عام طور پر وفاداری کے صلے میں اعزازات اور خطابات دیا کرتی تھی۔ اور علامہ کے بارے میں ایک دنیا جانتی تھی کہ وہ ایک آزاد منش انسان ہیں۔ دوسرے، برعظیم کے طول و عرض میں ابھی ترک موالات کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اور خطاب کو موالات کی ایک علامت قرار دیا جاتا تھا۔ تیسرے، اگرچہ علامہ اقبال ترک موالات کی تحریک میں شامل نہیں تھے لیکن ان کی ہمدردیاں تو رہنماؤں کے ساتھ تھیں۔ ان حالات میں لوگ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ علامہ اقبال خطاب یافتہ ہو سکتے ہیں۔ اس پر چہ میگوئیاں ہوئیں۔ احباب نے خط لکھے۔ اس زمانے کا اہم ترین اخبار ”زمیندار“ تھا۔ مولانا ظفر علی خان تو اسیر فرنک تھے، ان کی جگہ مولانا عبدالعزیز صاحب ادارت فرماتے تھے۔ انہوں نے علامہ کی خطاب یافتگی پر دیکھ طنز سے لکھ لکھے۔ اور دو مرتبہ اپنے مستقل مزاحیہ کالم ”افکار و حوادث“ میں بھی اس کا تذکرہ کیا۔

مولانا غلام بھیک نیرنگ خطاب یافتگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”میں اس اللہ کے قلندر کو خوب سمجھتا تھا۔ مگر یہ بھی معلوم تھا کہ شیطان اپنے داؤ پیچ سب پر چلاتا ہے۔ اس لیے ضروری سمجھا

کہ مبارکباد کے ساتھ ان کو یہ بھی یاد دلا دوں کہ اسلامی دنیا ان سے کیا کیا توقعات رکھتی ہے، ۱۔ ان کے مکتوب کے جواب میں اقبال نے لکھا: ”میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا۔ مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں، اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساسات سے فرو تر ہیں۔ سینکڑوں خطوط اور تار آئے اور آ رہے ہیں۔ اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ، جس کا آپ کے قاب کو احساس ہوا ہے۔ سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی، جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے۔ اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی، جس کی وجہ سے مجھ کو ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاء اللہ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔ ۲۔“ مولانا گرامی کے نام لکھا: ”آپ نے سن لیا ہوگا کہ اس سال اقبال خلاف توقع خطاب یافتہ ہو گیا۔ اس اعزاز کی اطلاع آپ کو خود دیتا مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں، وہاں اس قسم کے واقعات احساس انسانی سے بہت نیچے ہیں۔“

نہ من بر مرکب ختلی سوارم

نہ از وابستگان شہر یارم

مرا اے ہم نفس دولت ہمیں بس

چو کوم سینہ را، لعلے بر آرم، ۳

مولانا عبدالہاجد دریا بادی کے نام مکتوب سے بھی اقبال کے اصل احساسات کا علم ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: ”آپ کے مختصر الفاظ نے اس موقع پر میرے جذبات کی نہایت صحیح ترجمانی کی ہے۔ حالات مختلف ہوتے

تو میرا طریق عمل بھی اس بارے میں مختلف ہوتا۔ لیکن یہ بات دنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ اقبال کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں کھلی کھلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

بعد میں انکشاف ہوا کہ سر کا خطاب وفاداری کا صلہ نہیں تھا بلکہ اقبال کے علمی کارہائے نمایاں کے اعتراف کی ایک علامت تھا۔ جسے حضرت گراسی نے یوں پیش کیا :

ہر نکتہ علامہ وفا آہنگ است
 ہر حرف کلمہ حکمت و فرہنگ است
 اقبال سر اقبال شد از جوہر غم
 حاسد عوعو کند علاجش سنگ است

اس کا مفصل پس منظر سالک نے بھی بیان کیا ہے اور انہیں سر وحید الدین نے بھی۔ ایک خاص حد تک مرزا جلال الدین نے اس سے بھی بیان کیا ہے۔ ہم ان تینوں ماخذ سے حاصل شدہ معلومات کی بنا پر یہ خطاب کی کہانی پیش کرتے ہیں۔

پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سرشادی لال نے علامہ کو بلا کر کہا کہ حکومت نے مجھ سے خطابات کے لیے مشورہ طلب کی ہے اور میں آپ کے لیے ”خان صاحب“ کا خطاب تجویز کر رہا ہوں۔ علامہ نے اس میں اپنی توہین کا بہانہ بنا کر اسے ٹھکرا کر کہا کہ میں کسی خطاب کا خواہاں نہیں۔ میں نے اب سفاروں کی زحمت نہ فرمائیے۔ سرشادی لال نے کہا۔ ابھی چند فیصلے نہ کیجئے۔ ذرا کچھ دن سوچ لیجئے۔ علامہ نے کہا۔ میں سوچ چکا ہوں۔ مجھے خطاب کی کوئی ضرورت نہیں۔ دو تین دن بعد سرشادی لال نے یہاں پہنچا کہ

مجھ سے مل لیجیے۔ علامہ نے پیغام بر کی زبانی کہا بھیجا کہ اگر خطاب کے بارے میں بات کرنی ہے تو وہ بے سُر ہے۔ کیونکہ میں اپنے فیصلے سے آپ کو مطلع کر چکا ہوں۔ بہر حال اگر کوئی اور کام ہے تو حاضر ہو سکتا ہوں۔

اس زمانے میں سر ایڈورڈ میکلیگن پنجاب کے گورنر تھے۔ ان سے علامہ کے عزیز دوست نواب ذوالفقار علی خان کے گہرے روابط تھے۔ ایک دن نواب صاحب نے گورنر سے کہا کہ مشہور بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کو سر کا خطاب مل چکا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ اقبال اس قدر دانی سے محروم ہیں۔ حالانکہ وہ بہت بڑے شاعر بھی ہیں اور مسلمانوں کے محبوب رہنما بھی۔ اس پر گورنر نے کہا۔ اچھا۔ ہم انہیں ”خان بہادر“ کا خطاب دلائیں گے۔ نواب صاحب نے کہا کہ یہ خطاب تو ان کے شاہان شان نہیں ہے۔ گورنر بولے۔ پھر شمس العلماء کا خطاب کیسا رہے گا؟ نواب صاحب نے کہا۔ یہ بھی مناسب نہیں۔ گویا اس طرح یہ کہہ دیا کہ خطاب ملے تو سر کا خطاب ملے۔ جو سب سے اونچا ہوتا تھا۔

آہی دنوں برطانیہ کا ایک مشہور اخبار نویس، جو ادیب بھی تھا، دنیا نے اسلام کی سیاحت کے بعد افغانستان کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہوا اور گورنر پنجاب کا سہان ہوا۔ اس نے ایک تو ”اسرار خودی“ کا وہ انگریزی ترجمہ پڑھ رکھا تھا جو پروفیسر نکلسن نے کیا تھا۔ دوسرے، اسلامی ملکوں کے علمی اور ادبی حلقوں سے اقبال کے علمی اور شاعرانہ کہالات کا چرچا سن آیا تھا۔ تیسرے، اپنی ایک کتاب کے بارے میں علامہ کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے گورنر کو مشورہ دیا کہ اقبال کو چائے پر مدعو کیا جائے تاکہ ان سے ملاقات ہو سکے۔ گورنر

نے انہیں مدعو کر لیا۔ علامہ کے پاؤں کے انگوٹھے میں تکلیف تھی۔ یوں بھی وہ نقل و حرکت کے زیادہ قائل نہیں تھے، اس لیے ملاقات سے متامل تھے۔ بہر حال مرزا جلال الدین کا اصرار غالب آیا اور مرزا صاحب ہی آپہنچ گورنمنٹ ہاؤس میں اپنی کار پر پہنچا آئے۔ گورنر نے علامہ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اخبار نویس سے ان کا تعارف لرایا اور خود دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ علامہ اور اس اخبار نویس کے درمیان کافی دیر چائے کی پیالی پر علمی گفتگو ہوتی رہی۔ جب رخصت کا وقت قریب آیا، تو گورنر کا پیغام ملا کہہ جانے سے پہلے مجھے سنتے جائے۔ اقبال ان کے کمرے میں گئے، تو گورنر نے کہا: اقبال! مجھے انتہائی افسوس ہے کہ حکومت نے آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنے میں تمنایں روا رکھا ہے۔ میں اس وقت خطابات کی سفارش کر رہا ہوں۔ ہر میری خواہش ہے کہ آپ کے لیے ”سر“ کے خطاب کے لیے سفارش کی جائے۔ لیکن علامہ نے انکار کیا اور کہا کہ میں خطابات و اعزازات کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اور یوں بھی اسلام معاشی امتیازات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ علامہ نے دیکھا کہ ان کے انکار سے گورنر کے چہرے پر تکدر کے آثار نمایاں ہیں اور یہ قدرتی بات تھی۔ لیونکا گورنر نے سوچا ہوا کہہ ملکی فضا کے پیش نظر چند خطابات ماننے سے گریز کر رہے ہیں۔ اس پر اقبال نے کہا کہ اگر اس انکار نے علامہ کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو مجھے تامل نہیں۔ اس پر گورنر نے ہنس پر شگفتگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔

اس کے بعد گورنر نے بتایا کہ ”شمس العلماء“ کے خطاب کے لیے اس سال پنجاب سے کسی شخصیت کا انتخاب کیا جائے گا۔ میں نے بعض مسلمان معززین سے اس سلسلے میں تجاویز طلب کی ہیں۔ اگر آپ کے ذہن

میں کوئی نام ہو تو بتا دیں۔ اقبال نے کہا۔ میں صرف اس شرط پر نام تجویز کروں گا کہ اس کے بعد کسی اور نام پر غور نہ کیا جائے۔ گورنر نے کچھ دیر تامل کیا۔ پھر کہا۔ اچھا نام بتائیے۔ علامہ نے اپنے استاد مولوی سید میر حسن کا نام تجویز کیا۔ گورنر اس نام سے بے خبر تھے۔ بولے انہوں نے کون کون سی کتابیں تصنیف کی ہیں؟ علامہ نے فرمایا۔ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لیکن میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ہوں۔ وہ میرے استاد محترم ہیں۔ علامہ نے گورنر کو یہ بھی بتا دیا کہ مولوی میر حسن درویش قسم کے بزرگ ہیں۔ سرکار دربار میں حاضری ان کے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے اعلان خطاب کے بعد انہیں لاہور نہ بلائیے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ جب خطاب کا اعلان ہوا تو گورنر نے سند خطاب مولوی صاحب کے فرزند سید علی نقی شاہ کے سپرد کر دی جو گورنمنٹ ہاؤس میں ڈاکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ۶۔

حضرت علامہ کو سرکار خطاب مل گیا تو لاہور کے شہریوں کی طرف سے انہیں مقبرہ جہانگیر میں ایک شاندار عصر نہ دیا گیا۔ جس میں حکام بھی شریک ہوئے۔ اقبال نے اس موقع پر انگریزی زبان میں تقریر کی اور بتایا کہ وہ جرمن شاعر گوٹے کے دیوان مغرب کے جواب میں ”پیام مشرق“ لکھ رہے ہیں۔ مرزا جلال الدین راوی ہیں کہ اس تقریب میں گورنر بھی شامل تھے۔ اور ان کی موجودگی میں علامہ نے وہ اشعار سنائے جو ”طلوع اسلام“ کے ابتداء میں درج ہیں۔ اور ”انہوں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اعلیٰ کلمۃ الحق سے نہیں روک سکتی۔ ۸۔

جیسا کہ گذشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے ، سیاسی مسائل پر اظہار رائے میں اقبال کو جو حجاب درپیش تھے ، وہ ٹوٹ گئے ۔ اور اگرچہ وہ عملی سیاسیات کے کارزار میں ایک ہمہ گیر انداز میں داخل نہ ہوئے لیکن آہستہ آہستہ یہ رجحان بھی ختم ہوسے لگا ۔ جس سال علامہ کو خطاب ملا ، اسی سال پنجاب کی مجلس قانون ساز کے انتخابات ہونے تھے ۔ عوام چاہتے تھے کہ ان کی نمائندگی حضرت علامہ کی بلند مرتبت شخصیت کے سپرد ہو ۔ چنانچہ انہوں نے وفود بھیجے ، اخبارات میں اپیلیں شائع کیں اور اصرار کیا کہ علامہ لاہور کی نشست سے کونسل کی رکنیت کے لیے کھڑے ہوں ۔ علامہ کے مزاج کو یہ تجویز راس نہیں آئی تھی ۔ بہر حال پیہم اصرار کے پیش نظر انہوں نے نم رضامندی کا اظہار کر دیا ۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ اسی حلقے سے ان کے دوست میاں عبدالعزیز نارایت لاء کھڑے ہو رہے ہیں ۔ یہ سنا ، تو انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ۔ کیونکہ ان کی مروت نے گوارا نہ کیا کہ دوست کے ساتھ مقابلہ دیا جائے ۔ ۹

اس زمانے میں لچنہ غیرملکی شخصیات سے علامہ کی ملاقاتیں ہوئیں ۔ ان میں ایک علامہ عرووی تھے ۔ ان کا پورا نام علامہ عبدالعالی عرووی الظہرائی تھا ۔ بے حد ذہین اور طباع اور نہایت لسان آدمی تھے ۔ بہت اور کمیونزم کی طرف مائل تھے ۔ ان سے اقبال کی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں لیکن علامہ کا اطمینان نہ ہوا ۔ فروری ۱۹۲۳ء میں ترکیہ سے دو فوجی افسر ، میجر حیدر عذمت بے اور لیفٹیننٹ ایس آفندی افغانستان کے راستے برعظیم میں آئے ۔ لاہور میں ان کا زبردست استقبال ہوا ۔ ان کے اعزاز میں ایک پرجوش تقریب برپا کی گئی ، جس میں حضرت علامہ ، مولوی محبوب عالم ، مرزا جلال الدین ، حاجی میر شمس الدین ، عبدالعزیز مالک ،

غلام رسول مہر اور دوسرے ممتاز حضرات شامل تھے۔ سالک لکھتے ہیں :
 ”یہ دونوں ترک مجاہد حضرت علامہ کے ادب و احترام میں بچھے جاتے
 تھے اور کہتے تھے کہ ہم اپنے ترک بھائیوں سے زیادہ خوش قسمت ہیں
 کہ ہم نے حضرت علامہ کی زیارت کی ہے“۔ ۱۰۔

۱۹۲۳ء میں حضرت علامہ کو اسلام اور بالشویزم کے مسئلے پر
 ایک طویل بیان دینا پڑا۔ لیکن اس بیان کے تذکرے اور تجزیے سے پہلے
 پس منظر پیش کرنا ضروری ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں کارل مارکس
 نے اپنی مشہور کتاب داس کیپی ٹال (سرمایہ) لکھی۔ جس نے دنیا بھر
 کے دانشوروں اور ٹریڈ یونین کی سوچ پر اثر ڈالا۔ اس کتاب کا ماحصل
 یہ تھا کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری ایک قسم کی ڈکیتی ہے۔ اور
 اس کا مدار مزدوروں اور کسانوں کا خون چوسنے پر ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ
 نظام میں سرمایہ چند ہاتھوں میں مرتکز ہوتا چلا جائے گا اور مزدور طبقہ
 اتنا بے بس ہوگا، جتنا عہد غلامی میں بھی نہیں تھا۔ جب مزدوروں کی
 مظلومیت نقطہٴ عروج پر پہنچ جائے گی تو وہ متحد ہو کر انقلاب برپا
 کریں گے۔ اور ایک ایسا نظام وجود میں لائیں گے، جس میں ذرائع پیداوار
 عوام کے ہاتھ آجائیں گے اور نوع انسانی کی مجموعی بھلائی کے کام آئیں
 گے۔ اسی کو اشتراکیت کہتے ہیں۔ ابتداء میں اشتراکیت ایک معاشی
 نظریہ تھا۔ لیکن کارل مارکس اور آن کے ساتھیوں نے اسے حیات و کائنات
 کا ایک ہمہ گیر نظریہ بنا دیا۔ یورپ کے جن جن ملکوں میں صنعتی
 انقلاب آیا، وہاں انیسویں صدی کے اواخر سے سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں
 وجود میں آنے لگیں۔ جن کا نصب العین ایک اشتراکی معاشرے کا قیام
 تھا۔ اسی قسم کی ایک پارٹی روس میں بھی قائم ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں اس
 پارٹی کی دوسری کانگریس میں دو گروہ وجود میں آ گئے۔ ایک بالشویک

گروہ ، دوسرا منشویک گروہ - وجہ تسمیہ یہ تھی کہ بالشویک اکثریت کو کہتے ہیں اور منشویک اقلیت کو - اکثریتی گروہ ، بالشویک گروہ کی قیادت لینن کے ہاتھ میں تھی - ۱۹۱۲ء میں اکثریتی گروہ نے ایک علیحدہ اور باقاعدہ پارٹی کا روپ لے لیا جس کا نام "کل روس کمیونسٹ پارٹی (بالشویک) قرار پایا - نومبر ۱۹۱۷ء میں روس میں جو ہمہ گیر انقلاب آیا اور جس کے نتیجے میں ایک نیا معاشی نظام وجود میں آیا ، وہ اسی پارٹی کا لایا ہوا تھا - اور اب سوشلزم اور بالشویزم مرادف اصطلاحات بن گئیں - بلکہ بالشویزم کا لفظ زیادہ رائج رہا -

۱۹۱۷ء کے انقلاب کو روکنے اور ختم کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کی حامی قوتوں نے بین الاقوامی سطح پر بھی کوششیں کیں - لیکن یہ ناکام رہیں - اس انقلاب نے دنیا بھر کے بہت سے دانشوروں اور مزدور رہنماؤں کے خیالات کو متاثر کیا - اس سے ایک تو سرمایہ و محنت کی آویزش کا مسئلہ نمایاں ہوا - دوسرے ، یہ آرزو پرورش ہانے لگی کہ سوشلسٹ نظام دوسرے ملکوں میں بھی قائم کیا جائے - اور دنیا بھر میں روس کی قدر و منزلت اس لیے بھی بڑھی کہ وہ سامراجی نظام کا دشمن تھا - اس طرح روس سامراج دشمنی کی بھی ایک علامت بن گیا -

علامہ اقبال بھی اس سے متاثر ہوئے - لیکن ایک محدود انداز میں انہوں نے سوشلزم یا بالشویزم کا یورا فلسفہ تو قبول نہ کیا ، نہ اسے پختگی کے ساتھ اس عقیدے پر قائم تھے کہ اسلام ہی تمام معاشی اور معاشی ناہمواریوں کا صحیح حل پیش کرتا ہے - بہر حال جہاں تک سرمایہ و محنت کی آویزش اور سرمایہ دارانہ نظام کی استحصالی روس کا تعلق تھا ، اقبال نے لہلہ لڑ اپنے خیالات کا اظہار کیا - ان کی مشہور نظم "حضر راہ" اسی دور میں لکھی گئی - جس میں ایک بند تو تمام و لہل سرمایہ و

محنت کی آویزش، سرمایہ داری کی مذمت اور محنت کی حمایت کے لیے وقف تھا۔ اور باقی بندوں میں بھی اس طرف اشارے موجود تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ”پیام مشرق“ شائع کی۔ جس میں تین نظمیں انہی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک نظم میں فرانس کے مفکر کونت اور مزدور کے درمیان مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ کونت نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسانوں میں جو ناہمواریاں ہیں اور جو تفاوت ہے۔ وہ مطابق فطرت ہے۔ اور یہ تفاوت حسد اور کشمکش کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ مزدور کہتا ہے: ”حضرت کیوں حکمت کے پردے میں ہمیں دھوکا دے رہے ہو کہ یہ تفاوت فطری ہے۔ اس لیے اس کو برقرار رکھنا چاہیے۔ یہ ہمارے کارفرما اور سرمایہ اندوز، انسانیت کا کوئی صحت مند عضو نہیں۔ یہ تو چور ہیں۔ آپ کی عقل پر افسوس ہے کہ آپ نے چوروں کی حمایت کو حکمت کا لباس پہنایا ہے۔“ ایک اور نظم میں لینن اور جرن سامراج کے آخری نمائندے قیصر وایم کے درمیان مکالمے میں لینن کہتا ہے۔ کہ عرصہ دراز سے انسان بھاری چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہا ہے۔ ایک طرف انسانیت کا خون چوسنے والی اور اس کو غلام بنانے والی ملوکیت ہے اور دوسری طرف کلیسا اور حامیان مذہب کا استبداد۔ خواجہ کی قبا محنت کشوں کے خون ہی میں رنگی ہوئی ہے۔ بھوکے غلاموں نے آخر تنگ آمد بیچنگ آمد پر عمل کر کے اس قبا کو چاک کر کے سرمایہ داروں کو ننگا کر دیا ہے۔ عوام و جمہور کی بھڑکائی ہوئی آگ نے ردائے پیر کلیسا اور قبائے سلطانی کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ ۱۲۶۰ ایک اور نظم ”قسمت نامہ“ سرمایہ دار و مزدور، میں بھی یہی مضمون باندھا گیا ہے۔ ایک نظم ”نوائے مزدور، دنیا کے محنت کشوں کے لیے پیام انتقام ہے۔“ کھدر پوش مزدور کہتا ہے کہ بہاری محنت کے سرمائے سے ناکردہ کار سرمایہ دار ریشمیں قبا پہنتے ہیں۔ ان کے اعلیٰ و گہر ہمارے خون کے قطرے اور ہمارے

بچوں کے آنسو ہیں - کلیسا بھی ایک جونک ہے ، جو بہارا خون چوس کر موٹی ہو رہی ہے - سلطنتیں بہاری قوت بازو سے مضبوط ہوتی ہیں لیکن ان سے ہمیں کچھ حاصل نہیں - یہ تمام باغ و بہار بہارے گریہ، سحر اور خون جگر کی پیداوار ہے - آؤ ان تمام اداروں کے ساغروں میں ایک شیشہ گداز شراب انڈیل دیں - آؤ اس چمن حیات میں بہارے خون جگر سے لالہ گل پیدا کرنے والوں سے انتقام لیں - بے درد شمعوں کے طواف میں اپنے آپ کو پروانہ وار سوخت کرنا ختم کریں اور اپنی خودی سے آگاہ ہو کر خودداری اور آزادی کی زندگی بسر کریں - ۱۳۶۶

اس زمانے میں پنجاب کے چند نوجوان اشتراکیت کے زبردست حامی تھے - انہوں نے اسی کی نشر و اشاعت کے لیے کچھ دیر "انقلاب" کے نام سے ایک ماہ نامہ بھی نکالا ، جس کے مدیر شمس الدین حسن تھے - انہی نوجوانوں میں پروفیسر غلام حسین بھی شامل تھے - وہ ایڈورڈز کالج پشاور کے استاد تھے - نومبر ۱۹۲۲ء میں ملازمت چھوڑی اور لاہور آ گئے - اور "انقلاب" میں کام کرنا شروع کیا - دو چار پمفلٹ بھی لکھے - ۱۹۲۳ء میں بالشویک مائزس کے مقدمے میں گرفتار ہو گئے - آخر کار وہ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور مدتوں اسلامیہ کالج لاہور میں معاشیات کے استاد رہے - جن دنوں غلام حسین اسپر فرنک تھے ، ان کے رفیق کار شمس الدین حسن نے ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کے "زمیندار" میں ایک مضمون لکھا جس کے دوران میں لکھا کہ بالشویزم کی حمایت کوئی جرم نہیں - ان کے اپنے الفاظ یہ تھے :

"بالشویک نظام حکومت کارل مارکس کے فلسفہ سیاست کا سبب لباب ہے - اور کارل مارکس کے فلسفے کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے - ان حالات سے اگر

کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی خضر راہ اور پیام مشرق کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ بھی ہیں۔ پیام مشرق میں قسمت نامہ، سرمایہ دار و مزدور اور نوائے وقت کے عنوان سے جو مختصر سی نظمیں لکھی ہیں، ان سے قطع نظر کر کے صفحہ ۱۵۶ کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلک شبیرم آرزوست

کیا ایسے اشعار کی موجودگی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال ایک انتہائی خیالات رکھنے والے اشتراکی نہیں ہیں؟“ ۱۴

آسی دن علامہ اقبال نے یہ بات کسی سے سنی اور اخبار دیکھے بغیر فی الفور مدیر ”زمیندار“ کے نام ایک طویل مراسلہ بھیجا۔ جو ۲۴ جون کے شمارے میں چھپ گیا۔ علامہ نے پہلے پیراگراف میں بالشویک خیالات رکھنے والوں کو دائرہ اسلام سے اخراج کے مترادف قرار دیا۔ اصل مسئلہ پر انہوں نے جو کچھ لکھا۔ اس کا مکمل متن پیش کیا جاتا ہے:

”میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانیت جاعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا یہ طریق نہیں۔ کہ

معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث حرمت ربا اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے۔ اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے۔ روسی بالشویزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست رد عمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشویزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارتاً ذکر کیا ہے۔ شریعتِ حقہٗ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بناء پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے۔ اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔

”اسلام سرمائے کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا۔ بلکہ فطرت انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے۔ اور ہمارے لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا اور ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے فیما بینہم بینہم اخوانا۔ میں نے اسی نعمت کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں۔ اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے موثر نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ داری کی

قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنا ہے۔ پورپ اس نکتہ کو نظر انداز کر کے آج آلام و مصائب کا شکار ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام قومیں اپنے اپنے ممالک میں ایسے قوانین وضع کریں، جن کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجود نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی، جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں گے، جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔“ ۱۵

گویا اقبال بالشویزم کو ایک نظریہٴ حیات کے طور پر قبول نہیں کرتے تھے کیونکہ یہ اسلامی نظریہٴ حیات سے متصادم ہے۔ لیکن وہ سرمایہ دارانہ نظام کے نئے روپ کو لعنت قرار دیتے تھے۔ وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سرمایہ دارانہ نظام کو مناسب حدود میں رکھنے کے حامی تھے۔ اور چاہتے تھے کہ مساوات پر مبنی ایک منصفانہ اور عادلانہ معاشی اور معاشی نظام قائم کیا جائے۔ وہ روسی نظام کے اس نصب العین

کو تو پسند کرتے تھے کہ معاشری اور معاشی اونچ نیچ ختم ہو جائے۔ لیکن اس کے طریق کار سے اختلاف رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے سرمایہ و محنت کی آویزش پر جو کچھ لکھا، اسے آن کے پیغام کے مجموعی تناظر میں دیکھنا مناسب ہے۔

حوالے

- ۱ - "مطالعہ اقبال" - ص ۳۲ -
- ۲ - "اقبال نامہ" جلد اول - صفحات ۲۰۶-۲۰۷ -
- ۳ - "مکاتیب اقبال بنام گرامی" - ص ۱۸۷ -
- ۴ - "اقبال نامہ" جلد اول - ص ۲۳۳ -
- ۵ - "رباعیات گرامی" - ص ۳۰۰ -
- ۶ - "ذکر اقبال" - صفحات ۱۳۰-۱۲۸ -
- "ملفوظات اقبال" - صفحات ۲۴-۱۲۳ -
- "روزگار فقیر" جلد اول - صفحات ۴۴-۴۲ -
- ۷ - "ذکر اقبال" - ص ۱۱۷ -
- ۸ - "ملفوظات اقبال" - ص ۱۲۵ -
- ۹ - "ذکر اقبال" - ص ۱۲۰ -
- ۱۰ - ایضاً - صفحات ۱۱۵، ۱۲۲ - بحوالہ "زمیندار" - فروری ۱۹۲۴ -
- ۱۱ - "فکر اقبال" - صفحات ۲۴۹-۲۴۸ -
- ۱۲ - ایضاً - ص ۲۵۰ -
- ۱۳ - ایضاً - ص ۲۵۴ -
- ۱۴ - "خطوط اقبال" - صفحات ۱۵۳-۱۵۴ - (بحوالہ "زمیندار" - ۲۳ جون ۱۹۲۳ - ص ۳)
- ۱۵ - ایضاً - صفحات ۵۷-۱۵۵ - (بحوالہ "زمیندار" - ۲۴ جون ۱۹۲۳ -

بارہواں باب

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک : ادبی مسائل ، تصنیف و تالیف اور

انجمن حمایت اسلام

۱۹۱۷ء میں حضرت علامہ نے ادب کے مقصدی پہلو کی طرف جو اشارات ”ستارہ صبح“ میں ایک مختصر مقالے کے دوران میں کیے تھے ، اس دور میں ان کی وضاحت ہو گئی ۔ اور یوں حضرت علامہ کا نظریہ ادب زیادہ تفصیل کے ساتھ منظر عام پر آ گیا ۔ ۱۹۱۹ء کے آغاز کا ذکر ہے ۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں : ”شاعری محض محاورات اور اظہار بیان کی صحت سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے ۔ میرے معیار تنقید نگاروں کے ادبی معیاروں سے مختلف ہیں ۔ میرے کلام میں شاعری محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے ۔ مجھے قطعاً یہ خواہش نہیں کہ دور حاضر کے شعراء میں میرا بھی شمار ہو ۔“ اسی سال سید سلیمان ندوی کے نام لکھتے ہیں : ”شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں ۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس ۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ، ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں ۔ کیا عجب ، کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں ۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکالی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں ۔ ۲۰۰۰ چند سال بعد ۱۹۲۳ء میں سردار عبدالرب نشتر کے نام ایک مکتوب میں لکھا ۔ ”۔۔۔ زبان کو میں ایک بت تصور نہیں

کرتا جس کی پرستش کی جائے۔ بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔،، ۳

ان مکاتیب کے مطالعہ سے ہم یہ نتیجہ آسانی کے ساتھ اخذ کر سکتے ہیں کہ اقبال فن برائے فن کے قائل نہیں تھے۔ وہ فن برائے مقصد پر یقین رکھتے تھے۔ بلکہ فن برائے انقلاب کے نظریے پر عمل پیرا تھے۔ انہوں نے اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی کہ ادب یا فن میں خیال کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا اسلوب کو۔ جہاں تک ان کی اپنی ذات اور اپنے فن کا تعلق تھا، انہیں یہ کہنے میں حجاب محسوس نہ ہوا کہ اس میں خیال کی اہمیت غالب ہے اور اسلوب ثانی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خیال کے پہلو بہ پہلو آن کا اسلوب بھی نمو پاتا رہا۔ اور خیال اور اسلوب، دونوں سے برعظیم کے بے شمار ادیب اور شاعر متاثر ہوئے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، انہوں نے شعر میں فارسی اور اردو کو ذریعہ اظہار بنایا اور نثر میں انگریزی اور اردو کو۔ اس تنوع کا باعث یہ تھا کہ بعض مطالب کو فارسی میں بہتر طریقے پر بیان کیا جا سکتا تھا اور بعض مطالب کو انگریزی میں۔ لیکن جن خیالات کو عوام تک پہنچانا مقصود تھا، ان کا اظہار اردو میں کیا۔

علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد ہم عصر تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ قوم میں بیداری کا شعور اور احساس پیدا کرنے میں اقبال نے پہل کی۔ اور جیسا کہ ہم ایک گذشتہ باب میں لکھ چکے ہیں، مسلم قومیت کا تصور بھی واضح طور پر ابھرا تو اقبال کی نثری اور شعری تحریروں کی

بدولت - مولانا آزاد لکھتے تو پہلے بھی تھے۔ لیکن ان کا اصل کام
 ”المہلال“ سے شروع ہوا۔ جس کا اجراء ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ اور اس میں
 کوئی شبہ نہیں کہ اقبال نے آزاد کے خیالات کو پسند کیا۔ اس لیے
 کہ آزاد کے ابتدائی خیالات اقبال کے خیالات سے ہم آہنگ تھے۔ چنانچہ
 اقبال نے ”المہلال“ کے لیے دس خریدار بھی فراہم کیے اور اپنے دلاء
 سے بھی نوازا۔ جب ”المہلال“ کی بندش کے بعد مولانا آزاد نے ۱۰ اکتوبر
 ۱۹۱۵ء کو ”البلاغ“ کے نام سے ایک نیا ہفت روزہ جاری کیا تو اس
 کے پہلے شمارے کے صفحہ اول پر علامہ اقبال کی یہ نظم چھپی گئی :

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
 تصدق جس پہ حیرت خانہ سینا و فارابی
 فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
 میسر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشک عنابی
 مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
 نہیں ہنگامہ عالم میں اب سامان نے تابی
 تغیر آگیا ایسا مزاج اب عالم میں
 کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سہمی
 افغان نیم شب شاعر کی بارگوش ہوتی ہے
 نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف بے خوابی
 دسی کا شعلہ فریاد ہو نعلت رہا کیوں کر
 گرہاں ہے شب ہرستوں پر سحر کی آہاں تابی

صدا تربت سے آئی ، ”شکوہ اہل جہاں کم کن
نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی“

علامہ کو مولانا آزاد سے جو تعلق خاطر تھا ، وہ اس خط سے بھی واضح
ہوتا ہے جو انہوں نے آزاد کی رانچی کی نظربندی سے رہائی پر ۳ اپریل
۱۹۱۹ء کو سید سلیمان ندوی کے نام لکھا۔ فرماتے ہیں : ”الحمد لله ،
کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی۔ کیف باطن میں بالخصوص آج کل صحو
ہی کی ضرورت ہے۔ نبی کریمؐ نے صحابہ رضی کی تربیت اسی حال میں کی
تھی۔ سکر کی حالت عمل کی دشوار گزار منزل کو طے کر لینے کے بعد
ہو تو مفید ہے۔ باقی حالات میں اس کا اثر روح پر ایسا ہی ہے جیسا
جسم پر افیون کا۔ مولانا آزاد اب کہاں ہیں۔ پتہ لکھیے کہ ان کی
خدمت میں عریضہ لکھوں۔“ ۵

سات مہینے بعد ان تعلقات میں رخنہ پڑ گیا۔ کیونکہ مولانا آزاد کا
”تذکرہ“، منظر عام پر آیا تو اس میں ”الہلال“، پریس کے مینجر مولوی
فضل الدین احمد نے اپنے دیباچے میں لکھا کہ ”اقبال کی مشنویاں تحریک
الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں۔۔۔ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے
پہلے سنئے گئے ، ان میں اور مشنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے“۔ علامہ
نے مالک سے ایک ملاقات کے دوران میں اس تحریر پر افسوس کا اظہار
کیا۔ مالک لکھتے ہیں : ”راقم نے عرض کیا کہ مولوی فضل الدین
احمد نے حقیقتاً غلط لکھا۔ ان کو آپ کے مسلک و مذہب کے متعلق کچھ
بھی معلوم نہیں۔ انہیں لکھنے پڑھنے سے کیا سروکار۔ وہ تو مطبع الہلال
کے مہتمم تھے۔ اس کے بعد راقم نے چند ایسے فقرے کہے ، جن سے
مقصود یہ تھا کہ علامہ کے دل میں مولانا ابوالکلام کے متعلق کوئی

کدورت باقی نہ رہے۔ خدا جانے یہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں۔ بہر حال چونکہ راقم نظم و نثر اور جذبات اسلامی میں ان دونوں ہستیوں سے یکساں مستفید ہوا تھا، اس لیے اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کی۔ ۶

بہر حال اس غلط بیانی پر علامہ کا اضطراب قائم رہا۔ چنانچہ ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء کو انہوں نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب میں مولوی فضل الدین احمد کے دیباچے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا: ”شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر و انگریزی و اردو موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں۔ بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا تحریک الہلال نے آئے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دلآزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے منئے گئے، ان میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے کیا سنا تھا۔ اور سنی سنائی بات پر اعتبار کر کے ایسا جملہ لکھنا، جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں کسی طرح ان لوگوں کے شایان شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ ۷

معلوم نہیں کہ سید سلیمان ندوی نے کیا جواب دیا اور علامہ کی شکایت مولانا ابوالکلام تک پہنچائی یا نہیں۔ لیکن دو سال بعد جناب عشرت

رحمائی نے جب قومی بیداری کو اقبال کی مساعی سے منسوب کیا تو علامہ کی طبیعت میں قدرے انشراح پیدا ہوا۔ آپ نے جواب میں لکھا : ”زبا بہ اس ، کہ موجودہ بیداری کا سہرا میرے سر پر ہے یا ہونا چاہیے۔ اس کے متعلق کیا عرض کروں۔ مقصود تو بیداری سے تھا۔ اگر بیداری ہندوستان میں میرا نام تک بھی نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں۔ لیکن آپ کے اس ریمارک سے مجھے بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس بات کا شاید کسی کو احساس نہیں۔ مولوی ابوالکلام صاحب آزاد کے تذکرہ کا دیباچہ لکھنے والے بزرگ نے جن الفاظ میں محمد علی ، شوکت علی اور میری طرف اشارہ کیا ہے ، ان سے میرے اس خیال کو اور تقویت ہو گئی ہے۔ لیکن اگر کسی کو بھی اس کا احساس نہ ہو تو مجھے اس کا رنج نہیں۔ کیونکہ اس معاملے میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل بے غرض ہوں۔“ ۸

”بازگ درا“ ستمبر ۱۹۲۳ء میں چھپ کر تیار ہوئی۔ اس کی ترتیب کیسے ہوئی ، کتب ہوئی۔ اس کا ایک پس منظر ہے۔ علامہ کا اردو کلام بے حد مقبول تھا۔ اخباروں اور رسالوں میں چھپتا یا علامہ خود محفلوں میں سناتے تو لوگ اسے نقل کرنے کے محفوظ کر لیتے۔ یہ عادت بہت سوں کی تھی۔ والد مرحوم مولانا عبدالمجید سالک نے بھی عنفوان شباب میں علامہ کے کلام کی ایک بیاض تیار کر رکھی تھی جو میرے پاس موجود ہے۔ بعض لوگوں نے علامہ سے اجازت چاہی کہ ان کا کلام کتابی صورت میں چھاپ لیں۔ لیکن وہ نہ مانے۔ وجہ یہ تھی کہ ایک تو اخباروں اور رسالوں میں مطبوعہ کلام میں کتابت کی غلطیاں موجود تھیں۔ دوسرے ، بہت سے اشعار ، بلکہ بہت سی نظمیں ایسی تھیں جنہیں اقبال حذف کرنا چاہتے تھے۔ اور اتنی فرصت نہیں تھی کہ جم کر بیٹھیں

اور اردو مجموعہ کلام مرتب کر لیں۔ بہر حال آرزو موجود تھی۔ ۱۹۱۶ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔ ”افسوس ہے کہ مجموعہ اشعار اب تک شائع نہ ہو سکا۔ امید ہے کہ جنگ کے بعد شائع ہوگا۔“ ۹ مولوی احمد دین نے ”اقبال کی شاعری“ کے نام سے ایک کتاب چھاپی جس میں علامہ کی بہت سی نظمیں آگئیں۔ علامہ نے اسے بہت ناپسند کیا اور آخر مولوی احمد دین نے تمام نسخوں کو نذر آتش کر دیا۔ ۱۰ علامہ کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے بہت سا کلام جمع کر رکھا تھا۔ ایک دوست نے کہا۔ علامہ سے اجازت لے لو۔ مجموعہ میں چھاپ دوں گا۔ چنانچہ شیخ اعجاز احمد نے علامہ کے نام خط لکھا لیکن علامہ نے ۱۰ جنوری ۱۹۲۱ء کے مکتوب میں لکھا کہ مجھے یہ تجویز منظور نہیں کیونکہ میں خود مجموعہ مرتب کر رہا ہوں۔ ۱۱

معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے محض ٹالا نہیں تھا بلکہ وہ واقعی مجموعے کی ترتیب فرما رہے تھے۔ اور اس کی اشاعت کے لیے اسی طرح سے مالی امداد کی پیشکش بھی ہوئی تھی۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۰ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ”میں مجموعہ مرتب کر رہا ہوں۔ کچھ نظموں کی نظر ثانی باقی ہے۔ بعض نوات مند دوستوں نے اسے نہایت عمدہ رائے پر چھاپنے کا تہیہ کیا ہے۔ ان کی خواہش ہے۔ روپیہ وہ خرچ کریں اور فائدہ تمام وکل میں الٹھاؤں۔ دل اس کے قبول کرنے میں بھی مستعد ہے۔“

معلوم ہونا ہے کہ علامہ کی مصروفیات اتنی تھیں کہ اس نام پر کبھی توجہ دیتے تھے اور کبھی غافل ہو جاتے تھے۔ لیکن جون ۱۹۲۲ء میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے انہیں مجبور کر دیا کہ اس نام پر جم کر اور پوری سنجیدگی کے ساتھ توجہ دیں۔ ہوا یہ کہ حیدرآباد دکن کے ایک اہل علم شخص عبدالرزاق راشد نے ”ایات اقبال“ کے نام سے

ایک ضخیم مجموعہ اقبال سے پوچھے بغیر چھاپ دیا۔ اس پر علامہ کا رد عمل کیا تھا؟ اس سلسلے میں خلیفہ عبدالحکیم کا یہ بیان ہماری رہنمائی کرتا ہے: ”عرصے سے احباب مصر تھے کہ اپنا مجموعہ کلام چھپواؤ۔ لیکن وہ سن کر ٹال دیتے تھے۔ اس بارے میں یہاں تک ٹال مٹول ہوئی کہ حیدرآباد میں ایک صاحب نے اخباروں اور رسالوں سے ان کی تمام مطبوعہ نظمیں جمع کر کے، ان کی اجازت کے بغیر اور بغیر ان کو خبر کیے، ایک مجموعہ چھپوا کر فروخت کرنا شروع کر دیا۔ جس سے وہ بہت برہم ہوئے۔ کوئی اچھا شاعر اپنے مختلف زمانوں کا کلام جوں کا توں شائع نہیں کرنا چاہتا۔ بعض نظموں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ دنیا انہیں فراموش کر دے۔ بعض اشعار میں رد و بدل کرتا ہے۔ کہیں کچھ مٹاتا ہے، کہیں کچھ اضافہ کرتا ہے۔ کچھ نہ پوچھیے کہ ان صاحب نے کیا غضب کیا اور اقبال کو ان پر کس قدر غصہ آیا۔“، ۱۳

خلیفہ عبدالحکیم، عبدالرزاق راشد کے ہم جماعت رہے تھے۔ انہوں نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ادھر اقبال نے سر اکبر حیدری سے بھی دباؤ ڈلوایا۔ چنانچہ یہ مفاہمت طے پائی کہ عبدالرزاق راشد ایک ہزار روپیہ بطور رائٹی اقبال کو ادا کریں۔ یہ رقم خلیفہ عبدالحکیم کی وساطت سے ادا ہوئی۔ دوسری شرط یہ تھی کہ ”کلیات اقبال“ حیدرآباد دکن سے باہر فروخت نہ کی جائے۔ اور تیسری یہ، کہ اس کا دوسرا ایڈیشن نہ چھاپا جائے۔ ۱۴

ادھر یہ نامہ و پیام جاری تھا، ادھر علامہ نے چند مہینے کے اندر اندر ”بانگ درا“ مرتب کر کے چھاپ دی۔ چونکہ کتاب کی فروخت علامہ کے بس کا روگ نہیں تھا، اس لیے انہوں نے پہلے ایڈیشن کے پورے تین ہزار نسخے شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی کے ادارے دارالاشاعت پنجاب کے سپرد کر دیے۔ اور ادارے نے اپنی کمیشن وضع کر کے کتابوں

کی قیمت علامہ کو ادا کر دی ۱۵۔ ”بانگِ درا“ بے حد مقبول ہوئی۔ دو سال بعد پانچ ہزار نسخوں کا ایک اور ایڈیشن چھاپا گیا۔ ۱۹۶۲ء تک اس کے اکیس ایڈیشن چھپ چکے تھے، جن کے نسخوں کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تھی ۱۶۔ اتنا قبولِ عام علامہ کی کسی اور کتاب کو نصیب نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فارسی مجموعوں سے صرف اہل علم ہی مستفید ہو سکتے تھے لیکن اردو کلام سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا تھا۔ یوں بھی ”بانگِ درا“ ہماری قومی اور سیاسی تاریخ کے ایک پورے ربع میں عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمان تھی۔ اور اقبال عوام میں جانے پہچانے گئے اور ان کے محبوب بنے تو اصلاً اردو کلام ہی کی وجہ سے۔ پھر اس کتاب کی ایک اور بڑی خوبی یہ تھی کہ کلام کی ترتیب تاریخ وار ہوئی۔ اس طرح عوام اس قابل ہوئے کہ علامہ کے فکری ارتقاء سے آگاہ ہو سکیں۔

بہر حال اس دور میں علامہ کی بیشتر فکری توجہ ”پیامِ مشرق“ پر مرکوز رہی یہ کتاب یکم مئی ۱۹۲۳ء کو منظرِ عام پر آئی۔ اس کا پورا نام ہے ”پیامِ مشرق: در جواب دیوان شاعر الہانوی گوئیٹے۔ گوئیٹے کے ”مغربی دیوان“ کے بارے میں جرمنی کے شاعر ہائٹا نے لکھا: ”یہ ایک گلدستہ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے۔۔۔ اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے میں حرارت کا متلاشی ہے“۔ علامہ نے دیباچے میں گوئیٹے کے سوانح نگار بیل سوشکی کی تحریر سے یہ اقتباس دیا:

”بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئیٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی

سر زمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت ،
 وہی آسانی محبت ، وہی سادگی ، وہی عمق ، وہی جوش و حرارت ،
 وہی وسعت مشرب ، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے
 آزادی ! غرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا شیل پاتے
 ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب و ترجمان اسرار ہے ، اسی
 طرح گوئیٹے بھی ہے۔ اور جس طرح حافظ کے بند ظاہر سادہ الفاظ
 میں ایک جہان معنی آباد ہے ، اسی طرح گوئیٹے کے بے ساختہ پن
 میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و
 غریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت
 کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا۔ یعنی
 حافظ نے تیمور کو اور گوئیٹے نے نپولین کو۔ اور دونوں عام
 تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و
 سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے
 میں کامیاب رہے۔

اس کے بعد علامہ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ گوئیٹے کی مشرقیت
 محض عارضی ہے۔ اور وہ بھی ایسی ، جسے مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے۔
 عجمی تصوف سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ وہ تغزل محض کا دلدادہ تھا
 اور کلام حافظ کی صوفی تعبیر سے اسے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ ”پیام
 مشرق“ کے بارے میں اقبال نے لکھا :

”اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی ، مذہبی اور ملی حقائق کو
 پیش نظر لانا ہے ، جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے
 ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کے جرمی اور مشرق کی موجودہ حالت
 میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام

عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے ۔

یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے ۔ اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے ۔

یورپ نے اپنے علمی ، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں ۔ لیکن افسوس کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست مدبرین اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے جو انسانی خمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے ۔ خالص ادبی اعتبار سے دیکھیں تو جنگ عظیم کی کوفت کے بعد یورپ کے قوائے حیات کا اضمحلال ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشوونما کے لیے نامساعد ہے ۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ اقوام کی طبائع پر وہ فرسودہ ، مست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت غالب نہ آجائے جو جذبات قلب کو افکار و خیالات سے متمیز نہیں کر سکتی ۔۔۔

”مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل ترقی کے بعد آنکھ کھولی ہے ۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس ہونا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو ۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر

سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے خمیر میں
 متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون، جس کو قرآن نے
 ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بانفسهم کے سادہ اور
 بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی
 دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اور میں نے اپنی فارسی تصانیف
 میں اس صداقت کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی ہے“ ۱۷

”پیام مشرق“ کا پہلا ایڈیشن ایک ہزار نسخوں پر مشتمل تھا۔ یہ
 ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اگلے سال ایک ہزار کا اور ایڈیشن چھاپا گیا۔ جس
 سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل علم نے اس کا کتنا پر جوش خیر مقدم کیا۔

علامہ نے مالی یافتگی کی خاطر سکولوں کے لیے کچھ درسی کتابیں
 بھی لکھیں۔ ان میں اولین تاریخ ہند، تھی جو ۱۹۱۳ء میں گورنمنٹ کالج
 کے استاد تاریخ لالہ رام پرشاد کے تعاون سے لکھی۔ ۱۹۲۳ء میں سلسلہ
 ادبیہ کے نام سے حکیم احمد شجاع کی رفاقت میں چھٹی، ساتویں اور آٹھویں
 جماعتوں کے لیے جدید اردو نصاب تیار کئے، ۱۸، ۱۹۲۲ء میں میٹرکولیشن
 کے طلبہ کے لیے فارسی نصاب کی ترتیب کا خیال آیا۔ مواد کی تلاش بھی
 کی۔ ۱۹ لیکن یہ کتاب چند سال بعد تیار ہو سکی۔

حضرت اکبر الہ آبادی سے علامہ کو بے حد عقیدت تھی۔ عرصے
 تک ان سے خط و کتابت رہی۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں اکبر الہ آبادی اللہ کو
 پیارے ہوئے تو اقبال نے ان کے فرزند کے نام ایک خط میں لکھا:
 ”اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں
 ہوئی۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر
 نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے۔ زمانہ

سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے ، جب جا کے ایک اکبر آسے ہاتھ آتا ہے ۔ کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بد قسمت ملک اور اس کی بد قسمت قوم کے لئے کچھ عرصہ اور جاری رہتا۔،، ۲۰ بیٹے کے انتقال پر اپنے دوست محمد الدین فوق سے جس انداز میں تعزیت کی ، وہ درج کرنے کے قابل ہے ۔ افسوس کے بعد لکھا : ”مولوی عبداللہ غزنوی حدیث کا درس دے رہے تھے کہ ان کو اپنے بیٹے کے قتل کی خبر موصول ہوئی ۔ ایک منٹ تامل کیا ، پھر طلبہ کو مخاطب کر کے کہا مابہ رضائے او راضی ہستیم ۔ بیاید کہہ کر خود بکنیم ۔ یہ کہہ کر پھر درس میں مصروف ہو گئے ۔ مخلص مسلمان اپنے مصائب کو بھی خداتعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔“ - ۲۱

جسٹس شادی لال یوں تو پنجاب کی عدالت عالیہ سے منسلک تھے اور ان سے غیر جانب داری کی توقع ہونی چاہیے تھی لیکن وہ ججی کے دوران میں بھی سیاست بازی فرماتے تھے ۔ ایک دفعہ انہوں نے چاہا کہ علامہ اور سر محمد شفیع کے درمیان پھوٹ ڈالی جائے ۔ چنانچہ علامہ نے دوست مرزا جلال الدین سے نجی گفتگو کے دوران میں کہا کہ سر محمد شفیع اکثر اقبال کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کے کردار پر بھی حملہ کرتے ہیں ۔ اگر اقبال میرے ساتھ مل کر کام کریں تو ان کا مستقبل روشن جائے گا ۔ مرزا صاحب نے علامہ سے تذکرہ کیا تو انہوں نے اس سوال میں پھنسنے سے صاف انکار کر دیا ۔ اور کہا کہ شادی لال کی مصلحت ہے ۔ وہ میاں فیملی کا حریف ہے اور بعض مسلمانوں کو ساتھ ملا کر اس خاندان کو نیچا دکھانا چاہتا ہے ۔ آخر مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ اس بکھیڑے میں پڑوں ۔ ۱۹۲۵ء میں شادی لال چیف جسٹس ہو گئے ۔ ایک مسلمان جج کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا ، مسلمان اخباروں اور انجمنوں نے

مطالبہ کیا کہ جج کے عہدے پر حضرت علامہ کو فائز کیا جائے۔ لیکن شادی لال کو تو یہ علم تھا کہ علامہ آن کے آلمہ کار نہیں بنتے۔ چنانچہ انہوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، قانون دان کی حیثیت سے نہیں،،۔ اس طرح علامہ جج مقرر نہ ہو سکے۔ ۲۲

اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مسجد وزیر خان کے خطیب مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ نے حضرت علامہ پر کفر کا فتوے صادر کیا۔ اور اعلان کیا کہ جب تک اقبال توبہ نہ کریں، تمام مسلمان آن سے ملنا جلنا ترک کر دیں۔ ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔ یہ ایک بہت بڑی دھاندلی تھی۔ چنانچہ چاروں طرف شور مچ گیا۔ مولوی دیدار علی صاحب پر طعن و ملامت ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس فتوے کو جاہلانہ فتوے قرار دیا۔ سالک لکھتے ہیں: ”مولوی دیدار علی کی اس حرکت سے علمائے اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ کیونکہ مسلمانوں کے تمام طبقات عالم و عامی، قدیم تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال کو نہایت مخلص مسلمان، عاشق رسول، درد مند ملت اور حامی دین اسلام تسلیم کرتے تھے۔ اور کہتے تھے اگر ہمارے علماء کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے؟“ ۲۳

بات یہ ہوئی کہ اس زمانے میں برعظیم کے مسلمان مسئلہ حجاز میں الجھے ہوئے تھے۔ ایک گروہ سلطان ابن سعود کا حامی تھا دوسرا۔ مخالف اور دونوں گروہ مختلف مذہبی فرقوں سے تعلق رکھتے تھے اور فرقہ بندی کی بناء پر ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے۔ علامہ اقبال کے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ انہوں نے ابن سعود کو اچھے الفاظ میں یاد کیا تھا۔ اور مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ حجاز کی سیاست میں دخل

انداز نہ ہوں۔ علامہ کا نقطہ نگاہ خالص املاسی اور غیر فرقہ وار تھا لیکن ابن سعود کے مخالف علماء کو اس پر غصہ آیا۔ چونکہ دونوں فرقوں کے علماء کے درمیان تکفیر کا بازار گرم تھا، اس لیے کسی شخص کو تفریح سوجھی۔ اس نے ایک مصنوعی نام ”پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری“ سے مولوی دیدار علی کے نام ایک استفسار بھیجا، جس میں علامہ پر عجیب و غریب الزام تراشی۔ ملاحظہ فرمائیے استفتاء کا متن۔

”کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور حاسیان شرح متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات سے متصف کرے اور اس سے مرادیں طلب کرے، آخرت پر یقین نہ رکھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے استہزا کرے، علمائے کرام اور پیران عظام پر آوازے کسے اور انہیں برے خطابات سے یاد کرے، ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں، ’امام‘ اور ’چراغ ہدایت‘ کے الفاظ سے یاد کرے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو، کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین، نشست برخاست اور ہر طرح کا مذاطفہ کرنا جائز ہے یا ناجائز۔ اور نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ بینوا و تو جروا۔ اشعار حسب ذیل ہیں:-

آفتاب

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفل وجود کا سامان طراز تو
بزدان ساکنان نشیب و فراز تو

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
 زائیدگان نور کا ہے تاجدار تو
 نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
 آزاد قید اول و آخر ضیا تری

(ترجمہ گائیری منتر)

- ۲ - کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبی
 نمود ہر شے میں ہے ہماری کوئی بہارا وطن نہیں ہے
- ۳ - خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
 شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں
- ۴ - غضب ہیں یہ مرشدان خود ہیں خدا تری قوم کو بچانے
 بگاڑ کر تیرے مسلمانوں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں
- ۵ - رام کی تعریف میں فرماتے ہیں -

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
 مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
 ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
 اہل نظر سے جھتے ہیں اس کو امام ہند
 اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
 روشن تراز سحر ہے زمانے میں شام ہند
 تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
 پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا ۲۴

مولوی دیدار علی صاحب کو نہ شعری روایات سے آگہی تھی ، نہ ان اشعار کے سیاق و سباق کا علم تھا اور نہ ان کا کوئی ایسا ادبی پس منظر تھا کہ اشعار کو سمجھ سکتے - اقبال کے خلاف ابن سعود کی حمایت پر پہلے ہی سیخ پا تھے - انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور یہ فتویٰ جڑ دیا :

”اسم پروردگار اور یزدان عرفاً مخصوص ذات جناب باری ہے - اور اوتار ہندو کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں - اندریں صورت یزدان اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے - علی ہذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہین موسیٰ علیہ السلام بھی کفر اور توہین بزرگان دین فسق - لہذا جب تک ان کفریات سے قائل اشعار مذکور توبہ نہ کرے ، اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کر دیں - ورنہ سخت گنہگار ہوں گے -

ابو محمد دیدار علی الخطیب مسجد وزیر خان المرحوم،

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس فتویٰ کا حشر وہی ہوا جس کا یہ مستحق تھا اور حضرت علامہ کی مقبولیت میں قطعی طور پر کوئی فرق نہ آیا -

انجمن حمایت اسلام سے اقبال کی وابستگی ۱۸۹۹ء سے چلی آئی تھی - اس دوران میں وہ انجمن کی جنرل کونسل کے رکن بھی رہے اور کئی کمیٹیوں میں بھی شریک رہے - ۱۹۱۹ء کے اواخر میں انجمن میں دسٹری بندی بہت سنگین صورت اختیار کر گئی - اگلے سال ۲۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو انجمن کی بدعنوانیوں پر غور کرنے کے لئے مسلمانوں کا ایک جلسہ عام ہوا جس میں تجویز پیش کی گئی کہ نواب ذوالفقار علی خان کو انجمن کا صدر بنایا جائے - جنرل سیکرٹری کے عہدے پر حضرت علامہ اور حاجی میر

شمس الدین کو مقرر کیا جائے اور اسلامیہ کالج کی انتظامیہ کمیٹی کی صدارت پر میاں فضل حسین کو فائز کیا جائے۔ دو دن بعد انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا، جس نے رائے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور انہی حضرات کو عہدہ دار منتخب کر لیا۔ اپریل ۱۹۲۰ء کے آغاز میں انجمن کا سالانہ اجلاس ہوا جس کی صدارت سر ذوالفقار علی خان نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا: ”میں خود تو ناچیز ہوں۔ مگر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب جو آنریری سیکرٹری ہوئے ہیں ان کی نظیر ہندوستان بھر میں نہیں ملتی۔ ڈاکٹر صاحب میں حوصلہ اور علم ہے وہ کسی اور میں نہیں پائے جاتے۔ بہاری دعا ہے کہ وہ اپنی لیاقت نبی نوع انسان کی خدمت اور بہبودی میں صرف کریں۔“ یہ بھی اعلان ہوا کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ جو چندہ جمع کر رہے ہیں۔ اس میں پانسو روپے کی رقم کا اضافہ کریں گے جو علامہ اقبال کے سیکرٹری ہونے کی خوشہ میں کیا جا رہا ہے۔ ۲۶

چند مہینے بعد علامہ اقبال کو ایک بڑے مسئلے سے سابقہ۔ پڑا وہ یہ کہ آیا تحریک ترک موالات کے پیش نظر اسلامیہ کالج پنجاب یونیورسٹی سے تعلق توڑ لے اور حکومت سے گرانٹ لینا بند کر دے یا نہیں۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ کو تحریک خلافت سے جو دلچسپی تھی، اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ انہوں نے جنوری ۱۹۲۰ء میں ایک کمیٹی بنائی جس میں دوسرے کالجوں کے مسلمان طلبہ بھی شامل تھے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کے خلافت فنڈ کے لیے چندہ جمع کیا جائے۔ چنانچہ ۱۵ جون تک ایک ہزار چار سو تینتالیس روپے جمع ہوئے۔ جن میں سے ایک ہزار تین سو باون روپے مرکزی فنڈ کو بھیج دیے گئے۔ ۲۷

اس مسئلے پر انجمن کی کونسل کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں کافی بحث کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ یونیورسٹی سے الحاق برقرار رکھا جائے اور سرکاری امداد کا سلسلہ بھی جاری رکھا جائے۔ اس فیصلے کی رو سے پرنسپل ہنری مارٹن نے کالج کھول دیا۔ اور جن آٹھ طلبہ نے ترک موالات میں نمایاں حصہ لیا تھا، انہیں کالج چھوڑنے کا حکم دیا۔ انہوں نے انکار کیا تو کالج کمیٹی نے انہیں معطل کر دیا۔ اس پر کالج میں ہڑتال ہو گئی اسی دن لاہور میں ایک جلسہ عام ہوا، جس میں طلبہ سے بد سلوکی کے خلاف احتجاج کیا گیا اور پرنسپل کی برطرفی کا مطالبہ کیا گیا۔ جلسے کی طرف سے ایک وفد علامہ اقبال سے ملا اور معطلی کی کارروائی کے بارے میں دریافت کیا۔ تو علامہ نے کہا میں پرنسپل کی کارروائی کو سخت ناواقف سمجھتا ہوں لیکن کالج کمیٹی کے اندورنی معاملات میں مداخلت سے قاصر ہوں۔ اس پر وفد میاں فضل حسین سے ملا۔ لیکن وہاں سے مایوس کن جواب پایا۔ کالج میں ہڑتال کی وجہ سے حالات اتنے ابتر ہو گئے، کہ پرنسپل ہنری مارٹن کو معزول کرنا پڑا۔

انجمن کے ایک اور اجلاس میں اس مسئلے پر گرما گرم بحث ہوئی۔ علامہ نے کہا: ”میں ہمیشہ ہر معاملے کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں۔ اور جب تک کسی امر پر پورا پورا غور و خوض نہیں کر لیتا فطری رائے قائم نہیں کرتا۔ میں مسلمانوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ احکام شریعت کے احکام پر نہ چلے تو ہندوستان میں ان کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے بالکل تباہ ہو جائے گی۔“ بہت سے ارکان نے الحاق کے حق میں رائے دی۔ علامہ اقبال، حاجی میر شمس الدین اور مولای غلام محی الدین قصوری نے مشترکہ رائے کا اظہار کیا کہ ”ہم مذہب کو تمام چیزوں سے بالاتر سمجھتے ہیں اور علمائے کرام کو اپنا حکم سمجھتے ہیں۔ جمیعت

علمائے ہند جو کچھ فیصلہ کرے گی ، وہی ہماری رائے ہے ۔ ہم اسلام پر
سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں ۔ ۲۸۶۶

اس مسئلے پر حضرت علامہ نے اپنے موقف کا کھل کر اور وضاحت
کے ساتھ اعلان کیا تو اس طویل مکتوب میں ، جو ۱۸ نومبر ۱۹۲۰ء
کے زمیندار میں شائع ہوا۔ علامہ نے لکھا : ”مسلمانوں کے لیے نہ مسٹر گاندھی
کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے نہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہدایت نامہ ان کے لیے
دلیل راہ ہو سکتا ہے ۔ ان کو اپنے ہر فعل کے لیے خواہ انفرادی ہو خواہ
اجتماعی ، کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں نظام
کار تلاش کرنا چاہیے ۔ اور جو نظام کار ان دو مواخذ سے ملے ، اس پر عمل
پیرا ہونا چاہیے اور اس بات کا خیال تک بھی نہ کرنا چاہیے کہ ان کا
نظام عمل مسٹر گاندھی کے پروگرام کے مطابق ہے یا اس سے مختلف ہے۔“
علامہ کی تجویز یہ تھی اور انجمن نے بھی اسے قرار دار کی صورت میں
منظور کیا کہ ”انجمن حمایت اسلام اپنے طور پر علمائے پنجاب و ہندوستان
کی ایک کانفرنس کرے ۔ جس میں حالات حاضرہ سے واقف کار لوگ بطور
مشیر کام کریں“ ۔ اس کانفرنس میں مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور ہو اور
کثرت رائے سے فیصلہ کیا جائے لیکن مشیروں کو ووٹ دینے کا حق
حاصل نہ ہو ۔ جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو اسلامیہ کالج کا الحاق یونیورسٹی
سے برقرار رہے ۔ ۲۹

۳۱ جولائی ۱۹۲۲ء کو علامہ نے انجمن کی آذربری جنرل سیکرٹری
شپ سے استعفیے دے دیا ۔ اسے بڑی رد و کد بعد منظور کیا گیا ۔ اگلے سال
۸ جولائی کو انجمن نے پھر مجبور کیا تو آپ نے یہ عہدہ قبول کر لیا ۔
لیکن دس ماہ بعد اپنی مصروفیات کی بنا پر مستعفی ہو گئے ۔ بہر حال انجمن
کی سرگرمیوں سے وابستگی جاری رکھی ۔ ۳۰

حوالے

- ۱ - "خطوط اقبال"، - ص ۱۳۳ -
- ۲ - "اقبال نامہ"، جلد اول - ص ۱۰۸ -
- ۳ - ایضاً - ص ۵۶ -
- ۴ - "کاروان صحافت" - ص ۱۳۶ (بحوالہ "البلاغ" ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)
- ۵ - "اقبال نامہ" جلد اول - ۱۰۰-۱۰۱ -
- ۶ - "ذکر اقبال" - صفحات - ۱۰۳-۱۰۵ -
- ۷ - "اقبال نامہ" جلد اول - ۱۱۰-۱۱۱ -
- ۸ - ایضاً - صفحات ۳۲۷-۳۲۸ -
- ۹ - "انوار اقبال" - ص ۱۳۳ -
- ۱۰ - "مطالعہ اقبال" - ص ۳۵۳ -
- ۱۱ - "روزگار فقیر" جلد دوم - صفحات ۲۱۷-۲۱۸ -
- ۱۲ - "انوار اقبال"، - صفحات ۱۳۵-۱۳۶ -
- ۱۳ - "اقبال ریویو"، جنوری ۱۹۶۶ء - ص ۱۳۲ -
- ۱۴ - "مطالعہ اقبال"، - صفحات ۳۵۳-۳۵۶ -
- ۱۵ - ایضاً - ص ۳۶۲ - جناب سید عبدالواحد معینی کا بیان ہے کہ پہلے ایڈیشن کے دو ہزار نسخے چھپے تھے۔ لیکن "بانگ درا" میں ایڈیشنوں کا جو گوشوارہ درج ہے اس کے مطابق یہ ایڈیشن ہزار نسخوں پر مشتمل تھا۔
- ۱۶ - "روزگار فقیر"، جلد اول - ص ۲۱۵ -
- ۱۷ - "پیام مشرق"، - دیباچے سے تلخیص و اقتباس -
- ۱۸ - "انوار اقبال"، - صفحات ۲۱-۲۵ -
- ۱۹ - "اقبال نامہ"، حصہ دوم - ۱۶۰-۱۶۱ -

- ۲۰ - ”انوار اقبال“، - ص ۱۹۷ -
- ۲۱ - ایضاً - ص ۷۱-۷۲ -
- ۲۲ - ”ذکر اقبال“، - صفحات ۱۲۷-۱۲۶ -
- ۲۳ - ”ذکر اقبال“، - ص ۱۳۰ -
- ۲۴ - ”زمیندار“، - ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء -
- ۲۵ - ایضاً -
- ۲۶ - ”اقبال اور انجمن حمایت اسلام“ - صفحات ۵۷-۵۵ -
- ۲۷ - ”کریسنٹ“، (اسلامیہ کالج میگزین) - جلد ۱۴ - نمبر ۵ - جون ۱۹۲۰ء - صفحات ۱۲-۱۳ -
- ۲۸ - ”اقبال اور انجمن حمایت اسلام“، - صفحات ۶۳-۶۱ اور ۹۸-۹۵ -
فاضل مصنف نے معلومات کے حق میں ”زمیندار“ اور ”پیسہ اخبار“،
کے مختلف شماروں اور انجمن کی عروئدادوں سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔
- ۲۹ - ایضاً - صفحات ۱۰۳-۹۸ -
- ۳۰ - ایضاً - ص ۶۵ -



تیرہواں باب

انتخابی معرکہ

حضرت علامہ ملکی سیاسیات میں دخیل تو ضرور تھے لیکن وہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں تھے۔ اور وہ اس روش پر گمزن تھے کہ مسائل پر اظہار رائے تو کیا جائے لیکن حزبی کشمکش میں حصہ نہ لیا جائے۔ بہر حال ۱۹۲۶ء میں وہ ایک سیاسی جماعت نیشنل لیبرل لیگ میں شامل ہو گئے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو کشیدگی پیدا ہو رہی تھی، اس کو دور کرنے کی سعی کی جائے۔ ۱۹۲۶ء کے آغاز کی بات ہے، پنجاب میں ہندو مسلم کشمکش سے فضا مکدر تھی۔ مسلم قومیت کے بارے میں ان کے نظریات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ لیکن وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کا سر پھوڑتے رہیں۔ ان کی خواہش یہی تھی کہ دونوں قومیں اپنے فروعی اختلافات کو دور کریں اور بھائیوں کی طرح رہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں: ”میرے بعض احباب نے مجھ سے کہا کہ پنجاب کی مختلف اقوام کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ایک متحدہ کوشش ضروری ہے، جس میں ہر جماعت کے افراد شامل ہوں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے پیش نظر فی الحال کوئی سیاسی مقصد نہیں۔ تاہم اخلاق اعتبار سے اس میں شرکت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں ان کی اس کوشش میں شریک ہوا۔“ اصلاً یہ جماعت سیاسی نہیں تھی بلکہ محض ایک محدود مقصد کی خاطر قائم کی گئی تھی۔ اور یہ مقصد ایسا تھا، جس سے کوئی شخص انسان اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔

بہر حال حالات نے ایسی کروٹ لی کہ حضرت علامہ کو اس سے مستعفی ہونا پڑا۔ وہ بتاتے ہیں: ”تھوڑی ہی مدت کے بعد معلوم ہوا کہ گوہر مقصود یہاں بھی مفقود ہے۔ اور ملک میں ابھی حصول مقصد کے امکانات بہت کم ہیں۔ اس بناء پر میں نے اس جماعت سے استعفیٰ دے دیا۔“ ۱

چند دن بعد نیشنل لبرل لیگ کے صدر جناب چنتامنی کا ایک تار پہنچا، جس میں بتایا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنانے کی خاطر بمبئی میں ایک کانفرنس کی جا رہی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کا نام داعیوں کی فہرست میں شامل کر دیا جائے۔ علامہ نے آپہں اجازت دے دی لیکن اس سے قدرتی طور پر آن کی مراد یہ نہیں تھی کہ کسی سیاسی جماعت کی موافقت یا مخالفت کریں۔ اور نہ جناب چنتامنی کے برقیے میں کوئی ایسی بات تھی، جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا کہ ان کی کانفرنس کا مقصد کسی سیاسی جماعت کی مخالفت ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کانفرنس سوراہ پارٹی کی مخالفت کے لیے ہو رہی تھی۔ یاد رہے کہ سوراہ پارٹی کا مقصد یہ تھا کہ کونسلوں سے عدم تعاون نہ کیا جائے بلکہ آن میں داخل ہو کر قومی حقوق کے لیے جدوجہد کی جائے۔ جب کانفرنس کا اصل مقصد واضح ہو گیا تو اقبال اس سے لاتعلق ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنے بیان میں کہا: ”میں اس امر کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اب تک تمام سیاسی جماعتوں سے علیحدہ رہا ہوں۔ البتہ میری خواہش یہ رہی ہے اور ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں کہ موجودہ فضا ملک کے لیے بالبداہت باعث ننگ ہے اور مختلف اقوام کی اخلاقی و معاشرتی زندگی کے لیے نہایت مضرت رساں ہے۔ کسی سیاسی جماعت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں اہل ہند کے باہمی تعلقات کی درستی میں ہر مخلص شخص کے ساتھ ہوں۔“ ۲

اپریل ۱۹۲۶ء کے اواخر میں احباب نے اصرار کیا کہ علامہ پنجاب
 لیجس لیٹو کونسل کے انتخابات میں لاہور کی مسلم نشست سے کھڑے
 ہوں۔ گذشتہ انتخابات کے موقع پر بھی اصرار ہوا تھا اور اخبارات نے بھی
 مطالبہ کیا تھا اور علامہ نے حاسی بھی بھر لی تھی۔ لیکن جب دیکھا کہ
 ان کے دوست میاں عبدالعزیز بھی اسی حلقے سے امیدوار ہیں، تو اپنا ارادہ
 ترک کر دیا۔ اب عوام اور اخبارات نے زیادہ شدت کے ساتھ اصرار کیا۔
 بلکہ اخباروں نے یہ بھی لکھا کہ علامہ کی شخصیت اس قدر جلیل القدر
 ہے کہ انہیں بلا مقابلہ منتخب کرنا چاہیے۔ علامہ نے امیدواری کا ارادہ
 تو کر لیا لیکن پبلک طور پر اس کا اعلان کرنے سے محترز رہے۔ اس کی وجہ
 یہ تھی کہ اس وقت اس حلقے کی نمائندگی میاں عبدالعزیز کر رہے تھے۔ اور
 علامہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا عندیہ معلوم کیے بغیر کھڑے ہو جائیں
 اور اس طرح دوست سے بھی تعلقات آلودہ ہوں اور مسلمانوں میں بھی
 کشمکش کے دروازے کھلیں۔ بہر حال جولائی کے اوائل میں رائے علامہ کی
 شدت کے پیش نظر میاں عبدالعزیز نے اعلان کیا کہ اس مرتبہ وہ کھڑے
 نہیں ہوں گے بلکہ علامہ کے حق میں کام کریں گے۔ اور اس کے بعد میاں
 صاحب کے حاسیوں نے بھی علامہ کی حمایت میں اعلانات چھپوائے۔ اب
 علامہ کے راستے میں بظاہر کوئی رکاوٹ موجود نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے
 ۱۹ جولائی ۱۹۲۶ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں میاں عبدالعزیز اور ان
 کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا: ”اب مناسب معلوم ہوا ہے
 کہ میں اپنی امیدواری کا باقاعدہ اعلان کر دوں۔ مسلمانوں کو معلوم ہے
 کہ میں اب تک اس قسم کے مشاغل سے بالکل عاجز رہا۔ محض اس لیے،
 کہ دوسرے لوگ یہ کام انجام دے رہے تھے اور میں نے اپنے لیے دوسرا
 دائرہ کار منتخب کر لیا تھا۔ لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں
 کہ میں اپنا حلقہ عمل قدرے وسیع کروں۔ شاید میرا ناچیز وجود اس

طرح اس ملت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے جس کی خدمت میں میرے لیل و نہار گذرے ہیں۔ میرے خیالات و جذبات ہر مسلمان پر روز روشن کی طرح آشکارا ہیں۔ اور مجھے کامل امید ہے کہ وہ کونسل میں اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے میری ذات پر اعتماد کرنے میں ایک لحظہ کے لیے بھی متامل نہ ہوں گے۔ میں اپنے طول و طویل دعاوی کو شائستہ توجہ نہیں سمجھتا۔ عمل دلی جذبات کے ملفوظ اظہارات کا بہترین معیار ہے۔ خدا کرے کہ میں اس معیار پر پورا اتر سکوں۔“ ۳

ووٹروں کی غالب اکثریت کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی کہ علامہ بلامقابلہ چن لیے جائیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ سیاسی شعور تیز نہیں تھا۔ برادریوں کا چکر بہت چلتا تھا۔ دوسرے، دھڑے بندی بھی تھی اور اقبال کے ذاتی مخالفین بھی موجود تھے۔ چنانچہ علامہ کے مقابلے میں دو امیدوار آگئے۔ ایک ملک محمد حسین، دوسرے خان بہادر ملک محمد دین۔ ملک محمد حسین صدر بلدیہ تھے اور ملک محمد دین ارائیں برادری کے سربراہ اور رکن۔ ان میں سے ملک محمد حسین ۲ اکتوبر کو علامہ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ اور علامہ نے ان کے شکرے کے لیے ایک بیان جاری کیا، جس میں کہا کہ ”ان کے اس جذبے کو بے انتہا قابل تعریف سمجھتا ہوں کہ وہ مسلمانوں میں برادریوں کے افتراق کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے اور اتحاد المسلمین کے مقصد عزیز کے لیے انتہائی ایثار سے کام لے سکتے ہیں۔“

علامہ نے انتخابی مہم کے دوران میں کم و بیش بیس جلسوں سے خطاب کیا۔ پہلا جلسہ ۱۱ اکتوبر کو ہوا۔ اس سے خطاب فرماتے ہوئے علامہ نے کہا: ”میں انگریزی، اردو، فارسی میں بہ رنگ نثر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا، لیکن یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ طبائع

نثر کی نسبت شعر سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ لہذا میں نے مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے، اسلاف کے نقش قدم پر چلانے اور ناامیدی، بزدلی اور کم ہمتی سے باز رکھنے کے لیے نظم کا ذریعہ استعمال کیا۔ میں نے پچیس سال تک اپنے بھائیوں کی مقدور بھر ذہنی خدمت کی۔ اب میں ان کی بہ طرز خاص عملی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں۔ اسلامیات ہند پر عجب دور گذر رہا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ایک شاہی مجلس تحقیقات اصلاحات، جسے رائل کمشن کہتے ہیں، یہ تحقیق کرے گی کہ آیا ہندوستان مزید رعایات و اصلاحات کا مستحق ہے یا نہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان بھی اس باب میں پوری توجہ سے کام لیں اور اپنے حقوق کا تحفظ کریں۔ ممبر کا سب سے بڑا وصف یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی اور قومی منفعت کی ٹکر کے وقت اپنے شخصی مفاد کو مقاصد قوم پر قربان کر دے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی اپنے مفاد کو قوم کے مصالح کے مقابلے میں ترجیح نہیں دوں گا۔ اور رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس امر کی توفیق بخشے کہ میں آپ کی خدمت کر سکوں۔ میں اغراض ملی کے مقابلے میں ذاتی خواہشوں پر مٹنے کو موت سے بدتر خیال کرتا ہوں۔“ ۵

انتخابی دور کی ابتدائی مہم میں بہت سے لوگ علامہ کے مخالف تھے۔ بقول سالک ”جو لوگ ملک و قوم کے لیے کام کر رہے تھے، ان میں سے اکثر ایسے تھے جن سے علامہ کی جلالت قدر اور عظمت علمی برکاز ہو سکتی تھی۔ مثلاً ڈاکٹر سیف الدین کچاو اور موای عمر علی چشتی، لیکن دھڑے بندی کا برا ہو جس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہو رہی تھی۔ ۶۰۰ بہر حال بعد میں ڈاکٹر کچلو اقبال سے آملے۔ ۱۵ اکتوبر کی صبح کو ارائین برادری کا ایک وفد جناب سہر صوبہ کی سرکردگی میں علامہ سے ملا اور درخواست

کی کہ وہ ملک مجدد دین کے حق میں دست بردار ہو جائیں۔ علامہ نے وفد کے سامنے اسلامیات کا اصول پیش کیا کہ مسلمانوں کا نائب وہی ہو سکتا ہے جس پر مسلمانوں کا اجاع ہو جائے۔ وفد کے رکن حاجی شمس الدین نے اس اصول کو سب سے پہلے قبول کیا۔ اس دن علامہ کے حق میں ایک جلوس نکلا اور ایک جلسہ ہوا۔ حاجی شمس الدین بڑھاپے کے باوجود جلوس میں شامل رہے۔ شام کو جلسہ ہوا، ملک مجدد حسین نے صدارت فرمائی۔ ڈاکٹر سیف الدین کجلو نے تقریر کی اور علامہ نے اپنی مختصر تقریر میں اس دن کے واقعہ کی تفصیل پیش کرنے کے بعد کہا کہ ”اب ہم کو پھر ابراہیمی کام کرنا ہے اور ذات پات کے بت کو پاش پاش کرنا ہے۔ میں نوجوانوں کے سامنے عنقریب ایک موشل پروگرام پیش کرنے والا ہوں۔“

پنجاب خلافت کمیٹی نے ایک انتخابی بورڈ بنا رکھا تھا، جو صوبائی مجلس قانون ساز کے انتخاب میں بعض شرائط کے تحت امیدواروں کی مدد کرتا تھا۔ یہ شرائط ایک قسم کا انتخابی منشور تھیں، جس کے یہ چار نکات تھے۔

۱۔ ہمیشہ قومی مفاد کو ذاتی اغراض اور حکومت کی خوشنودی پر ترجیح دینا۔

۲۔ مسلمانوں کے تمام حقوق کی حفاظت کے علاوہ ہندوستان کی آزادی کا نصب العین پیش نظر رکھنا۔ اور خلافت کمیٹی جب تک اس نصب العین کو سامنے رکھ کر کام کر رہی ہے، اس کی مخالفت کونسل کے اندر یا باہر نہ کرنا۔

۳۔ عام اسلامی مفاد کی حفاظت کے علاوہ جب تک ہندوستان کے حالات بدل نہ جائیں، اس وقت تک مسلمانوں کے لئے فرقہ واریت کی جہد و جہد جاری رکھنا۔

۴۔ کونسل کے اندر اس جماعت کی ہم نوائی کرنا جو مندرجہ بالا اصول پر کار بند ہو۔

علامہ نے اس منشور پر اپنے دستخط ثبت فرمائے اور اس طرح پنجاب خلافت کمیٹی کی تائید و حمایت بھی انہیں حاصل ہو گئی۔ ۸

اس انتخابی مہم میں علامہ اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے کوئی ناروا بات نہ کہی گئی لیکن حریف امیدوار اور اس کے حامیوں نے شائستگی کی حدود پھلانگ ڈالیں۔ اس صورت حالات کو سمجھنے میں علامہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ دستاویز بہاری مدد کرتی ہے، جو مولانا غلام رسول مسر نے اقبال اکیڈمی کے حوالے کی اور جس کا عکس ”انور اقبال“ میں درج ہے ۹۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اخبارات بالخصوص سیاست میں علامہ کو وہابی، نجدی، کذاب، مہوٹا اور دشمن اسلام قرار دیا گیا۔ مخالفین نے کل چودہ پوسٹر چھاپے۔ جن میں علامہ دوسرے الزمات لگانے کے، علامہ کے اعمال و عقائد پر حملے کیے گئے۔ ان اشتہارات کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ علامہ کے حق میں بیس جلسے ہوئے لیکن کسی جلسے میں کسی کے خلاف کچھ نہ کہا گیا اور اگر کسی نے جوش میں آکر کچھ کہہ دیا تو اسے روک دیا گیا۔ بلکہ بعض جلسوں میں ارائیں برادری کی تعریف بھی کی گئی۔ علامہ کے حق میں شیعہ رہنما سید علی حائری، خواجگان نارو وال، مرزائے قادیان، احمدیوں اور انجمن اسلامیہ میاں میر نے اعلانات چھاپے۔ زرگروں، بوچڑوں، جوہلوں اور لوہاروں کی برادریوں نے متفقہ فیصلے کئے کہ وہ علامہ کے حق میں ووٹ ڈالیں گی۔

انتخابی مہم کے دوران میں لاہور کی فضا کی تصویر فقیر سید وحید الدین یوں کھینچتے ہیں: ”ایک طرف کراہہ کے کارکن تھے اور دوسری طرف

جاں باز عقیدت مند اور بے غرض مداحین - ہم ان دنوں بازار حیکماں والے مکان میں رہتے تھے - راقم الحروف کی نگاہوں میں ان جلوسوں کا سماں آج تک پھر رہا ہے جو ڈاکٹر صاحب کی تائید و موافقت میں شہر کی سڑکوں اور گلیوں سے گزرتے تھے - وہ پر جوش تقریریں ، وہ اخلاص سے لہریز نعرے ، کسی کسی چلتے ہوئے فقرے اور چہبتے ہوئے جملہ میں ڈاکٹر صاحب کے حریف پر طنز بھی - اس قسم کی شوخیاں اور خوش فعلیاں تو انتخابات کا خاصہ بھی ہیں - بعض من چلے کارکنوں نے کچھ اشعار بھی سوزوں کر لیے تھے جو پر حوش انداز میں گائے جاتے تھے... یہ اشعار لاہور میں زبان زد خاص و عام تھے اور گھر گھر میں ان کی گونج سنائی دیتی تھی - فریق مخالف کو ڈاکٹر صاحب کی مقبولیت کا اچھی طرح اندازہ تھا ، اس لیے اس نے الیکشن جیتنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور انتخابات میں کامیاب ہونے کے لیے جو تدبیریں بھی اختیار کی جا سکتی تھیں ان کو بروئے کار لایا گیا - کئی ہفتے شہر میں خوب ہنگامہ آرائی رہی - لاہور کے دروئیوار سے ووٹ ووٹ کی صدائیں آتی تھیں - “ ۱۰

انتخابی مسہم کی ہمہ ہمی اور ہنگامہ خیزی میں بھی علامہ کا انداز بیان نہ بدلا - الزام تراشی اور پوسٹر بازی کے باوجود انہوں نے کوئی ایسا لفظ زبان سے نہ نکالا جس پر انگلی اٹھائی جا سکتی - عین اس وقت جب انتخابی مسہم اپنے عروج پر تھی اور پولنگ قریب تھا ، حضرت علامہ نے اپنی تقریر میں عجز وانکسار کا دامن نہ چھوڑا - اور جو کچھ کہا درد مندانه اور مخلصانہ انداز میں کہا - آپ نے فرمایا :

”مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے - میں نے برسوں مطالعہ کیا ، راتیں غور و فکر میں گزار دیں تاکہ وہ حقیقت معلوم کروں جس پر کار بند ہو کر عرب حضور سرور کائنات کی

صحبت میں تیس سال کے اندر اندر دنیا کے امام بن گئے۔ وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے جو ہر شخص کے لبوں پر ہر وقت جاری رہتی ہے۔ کاش ہر مسلمان کے دل میں بیٹھ جائے۔ نسلی اور اعتقادی اختلاف میں تنگ نظری اور تعصب نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ اختلاف رائے ایک طبعی امر ہے۔ اس لیے کہ طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی نظر مختلف ہے، اسلوب فکر مختلف ہوتا ہے لیکن اس اختلاف کو اس طریقے پر رکھنا چاہیے جس طرح کہ ہمارے آبا و اجداد نے اسے رکھا۔ اس صورت میں اختلاف رحمت ہے جب لوگوں میں تنگ نظری آجاتی ہے تو یہ زحمت بن جاتا ہے۔ مسلمانو! میں تمہیں کہتا ہوں کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو متحد ہو جاؤ۔ اختلاف بھی کرو تو اپنے آباء کی طرح۔ تنگ نظری چھوڑ دو۔ میں کہتا ہوں تنگ نظری چھوڑنے سے سب اختلاف مٹ سکتے ہیں۔

”مسلمانان ہند کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاسیات کے ساتھ گہری وابستگی پیدا کریں۔ جو لوگ خود اخبار نہ پڑھ سکتے ہوں، وہ دوسروں سے سنیں۔ اس وقت جو قوتیں دنیا میں کار فرما ہیں، ان میں سے اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ لیکن ’لیظہرہ علی الدین‘ کے دعویٰ پر میرا ایمان ہے۔ ’لاتہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلمون ان کنتم مومنین۔‘

”میں کہتا ہوں کہ مخالف دو نرمی سے سمجھاؤ۔ ’جاواولہم بالتی ہی احسن‘۔ قلب کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ محبت

سے رام ہو سکتا ہے ، مخالفت اور عداوت سے رام نہیں ہو
سکتا " - ۱۱

علامہ کے پاس دولت نہیں تھی جو انتخابی مہم میں لٹائے - آن
کے پاس کفر کے فتوے نہیں تھے - وہ کسی کے خلاف جھوٹے الزام
نہیں لگا سکتے تھے - آن کے پاس برادری کا نعرہ نہیں تھا - صرف ایک
ہی چیز تھی ، خدمت کا بے پناہ جذبہ - اسلام سے بے پناہ لگاؤ - اور ایک
پچیس سالہ تاب ناک ماضی ، جس کے دوران میں انہوں نے اپنے خیال
افروز کلام سے قوم کی مردہ رگوں میں خون تازہ کی لہر دوڑا دی - یہی
وہ عناصر تھے ، جنہوں نے انہیں انتخاب میں شان دار کامیابی دلائی -

ووٹروں کی کل تعداد بارہ ہزار تھی - یہ بہ ظاہر کم معلوم ہوتی ہے لیکن
انگریز کے زمانے میں بالغوں کے حق رائے دہی کا اصول نہیں چلتا تھا -
ووٹروں کے لیے تعلیمی یا مالیاتی اوصاف ضروری تھے - اس لیے آبادی کے
ایک چھوٹے سے طبقے کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا - ان میں سے اڑسٹھ
فی صد لوگوں نے اپنے ووٹ کا استعمال کیا - علامہ کو پانچ ہزار چھ سو
پچھتر ووٹ ملے اور آن کے حریف کو دو ہزار چار سو اٹھانوے - گویا
علامہ نے اپنے حریف سے تین ہزار ایک سو ستتر ووٹ زیادہ لیے - ۱۲ اس
طرح لوگوں نے برادری کے امتیازات کو ختم کر کے اعلیٰ سیاسی شعور کا
ثبوت فراہم کر دیا - انتخاب کا نتیجہ سنا تو لوگوں کی خوشی کی کوئی
انتہا نہیں تھی - رضا کاروں کا جلوس "آگنی فوج اقبالی" کا ترانہ گاتا علامہ
کے دولت کدے پر پہنچا - لوگوں نے خوشی میں آ کر انہیں کاندھوں پر
اٹھا لیا - علامہ نے آن کا شکریہ ادا کیا - اس کے بعد دعوتوں اور تقریبات
کا سلسلہ شروع ہو گیا - نہ صرف لاہور میں ، بلکہ دوسرے شہروں میں بھی -

یہ انتخابی مہم بہت بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ کیونکہ یہ علامہ کی زندگی میں ایک نئے ورژ کی حیثیت رکھتی تھی۔ علامہ عملی سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور کسی جماعت کے ساتھ وابستہ نہ ہوئے۔ لیکن کونسل کی رکنیت حاصل کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سیاست کے میدان میں داخل ہو گئے اور اس کے بعد سیاسی جماعتوں سے بھی وابستہ ہوئے۔ اور ان کی سیاسی زندگی اگرچہ ہمیشہ محدود رہی لیکن اس کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ سیاست کا ایک اہم لازمہ رابطہ عوام ہے۔ علامہ عادتاً زیادہ چلنے پھرنے کے قائل نہیں تھے۔ مشاعروں کو ناپسند کرتے تھے۔ جلسوں میں بھی اشد ضرورت سے ہی شرکت کرتے تھے اور بنیادی طور پر خانہ نشین تھے۔ لیکن انتخابی مہم میں یہ حجاب بھی ٹوٹ گیا۔ وہ کئی محلوں میں گئے، جلسوں سے خطاب کیا اور عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کیا۔ اس نے بھی انہیں آنے والی سیاسی زندگی میں مدد دی۔ تیسری بات یہ تھی کہ انتخاب کے تجربے نے علامہ پر واضح کر دیا کہ سیاست نہ محض ہنسے کا کھیل ہے نہ نعرہ زنی کا۔ کیونکہ انہوں نے خود دیکھ لیا کہ لوگوں نے شعوری طور پر سعی کی کہ الیکشن کے سلسلے میں علامہ کو زیادہ روپیہ صرف نہ کرنا پڑے۔ بہت سے کام لوگوں نے خود کیے۔ دوسرے حریف کی غیر شائستہ حرکتوں کے باوجود علامہ کی جیت اس بات کا ثبوت تھا کہ نتھری ستھری سیاست کی گنجائش موجود ہے۔

حوالے

- ۱ - "گفتار اقبال" - صفحہ ۱۳ (بہ حوالہ "زمیندار" ۶ اپریل ۱۹۲۶ء)
- ۲ - ایضاً - صفحات ۱۳-۱۴ (بہ حوالہ "زمیندار" ۶ اپریل ۱۹۲۶ء)
- ۳ - ایضاً - ص ۱۵ (بہ حوالہ "زمیندار" ۲۰ جولائی ۱۹۲۶ء)
- ۴ - ایضاً - ص ۲۶۹ (بہ حوالہ "زمیندار" ۵ اکتوبر ۱۹۲۶ء)

- ۵ - ایضاً - صفحات ۱۷-۱۶ (بہ حوالہ "زمیندار"، ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۶ء)
- ۶ - ذکرِ اقبال - ص ۱۳۳
- ۷ - گفتارِ اقبال - صفحات ۱۷-۱۸ (بہ حوالہ "زمیندار" ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۶ء)
- ۸ - ایضاً - ص ۲۷۰
- ۹ - "انوارِ اقبال" - بالمقابل ص ۱۹۹ -
- ۱۰ - "روزگارِ فقیر"، - جلد اول ص ۱۰۳ -
- ۱۱ - "گفتارِ اقبال" - صفحات ۱۸-۱۹ -
- ۱۲ - "روزگارِ فقیر"، - جلد اول - صفحات ۱۰۳-۱۰۴ - (بہ حوالہ "سول اینڈ ملٹی گزٹ" ۳ نومبر و ۳ دسمبر ۱۹۲۶ء)

۷



چودھواں باب

اقبال ، مجلسِ قانون ساز میں

حضرت علامہ دیہاتی اور غیر دیہاتی کے امتیازات کے خلاف تھے۔ چنانچہ انہوں نے انتخابات میں کمیابی کے چند دن بعد ہی پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ارکان کو مشورہ دیا کہ وہ ان امتیازات سے یکسر کنارہ کش ہو کر اور متحدہ طور پر اسلام اور وطن کی خدمت انجام دیں۔ لیکن کونسل میں ان کے داخلے سے دو سال پہلے میاں فضل حسین کے ہاتھوں نیشنل یونینسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ اس زمانے میں اس کے پس پردہ یہ جذبہ کارفرما تھا کہ مشترکہ معاشی مفاد کی بناء پر دیہاتی مسلمان ارکان اور دیہاتی ہندو ارکان کے درمیان گہرا تال میل پیدا ہو۔ ڈاکٹر عاشق بٹالوی لکھتے ہیں: "اقتصادی مفاد کے مشترک ہو جانے سے ان دونوں گروہوں میں یگانگت اور ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ اس قسم کی یگانگت اس لیے بھی ضروری تھی کہ مسلمان بجائے خود اشریف میں نہیں تھے اور ایسی پارٹی بنانے سے معذور تھے جو تنہا حکومت چلانے پر قدرت رکھتی ہو۔ جداگانہ نیابت کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے سیاسی مسائل اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر کونسل میں مخلوط پارٹی بنانا قطعاً معیوب نہیں تھا۔۔۔ شہری اور دیہاتی مسلمانوں کے مفاد میں کوئی باہم تصادم نہیں تھا۔ شہری مسلمان غیر زراعت پیشہ ہونے کے باوجود قانون انتقال اراضی کے حاسی تھے اور انہیں یہ لسی صورت سے گوارا نہیں تھا کہ دیہاتی مسلمان اس قانون کی حفاظت و صیانت سے محروم ہو جائیں۔"

آن کی زمینیں سود در سود کے چکر میں پڑ کر ہندو ماہوکاروں کے قبضے میں چلی جائیں۔ چودہری لال چند کی پارٹی (دیہاتی ہندوؤں کی پارٹی) بھی اسی اصول کی حامی تھی۔ لہذا صوبے کے وسیع مفاد اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے میاں فضل حسین کا یہ اقدام ہرگز قابل اعتراض نہیں تھا۔ مقصد بہر حال یہ تھا کہ شہری ہندوؤں کے اس دولت مند طبقے کے استیلا سے، جو مختلف ذرائع آمدنی کے علاوہ سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض ہو چکا تھا، صوبے کی غریب اور پسماندہ آبادی کو محفوظ رکھا جائے۔ فضل حسین اور لال چند کی اس مشترک پارٹی کا نام نیشنل یونینسٹ پارٹی رکھا گیا اور کونسل کے شہری مسلمان بطیب خاطر اس میں شامل ہو گئے۔“ ۲

چونکہ حضرت علامہ بھی زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی چاہتے تھے، اس لیے کونسل کے اندر وہ اسی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عاشق بٹالوی لکھتے ہیں: ”اقبال ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک پنجاب لیجس لیٹو کونسل کے رکن رہے۔ یہ تین سال انہوں نے یونینسٹ پارٹی کے اندر رہ کر اس جماعت کے طریق کار کو بغور دیکھا۔ شہری دیہاتی چپقلش لیجس لیٹو کونسل کے اندر اسی پارٹی نے پیدا کی تھی اور پھر اس چپقلش نے صوبے کی پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اقبال سے یہ تمام باتیں پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اقبال ایسے بلند پایہ مفکر، فلسفی اور شاعر کو صوبے کی لیجس لیٹو کونسل میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن میری ناچیز رائے ہے کہ اگر اقبال کونسل کے اندر بیٹھ کر یونینسٹ پارٹی کے طرز عمل کو بہ چشم خود ملاحظہ نہ کرتے تو شاید ان کے ہاتھوں وہ کارنامہ سرانجام نہ پا سکتا جو قدرت نے ان کی

زندگی کے آخری دو برسوں میں ان کے لیے مقدر کر رکھا تھا۔“ ۳ بہرحال یہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ اقبال ابتداء سے شہری اور دیہاتی مسلمان میں چپقلش کے مخالف تھے۔ اور انہوں نے کونسل میں وقتاً فوقتاً مختلف مسائل پر جس انداز میں اظہار خیال کیا، اس میں اس چپقلش کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ انہوں نے جو کچھ کیا اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق کیا اور جو بات کہی مسلمانوں اور دوسرے پسماندہ طبقات کی بھلائی کے لیے کہی۔

مرزا جلال الدین لکھتے ہیں کہ ”اقبال کونسل میں گئے تو اس کی کارروائیوں سے انہوں نے اسی بے رخی سے کم لیا جو ان کا معمول تھا۔ اس پر ان کے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور ان پر غیر عملی اور تساہل پسند ہونے کا الزام دیا جانے لگا۔ اول تو اقبال ان معنوں میں عملی انسان ہی نہ تھے کہ وہ زبان سے جن خیالات کا اظہار فرماتے، جنٹ ان پر عمل کر کے دکھا بھی دیتے۔ دوسرے، کسی شاعر کے قول و عمل میں تطابق کچھ اتنا ضروری بھی نہیں۔ تیسرے، ڈاکٹر صاحب محض اپنے آپ کو عملی ثابت کرنے کی نیت سے زیادہ باتیں بنانا بھی نہیں جانتے تھے۔۔۔“ ۴ ہمارے نزدیک کونسل کے کام سے بے رخی کا الزام مراسر ایوانی پر مبنی ہے۔ کیونکہ اگر ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک کی کونسل کی روئداد کا احتیاط سے مطالعہ کیا جائے تو نتیجہ بالکل برعکس نظر آنے لگا۔

ایک پارلیمانی مقرر کی حیثیت سے علامہ کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ جس مسئلے پر اظہار رائے مقصود ہوتا، اس کے بارے میں پہلے اچھی طرح تحقیق بھی کرتے اور تیاری بھی۔ چونکہ وہ ایک مفکر اور فلسفی بھی تھے، اس لیے ان میں مستقبل شناسی کا جوہر بھی موجود تھا۔ مثلاً انکم ٹیکس کے اصول پر مالیے کی تشخیص کو ایجیے۔ پاکستان میں اس

کا رواج ۱۹۷۷ء سے ہوا۔ علامہ یہی تجویز نصف صدی پہلے پیش کر چکے تھے اور اس کے جواز میں محکم دلائل پیش کر چکے تھے۔ جب حکمران طبقے نے یہ دلیل پیش کی کہ زمین کی ملکیت مملکت کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس لیے مالیے کی تشخیصاً نکم ٹیکس کے اصول پر نہیں ہو سکتی۔ تو انہوں نے اس نظریے کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ نہ قدیم ہند میں اور نہ دورِ مغلیہ میں پادشاہوں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ وہ ساری اراضی کے مالک ہیں۔ ”ہمیں بتایا جاتا ہے کہ مغن ایسے حقوق کے دعویدار تھے لیکن پنجاب کے لوگ تو باہر کی نسل کی آمد سے بہت پہلے زمینوں کے مالک تھے۔ جس سے یہ ناقابلِ تردید سبق حاصل ہوتا ہے کہ تاج آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ اور صرف عوام غیر فانی ہوتے ہیں :

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت
 خراجِ شہر و گنجِ کان و یم رفت
 آسم را از شہاں پایندہ تر داں
 نمی بینی کہ ایراں ماند و جم رفت“۵

۱۹۲۸ء میں یہ مسئلہ پھر کونسل میں زیر بحث آیا تو علامہ نے اس نظریے کو ایک مرتبہ پھر للکارا۔ انہوں نے فرمایا کہ یورپی مصنفین میں سب سے پہلے فرانس کے مصنف پیرون نے ۱۷۷۷ء میں اس نظریے کو جھٹلایا۔ ۱۸۳۰ء میں برگز نے بہت وسیع پیمانے پر تحقیق کی اور اس نے اپنی کتاب میں منوسمرتی، اسلامی قوانین اور ہندوستان کے مختلف حصوں کے دستور اور رواج کا تجزیہ کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان کی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہ آیا جس میں مملکت نے اراضی کی ملکیت کا دعویٰ کیا ہو۔ یہ نظریہ پیش ہوا تو لارڈ کرزن کے عہد میں، لیکن کچھ عرصہ قبل

ٹیکسیشن کمیٹی کی جو رپورٹ شائع ہوئی، اس میں یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ نظریہ بے بنیاد ہے - ۶

بعض ارکان نے یہ تجویز پیش کی کہ اس مسئلے کی تحقیق کے لیے ایک انکوائری کمیشن روس بھیجا جائے۔ اس کے جواب میں علامہ نے کہا : ”میرے فاضل دوست غالباً ان اسباب سے آگاہ نہیں ہیں، جن کے نتیجے میں روس میں انقلاب آیا۔ ضروری نہیں کہ یہ اسباب بیان کیے جائیں۔ جب سے روس میں انقلاب آیا ہے، وہاں جو کچھ ہوا اور جو نظام قائم ہوا ان کے بارے میں خاصا لٹریچر چھپ چکا ہے۔ ہرٹرینڈ رسل جیسی شخصیت اور دوسرے حضرات نے کتابیں لکھی ہیں اور معاشی مسائل کی چھان بین میں خاصا وقت صرف کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے محترم دوست پنڈت نانک چند پہلے ہی چودہری افضل حق کی تجویز کا یہ مؤثر جواب دے چکے ہیں کہ اس مرحلے پر پنجاب کے زمیندار نجی املاک کے حق سے محروم ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس منک (پنجاب) میں چھوٹے چھوٹے زمیندار موجود ہیں۔ وہ مالک تو ہیں، لیکن دو سو بیگھے یا دو دو کنال اراضی کے۔ وہ عملاً مزارعین ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نجی ملکیت کے حق کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“

علامہ نے کہا کہ جب میں یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ مالیت کی تشخیص پر انکم ٹیکس کا اصول لاگو لیا جائے تو میرے پیش نظر صرف یہ بات ہوتی ہے کہ انصاف سے کام لیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ زمیندار بڑا ہو یا چھوٹا، اسے مالیت ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا ذریعہ آمدنی مختلف ہو اور وہ سال بھر میں دو ہزار روپے سے کم کماتا ہے تو آپ اس پر ٹیکس نہیں لگاتے۔ یہ تفاوت صریح بے انصافی پر مبنی ہے۔ اس پر وزیر مال نے کہا کہ اس اصول پر عمل اس لیے ممکن نہیں کہ

ہمیں مسلسل روپے کی ضرورت ہے۔ ترقیات کے لیے بھی روپیہ درکار ہے اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ حکومت کے پاس کوئی پتھر موجود نہیں۔ اس پر علامہ نے کھری کھری سنائیں۔ انہوں نے کہا ”جب تک حکومت کی جیب میں دھرتی کے وہ تمام کاشت کار موجود ہیں جو شدید محنت سے مٹی کو سونا بناتے ہیں تو اسے پارس پتھر کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر یہ دلیل درست ہے، تو میں کہوں گا کہ مالیے کے نئے نظام سے جو خسارہ ہو اسے دوسرے طریقوں سے پورا کیا جائے۔ نظم و نسق کا خرچ گھٹایا جائے۔ ترقیات پر کم روپیہ صرف کیا جائے۔ کیونکہ یہ لفظ تو بڑا باوقار ہے لیکن اس سے ہمیں ابھی تک کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اسی طرح خسارے کو پورا کرنے کے لیے حکومت ہند سے زر امداد حاصل کیا جا سکتا ہے۔“

جب یہ محسوس ہوا کہ اربابِ حکومت کسی صورت میں یہ تجویز قبول نہیں کریں گے، تو حضرت علامہ نے یہ متبادل تجویز پیش کر دی کہ کسانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کم از کم اتنا کیا جائے کہ بارانی علاقوں میں پانچ بیگھے اراضی تک کے مالکوں کو مالیے سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ لیکن نو کر شاہی کے نمائندوں نے یہ تجویز اس بنا پر مسترد کر دی کہ اس سے حکومت کو کروڑوں روپے کا نقصان ہوگا۔

جب مینرانیدہ پنجاب میں پے در پے خسارہ ہونے لگا تو علامہ نے آمدنی کے چند وسیلے تجویز کیے۔ ایک یہ کہ انکم ٹیکس کو مرکزی حکومت کے محاصل میں شامل کر دیا جائے۔ دوسرے انگلستان کی طرح یہاں بھی موت پر ٹیکس لگایا جائے اور آن ورثا سے وصول کیا جائے جنہیں بیس ہزار یا تیس ہزار کی املاک حاصل ہوئی ہو۔ کفایت شعاری کے سلسلے میں علامہ کی تجاویز کی زد براہِ راست انگریزوں پر پڑتی تھی۔ کیونکہ

آہوں نے ایک تو اعلیٰ افسروں کی تنخواہوں میں کمی کا مطالبہ کیا ، جو زیادہ تر انگریز تھے ۔ دوسرے ، یہ مطالبہ کیا کہ مشینری ارزاں ترین منڈیوں سے خریدی جائے ۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پہلی مشینری برطانیہ سے درآمد کی جاتی تھی جس کے دام زیادہ تھے ۔ لیکن اس زمانے میں جاپان بھی صنعتی ملک بن چکا تھا اور اس کی مشینری اور مصنوعات کی قیمتیں کم تھیں ۔ ۹

۱۹۳۰ء میں پنجاب کی معاشی حالت اور ابتر ہو گئی ۔ اس کا ایک

سبب تو وہ عالمی معاشی بحران تھا ، جو اکتوبر ۱۹۲۹ء میں امریکہ سے شروع ہوا اور جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور وہ بھی اس تیزی کے ساتھ کہ بڑے بڑے ماہرین معاشیات ہکا بکا رہ گئے ۔ اور دوسرا سبب سامراجی نوکر شاہی کا استحصال تھا جو بڑھتا چلا جا رہا تھا ۔ اس سال پنجاب اتنا مقروض تھا جتنا پہلے کبھی نہ ہوا ۔ بے روزگاری روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی ۔ تجارت سرد پڑی ہوئی تھی ۔ علامہ نے اس صورت حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے تین متبادل راستوں کی نشاندہی کی ۔ اول : موجودہ نظام برقرار رکھتے ہوئے خسارے کے بیٹے ، فرقہ وارانہ فسادات ، لاکھوں افراد کی بھوک ، قرضے اور بے روزگاری کو برداشت کیا جائے ۔ دوم : موجودہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے ۔ سوم : موجودہ نظام کی صورت قائم رکھ کر یہ اختیار حاصل کیا جائے کہ اس کے اخراجات کم کیے جا سکیں ۔ علامہ نے کہا کہ اگر ہم آرام دہ زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو اس نظام کو ختم کرنا ہوگا ۔ بے روزگاری کو دور کرنے کے لئے علامہ کے نزدیک صنعتوں کا اجراء ضروری تھا ۔ بالخصوص پارچہ بافی اور جوئے بنانے کی صنعتوں کا ۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت ان صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرے اور اگر بے روزگاری اور واقعی دور کرتا ہے ، تو ان صنعتوں کو کانپور اور احمد آباد کے خلاف تحفظات فراہم کئے جائیں ۔ ۱۰

تعلیم کے سلسلے میں علامہ نے بے دریغ اس بات پر زور دیا کہ لازمی تعلیم کا اصول لاگو کیا جائے۔ اور اس کے نفاذ میں پوری سنجیدگی سے کام لیا جائے۔ آپ نے دو مختلف مواقع پر اس بے انصافی کے خلاف احتجاج کیا جو تعلیم کے معاملے میں مسلمانوں سے کی جا رہی تھی۔ اس سلسلے میں اعداد و شمار بھی پیش کیے۔ مثلاً ۱۹۲۲-۲۳ء میں پچپن سکولوں کو گرانٹ ملی، جن میں صرف سولہ سکول مسلمانوں کے تھے۔ اس کے بعد کے پانچ سالوں کے دوران میں جتنی گرانٹ ہائی سکولوں کو ملی، اس کا بیس فی صد حصہ مسلمان سکولوں کو ملا۔ حالانکہ مسلمان پس ماندہ بھی تھے اور صوبے میں اکثریت کے بھی مالک تھے۔ ایک اور تقریر میں بتایا کہ ۱۹۲۸-۲۹ء میں اکیس سکولوں کو خصوصی گرانٹ دی گئی۔ ان میں تیرہ سکول ہندوؤں کے تھے، چھ سکھوں کے اور صرف دو مسلمانوں کے۔ اور گرانٹ کی کل رقم میں سے مسلمان سکولوں کو صرف سات فی صد رقم ملی۔ ۱۱

جولائی ۱۹۲۷ء میں سردار آجل سنگھ نے کونسل میں یہ قرار داد پیش کی کہ آئندہ تمام سرکاری اسمبلیاں کھلے مقابلے سے ہر کی جائیں۔ اور جہاں ایسا مقابلہ نہ ہو سکے، وہاں بلا تميز مذہب و ملت سب سے زیادہ تعلیمی اوصاف رکھنے والے امیدواروں کو مقرر کیا جائے۔ یہ قرار داد کیوں پیش کی گئی؟ اس لیے کہ غیر مسلم جانتے تھے کہ مسلمان تعلیمی معاملے میں پس ماندہ ہیں اور کھلے مقابلے کی صورت میں شاذ ہی کامیاب ہوں گے۔ علامہ اقبال نے اس قرار داد کی مخالفت میں آواز اٹھائی۔ وہ کھلے مقابلے کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن پنجاب کے مسلمانوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر تقریروں کا ایک ایسا نظام چاہتے تھے جس میں کھلے مقابلے کے پہلو بہ پہلو

انتخاب اور نامزدگی کی بھی گنجائش ہو۔ تاکہ ہمس ماندہ طبقات نظم و نسق سے بے دخل نہ ہو جائیں۔

قرارداد کے حق میں تقریر کرتے ہوئے کچھ غیر مسلم ارکان نے کہا کہ اس سے متحدہ قومیت کے نشو و نما میں مدد ملے گی۔ علامہ نے کہا:

”میں نہیں جانتا کہ ایک قوم بننا پسندیدہ بھی ہے یا نہیں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو رد بھی لیا جاسکتا ہے۔ بہر حال فرض کیجئے کہ ایک قوم بننا پسندیدہ ہے تو میں کہوں گا کہ اس سے پہلے اس ملک کے مختلف فرقوں میں باہمی اعتماد پیدا ہو۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ فرقے ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ جب ہم آپس میں ملتے ہیں تو قومیت کی بات کرتے ہیں اور نوع انسان سے محبت کا ذکر کرتے ہیں۔ ابھی چند روز پہلے میرے ایک دوست نے دو ہندو شرفاء کی گفت گو سنی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا، اب ہماری پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ دوسرے نے کہا، زبان پر قوم پرستی کے الفاظ ہوں لیکن اصل میں اپنے فرقے کے حقوق پر نظر رکھی جائے۔“

لاہور کے ہندو مسلم فسادات پر تحریک التوا پیش ہوئی تو علامہ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات میں خوشگواہی پیدا کرنے لیے رسمی کاروائیاں تو بہت ہوتی ہیں لیکن کوئی سنجیدہ کام نہیں ہوتا۔ انہوں نے انتباہ لیا: ”۔۔۔ ہم اصل میں خانہ جنگی کی حالت میں ہیں۔ اگر اسے ختم کرنے لیے سخت اقدامات نہ کیے گئے تو سارے صوبے کی فضا زہر آلودہ ہو جائے گی۔۔۔ اگر فرقہ وارانہ

منافرت ہماری زندگی میں زیادہ دخیل ہو گئی ، تو اس سے سارا ملک متاثر ہوگا۔ اور دیہات میں رہنے والے بھی ابک دوسرے سے دست و گریبان ہو جائیں گے۔“ علامہ نے اس تجویز کی تائید فرمائی کہ مختلف فرقوں کی ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے ، جس میں حکومت کے نمائندے بھی شامل ہوں۔ اور یہ کانفرنس موجودہ کھچاؤ کو دور کرنے کے لیے تجاویز پیش کرے۔ ۱۳۔

حضرت علامہ نے پنجاب کونسل میں بندشِ شراب کی تحریک بھی پیش کی اور تلوار کو قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ کرانے کی بھی۔ موخرالذکر تحریک کا پس منظر یہ ہے کہ سکھوں کو ازروئے مذہب اور ازروئے قانون کرپان رکھنے کی اجازت تھی۔ اس طرح پوری سکھ قوم بچوں سمیت مسلح تھی۔ فرقہ وار فسادات ہوتے تو سکھوں کے مقابلے میں مسلمان نہتے ہوتے تھے۔ اس پر مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں تلوار رکھنے کی اجازت دی جائے۔ علامہ نے اسی مطالبے کی ترجمانی فرمائی۔ حضرت علامہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ مذہب دشمن لٹریچر پر قدغن لگ گئی اور وہ بھی ہندوستان گیر سطح پر۔ اس زمانے میں ہندو مسلم فسادات کا بڑا سبب یہ تھا کہ پنجاب میں بعض لوگ ایسا لٹریچر چھاپتے تھے جس میں ایک دوسرے کے مذہبی پیشواؤں پر سخت اور رکیک حملے کیے جاتے تھے۔ علامہ نے کونسل میں یہ تحریک پیش کی کہ حکومت ہند سے سفارش کی جائے کہ وہ ایسے حملوں کے انسداد کے لیے ایک قانون نافذ کرے۔ چنانچہ یہ قانون نافذ کر دیا گیا۔ ۱۴۔

طبِ یونانی یا دوسرے لفظوں میں طبِ مشرق کی انگریزوں نے ایسی مسلسل حوصلہ شکنی کی کہ اس کے آثار و باقیات اب تک موجود ہیں۔ اور پاکستان زندگی کے تیس سال گزارنے کے باوجود طبِ مشرق کو اس کا مقام عطا نہیں کر سکا۔ علامہ طبِ مشرق کو بہت پسند کرتے تھے۔

چنانچہ انہوں نے ۱۹۲۸ء میں کونسل میں اس کے حق میں ایک زور دار تقریر کی۔ جس میں ایک تو طبِ مغرب پر طبِ مشرق کی فوقیت ثابت کی۔ دوسرے یہ کہا کہ طبِ مشرق ایک ارزاں نظام ہے اور طبِ مغرب میں علاج پر جو لاگت آتی ہے وہ غریب عوام کی طاقت سے باہر ہے۔ اور یہ اہم نکتہ بھی بیان فرمایا کہ عام لوگوں کے تاثر کے مطابق جب حکومت طبِ مغرب کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور طبِ مشرق کی حوصلہ شکنی تو اس کے پس پردہ تجارتی مفادات کارفرما ہیں۔ سیدھے سادے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ انگریز کی حکومت برطانیہ کو فائدہ پہنچانے کے لیے برعظیم پر طبِ مغرب کا نظام ٹھونس رہی ہے۔ ۱۵

قوم پر جب کوئی مصیبت آتی، علامہ سینہ سپر ہو گئے۔ ۱۹۲۷ء میں مشہور عالم دین مولانا محمد عرفان کو پولیس نے بری طرح مارا پٹا تو علامہ نے اس کی تحقیقات کی۔ اور پولیس سے احتجاج کیا۔ پولیس نے تسلی بخش جواب نہ دیا تو کونسل میں یہ معاملہ اٹھایا۔ ۱۶ اسی سال لاہور میں رنگ محل کے علاقے میں ایک ہندو قتل ہو گیا تو حکام نے تعزیری چوکی بٹھا دی اور خرچ اہل محلہ پر ڈال دیا۔ علامہ نے ایک نو کونسل میں پوچھنے کے لیے ایک سوال بھیجا۔ دوسرے، حکام سے بھی ملے۔ حکام نے تعزیری چوکی اٹھا لی اور علامہ نے سوال واپس لے لیا۔ ۱۷

ہارلیانی مقرر کی حیثیت سے علامہ کا پایہ بلند تھا۔ ان کی طرف سے اعداد و شمار اور حقائق پر مبنی ہوتی تھیں۔ بعض اوقات وسیع مطالعے کے بعد کسی مسئلے کا تاریخی پس منظر بھی بیان کرتے تھے۔ تقریروں میں کبھی کبھی اشعار بھی لاتے تھے اور مزاحیہ اشارے بھی کرتے تھے۔ جب مالیے کی تشخیص پر انکم ٹیکس کا اصول لاگو کرنے کی تجویز زیر بحث تھی تو میاں فضل حسین (ایگزیکٹو کونسلر برائے مال) نے ایک اہم نکتہ

کی تشریح کسی اور رکن پر چھوڑ دی - علامہ نے کہا - یہ تو وہی ہوا کہ ”چور نالوں پنڈ کاہلی“ - ایک رکن نے پوچھا - ”چور کون ہے؟“ علامہ بولے - خود ہی سمجھ لیجیے گا - اسی بحث کے دوران میں میاں فضل حسین نے کہا - علامہ کی تجویز پر عمل کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ لگان بل جیسا ننھا ننھا بچہ سوت کے گھاٹ آتر گیا - اور ظاہر ہے بچوں کی ہلاکت کڑی اچھی بات نہیں - علامہ نے جواب دیا - یہ ضبطِ تولید کا زمانہ ہے - اور اگر بچے کے متعلق ہمیں یہ علم ہے کہ وہ بڑا ہو کر بدعاش نکلیے گا تو اس کی ہلاکت میں چنداں مضائقہ نہیں - ایک اور بحث کے دوران میں اقبال نے کہا - ”اس ملک کے پرانے حکماء کہا کرتے تھے کہ یہ دنیا محض مایا یا فریب ہے - میں نہیں جانتا کہ اس ایوان سے باہر کی دنیا مایا ہے یا نہیں - لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ اس ایوان کے اندر ہوتا ہے وہ مایا کے سوا اور کچھ نہیں - اور مجھے یہ بھی کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی اس فریب کا ایک جزو ہوں -“ متحدہ قومیت پر بحث چل رہی تھی تو علامہ نے فرمایا : ”متحدہ قومیت کی گفتگو بے سود ہے اور شاید عرصے تک بے سود ہی رہے - پچھلے پچاس سال سے یہ الفاظ لوگوں کی زبان پر ہیں - یہ چیز ایک مرغی کی طرح کڑکڑاتی تو بہت رہی ہے لیکن انڈا ایک نہیں دیا -“ ۱۸

اب علامہ کی پارلیمانی زندگی کے بارے میں ایک سوال باقی رہتا ہے کہ وہ یونینسٹ پارٹی سے متاثر ہوئے یا نہیں - اور اگر ہوئے تو کس حد تک - اور ان کے تعلقات پارٹی کے ارباب کے ساتھ کیسے رہے - اس سے انکار نہیں کہ علامہ رسمی طور پر یونینسٹ پارٹی سے وابستہ رہے لیکن وہ اس کے نظم و ضبط کے تابع نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے - اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ذہنی سطح کونسل کے دوسرے ارکان سے کہیں بلند تھی - ہر

مسئلے پر ان کی اپنی سوچ تھی۔ وہ دیہاتی مسلمانوں کے حقوق کی ترجمانی کرتے رہے لیکن شہری اور دیہاتی کے درمیان امتیاز کا جو چکر چلتا رہا، اس سے الگ رہے۔ انہوں نے ہر معاملے میں پارٹی کے موقف کا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ بسا اوقات اس کے بالکل برعکس آراء کا اظہار کرتے رہے۔ مثلاً مالیے کی تشخیص پر انکم ٹیکس کے اصول کا نفاذ۔ پانچ بیگھے تک زمین کا مالیے سے استثنیٰ۔ یونینسٹ پارٹی کے قائد میاں فضل حسین دو عملی کے نظام میں ایگزیکٹو کونسل کے رکن برائے مال تھے، جو ایک طرح کا وزارتی عہدہ تھا۔ ان سے بار بار علامہ کی جھڑپ ہوئی۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ علامہ عملاً ایک آزاد رکن تھے اور انہیں اس آزادی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کی شہادت میاں فضل حسین کے فرزند میاں عظیم حسین اپنے باپ کے سوانح میں یوں فراہم کرتے ہیں :

”سر فضل حسین نے یہ تجویز کی کہ کونسل کے سپیکر چودھری شہاب الدین کی میعاد صدارت ختم ہونے کے بعد یونینسٹ پارٹی علامہ اقبال کو سپیکر منتخب کر لے۔ لیکن چونکہ علامہ نے پارٹی کی پالیسی پر تنقید کر کے اور اخباروں میں اس کے خلاف لکھ کر اس کی ہمدردی کھو دی تھی، اس لیے یونینسٹ پارٹی کی اکثریت نے ان کو کونسل کا سپیکر منتخب کرنے سے انکار کر دیا۔“ ۱۹

حوالے

- ۱۔ ”گفتارِ اقبال“، ص ۲۰ (بحوالہ ”زمیندار“ ۲۸ نومبر ۱۹۲۶ء)۔
- ۲۔ ”اقبال کے آخری دو سال“۔ صفحات ۱۶۷-۱۶۶۔
- ۳۔ ایضاً۔ ص ۲۷۳۔
- ۴۔ ”ملفوظاتِ اقبال“، صفحات ۱۰۷-۱۰۶۔

- ۵ - Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۵۷-۵۸ -
- ۶ - ایضاً - صفحات ۷۲-۷۳ -
- ۷ - ایضاً - صفحات ۷۷-۷۸ -
- ۸ - ایضاً - صفحات ۷۴-۷۵ -
- ۹ - ایضاً - ص ۸۲ -
- ۱۰ - ایضاً - صفحات ۸۵-۸۶ -
- ۱۱ - ایضاً - صفحات ۸۷ ، ۸۰ -
- ۱۲ - ایضاً - صفحات ۶۳-۶۹ -
- ۱۳ - ایضاً - صفحات ۶۳-۶۴ -
- ۱۴ - ”اقبال کا سیاسی کارنامہ“ - صفحات ۱۰۳-۱۰۵ -
- ۱۵ - Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۷۰-۷۱ -
- ۱۶ - ”گفتارِ اقبال“ - صفحات ۴۸-۴۹ (بحوالہ ”انقلاب“
۲۳ اگست ۱۹۲۷ء) -
- ۱۷ - ”ذکرِ اقبال“ - ص ۱۴۶ -
- ۱۸ - Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۶۷ ، ۶۰ ، ۷۷ ، ۷۲ -
- ۱۹ - ”ذکرِ اقبال“ - ص ۱۴۳ -



پندرہواں باب

جداگانہ انتخاب کے لیے جدوجہد

۱۹۲۷ء برعظیم کی اسلامی سیاست میں ایک اہم سال تھا۔ تحریک ترک موالات کے بعد سنگھٹن اور شدھی کی تحریکوں نے فضا مسموم کر رکھی تھی۔ شمالی ہند میں ہندو مسلم فسادات پورے تھے۔ ۱۹۱۶ء کا میثاق لکھنؤ مدتوں دفن ہو چکا تھا۔ کانگریس اپنا اثر و رسوخ کھو بیٹھی تھی۔ اس کا وقار گر چکا تھا۔ وہ ہندو نیشنلزم کا سمہارا لینے لگی اور عملاً ہندو سہا سبھا کی ایک شاخ بن کر رہ گئی تھی۔ بہرحال ابھی کانگریس میں کچھ روشن خیال عناصر موجود تھے جو چاہتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی نئی حیاسی مفاہمت ہو جائے۔ مسلمان رہنما خصوصیت سے آرزومند تھے کہ مکمل آزادی کے لیے ایک متحدہ محاذ بن جائے۔ کیونکہ ان میں ابھی شدید تعصب نہیں آیا تھا۔ اور اگر آیا تھا تو اس نے بہت کم رہنماؤں کو متاثر کیا تھا۔ ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ میں مسلمانوں کے لیے حسن و خوبی کا اگر کوئی پہلو موجود تھا تو وہی نہ کانگریس نے ان کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن تحریک ترک موالات کے بعد ہندو نیشنلزم نے اسی کو اپنے تمام حملوں کا نشانہ بنایا۔ اور مسلمان رہنماؤں کا بنوں پن ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اپنی روایتی فراخ دلی کی حدود کو پھلانگ کر جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو واپس لے لیا۔ اور یہاں سے مسلمان قیادت میں پھوٹ کے دروازے کھل گئے۔

اس کہانی کا آغاز یوں ہوا کہ کانگریس کے صدر جناب سری نواس آئینگر اور جناب محمد علی جناح (وہ ابھی ”قائد اعظم“ کی حیثیت سے معروف نہ تھے) کے درمیان مذاکرات ہوئے اور جناب جناح نے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں تیس کے لگ بھگ مسلمان رہنماؤں کا ایک اجلاس بلایا۔ اس میں مہاراجہ محمود آباد، سر محمد شفیع، صاحبزادہ سر عبدالقیوم، مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سر محمد یعقوب، مولوی شفیع داؤدی، نواب اسماعیل خان، سر عبدالرحیم، نواب ذوالفقار علی خان اور بعض دوسرے حضرات شامل تھے۔ اس اجلاس میں آئینگر کی پانچ تجاویز پر مفصل بحث ہوئی اور اس کے بعد کثرت رائے سے اس فارمولے پر اتفاق ہوا جو سیاسی تاریخ میں ”تجاویز دہلی“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس فارمولے کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کا مطالبہ ترک کر کے مخلوط انتخاب کا اصول مان لیں گے بشرطیکہ کانگریس مندرجہ ذیل مطالبات پر صاف کرے :

- ۱۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی قانونی اکثریت تسلیم کی جائے۔
- ۲۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے الگ صوبے کی حیثیت دے دی جائے۔
- ۳۔ صوبہ سرحد میں دوسرے صوبوں کے برابر آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں۔
- ۴۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دے دی جائے۔

۵ - صوبائی مجالسِ قانون ساز میں ہر قوم کو اپنی آبادی کے تناسب سے نشستیں دی جائیں۔ گویا پاسنگ یا ویٹیج کا اصول ختم کر دیا گیا۔ کیونکہ کسی صوبے کی اقلیت کو آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔

مسلمانوں کے مؤقف میں بنیادی لچک لائی گئی۔ ہندوؤں کا ایک اہم مطالبہ مان لیا گیا۔ لیکن ہندوؤں نے بنیادہنیت سے کم لیتے ہوئے ایک بار پھر کم ظرفی کا مظاہرہ کیا۔ ہندو اخبارات نے ”تجاویزِ دہلی“، پر جو تبصرے کیے، ان کا ماحصل یہ تھا کہ مسلمان مخلوط انتخاب قبول کر کے اس کی قیمت سندھ کی علیحدگی اور صوبہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کی صورت میں وصول کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کا مقصد یہ ہے کہ کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ لو۔ گویا مسلمانوں کی فراخ دلی کے جواب میں یہ چاہا گیا کہ وہ مکمل طور پر ہتھیار ڈال دیں۔

دوسری طرف مسلمانوں کے ایک بہت بڑے عنصر میں بھی اضطراب پیدا ہوا کہ انہوں نے اپنے ملی تشخص کی برقراری کے لیے بڑی مشکل سے جداگانہ انتخاب کا اصول منوایا تھا اور اب اس کی بھی قربانی دی جا رہی ہے۔ دہلی کے اجلاس میں سر محمد شفیع اور آن کے ساتھیوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ مخلوط انتخاب کی صورت میں ہندو اکثریت چاہے تو اپنے ووٹوں کی مدد سے مسلمانوں کے ایسے نمائندے منتخب کر سکے گی جو اس کے اشارے پر ناچنے لگتے ہوں گے۔

حضرت علامہ اس معاملے میں سر محمد شفیع کے ساتھی تھے اور اس میں اچھنبے کی کوئی بات نہیں تھی۔ کیونکہ علامہ ایک عرصہ دراز سے مسلم

قومیت کے تصور پر زور دیتے چلے آئے تھے۔ اُن کی شاعری بھی اسی کی عکاس تھی۔ وہ متحدہ قومیت کے تصور کو ناممکن العمل سمجھتے تھے۔ جداگانہ انتخاب مسلمانوں کے قومی تشخص کی علامت تھا اور مخلوط انتخاب متحدہ قومیت کا۔ تجاویزِ دہلی سے مسلم قومیت کے لیے جو خطرہ پیدا ہوا، اُس کی روک تھام کے لیے یکم مئی ۱۹۲۷ء کو لاہور میں پنجاب صوبہ مسلم لیگ کا ایک اجلاس ہوا۔ اس میں پہلے سر محمد شفیع نے دہلی کی تجاویز اور ان پر ہندو سہا سبھا کے ردعمل پر ایک تقریر کی۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے ایک قرارداد پیش کی جس میں یہ نکات پیش کیے گئے :

۱۔ ملک کی موجودہ سیاسی حالت سے مجالسِ قانون ساز صرف اسی صورت میں حقیقی طور پر نمائندہ ادارے بن سکتی ہیں کہ جداگانہ انتخاب کا نظام برقرار رہے۔

۲۔ حلقہ ہائے انتخاب کی علیحدگی ہی سے باشندوں کے جائز حقوق و فوائد محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اور اسی صورت میں وہ فرقہ واریت کشمیش دور ہو سکتی ہے جو وقتاً فوقتاً پیش آتی رہی ہے اور جو مخلوط حلقہ ہائے انتخاب سے پیدا ہوگی۔

۳۔ جب تک اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا کوئی مؤثر اور محکم بندوبست نہیں ہوتا، مسلمان جداگانہ انتخاب کو دستورِ ہند کے ایک اساسی جزو کی حیثیت سے قائم رکھنے پر لازماً مصرع رہیں گے۔

علامہ نے اس مسئلے پر اپنی تقریر میں کہا۔ ”مجھے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ میں سب سے پہلا ہندوستانی ہوں جس نے ہندو مسلم

اتحاد کی اہمیت و ضرورت کا احساس کیا - اور میری ہمیشہ سے یہ آرزو رہی کہ اتحاد مستقل حیثیت اختیار کر لے۔ لیکن حالات حلقہ ہائے انتخاب کے اشتراک کے لیے موزوں نہیں ہیں - اور ہمارے صدر (سر محمد شفیع) نے ہندو رہنماؤں کی تقریروں کے جو اقتباسات اپنے خطبہٴ صدارت میں دیے ہیں، ان سے ہندوؤں کی افسوسناک ذہنیت آشکارا ہوتی ہے - اس ذہنیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تو حلقہ ہائے انتخاب کا اشتراک کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا - میں حیران ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی ذہنیت اختیار کرنے کی ہندوؤں کو کیوں ضرورت پڑی - مسلمان تعداد میں کم ہیں، اقتصادی حیثیت سے پیچھے ہیں، تعلیم میں پس ماندہ ہیں، ویسے بڑے بھولے بھالے ہیں - حکومت انہیں آسانی سے چکنی چھڑی باتیں کرنے پہنچلا لیتی ہے - ہندو انہیں پھسلا لیتے ہیں - میں حیران ہوں کہ ہندوؤں نے یہ ذہنیت کیوں اختیار کی - اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ذہنیت ہے - اور اگر کوئی اور وجہ نہ ہوتی تو میں کہتا کہ تنہا اسی وجہ سے حلقہ ہائے انتخاب الگ رکھیں جائیں“ - اسی تقریر میں علامہ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ ہندوؤں کی مساعی اور حکومت کی سرگرمیوں سے انہیں جو مصیبتیں درپیش ہیں، ان کا واحد حل یہی ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر ٹھوٹے ہوں اور مردانہ وار ہر مصیبت کا مقابلہ کریں - انہوں نے سر محمد شفیع کو مشورہ دیا کہ وہ تمام بڑے بڑے شہروں کا دورہ کریں اور مسلمانوں کی خطرات سے آگاہ کریں - اور آپ نے اس سلسلے میں ہر ممکن تعاون کی مساعی فرمائی - ۲

۱۹۲۶ء میں حکومت برطانیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ ایک سماجی کمیشن ہندوستان بھیجے گی جو مختلف سیاسی عناصر سے تبادلہٴ خیالات اور حالات کے مطالعہ و مشاہدہ کے بعد یہ سفارش کرے گا کہ انہی اصلاحات

کی اگلی قسط کے خد و خال کیا ہوں۔ علامہ اقبال نے اپنی انتخابی مہم کے دوران میں جو تقریریں کیں، ان میں کہا تھا کہ انتخاب لڑنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رائٹل کمشن کے سامنے مسلمانوں کا زاویہ نگاہ حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ جب کمشن کا تقرر بہت قریب تھا، تو یکم نومبر ۱۹۲۷ء کو برطانیہ کے ممتاز روزنامہ ”دی ٹائمز“ نے لکھا کہ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ اس کمشن میں ہندوستانی نمائندے شامل نہ ہوں۔ اس سے پہلے کانگریسی لیڈر بی۔ بی۔ نرس۔ نفیس لندن گئے تھے اور انہوں نے وزیراعظم برطانیہ پر زور دیا تھا کہ اس کمشن میں گاندھی جی کو ضرور رکھا جائے۔ لیکن ۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو جب حکومت برطانیہ نے سر جان سائمن کی صدارت میں ایک سات رکنی کمشن کا اعلان کیا، تو برعظیم کے لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ساتوں برطانوی پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔ گوبا برعظیم کے رہنماؤں کو کوئی نمائندگی نہ دی گئی۔ اس پر قدرتی طور پر احتجاج ہوا اور بعض سیاسی جماعتوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ کمشن کا نہ صرف مقاطعہ کیا جائے بلکہ جب وہ ہندوستان میں آئے تو اس کے خلاف مظاہرے کیے جائیں۔ ۳

سائمن کمشن کے تقرر پر علامہ اقبال نے صوبہ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے ایک طویل بیان جاری کیا۔ جس کے نمایاں نقوش یہ تھے۔

اول : کمشن میں کسی ہندوستانی کا نہ ہونا غیر متوقع، مایوس کن اور تکلیف دہ ہے۔ یہ بات انگریزی نقطہ نگاہ سے بھی ایک بہت بڑی غلطی ہے۔

دوم : کمشن میں کسی ہندوستانی کا نہ لیا جانا ہندوستان کے وقار پر حملہ ہے۔ لیکن یہ حملہ میرے نزدیک اس بات کا نتیجہ نہیں کہ

برطانوی پارلیمنٹ کو ہندوستان کے فہم و ادراک یا دماغی قابلیت کے متعلق سوئے ظن ہے۔ بلکہ اس کی وجہ وہ بے اعتدالی اور بدظنی ہے جو ہندوستان کی مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے متعلق ہے۔

سوم : اگر کمشن میں ہندوستانی ممبروں کو لیا جاتا تو مسلمانوں کے سرکردہ آدمیوں میں سے غالباً مسٹر جناح یا مر علی امام پر نظر پڑتی۔ یہ دونوں مخلوط انتخاب کے حامی ہیں اور یہ امر پنجابی نقطہ خیال سے موجب اطمینان نہ تھا۔

چہارم : کمشن میں ہندوستانی ارکان کی عدم موجودگی کا مداوا کرنے کے لیے یہ تجویز کی گئی ہے کہ اس کے ساتھ مرکزی اسمبلی کے ارکان پر مشتمل ایک امدادی مجلس قائم کر دی جائے۔ یہ ممبری سے محرومی کا کوئی اچھا بدل نہیں لیکن فائدے سے بھی خالی نہیں۔ بہر حال پنجابی نقطہ نگاہ سے یہ مجلس بھی موجب اطمینان نہیں۔ کیونکہ مرکزی اسمبلی کے جن مسلمان ارکان کے انتخاب کا امکان ہے، وہ مخلوط انتخاب کے حامی ہیں۔

پنجم : جہاں تک کمشن کے مقاطعہ یا عدم مقاطعہ کا سوال ہے، اس میں کوئی رائے نہیں دینا چاہتا۔ کیونکہ ۱۳ نومبر کو صوبہ مسلم لیگ اس پر غور کرنے والی ہے۔

ششم : ہندوستان کی مختلف قوموں کے لیے اب بھی یہ راستہ لہلا ہے کہ ان کے نمائندے آپس میں صل بیٹھیں اور سیاسی اختلافات کو دور کرنے کے لیے کوئی سمجھوتہ کر لیں۔

۱۳ نومبر ۱۹۲۷ء کو سر محمد شفیع کے مکان پر انہی کی صدارت میں صوبہ لیگ کا اجلاس ہوا جس میں سر محمد شفیع کی تحریک پر ایک قرارداد منظور ہو گئی۔ جس میں کہا گیا کہ سائمن کمشنر کا مقاطعہ ملکی زاویہ نگاہ سے بالعموم اور اسلامی نقطہ نگاہ سے بالخصوص نقصان رساں ہوگا۔ علامہ نے ایک بیان میں دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ بھی اسی قسم کا فیصلہ کریں اور کہا: ”سرجان سائمن صدر کمشنر نے نہایت صحیح کہا کہ کمشنر کا فرض محض یہ ہوگا کہ ہندوستان کی طرف سے جو مختلف تجاوز پیش ہوں، ان کی روئداد پیش کرے اور ان پر غور و خوض کرے۔ اس ملک کی قلیل التعداد جماعتوں کو رائل کمشنر کی آمد سے بڑھ کر اپنے اندیشے، اپنی امیدیں اور اپنے مقاصد ظاہر کرنے کا اور کوئی موقع نہیں مل سکتا۔ میری رائے میں ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنی اپنی تہذیبوں کے مطابق نشو و ارتقا حاصل کریں۔ یہ مقصد حاصل ہونا چاہیے۔ خواہ مغرب کے دستوری اصول سے حاصل ہو یا کسی دوسرے ایسے ذریعے سے جو وقت کے مطابق ہو اور لوگوں کی ضروریات پوری کرے۔“ ۵

علامہ کا موقف بالکل واضح تھا۔ وہ برعظیم میں مسلمانوں کے قومی تشخص کا تین چاہتے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ جداگانہ انتخاب باقی رہتا اور مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمان اپنی قسمت کے مالک خود اور اپنی تہذیب کو نشو و ارتقاء بخشنے میں ایک اہم کردار ادا کرتے۔ یہ کام دو طریقوں سے ہو سکتا تھا۔ اول: ہندو قوم ان مطالبات کو مان لیتی اور دونوں قومیں اختیارات کو منتقل کرانے کے لیے متحدہ جدوجہد کا آغاز کر دیتیں۔ دوم: انگریز مسلمانوں کے مطالبے مان لیتے۔ چونکہ ہندو قوم مفاہمت کے راستے میں دیوار بنی رہی، اس لیے مسلمانوں کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ سائمن کمشنر کو اپنے نقطہ نگاہ سے آگاہ کرنے۔

مسلم لیگ کے جس گروہ نے تجاویزِ دہلی پر صاد کیا تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ سائمن کمشنن کا مقاطعہ کیا جائے۔ کانگریس کا موقف بھی یہی تھا اور برعظیم کے طول و عرض میں بائیکاٹ، بائیکاٹ کے نعروے بلند ہو رہے تھے۔ اتنے میں برطانوی دارالامراء میں وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے ایک بحث میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات مستقل نوعیت کے حامل ہیں۔ اور اگر ہندوستانی رہنماؤں کو سائمن کمشنن کی ترکیب پر اعتراض ہے، تو وہ کیوں نہیں آپس میں اتفاق رائے کر کے کوئی تجاویز پیش کر دیتے؟ اس پر ۸ دسمبر کو نواب سر ذوالفقار علی خان، علامہ اقبال، صاحبزادہ سر عبدالقیوم، مرکزی اسمبلی کے دو ارکان میاں عبدالجی اور سید راجن شاہ اور مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا کہ ہمارے سامنے دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ، کہ مشترکہ لائحہ عمل کے لیے فرقہ وارانہ اختلافات کا فیضانہ اور منصفانہ نصفیہ کر لیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو سائمن کمشنن کے سامنے اپنا موقف واضح کیا جائے۔ رہنماؤں نے انتہاء کیا کہ مقاطعہ کی لاجبہل روش اختیار کرنے سے افسوس اور ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ کمشنن ہندوستان کی اقلیتوں کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری ضمانت لے کر آ رہا ہے۔ ان رہنماؤں نے اس تجویز کی بھی مخالفت کی کہ مسلم لیگ، ہندو سہاسبھا اور کانگریس کی ایک کونفرنس میز کانفرنس بلائی جائے تاکہ سیاسی تصفیہ کیا جا سکے اور اس سے پہلے سائمن کمشنن کا مقاطعہ لیا جائے۔ مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ اگر مسلمان سائمن کمشنن کے سامنے بھی اپنا موقف پیش کرنے سے گریز کریں اور کانفرنس میں بھی شنوائی نہ ہو تو بھر لیا ہو؟ آگے چل کر اس بیان میں لہا گیا: "لالہ لاجپت رائے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کرتے ہیں، مگر تمام اختلافی مسائل کو خصوصاً فرقہ وارانہ نیابت کے معاملے کو

اہل برطانیہ کی ثالثی پر چھوڑ دینے کے خواہاں ہیں۔ مسلمان ایسی چالوں سے ناواقف نہیں۔ ملک کی اکثریت کو چاہیے کہ فوراً ہمارے ساتھ دیانتدارانہ مفاہمت کر کے مسلمانوں کے دل میں اپنا اعتماد پیدا کریں۔۔۔ ہم نہایت جرأت اور زور کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم کرایہ کے ٹٹو بننے کے لیے تیار نہیں۔ مسٹر جناح اور دیگر حضرات نے یہ فقرہ اڑا لیا ہے کہ ہماری خودداری ہمیں رائل کمشن کی تائید کی اجازت نہیں دیتی۔ ہم اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ فرقہ وارانہ جنگ اور خودداری یکجا قائم نہیں رکھی جا سکتیں۔ تدبیر کا اقتضا یہ ہے کہ اس نازک موقع پر جذبات کو عقل اور دلیل پر حاوی نہ ہونے دیں۔“ ۶

جداگانہ انتخاب اور سائمن کمشن سے تعاون کے مسائل پر مسلمان قیادت دو حصوں میں منقسم تھی۔ سر محمد شفیع اور علامہ اقبال جداگانہ انتخاب کے حامی تھے اور سائمن کمشن سے تعاون کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف جناب محمد علی جناح اور ان کے ساتھی تجاویزِ دہلی کی بناء پر مخلوط انتخاب قبول کر چکے تھے اور سائمن کمشن کا مقاطعہ چاہتے تھے۔ اس اختلاف نے دنوں میں ایک سنگین روپ اختیار کر لیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل انڈیا مسلم لیگ دو متوازی جماعتوں میں بٹ گئی۔ ایک کو لاہور لیگ یا شفیع لیگ کہا جاتا تھا۔ جس کے صدر سر میاں محمد شفیع اور سیکرٹری علامہ اقبال تھے۔ دوسری کو کلکتہ لیگ یا جناح لیگ کا نام ملا جس کے صدر محمد علی جناح تھے اور سیکرٹری ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ پرانے خلافتی رہنماؤں میں سے حسرت موہانی لاہور لیگ میں شامل تھے اور علی برادران کلکتہ لیگ میں۔ یہ بٹوارہ کیسے ہوا؟ اس سلسلے میں حضرت علامہ اور ملک فیروز خان نون کا وہ بیان ہماری رہنمائی کرتا ہے جو ۱۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو جاری ہوا۔ اس طویل بیان کا ماحصل یہ ہے کہ ۲۰ نومبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ

آئندہ سالانہ اجلاس لاہور میں ہوگا اور سر محمد شفیع صدارت کریں گے۔ ڈاکٹر کچلو نے زبانی طور پر احتجاج بھی کیا اور سیکرٹری کے عہدے سے استعفیٰ بھی دے دیا۔ اس کے بعد آن کے جی میں کیا آئی کہ سیکرٹری کی حیثیت سے دہلی میں لیگ کونسل کا ایک اور اجلاس طلب کر لیا، جس میں فیصلہ کیا کہ ایک سالانہ اجلاس کلکتے میں ہوگا اور سر محمد یعقوب صدارت کریں گے۔ بیان میں کہا گیا کہ کلکتے کے انتخاب کی ”اصل وجہ یہ ہے کہ کلکتہ میں مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق ۲ مارچ ۱۹۲۷ء کی منظور کردہ تجاویز دہلی کو مسلمان قوم کے سر منڈھنے کا موقع لاہور کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ مسلمانان پنجاب متفقہ طور پر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے حامی ہیں۔“

فریقین کی طرف سے بیانات کی جنگ نقطہ عروج پر بھی۔ جناب علی جناح کے ایک بیان کے جواب میں حضرت علامہ اور سر ذوالفقار علی خان نے ایک مشترکہ بیان میں کہا کہ۔ ”موجودہ نازک وقت کا اہم مقصد تمام خیر خواہان ملک کے لیے ایک ہے۔ جو بڑی بے چینی سے محسوس کرتے ہیں کہ آن کے ملک کی قسمت، زندگی اور موت سے وابستہ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس ابنلا کے زمانے میں ایسے آدمی ہندوؤں میں نہیں آئے جو پردہ اٹھا کر اپنے ملک کے حقوق کا صحیح فیصلہ دیوتاؤں سے لڑیں۔ ہندوستان کی بدقسمتی سے بمبئی اور کلکتے کے سرمایہ داروں کہ آئندہ بچانے کا موقع مل گیا ہے۔“ بیان میں کہا گیا کہ ہندو ادریت اس وجہ میں مبتلا ہے کہ وہ ہمارے تعاون کے بغیر سواراج کی منزل پر پہنچ سکتی ہے۔ اور یہ اہم انکشاف بھی کیا گیا کہ ہندو رہنما برطانوی لیبر پارٹی کے ساتھ خفیہ سازشوں میں مصروف ہیں۔ بیان کے آخری الفاظ یہ تھے: ”اہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ دولت، رسوخ، سیاسی قوت اور

تعداد کے لحاظ سے ہم ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس لیے جب تک ہم ہندوؤں اور انگریزی حکومت دونوں سے اپنے حقوق کا مطالبہ مستعدی اور سرگرمی سے نہ کریں، بہاری سیاسی موت مسلمہ امر ہے۔۔۔۔ ہم اس بات کو زمانہ مستقبل پر چھوڑتے ہیں۔ جو ہمارے اس استقلال کا انصاف کرے گا جو ہم نے فرقہ وارفاد کو مستحکم بنیاد پر رکھنے میں دکھلایا ہے۔“ ۸

۱۹۲۷ء کے آخری دو دنوں میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک سیشن سر محمد شفیع کی صدارت میں لاہور میں ہو رہا تھا۔ دوسرا سر محمد یعقوب کی صدارت میں کلکتے میں۔ لاہور لیگ میں علامہ اقبال، نواب ذوالفقار علی خان، حسرت موہانی اور دوسرے رہنما شامل تھے۔ کلکتہ لیگ میں محمد علی جناح، علی برادران، ظفر علی خان، سیف الدین کچلو، ابوالکلام آزاد، مولوی فضل الحق، ملک برکت علی اور ڈاکٹر عالم شامل تھے۔ لاہور لیگ نے ایک تو تجاویزِ دہلی کی مخالفت اور سائمن کمشن سے تعاون کی قراردادیں منظور کیں۔ دوسرے، علامہ اقبال کی تحریک پر یہ قرارداد منظور ہوئی: ”موجودہ انتظام میں بنگال و پنجاب کے مسلمانوں کو مجلس وضع قوانین میں اکثریت کے حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اس کے خلاف پرزور احتجاج کرتا ہے اور اسے اصولِ جمہوریت کے منافی بتاتا ہے۔ لیگ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ ۱۹۲۱ء میں مسلمانوں کے خلاف جو بے انصافی کی گئی تھی، اسے دور کیا جائے۔“ ۹ دوسری طرف کلکتہ لیگ نے تجاویزِ دہلی اور سائمن کمشن کے مقاطعہ پر صاد کر دیا اور اس طرح ان دو متوازی جماعتوں میں بعدالمشرقین پیدا ہو گیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کلکتہ لیگ زیادہ بااثر جماعت

تھی کیونکہ اس میں امراء کا طبقہ بھی شامل تھا اور وہ پرانے خلافتی رہنما بھی جنہوں نے تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں حصہ لے کر ، قید و بند کی صعوبتیں جھیل کر اور قربانیاں دے کر مسلمان عوام کے دل میں گھر کر رکھا تھا۔ لاہور لیگ کا معاملہ مختلف تھا۔ اس میں صرف ایک ممتاز خلافتی رہنما حسرت موہانی شامل تھے۔ باقی جتنے سربراوردہ ارکان تھے ، وہ یا تو طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے یا برطانوی فوازی کے لیے مشہور تھے۔ علامہ اقبال اس کلیے سے مستثنیٰ تھے اور مسلمانوں میں بے حد محبوب تھے۔ علامہ نے اپنی بردلعزیزی داؤ پر لگا دی تو محض ان اصولوں کی خاطر ، جن کے لیے وہ مدتوں سے کوشاں تھے۔ یہ اصول کیا تھے ؟ متحدہ قومیت کی مخالفت ، مسلم قومیت کا نشو و ارتقاء ، قومی تشخص کی خاطر جداگانہ انتخاب کی برقراری ، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت اور مسلم اکثریتی صوبوں میں ایسے حالات کی تخلیق جو ان علاقوں میں اسلام، تہذیب کے نشو و ارتقاء میں مدد دیں۔ اور یہی وہ عناصر ہیں جنہوں نے بعد میں علیحدہ مسلم مملکت کے تصور کو جنم دیا۔

حوالے

- ۱ - Muslim Separatism in India - ص ۱۹۳ -
- ۲ - "گفتارِ اقبال" - صفحات ۲۶-۲۸ (بحوالہ "انقلاب" - مئی ۱۹۴۰ء)
- ۳ - Muslim Separatism in India - صفحات ۱۹۵-۱۹۶ -
- ۴ - "گفتارِ اقبال" - صفحات ۴۹-۵۱ (بحوالہ "انقلاب" - نومبر ۱۹۴۰ء)
- ۵ - ایضاً - صفحات ۵۲-۵۳ (بحوالہ "انقلاب" - ۱۸ نومبر ۱۹۴۰ء)
- ۶ - ایضاً - صفحات ۵۳-۵۶ (بحوالہ "انقلاب" - ۸ دسمبر ۱۹۴۰ء)
- ۷ - ایضاً - صفحات ۵۷-۶۰ (بحوالہ "انقلاب" - ۱۶ دسمبر ۱۹۴۰ء)
- ۸ - ایضاً - صفحات ۶۱-۶۳ (بحوالہ "انقلاب" - ۲۱ دسمبر ۱۹۴۰ء)
- ۹ - ایضاً - ص ۶۵ (بحوالہ "انقلاب" - ۳ جنوری ۱۹۴۸ء)

سولہواں باب

نہرو رپورٹ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس

۱۹۲۷ء کے اواخر میں ہر عظیم ابتری کا شکار تھا۔ بنگال میں مزدور تحریک منظم ہو رہی تھی، شمالی ہند اور شمال مغربی ہند میں کسان مضطرب اور بے چین تھے۔ کانگریس کے اندر ایک سوشلسٹ گروپ وجود میں آ چکا تھا۔ پنجاب میں نوجوانوں نے ایک دہشت انگیز تنظیم بنا رکھی تھی، جن میں غالب تعداد ہندوؤں کی تھی۔ لیکن جس چیز نے امن و امان کے شیرازے کو بالکل منتشر کر دیا، وہ ہندو مسلم کشیدگی تھی جس نے خونیں فسادات کی وجہ سے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ان میں منظم گروہ بھی لڑتے تھے اور ایک دُعا حملے بھی ہوتے تھے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حکومتی مشینری اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت اس خانہ جنگی پر قابو پانے میں ناکام رہی۔ جہاں تک کانگریسی سیاست کا تعلق تھا، اس کے بڑے بڑے رہنما یا تو عزلات نشین تھے یا ملک سے باہر تھے۔ ایسے میں کانگریس کے نسبتاً روشن خیال صدر سری نواس آئنکر لاکھ ناگ کی مدد سے ایک یونٹی کانفرنس کر چکے تھے، جس میں تجاویز دیں۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں کانگریس کا مدراس سیشن ہوا۔ لاندھی جی ایک عرصے کی غیر حاضری کے بعد شریک ہوئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سوویت روس کے دورے سے واپس آئے تو سوشلزم سے بہت متاثر تھے۔ اس سیشن میں ایک بار پھر تجاویز دہلی کو ایک مفاہمی فارمولے کی حیثیت سے قبول

کیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ وزیر ہند لارڈ برکن ہبڈ کے چیلنج کے جواب میں فیصلہ ہوا کہ ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی جائے، جہاں ایک ایسا آئین تیار کیا جائے جس پر تمام سیاسی عناصر کو اتفاق ہو۔ مختلف سیاسی جماعتوں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ انہیں قبول کرنے والی جماعتوں میں جناح لیگ بھی شامل تھی۔ کیونکہ اسے ابھی تک کانگریس کی نیک نیتی پر اعتماد تھا۔ لیکن جب ۱۹۲۸ء کے اوائل میں دہلی میں کانفرنس کا آغاز ہوا تو چند روز کے اندر اندر معلوم ہو گیا کہ یہ بیل آسانی سے منڈھے نہیں چڑھے گی۔ ایک مہینے تک مذاکرات ہوتے رہے، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہندو مہاسبھا کانگریسی قیادت پر اس درجہ مسلط تھی کہ مسلمانوں کی شنوائی قریب قریب ناممکن تھی۔ حالت یہ ہوئی کہ ایک مرحلے پر جناح لیگ کے نمائندوں کو بھی واک آؤٹ کرنا پڑا۔ حالانکہ اس کا نقطہ نگاہ کانگریس کے قدرے روشن خیال طبقے کے نقطہ نگاہ سے کافی حد تک مماثلت رکھتا تھا۔ اس پر کانفرنس سے باہر تبادلہ خیالات ہوتا رہا اور جب معلوم ہوا کہ مفاہمت ممکن نہیں تو ۱۱ مارچ کو کانفرنس ملتوی ہو گئی۔ مئی کے مہینے میں یہی کانفرنس بمبئی میں ہوئی۔ وہاں پنڈت موتی لال نہرو اور ہندو مہاسبھا میں گٹھ جوڑ ہوا اور اس کے نتیجے میں تجاویز دہلی کی منظوری کو کالعدم کر دیا گیا۔

آل پارٹیز کانفرنس کے دس ارکان کی ایک کمیٹی ابھری۔ اس کے صدر موتی لال نہرو تھے، اس لیے یہ عام طور پر نہرو کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں مسلمانوں کے دو نمائندے شامل تھے۔ ایک سر علی امام، دوسرے شعیب قریشی۔ کمیٹی اس مقصد کے لیے بنائی گئی کہ وہ ہندوستان کے آئین کا ایک مسودہ تیار کرے۔ چنانچہ الہ آباد میں اس کے اجلاس تین مہینے تک ہوتے رہے۔ آئین کا ایک مسودہ تیار ہو گیا، جسے نہرو

- رپورٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس رپورٹ کے نمایاں نقوش یہ تھے۔
- ۱ - ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دیا جائے اور یہاں ایک پارلیمانی نظام حکومت قائم کیا جائے۔
 - ۲ - صوبوں کی حد بندی لسانی اعتبار سے از سر نو کی جائے۔
 - ۳ - صوبوں کو اندرونی خود مختاری دی جائے لیکن باقی ماندہ یا مابقی اختیارات مرکز کے ہاتھ میں ہوں۔
 - ۴ - مرکز کو صوبوں کے معاملات میں مداخلت کے اتنے دور رس اختیارات دیے گئے، جن سے صوبوں کی اندرونی خود مختاری مضحکہ خیز بن گئی۔
 - ۵ - سندھ کو بمبئی سے الگ کر دیا جائے لیکن معاشی پہلوؤں کی جانچ پڑتال کے بعد۔
 - ۶ - صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے برابر حیثیت دی جائے۔
 - ۷ - جن صوبوں میں مسلم اقلیتیں بہت چھوٹی ہیں یا صوبہ سرحد میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، ان میں مجالس قانون ساز کی رکنیت کے سلسلے میں مخلوط انتخاب کے ساتھ فروری وار کوٹا مقرر کر دیا جائے۔
 - ۸ - پنجاب اور بنگال میں نشستوں کی تخصیص خارج از بحث قرار دی گئی۔ ان صوبوں کو مخلوط انتخاب کے ساتھ لہلا میدان قرار دیا گیا۔
 - ۹ - میثاق لکھنؤ میں مندرج وہ گنجائش ختم کر دی گئی کہ اگر

کسی اقدام کے خلاف کسی فرقے کے نمائندوں کی دو تہائی
اکثریت ووٹ دے تو اسے کالعدم قرار دیا جائے۔ ۱

اس کا مطلب یہ تھا کہ میثاقِ لکھنؤ میں مسلمانوں کے جو مطالبات
مانے گئے تھے، ان میں سے بیشتر کو منسوخ کر دیا گیا۔ تجاویزِ دہلی میں
سے مخلوط انتخاب کی تجویز اختیار کر لی گئی لیکن نشستوں کی تخصیص ختم
کر دی گئی۔ اور جن شرائط پر مسلمانوں کے ایک گروہ نے مخلوط انتخاب کا
اصول مانا تھا، ان میں سے بیشتر کو رد کر دیا گیا۔ گویا یہ بات ثابت ہو
گئی کہ تجاویزِ دہلی کے روپ میں مسلم موقف میں جو لچک پیدا کی گئی
تھی، وہ مسلمانوں کے لیے بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ اور وہ مسلمان حق پر تھے
جنہوں نے تجاویزِ دہلی کو جداگانہ انتخاب سے انحراف کی بناء پر مسترد
کر دیا تھا۔

۲. اگست ۱۹۴۸ء کو حضرت علامہ نے آل انڈیا مسلم لیگ (لاہور)
کے جنرل میکرٹری کی حیثیت سے نہرو رپورٹ کے بارے میں ایک بیان
جاری کیا۔ یہ بیان متوازی تھا لیکن نامکمل۔ کیونکہ ابھی نہرو رپورٹ کے
کچھ حصے ہی سامنے آئے تھے، مکمل متن نہیں چھپا تھا۔ حضرت علامہ
نے جو نکات پیش کیے، ان کی تلخیص یہ ہے :-

اول : ایک نصب العین کی حیثیت سے درجہ 'نو آبادیات سے اتفاق ہے۔
لیکن اس سے لالہ لاجپت رائے اور بعض اسلامی جرائد کے ان
منافقانہ دلائل کا بخوبی انکشاف ہو جاتا ہے، جو وہ اس کے ثبوت
میں پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی دنیائے اسلام کی
آزادی کے مترادف ہے۔

دوم : یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پنجاب اور بنگال کی مختلف اقوام

اپنی اپنی قوم کے نمائندوں کے حق میں ووٹ دیں۔ اور اسی مفروضے کی بناء پر پنجاب کے مسلمانوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ کونسل میں ان کی اکثریت ہوگی۔ اگر ایسا ہی ہے، تو جداگانہ انتخاب کیوں رائج نہیں کیا جاتا۔ کم از کم نشستوں کی تخصیص کیوں نہیں کی جاتی؟

سوم : بالغوں کو حق رائے دہی دینے سے مسلمانوں کو نقصان ہوگا۔ کیونکہ ان کی آبادی پنجاب میں چھپن فی صد ہے لیکن بالغوں کا تناسب چون فی صد ہے۔ اس دو فی صد خسارے سے بندوڑوں اور سکھوں کے بالغوں کے تناسب میں دو فی صد اضافہ ہو جاتا ہے۔ بالغ خواتین میں مسلمانوں کا تناسب پچپن فی صد ہے لیکن قدامت پسندی، کم تعلیم بلکہ ناخواندگی کی وجہ سے ان میں سے بہت کم پولنگ سٹیشنوں پر جا سکتی ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کا تناسب اور گھٹ جائے گا۔

چہارم : ایک لاکھ آبادی کے لیے ایک نمائندہ مقرر کرنے سے پنجاب میں حلقوں کی تقسیم از سر نو ہوگی۔ اس سے بھی مسلمانوں کی نیابت کو نقصان پہنچنے اور اکثریت سے اقلیت میں بدل جانے کا خطرہ ہے۔

۲۸ اگست ۱۹۴۸ء کو لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اس وقت جناب جناح انڈسٹان میں تھے۔ شہد علی علاج کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے۔ لاہور لیگ کی تو شرکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا، خود کلکتہ لیگ کے نمائندے بھی شریک نہ ہوئے۔ البتہ خلافت کمیٹی نے ایک وفد بھیجا، جس میں مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا شوکت علی بھی شامل تھے۔ مولانا شوکت علی نے لاہور رپورٹ

کی تجاویز پر نکتہ چینی کی اور ان کی مخالفت کی - کچھ اور ممبروں نے بھی اختلاف کیا۔ لیکن کانفرنس کے صدر ڈاکٹر انصاری نے یقین دلایا کہ کچھ عرصہ بعد نہرو رپورٹ پر نظرِ ثانی بھی ہو سکے گی - اس پر مسلمان ارکان نے اس پر مسہر تصدیق ثبت کر دی - لیکن مولانا شوکت علی اڑے رہے اور انہوں نے اس کے خلاف ایک بیان بھی دیا - اب حضرت علامہ نے زیادہ کھل کر نہرو رپورٹ پر تنقید کی - اور یہ اہم بات کہی کہ ”ہندوستان کا مسلمان اب اس جذبے کو از سر نو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت مقرر کرنے پر مجبور ہو جائے گا جسے ہندی قومیت کے جذبے سے موسوم کیا جاتا ہے - جو وہی وہ اس امر پر غور کرے گا ، وہ اپنے آپ کو مولانا شوکت علی کی طرح پائے گا - جن کی آنکھیں اب کھل چکی ہیں اور جو کمال رنج و احساسِ درد کے ساتھ اپنے دل کو آزادی کے آس جوش اور جذبے سے خالی پاتے ہیں ، جس نے ان کی ہستی میں ایک قسم کی بجلی بھر رکھی تھی -“ علامہ نے ایک بار پھر جداگانہ انتخاب کے حق میں آواز بلند کرتے ہوئے یہ دلیل دی کہ اس سے فرقہ وارانہ آشتی کو فروغ حاصل ہوگا۔ انہوں نے کہا جس صوبے میں جداگانہ انتخاب کی صورت میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مذہبی فرقہ بازی اور برادری کے احساسات سے فائدہ اٹھانے پر شرمسار نہیں ہوتے ، وہاں اگر مخلوط انتخاب رائج کر دیا گیا تو بہت سے حلقوں میں ہندو اور مسلمان دونوں کھڑے ہوں گے اور مذہبی احساسات بھڑک اٹھیں گے - علامہ کا یہ بھی موقف تھا کہ مسلمان نشستوں کی تخصیص کے باوجود مخلوط انتخاب کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے -۳

حضرت علامہ کے بیانات سے پنجاب کے مسلمان چونکا ہو گئے اور سیاسی فضا بالکل بدل گئی۔ اس فضا کی ایک تصویر سالک نے یوں کھینچی ہے : ”پنجاب سے جو بزرگ لکھنؤ جا کر نہرو رپورٹ کو قبول کر آئے

تھے ان میں مولانا عبدالقادر قصوری ، مولانا ظفر علی خان اور تمام دوسرے خلافتی پنجابی کارکن شامل تھے ۔ لیکن ان حضرات کو پنجاب میں واپس آتے ہی معلوم ہوا کہ اس معاملے میں قوم ان کے ساتھ نہیں ہے ۔ انقلاب نے بارہا ان کو چیلنج کیا کہ مسلمانوں کے کسی جلسہ عام میں آ کر نہرو رپورٹ کی حمایت کریں ۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ ہمت کدر کے دہلی دروازے کے باہر باغ میں مسلمانوں کے سامنے نہرو رپورٹ کی تائید کرنی چاہی ۔ لیکن ہزارہا مسلمانوں نے ایک نہ سنی ۔ بلکہ سٹیج پر اینٹیں برسائیں ، جن سے مولانا عبدالقادر قصوری ، مولانا ظفر علی خان اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری زخمی بھی ہو گئے ۔ غرض نہرو رپورٹ کے خلاف مسلمانوں میں قہر و غضب کا جذبہ بے حد مشتعل ہو گیا اور مسلم لیگ کے نقطہ نگاہ کی پیہم تائید ہونے لگی ۔ ”حقیقت یہ تھی کہ نہرو رپورٹ سے پہلے پنجاب میں لاہور لیگ زیادہ مؤثر جماعت نہیں تھی لیکن اب حالات نے ایسا پانسہ پلٹا کہ لاہور لیگ کے مخالفین عوام کی نظروں سے گر گئے ۔ اس زمانے میں پنجاب کا سیاسی میدان حضرت علامہ کے ہاتھ میں تھا ۔

اب ملکی سیاست کا نقطہ ماسکہ نہرو رپورٹ تھی ۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں دو بڑی کانفرنسیں ہوئیں ۔ دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس، جس کی صدارت آغا خان نے فرمائی ۔ کلکتے میں آل پارٹیز کانفرنس، جس میں کانگریس ، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی نے حصہ لیا ۔ ان دونوں کانفرنسوں میں مسلم لیگ نے بیان کرنا ضروری ہے ۔ پنجاب کے مسلمانوں نے سوچا کہ نہرو رپورٹ کے خلاف جذبہ تو نیز ہے لیکن مسلمان چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں منقسم ہیں اور ان کی قوت بکھر کر کمزور ہو رہی ہے ۔ چنانچہ سر محمد شفیع اور علامہ اقبال نے اجماع امت کی خاطر آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انعقاد کا منصوبہ باندھا ۔ اس منصوبے کے خد و خال یہ تھے کہ سب کزی اسمبلی اور

کونسل آف سٹیٹ کے تمام غیر سرکاری مسلمان ارکان اور صوبائی مجالس قانون ساز کے تمام غیر سرکاری مسلمان ارکان جمع کیے جائیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ (لاہور)، آل انڈیا مسلم لیگ (کلکتہ)، آل انڈیا خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء ہند کے بیس بیس نمائندے بلائیں جائیں۔ بلکہ کانفرنس کو زیادہ سے زیادہ نمائندہ بنانے کی خاطر بعض غیر سیاسی مسلمان انجمنوں کے بھی بیس بیس مندوب مدعو کر لیے جائیں۔ اور تقریباً چھ سو نمائندہ مسلمان رہنماؤں کی اس کانفرنس کی صدارت کے لیے سر آغا خان کو بلا یا جائے جن کا برطانیہ میں بہت اثر تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے قومی مطالبات مرتب کر کے پیش کر دیے جائیں۔ ۵

اب مسلمانوں کے دوسرے گروہ کے بارے میں منیے۔ محمد علی جناح انگلستان سے لوٹے تو حالات کی نئی کروٹ پر حیران و ششدر رہ گئے۔ انہوں نے نہرو رپورٹ اور لکھنؤ کانفرنس کے فیصلوں کو آخری اور قطعی ماننے سے انکار کر دیا۔ چند دن بعد مولانا محمد علی بھی یورپ سے لوٹ آئے۔ وہ اس بات پر ناراض تھے کہ تجاویزِ دہلی کو طاق پر رکھ دیا گیا ہے۔ انہوں نے گاندھی جی اور موتی لال نہرو، دونوں پر عہد شکنی کا الزام لگایا۔ کانگریس نے کلکتے میں آل پارٹیز کانفرنس بلائی تو پہلے جناح لیگ اور خلافت کمیٹی دونوں شمولیت سے متامل تھیں۔ بہر حال بعد میں راضی ہو گئیں۔ اور جناب محمد علی جناح کی قیادت میں کلکتہ لیگ کے تئیس ارکان کا ایک وفد شامل ہوا اور مولانا محمد علی کی قیادت میں خلافت کمیٹی کا وفد آیا۔ ۶ یہ دونوں وفود تو نیک نیتی سے آئے، لیکن اس بات کا کیا علاج کہ غیر مسلم قیادت بالکل بدنیت ہو چکی تھی۔ جناب محمد علی جناح نے صرف تین ترمیمیں پیش کیں۔ اول: مرکزی اسمبلی میں جتنے منتخب ممبر شامل ہوں، ان میں سے ایک تہائی مسلمان ہوں۔ دوم: پنجاب اور بنگال میں اگر

بالغوں کو حق رائے دہی عطا نہ ہو سکا تو مخلوط انتخاب رائج کر کے کم از کم دس سال کے لیے مسلمانوں کی نشستیں ان کی آبادی کے تناسب سے مخصوص کی جائیں۔ سوم : باقی ماندہ یا مابقی اختیارات مرکزی حکومت کی جگہ صوبوں کے سپرد کیے جائیں۔ یہ تینوں تجاویز نہایت بے ضرر تھیں، لیکن ہندو تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے تینوں کو مسترد کر دیا۔ مولانا محمد علی نے درجہ نوآبادیات کو نصب العین بنانے کی مخالفت فرمائی تو لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مولانا نے تنگ آ کر کہا۔ اگر یہ غنڈہ گردی جاری رہی تو میں تقریر نہیں کر سکتوں گا۔۔۔ اس پر حاضرین میں سے کسی نے جواب دیا کہ سب سے بڑے غنڈے تو آپ خود ہیں۔ اب مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہیں محسوس ہوا کہ ہندوؤں کی کوئی بات بھی ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ محمد علی جناح تو مایوس ہو کر سیدھے بمبئی کو لوٹ گئے لیکن مولانا محمد علی اور بہت سے دوسرے مسلمان رہنا ککتے سے سیدھے دہلی پہنچے اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اور انہوں نے بڑے دھڑلے سے جداگانہ انتخاب کی جہالت کی۔ یہ کانفرنس ۲۹ دسمبر ۱۹۲۸ء سے یکم جنوری ۱۹۲۹ء تک ہوئی۔ بروکرام کے مطابق سر آغا خان نے صدارت فرمائی۔

سر آغا خان نے اپنے خطبہ صدارت سے پہلے کہا کہ مسلمانوں کو فرقہ یا فرقہ نہیں، نیشن یا قوم ہیں۔ اس لیے کوئی مقرر مسلمانوں کے لیے یا کسی کا لفظ استعمال نہ کرے۔ خطبہ صدارت کے بعد سر آغا خان نے ایک طویل قرارداد پیش کی جس میں ان امور پر زور دیا گیا۔ اول : مسلمان کسی شرط پر اور کسی صورت میں بنی جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ دوم : سندھ نو بمبئی سے الگ لیا جائے۔ سوم : صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے برابر ایسی اصلاحات نافذ کی

جائیں۔ چہارم : ہندوستان کی حکومت فیڈرل طرز کی ہو۔ پنجم : باقی ماندہ یا مابقی اختیارات مرکزی جگہ صوبوں کو دیے جائیں۔ ششم : مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نیابت دی جائے۔ ۹۔

علامہ اقبال نے اس قرارداد کی حمایت میں جو تقریر کی اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے :-

”میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہ عمل قائم کی تھی، وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔“

”حضرات ! میں آج نہایت صاف صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے، تو ان کو جلد از جلد اپنی اصلاح و ترقی کے لیے سعی و کوشش کرنی چاہیے۔ اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے بعض حصے ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔ آج ہر قوم اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و کوشش کر رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و کوشش نہ کریں۔ آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو رزولوشن پیش ہوا ہے، وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرور عالم

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کا
اجماع کبھی گمراہی پر نہیں ہوگا۔“ ۱۰

اب ہر طرف آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا غلغلہ تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے
قومی مطالبات پر اجماعِ امت ہو چکا تھا۔ ان مطالبات کے حق میں جا بہ
جا جلسے ہوئے۔ کانفرنس کے کم و بیش تین مہینے بعد جناب محمد علی
جناح نے محسوس کیا کہ جب نظریات میں بظاہر کوئی اختلاف نہیں رہا
اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے آن کی مساعی کی کانگریس نے بھی کوئی قدر
نہیں کی، تو بہتر یہی ہے کہ دونوں مسلم لیگیں ایک دوسرے میں ادغام
ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی لیگ کے سیکرٹری ڈاکٹر سیف الدین کچلو
کو لاہور بھیجا تا کہ وہ حضرت علامہ اور سر محمد شفیع سے رابطہ پیدا
کریں۔ ڈاکٹر کچلو نے مدیران ”انقلاب“ کی مدد سے علامہ سے ملاقات
کی اور مفصل تبادلہ خیالات کے بعد فیصلہ ہوا کہ دونوں مسلم لیگ
کونسلوں کے اجلاس دہلی میں ایک ہی تاریخ پر ہوں اور پھر ایک مشترک
اجلاس کر کے دونوں کا ادغام عمل میں لایا جائے۔ ۱۱ یہ مشترک اجلاس
مارچ ۱۹۴۹ء کے اواخر میں ہوا۔ دونوں لیگوں کے رہنما شریک ہوئے لیکن
نہرو رپورٹ کے چند حامی مسلمانوں نے ایسی اتھری پیدا کر دی کہ جناب
محمد علی جناح کو اجلاس ملتوی کرنا پڑا۔ اور وہ اپنے وہ چودہ نکات پھر
پیش نہ کر سکے جو بعد میں قومی مطالبات کی صورت اختیار کر گئے اور
سیاسی تاریخ میں ”جناح کے چودہ نکات“ کے نام سے مشہور ہو گئے۔
اس اجلاس کے افسوسناک انجام پر۔ اپریل ۱۹۴۹ء کو حضرت علامہ، ملک
فیروز خان نون اور شیخ عبدالقادر نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا، جس
میں نہرو رپورٹ کے حامیوں کی تخریبی دگرہیوں کا پردہ چاک کیا۔ ۱۲

بہر حال اس کے چند ماہ بعد ادغام عمل میں آ گیا۔ سر محمد شفیع نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور جناب محمد علی جناح صدر بن گئے۔

حضرت علامہ اپنے اصولوں کے اتنے پکڑے تھے کہ ایک مرحلے پر جب لاہور لیگ سے اصولی اختلاف پیدا ہوا تو جنرل سیکرٹری کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ سائمن کمشن کے سامنے پیش کرنے کے لیے مئی ۱۹۲۸ء میں جو یادداشت مرتب کی گئی، اس میں ایک تجویز یہ تھی کہ صوبائی حکومتوں میں قانون، امن اور عدل کے شعبے گورنروں کو سونپ دے جائیں۔ علامہ اس کے خلاف تھے اور وہ چاہتے تھے کہ صوبائی خود مختاری پر لحاظ سے مکمل ہو۔ ابھی یہ یادداشت تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھی کہ علامہ کو دردِ گردہ کی شکایت عود کر آئی اور وہ علاج کے لیے دہلی چلے گئے۔ ان کی غیرحاضری میں یادداشت میں مطلوبہ تبدیلیاں نہ کی گئیں۔ جب وہ دہلی سے لوٹے تو اخباروں میں یادداشت کی تلخیص دیکھ کر بہت مایوس ہوئے۔ اس پر انہوں نے ۲۴ جون ۱۹۲۸ء کو لیگ کی جنرل سیکرٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے مکتوب میں لکھا: "۔۔۔ یادداشت میں صوبائی خود مختاری کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ بلکہ اس میں تجویز کیا گیا ہے کہ صوبوں میں وحدانی حکومتیں قائم کی جائیں اور قانون، امن اور عدل کے محکمے براہِ راست گورنروں کے چارج میں دے دیے جائیں۔ میرے لیے یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ یہ تجویز حقیقت میں دو عملی نظامِ حکومت کی ایک ملفوف شکل ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی آئینی پیش رفت مطلوب نہیں۔" ۱۳

اس پر سر محمد شفیع اور ان کے دوسرے ساتھی پریشان ہوئے۔ مسئلے پر دوبارہ غور کیا گیا اور صوبائی خود مختاری کے مطالبے کو یادداشت میں

شامل کیا گیا۔ اس پر علامہ نے استعفیٰ واپس لے لیا اور جب ۵ نومبر ۱۹۴۸ء کو مسلم لیگ کا وفد سائمن کمشن سے ملا تو اس میں علامہ بھی شامل تھے اور سر محمد شفیع کے پہلو بہ پہلو آپ نے بھی کمشن کے سوالات کے جواب دئے۔ ۱۳

علامہ کی سیاسی زندگی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، لیکن انہوں نے اس مختصر سی سیاسی زندگی میں بھی ثابت کدیر دکھایا کہ اصولوں پر سمجھوتہ ناممکن ہے۔ وہ دو باتوں پر خصوصی زور دیتے تھے۔ اول: جداگانہ انتخاب۔ دوم: صوبائی خود مختاری۔ پہلے مطالبے کا مقصد قومی تشخص کا تیقن تھا اور دوسرے مطالبے کے پس پردہ یہ جذبہ کارفرما تھا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں نظم و سق آن کے ہاتھ میں آجائے۔ اور یہی دو عناصر پاکستان کی ابتداء کی حیثیت رکھتے تھے۔

حوالے

- ۱ - Muslim Separatism in India - صفحات ۹۸-۱۹۶ -
- ۲ - "گفتارِ اقبال" - صفحات ۶۶-۶۹ (بحوالہ "انقلاب" - ۲۱ اگست ۱۹۲۸ء) -
- ۳ - ایضاً - صفحات ۷۰-۷۲ (بحوالہ "انقلاب" - ستمبر ۱۹۲۸ء) -
- ۴ - "سرگذشت" - ص ۲۵۴ -
- ۵ - "اقبال کے آخری دو سال" - ص ۲۲۰ -
- ۶ - Muslim Separatism in India - ص ۲۰۰ -
- ۷ - ایضاً و "اقبال کے آخری دو سال" - صفحات ۲۱۳-۲۱۴ -
- ۸ - "سرگذشت" - ص ۲۶۲ -
- ۹ - "اقبال کے آخری دو سال" - صفحات ۲۲۹-۲۲۸ -

- ۱۰ - ”گفتارِ اقبال“ - ص ۷۳ (بحوالہ ”انقلاب“ یکم جنوری ۱۹۲۹ء
اور رپورٹ آل پارٹیز مسلم کانفرنس، دہلی ۱۹۲۹ء - م ۲۸-۲۹ -
- ۱۱ - ”سرگذشت“، - صفحات ۲۶۵-۲۶۴ -
- ۱۲ - ”گفتارِ اقبال“ - صفحات ۹۱ - ۸۷ (بحوالہ ”انقلاب“
۱۰ اپریل ۱۹۲۹ء) -
- ۱۳ - ”ذکرِ اقبال“، - صفحات ۲۴۲-۲۴۰ اور -
Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۱۶۰-۱۵۹ -
- ۱۴ - ”ذکرِ اقبال“، - ص ۱۴۲ -



سترہواں باب

دینی تفکر کا انداز جدید

کارزارِ سیاست کی ہمہ سعی کے دوران میں بھی حضرت علامہ سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے رہے۔ ان کے مطالعہ کا موضوع تھا ”اسلام میں دینی تفکر کا اندازِ جدید“ مقصد یہ تھا کہ اسلام کی فلسفیانہ روایت اور علم کے مختلف دوائر میں تازہ تبدیلیوں کا خیال رکھتے ہوئے فکرِ اسلامی کی تعمیر نو ہو۔ وہ اس حقیقت سے خوب آگاہ تھے کہ اگرچہ اسلام ایک جان دار اور انقلابی تحریک ہے، لیکن صدیوں پرانے جمود نے اس پر گرد کی ایسی تہیں جا رکھی ہیں کہ اس کی اصل صورت نظروں سے اوجھل ہے۔ انہوں نے گہرے مطالعہ اور گہری سوچ سے گرد صاف کر کے صرف اس کی اصل منزہ صورت نمایاں کر دی، بلکہ قدیم و جدید کے امتزاج سے اسے ایک ایسے انداز میں پیش کیا کہ یہ عصر حاضر کے چیلنج سے حسن و خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکے۔

علامہ نے خطباتِ مدراس کے دیباچے میں یہ اہم نکتہ بھی موجودہ زمانہ اس کوشش کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس اشارت میں بہت سے عناصر کارفرما تھے۔ اول یہ کہ دورِ جدید میں مذہب پر جو ہمہ گیر بلغار ہو رہی تھی، اس کا مقابلہ نئے ہتھیاروں ہی سے ہو سکتا تھا۔ دوم: دنیائے اسلام میں سیاسی بیداری کے جو آثار نظر آ رہے تھے، ان کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ملتِ اسلامیہ نظریاتی اعتبار سے لیلِ کانٹے سے اہس ہو۔

سوم : برعظیم کے مسلمان جداگانہ انتخاب اور صوبائی خود مختاری کے ذریعے
 سے قومی تشخص کی بحالی کے لیے جو جد و جہد کر رہے تھے ، آتے
 استحکام بخشنے کے لیے اور ایک مثالی نظام کی تشکیل کی خاطر نظریاتی
 بنیادیں فراہم کی جائیں۔ اور ان خطبات میں خوبی کا ایک بڑا پہلو یہ تھا
 کہ علامہ نے اپنی سوچ کو قطعی اور آخری قرار دیتے تھے اور نہ یہ چاہتے
 تھے کہ عصر حاضر کی بدلتی ہوئی دنیا میں فکر اسلامی کے سوتے خشک
 رہیں۔ چنانچہ انہوں نے خطباتِ مدراس کے دیباچے میں لکھا :

”یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ فلسفیانہ سوچ میں کوئی
 قطعیت نہیں ہوتی۔ جوں جوں علم ترقی کرے گا اور فکر کی
 نئی رائیں کھلیں گی ، غالباً میری تاویلات سے بہتر تاویلات
 کے ابھرنے کا امکان ہوگا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ بڑی احتیاط
 کے ساتھ انسانی فکر کے ارتقاء پر نظر رکھیں اور ایک آزاد ،
 تنقیدی طرزِ عمل قائم رکھیں۔“ ۱

خطباتِ مدراس یا دوسرے لفظوں میں ”تشکیلاتِ جدید الہیاتِ اسلامیہ“
 سات مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات ۱۹۲۹ء کے آغاز میں مدراس مسلم
 ایسوسی ایشن کی دعوت پر پڑھے گئے۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن اور
 علی گڑھ کی علمی محفلوں میں بھی پیش کیے گئے۔

علامہ نے پہلے مقالے میں لکھا کہ پچھلے پانسو سال سے اسلام میں
 دینی تفکر عملی اعتبار سے جامد ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب یورپی
 فکر دنیا نے اسلام سے روشنی حاصل کرتا تھا۔ لیکن آج یہ صورت ہے کہ
 دنیا نے اسلام بڑی تیزی کے ساتھ روحانی اعتبار سے یورپ کی طرف بڑھ رہی

ہے۔ اس میں کوئی خرابی نہیں کیونکہ یورپی ثقافت اپنے ذہنی پہلو سے اسلامی ثقافت کے بعض اہم ترین ادوار کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہمارا اندیشہ صرف یہ ہے کہ یورپی ثقافت کی ظاہری چمک دمک اتنی خیرہ کن ثابت نہ ہو کہ اس سے ہماری آگے بڑھنے کی رفتار کم ہو جائے اور ہم اس کی اندرونی حقیقت تک رسائی میں ناکام رہیں۔ ہمارے دور جمود میں یورپ عظیم مسائل پر سوچتا رہا۔ اس سوچ نے تسخیرِ فطرت کے دروازے کھول دیے۔ انسان میں ایک نئی خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ ماحول کی قوتوں پر برتری کا ایک نیا احساس ابھرا۔ پرانے تجربات پر نئے تجربات کی روشنی میں تفکر ہوا اور بہت سے نئے مسائل بھی اُٹھے۔ ایسے میں یہ کوئی اجنبی کی بات نہیں کہ ایشیا اور افریقہ میں مسلمانوں کی نوجوان نسل ایک نئی سمت کی تلاش میں ہے۔ اب ہمیں ایک آزاد جذبے کے ساتھ دیکھنا ہے کہ یورپ نے کیا کچھ سوچا ہے اور وہ جن نتائج پر پہنچا ہے وہ کہاں تک اس معاملے میں مددگار ہو سکتے ہیں کہ دینیاتی فکر پر نظرِ ثانی کی جائے۔ یا ضرورت ہو تو ایسے ایک نیا رنگ دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ اس مذہبِ دشمن اور خاص طور پر اسلام دشمن پروپیگنڈے کو نظر انداز کر دیں جو وسطی ایشیا میں ہو رہا ہے اور ہندوستان کی سرحد کو پھلانگ چکا ہے۔ پس وقت آ گیا ہے کہ اسلام کے بنیادی عناصر پر نظر ڈالی جائے۔ میں ان مقالات میں اسلام کے بعض بنیادی نظریات پر فلسفیانہ بحث کرنے کا تاکہ نئے نوعِ انسانی کے لیے ایک پیغام کی حیثیت سے اسلام کی مناسب تقدیم ہو سکے اور مزید بحث کے لیے زمین تیار کر لی جائے۔

علاوہ نے بتایا کہ فلسفہ آزادانہ عقلی تجسس و تحقیق کا نام ہے۔ اس کے مقابلے میں دین کی اساس ایمان پر ہے اور ایمان عقل کی رہنمائی سے مستغنی ہوتا ہے۔ اس کی مثال بعض ہریدوں کی پرواز ہے جو خرد اور

استدلال کی رہنمائی کے بغیر اپنا راستہ بھی جانتے ہیں اور اپنی منزل پر بھی پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایمان محض جذبے اور تاثر کا نام ہے۔ ایمان کے اندر ایک انداز کی عقل اور علم بھی مضمون ہے۔ لیکن دین محض استدلال کی پیداوار نہیں اور اپنے اوپر استدلال کی حکومت تسلیم نہیں کر سکتا۔ عقل اور وجدان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک کا تعلق حقیقت کے زمانی پہلو سے ہے اور دوسرے کا لازمانی، سرمدی اور ابدی پہلو سے بلکہ وجدان ایک وسیع تر اور بلند تر عقل ہی کا نام ہے۔ اسلام کی عقلی تاسیس کوئی بعد کی پیداوار نہیں خود حضور سرور کائناتؐ اشیاء کی ماہیت کو جاننا چاہتے تھے اور قرآن حکیم میں استدلال بھی موجود ہے اور عقل کو استعمال کرنے اور مشاہدہ کائنات سے اس کے خالق کو پہچاننے کی تلقین ہے۔

اقبال کے نزدیک سائنس اور مذہب دونوں کے موضوع و معروض الگ الگ ہیں۔ مذہب کیمیا اور طبیعیات کا حریف بن کر عالم محسوسات کے لیے کوئی نظریہ پیش نہیں کرتا۔ دونوں کا مدار اور معروض تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ایک کا معروض روحانی تجربہ ہے اور دوسرے کا معروض عالم محسوسات۔ مذہب روحانی تجربے کی حقیقت و ماہیت کو پہنچنے کی کوشش کا نام ہے۔ ۲

دوسرے مقالے کا موضوع ہے۔ ”مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار“ اور اس کا مقصد یہ دریافت کرنا تھا کہ عقل مذہبی وجدان کی کہاں تک تائید کرتی ہے۔ علامہ نے اس مسئلے کی پوری چھان پھٹک کے بعد آخر میں لکھا :

”یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مذہب کے عزائم فلسفہ سے بلند تر ہیں۔ فلسفہ عبارت ہے، حقائق کے عقلی ادراک سے۔“

لہذا وہ کسی ایسے تصور سے آگے نہیں بڑھتا جو ہمارے محسوسات و مدركات کی گوناگون دُنیا کو ایک نظام میں مدغم کر دے۔ وہ گویا دُور ہی سے حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ برعکس اس کے، مذہب اس سے قرب و اتصال کا آرزومند ہے۔ ایک نظریہ ہے۔ دوسرا حقیقت، تقرب اور اتصال۔ لیکن یہ تقرب اور یہ اتصال جب ہی ممکن ہے کہ فکر اپنے حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ جس میں اُسے کامیابی ہوگی تو اس ذہنی روش کی بدولت جسے مذہب نے دُعا سے تعبیر کیا ہے اور جو پیغمبرِ اسلام صلعم کے لبِ مبارک پر تا دمِ آخر موجود تھی۔“

تیسرے مقالے میں علامہ نے ذاتِ اللہیہ کے تصور اور حقیقتِ دُعا کے مسئلے پر روشنی ڈالی اور ایک وسیع تناظر میں اس کے مطالعہ کے بعد آخر میں لکھا:

”اسلام نے عبادت کے لیے ایک مخصوص سمت انتخاب کی تو محض اس لیے کہ جماعت کے اندر ایک ہی قسم کے جذبات موج زن ہوں، بعینہ جس طرح اس کی ظاہری شکل سے مساواتِ اجتماعی کی حس بیدار ہوتی اور پرورش پاتی ہے۔ لیوننگ صلوٰۃ یا جماعت سے مقصود ہی یہ ہے کہ شرکائے جماعت سب اپنے مرتبہ و مقام یا نسلی حیثیت کا کوئی احساس باقی نہ رہے۔۔۔ نوعِ انسانی ایک ہے۔ اس لیے کہ وہ محیط برکُل ذات جس نے ہر شے کو اپنے دامن میں لے رکھا ہے، جو ہر انا کی خالق اور اس کا سہارا ہے، ایک ہے۔ لہذا قرآن مجید نے

نسل اور قوم اور شعوب و قبائل کی تقسیم کو تعارف کا ایک ذریعہ ٹھہرایا تو اس کی وجہ بھی یہی ہے - حاصلِ کلام یہ ، کہ اسلام میں صلوات یا جماعت حصولِ معرفت ہی کا سرچشمہ نہیں ، اس کی قدر و قیمت کچھ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے - صلوات یا جماعت سے اس تمنا کا اظہار بھی مقصود ہے کہ ہم ان سب امتیازات کو مٹاتے ہوئے ، جو انسان اور انسان کے درمیان قائم ہیں - اپنی اس وحدت کی ترجیحی ، جو گویا ہماری خلقت میں داخل ہے ، اس طرح کریں کہ ہماری عملی زندگی میں اس کا اظہار سچ سچ ایک حقیقت کے طور پر ہونے لگے - " ۵

چوتھے خطبے میں "انسانی انا اس کی آزادی اور بقائے دوام" کے تحت علامہ نے خودی ، جبر و قدر اور حیلت بعدالموت کے مسائل کی تشریح کی اور یہ بھی لکھا کہ "ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ فکر از سر نو غور کریں -" علامہ کے نزدیک شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے ایک نئی رُوح کی بیداری محسوس کی - "لیکن اس عظیم الشان فریضے کی حقیقی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا اندازہ تھا تو سید جمال الدین افغانی کو ، جو اسلام کی حیاتِ ملی اور حیاتِ ذہنی کی تاریخ میں بڑی گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے انسانوں اور ان کی عادات و خصائص کا وسیع تجربہ رکھتے تھے - ان کا مطمحِ نظر بہت بلند تھا اور اس لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ ان کی ذاتِ گرامی ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک جیتا جاگتا رشتہ بن جاتی - ان کی انتھک کوششیں اگر صرف اسی امر پر مرکوز رہتی کہ اسلام نے نوعِ انسان کو

جس طرح کے عمل اور ایمان کی تلقین کی ہے ، اس کی نوعیت کیا ہے ۔ تو آج ہم مسلمان اپنے پاؤں پر کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوتے۔“

پانچویں خطبے کا عنوان ہے ۔ ”اسلامی ثقافت کی روح“ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ دنیائے اسلام نے علم و حکمت کی جو خدمات سرانجام دی ہیں ان کا جائزہ لیا جائے ۔ بلکہ یہ تھا کہ ان تصورات کی جانچ پرکھ کی جائے جو اسلامی تہذیب و ثقافت میں کارفرما رہے ۔ ان تصورات میں عقیدہ ختم نبوت کے اہم اور بنیادی تصور کو علامہ نے اولیت دی ۔ علامہ کا ارشاد تھا کہ اسلام میں نبوت اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی ، اس لیے اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا ۔ اسلامی نظام فکر میں اس بات کا گہرا ادراک مضمر تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا ۔ اس کے شعور ذات کی تکمیل ہوگی تو اس طرح ، کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے ۔ بہر حال تصور خاتمیت سے علامہ کی مراد یہ نہیں تھی کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا عمل دخل ہے اور جذبات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں ۔ ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ واردات باطنی کی دوائی بھی صورت ہو ہمیں اس پر بحیثیت ایک ماخذ علم کے آزادانہ تنقید کا حق پہنچتا ہے۔ انہوں نے لکھا :

”اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدہ ”یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں رہتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے ، لہذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے ۔ اس اجازت سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے ، جس سے اس قسم کے دعووں کا قلع قمع ہو جاتا ہے اور جس

سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی

دُنیا میں بھی علم کے نئے نئے دروازے بھی کھل جائیں۔“

اقبال نے بتایا کہ مشاہداتِ باطن علمِ انسانی کا صرف ایک ذریعہ ہیں۔ قرآنِ پاک کے نزدیک اس کے دو اور سرچشمے ہیں۔ ایک عالمِ فطرت، دوسرا عالمِ تاریخ۔ مظاہرِ فطرت حقیقتِ مطلقہ کی آیات ہیں اور اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور و تفکر سے کام لے۔ یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے۔ کیونکہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے، وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا۔ جہاں تک عالمِ تاریخ کے سرچشمے کا تعلق ہے، اس کے سائنسی مطالعہ سے وسیع تر تجربہ کے حصول، عقلِ عملی کی مزید پختگی اور آخر کار زندگی و زمان کی ماہیت سے متعلق بعض بنیادی تصورات کے بہتر تحقق کا امکان ہے۔ یہ بنیادی تصورات دو ہیں۔ اول: وحدتِ مبداءِ حیات۔ ”یہاں وحدتِ انسانی کا خیال نہ تو محض کوئی فلسفیانہ تصور تھا نہ شاعرانہ خواب۔ بلکہ بحیثیت ایک عمرانی تحریک کے اسلام کا مقصد یہ تھا کہ اس تصور کو مسلمان کی روزانہ زندگی کا ایک زندہ عنصر بنا دیا جائے اور یوں ایک خاموش، غیر محسوس طریقے سے اُس کو درجہ تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔ دوم: حقیقتِ زمان کا نہایت گہرا احساس اور زندگی کا یہ تصور، کہ وہ عبارت ہے زمان میں ایک مسلسل اور مستقل حرکت سے۔“

چھٹے خطے کا عنوان ہے۔ ”اسلام کی ترکیب میں حرکت کا اصول۔“

اس میں اجتہاد کے مسئلے پر علامہ نے شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی۔ دنیا نے اسلام میں اُس وقت جو فکری تحریکیں نمودار ہوئی تھیں، ان کا تجزیہ

کیا اور انہیں اسلامی تعلیمات کی کسوٹی پر پرکھا۔ زمانہ حال کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا اور ایسے نتائج پر پہنچے جو کم از کم اس زمانے میں عام روایتی روش سے ہٹ کر تھے۔ اس خطبے کے جہاد مطالب کا احاطہ کرنا تو نہ ممکن ہے اور نہ ہمارے منصب میں شامل ہے۔ لیکن چند نمایاں نقوش بیان کیے جا سکتے ہیں۔

۱۹۲۸ء میں ہمارے رہنما دنیا نے اسلام کی سیاست پر بھی مشورہ تھے اور برعظیم کی اسلامی سیاست پر بھی۔ اس تشویش نے انتشارِ فکر کو جنم دیا اور اقبال نے حالات کا تجزیہ کر کے انتشارِ دور کرنے کی سعی فرمائی۔ اس زمانے میں ترکیہ میں جمہوریت کا دور دورہ ہو چکا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کی بساط الٹ چکی تھی۔ لیکن برعظیم کے بہت سے رہنما روایتی اندازِ فکر کو اپنائے ہوئے تھے۔ وہ خلافت کا احیاء چاہتے تھے۔ لیکن لوگوں کی آرزو تھی کہ کمال اتاترک یہ کارنامہ سرانجام دیں۔ لیکن لوگ سعودی عرب کے حکمران سلطان ابن سعود سے امیدیں باندھ رہے تھے۔ ادھر برطانوی سامراج کی آرزو تھی کہ کوئی ایسی شخصیت مل جائے جو خلیفۃ المسیحین بھی ہو اور کٹھ پتلی بھی۔ اس آرزو کے پس پردہ یہ محرک جہادِ زوردار تھا کہ اتحادِ عالمِ اسلامی کے لیے مسلمانوں کے سینوں میں جو تمناں بھری ہوئے ہیں، ان کے نکاس کی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ ساری دنیا کے مسلمان برطانوی سامراج کی آلہ کار بن جائے۔ ایسے میں اقبال نے لکھا:

”سنی قانون کی رو سے ایک امام یا خلیفہ کا تقرر قطعی طور پر ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا خلافت کسی فرد واحد کو تفویض ہونی چاہیے یا نہ لیتا؟“

اجتہاد یہ ہے کہ اسلام کی رُوح کے مطابق خلافت افراد کی ایک جماعت یا ایک منتخب شدہ اسمبلی کو بھی تفویض ہو سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، مصر اور ہندوستان کے فقہا نے اس نکتے پر اظہارِ خیال نہیں کیا۔ ذاتی طور پر سیری رائے یہی ہے کہ ترکیہ کا نقطہ نگاہ بالکل معقول ہے۔ بلکہ اس معاملے میں کسی استدلال کی حاجت نہیں۔ جمہوری طرزِ حکومت نہ صرف اسلام کی رُوح کے مطابق ہے، بلکہ دنیائے اسلام میں جو نئی قوتیں ابھر رہی ہیں ان کے پیش نظر جمہوریت ایک ضرورت بن چکی ہے۔“

علامہ نے بتایا کہ ابنِ خلدون نے عالمی خلافتِ اسلامیہ کے تین مختلف تصورات کا تذکرہ کیا ہے۔ اول: عالمی امامت ایک شرعی ادارہ ہے، اس لیے اس کا قیام واجب ہے۔ دوم: یہ محض امرِ مصلحت ہے۔ سوم: ایسے کسی ادارے کی ضرورت نہیں۔ ترکیہ نے پہلے تصور کو چھوڑ کر دوسرے تصور کو اپنایا ہے۔ ترکوں کا استدلال ہے کہ سیاسی سوچ میں ہمیں ماضی کے سیاسی تجربے سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ جو یہ ہے کہ عالمی خلافت کا تجربہ عملاً ناکام رہا ہے۔ جب تک ایک اسلامی سلطنت قائم تھی، اس پر عمل ممکن تھا۔ لیکن جب سلطنت آزاد سیاسی اکٹیوں میں بٹ گئی تو یہ تصور ممکن العمل نہیں رہا۔ بلکہ یہ تصور آزاد اسلامی ریاستوں کے اتحاد میں حائل بھی رہا ہے۔ ایران عقیدے کے اختلاف کی بناء پر خلافت سے الگ رہا۔ مراکش ہمیشہ اسے شہرے کی نظروں سے دیکھتا رہا اور عرب اپنے کھونے ہوئے منصب کی بازیابی کی آرزو کرتے رہے۔ اور یہ سب اختلاف کیوں؟ محض اقتدار کی ایک ایسی علامت کی

خاطر ، جو عملی اعتبار سے ایک عرصے سے ختم ہو چکی تھی - پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اس تجربے سے کوئی سبق حاصل نہ کریں ؟ علامہ نے اس اندازِ فکر سے اتفاق کیا - ۹

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر عالمی خلافتِ اسلامیہ کا تصور ختم ہوتا ہے تو دنیائے اسلام کے اتحاد کی صورت کیا ہوگی ؟ علامہ نے یہ تجویز پیش کی کہ اس وقت ہر مسلمان قومیت کو اپنی ذات کی گہرائی میں ڈوب جانا چاہیے اور عارضی طور پر اپنی توجہ اپنے آپ پر مرکوز کر دینی چاہیے - حتیٰ کہ سب اتنی مضبوط و توانا ہو جائیں کہ وہ جمہوریتوں کا ایک جیتا جاگتا خاندان وجود میں لا سکیں - اقبال نے لکھا :

”میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر یہ حقیقت آہستہ آہستہ منکشف کر رہا ہے کہ اسلام نہ وطنیت ہے ، نہ سامراج - بلکہ وہ ایک جمعیتِ اقوام ہے جو مصنوعی سرحدات اور نسلی امتیازات کو محض حوالے کی آسانی کے لیے تسلیم کرتی ہے ، نہ کہ اپنے ارکان کا معاشری دائرہ نظر محدود کرنے کے لیے -“ ۱۰

گویا اقبال کے نزدیک اتحادِ اسلامی رسمی خلافت کے ذریعے سے نہیں بلکہ آزاد جمہوریتوں کے ایک جیتے جاگتے خاندان یا جمعیتِ اقوام کے روپ میں ممکن ہے - اس کے بعد سامراجی طاقتوں نے کٹھ پتلی خلافت کے احیاء کے لیے بہت سی کوششیں کیں - کبھی ابن سعود کو آئے بڑھایا ، کبھی شاہ عبداللہ کو اور کبھی شاہ فاروق کو - لیکن جوں جوں مسلمان قومیں آرا- ہوتی چلی گئیں ، رسمی خلافت کا تصور ہسٹا ہوتا چلا گیا اور

آج دنیائے اسلام میں وہی رجحان نمودار رہا ہے ، جس کی نشان دہی علامہ نے کی تھی ۔

اس خطبے میں علامہ نے جمہوری رجحانات کے پیش نظر ایک اور مسئلے کا بھی حل پیش کر دیا ۔ مسئلہ یہ تھا کہ اجتہاد کا اختیار کس کو ہے ۔ مختلف مذاہب فقہ کے نمائندہ افراد کو یا ایک مسلم قانون ساز اسمبلی کو ؟ اقبال کی رائے یہ تھی کہ آج کے زمانے میں متصادم فرہوں کی تعداد میں اضافے کے پیش نظر اجماع کی بہترین صورت مسلم قانون ساز اسمبلی ہی مہیا کر سکتی ہے ۔ وہ قانون سازی میں مشورے کے لیے علماء کی کمیٹی کے تصور کو خطرناک قرار دیتے تھے اور زیادہ سے زیادہ اسے ایک عارضی تجربہ کی حیثیت سے گوارا کرنے پر تیار ہو گئے ۔ رہا یہ خدشہ کہ قانون ساز اسمبلی میں زیادہ تر عابثے لوگ شامل ہوں گے جو اسلامی قانون کی باریکیوں سے نا آشنا ہوں گے ، اس لیے قانون کی تاویل میں غلطیوں کا امکان ہوگا تو اقبال کے نزدیک اس کا علاج یہ تھا کہ نمائندہ علماء بھی قانون ساز اسمبلی کے رکن ہوں اور مسلمان ملکوں میں قانون کی تعلیم کے موجودہ نظام میں اصلاح کی جائے ۔ اس کا دائرہ وسیع کیا جائے اور اسلامی قانون کے ساتھ ساتھ دوسرے جدید قانونی نظام بھی زیر مطالعہ آئیں ۔ آج نصف صدی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ دنیائے اسلام میں اسی بنیاد پر کام چلایا جا رہا ہے ۔ ۱۱

ساتویں خطبے کا عنوان تھا ۔ کیا مذہب ممکن ہے یا کیا مذہب کا امکان ہے ؟ یہ خطبہ خطبات مدراس میں شامل نہ تھا بلکہ ارسٹوٹیلین سوسائٹی لندن کی دعوت پر لکھا گیا تھا ۔ علامہ نے اس موضوع پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا کہ مذہب اور سائنس ،

دونوں کی منزل مقصود ایک ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے طریقہ ہائے کار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دونوں کا نصب العین یہ ہے کہ حقیقت کی تہ تک پہنچیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ مذہب سائنس سے کہیں بڑھ کر حقیقتِ مطلقہ تک پہنچنے کا آرزومند ہے۔ پھر دونوں کے نزدیک موجود حقیقی تک رسائی کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی کہ ہم اپنے احساسات اور تجربات کی تطہیر کرتے رہیں۔ ایک ماہر سائنس کی طرح مذہبی نفسیات کا طالب علم بھی مختلف تجربات سے گزرتا ہے مگر محض ایک ناظر کی حیثیت سے نہیں بلکہ تجربہ کے ایک ناقد کے انداز سے، وہ ایک مخصوص تکنیک کے قواعد کے مطابق جو اس نوعیت کی تفتیش کے لیے موزوں ہیں، تمام موضوعی عناصر کو تجربہ کے متن سے خارج کر دیتا ہے تا کہ وہ قطعی معروضیت کے مقام تک پہنچ جائے۔ جب وہ اس آخری مکلفہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو وہ اسے بغیر کسی تامل کے اپنے وجود کے اصل اصول کی حیثیت سے پہچان لیتا ہے۔ یہ تجربہ یں اسرار نہیں بلکہ ایک فطری تجربہ ہے اور انسانی ایغوا کے لیے نہایت اہم حیاتیاتی مفہوم کا حامل ہے۔ البتہ ایک خطرہ اس میں ایغوا کو لاحق ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آخری تجربہ سے ماقبل تجربات میں وہ اس قدر کھو جائے کہ اس کی فعالیت میں مستی آ جائے۔ مشرقی تصوف کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ ایک حقیقی خطرہ ہے۔

علامہ مدراس پہنچے تو ان کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ ریلوے سٹیشن پر ان کا شاندار استقبال ہوا۔ خطبات کے لیے جن مجالس کا انعقاد ہوا ان میں حاضری بھرپور تھی اور متنوع بھی۔ مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو ہندو اہل علم بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ پہلے دو جلسوں کی صدارت ڈاکٹر پی۔ سیہرائین نے کی اور گورنر کی طرف سے ایک خصوصی خیر مقدمی

پیغام پڑھا گیا - ۱۴ بہت سی انجمنوں نے تقریبات برپا کیں اور ان میں علامہ کی خدمت میں سپاسنامے پیش کیے - انجمنوں کے نام یہ ہیں : انجمن ترقی، اردو، ہندی پرچاری سبھا، اردو سوسائٹی، گورنمنٹ محمدن کالج، انجمن خواتین اسلام، یتیم خانہ اسلامیہ اور انجمن ہلال احمر - ۱۴ انجمن ہلال احمر کے سپاسنامے کے جواب میں تقریر تو مختصر کی لیکن اس میں دو اہم نکتے بیان کر دیے - اول : ہندوستان، ایران، افغانستان، شام، حجاز اور چین نے ایک دوسرے سے طویل فاصلوں کے باوجود اپنے مسئلے کا جو حل تجویز کیا ہے اس کے اصولوں میں ایک نمایاں یکسانیت پائی جاتی ہے - خیالات کا یہ اتحاد ایشیا کے مستقبل کے لیے ایک نیک شگون ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ ایشیا کو پھر عروج حاصل ہوگا - دوم : ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مسائل پر دونوں پہلوؤں سے غور کر کے ایک مصالحانہ نتیجے پر پہنچنا چاہیے - پرانی دنیا ختم ہو رہی ہے، نئی دنیا ظہور میں آنے والی ہے اور ہندوستان ہی وہ ملک ہے جو مادہ پرستوں کی مغربی دنیا کو نیا پیغام پہنچانے کے قابل ہوگا - ۱۵

۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو انجمن خواتین اسلام نے اپنے سپاسنامے میں عورت کی مظلومیت اور حریت نسواں کی ضرورت کا تذکرہ کیا - اس کے جواب میں علامہ نے ایک مفصل تقریر میں چند اہم نکات پیش کیے، جن کی تلخیص پیش کرنا ضروری ہے - ۱۶

اول : اسلام میں عورت اور مرد میں قطعی مساوات ہے - قرون اولیٰ میں عورتیں جہاد میں مردوں کے دوش بدوش شریک ہوئیں - خلیفہ کے انتخاب میں اپنی آواز رکھتی تھیں - خلفائے عباسیہ کے عہد میں ایک موقع پر خلیفہ کی بہن قاضی القضاة کے عہدے پر مامور تھیں اور خود فتویٰ صادر کرتی تھیں -

دوم : عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص خاص علیحدہ فرائض ہیں۔ ان فرائض میں اختلاف ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔

سوم : اسلام میں ماں بچوں کی وراثت کا حق رکھتی ہے۔ عورت چاہے تو نکاح کے وقت یہ شرط پیش کر سکتی ہے کہ اسے طلاق لینے کا حق دیا جائے۔ اسلام میں تعدد ازدواج کا حکم نہیں دیا گیا محض اجازت ہے۔ عورت چاہے تو نکاح کے وقت مرد سے مطالبے کا حق رکھتی ہے کہ وہ تعدد ازدواج کی اجازت کو اپنے حق میں ترک کر دے۔ فقہ اسلامی میں بیوی بچوں کو دودھ پلانے کی اجازت طلب کر سکتی ہے اور لٹھانا بکھانے کی اجازت بذریعہ عدالت حاصل کر سکتی ہیں۔

چہارم : ”وہ حق جس کا عورت انصاف و عقل کے ساتھ نہیں مطالبہ کر سکتی ہے، وہ قرآن پاک نے دے دیا ہے۔ اگر آپ اس سے جاہل و غافل رہیں یا اس سے فائدہ نہ اٹھائیں یا اس سے حاصل کرنے پر اصرار نہ کریں، تو وقت ضرورت قانونی جازہ جوئی نہ کریں تو یہ قرآن یا شریعت اسلام کا قصور نہیں۔“

مدراس میں سہ روزہ قیام کے بعد حضرت علامہ بنگلور مہدی صاحب نے آپ کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ دو جلسے ہوئے۔ ایک کی صدارت ریاست میسور کے وزیراعظم نے کی دوسرے کی وزیر تعلیم نے۔ مہاراجہ صاحب میسور نے اور میسور یونیورسٹی نے بھی مدعو کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہاں بھی پہنچے اور میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی صدارت میں ”علم اور مذہبی مشاہدات“ پر وہ مقالہ پڑھا جو اس سے پہلے مدراس میں پڑھا چکے

تھے - یونیورسٹی کے غیر مسلم اہل تہذیب نے بھی ان کی پذیرائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور کہا کہ علامہ کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں لیکن وہ کسی مذہب یا جماعت کی ملک نہیں ہو سکتے - وہ ہم سب کے ہیں - علامہ کو ٹیپو سلطان شہید مرح سے عشق تھا اس لیے حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے مزاروں پر پہنچے اور فاتحہ پڑھی - علامہ فرماتے ہیں : ”میسور میں جہاں کہیں بھی گیا ، لوگوں کی زبانوں پر ایک ہی نام تھا - یعنی سلطان شہید کا نام - جہاں کہیں دو تین آدمیوں کی محفل گرم ہوتی ، ایک ہی قصہ تھا - ایک ہی رنگین داستان تھی جسے ہر کوئی بیان کرتا اور سب لوگ ادب سے سر جھکائے سنتے اور وہ سلطان شہید کی معرکہ آرا زندگی کا ماجرا تھا - بازاروں میں دکانداروں کا موضوع سخن بھی یہی تھا - دو تین مجلسوں میں جہاں جانے کا مجھے اتفاق ہوا یہی باتیں ہوتی رہیں - میں نے عملاً کئی مرتبہ گفتگو کا رخ دوسری باتوں کی طرف پھیرا لیکن ہر بار پھر سلطان ٹیپو کا تذکرہ آ جاتا - ۱۸

اس کے بعد علامہ حیدرآباد دکن گئے - اس سے پہلے وہ دو مرتبہ دکن آ چکے تھے - ایک بار ۱۹۱۰ء میں، جب سر اکبر حیدری کے مہمان رہے اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد سے گہرے رابطے کا آغاز ہوا - دوسری بار ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں - تیسری بار آئے تو جامعہ عثمانیہ کی دعوت پر اور اس مقصد سے کہ جو لیکچر مدراس میں دیے تھے ، وہی حیدرآباد دکن میں بھی دیے جائیں - مہمان خانہ شاہی میں قیام ہوا - انہوں نے محل کی کتاب حضوری میں نام لکھا اور واپس ہو گئے - جب کتاب نظام کی خدمت میں پیش ہوئی تو انہوں نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی - چنانچہ ہرکارہ دوڑا - علامہ کو اطلاع دی اور وہ نظام سے ملے - ٹاؤن ہال میں

دو جلسے ہوئے۔ ایک کے صدر مہاراجہ کشن پرشاد شاد تھے دوسرے کے نواب سر امین جنگ بہادر۔ شاد نے ایک محفلِ مشاعرہ بھی برپا کی۔ علامہ نے دوسروں کا کلام تو سن لیا لیکن خود کلام سنانے سے متامل تھے۔ بہر حال اصرار غالب آیا تو چار پانچ شعر سنا دیے۔

اس طرح جنوبی ہند کا وہ علمی دورہ اپنے اختتام کو پہنچا جو اس اعتبار سے اقبال کی زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا کہ انہوں نے فکر و خیال کی ایسی ایمان افروز قندیلیں روشن کر دیں، جن کی ضیاء باری کا سلسلہ آج بھی قائم ہے۔

حوالے

- ۱ - Reconstruction of Religious Thought in Islam - ص (۱۷۱)۔
- ۲ - ایضاً - صفحات ۷-۸۔
- ۳ - ”فکرِ اقبال“ - صفحات ۷۷-۷۸ (تلخیص و اقتباس)۔
- ۴ - ”تشکیلِ جدید اللہیاتِ اسلامیہ“ - صفحات ۹۳-۹۴۔
- ۵ - ایضاً - صفحات ۱۳۰-۱۳۱۔
- ۶ - ایضاً - صفحات ۱۳۵-۱۳۶۔
- ۷ - ایضاً - صفحات ۱۹۰-۲۱۶ (تلخیص و اقتباس)۔
- ۸ - Reconstruction of Religious Thought in Islam - ص ۱۵۱۔
- ۹ - ایضاً - ص ۱۵۸۔
- ۱۰ - ایضاً - ص ۱۵۹۔
- ۱۱ - ایضاً - صفحات ۱۷۵-۱۷۶۔
- ۱۲ - ایضاً - صفحات ۹۶-۹۷۔
- ۱۳ - Letters and Writings of Iqbal - صفحات ۴۹-۵۳۔

۱۳ - ”ذکرِ اقبال“، - ص ۱۳۸ -

”انوارِ اقبال“، - صفحات ۲۳۰-۲۳۷ -

”گفتارِ اقبال“ - ص ۷۳ -

۱۵ - ”گفتارِ اقبال“، - ص ۷۳ (بحوالہ ”انقلاب“ ۱۷ جنوری ۱۹۲۹ء)

۱۶ - ایضاً - صفحات ۷۵-۸۳ -

۱۷ - اصل خبر میں یہ فقرہ درج تھا کہ ”عورتیں بچے جننے کی اجرت

طلب کر سکتی ہیں۔“ علامہ نے مدیر ”انقلاب“ کے نام ایک

مکتوب میں اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ میں نے دودھ

پلانے کی اجرت کا ذکر کیا تھا۔ ”خطوطِ اقبال“ - ص ۱۹۱ -

۱۸ - ”ذکرِ اقبال“ - صفحات ۱۳۸-۱۳۹ (بحوالہ سیرتِ اقبال - طاہر

فاروقی اور ملفوظاتِ اقبال - عبدالرشید طارق)

۱۹ - ”مطالعہ اقبال“، - صفحات ۱۱۳-۱۱۵ -



اٹھارہواں باب

ہندو مسلم کشیدگی ، افغانستان اور فلسطین

۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک کا دور حیاتِ اقبال کا منصور و ترین دور تھا۔ مجلسِ قانون ساز کی رکنیت ، جداگانہ انتخاب کے لیے جدوجہد ، نہرو رپورٹ کے خلاف مہم ، آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شرکت اور خطباتِ مدراس کا تذکرہ ہو چکا ہے ، لیکن اس سلسلے کی ابھی اور بہت سی کڑیاں باقی ہیں جو علامہ کی زندگی کے اہم اجزاء کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم علیحدہ مسلم مملکت کے لیے اقبال کی مساعی پر توجہ دیں ، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان درمیانی کڑیوں کا احاطہ کر لیں۔

ہندو سیاست میں سوامی شردھانند کیا داخل ہوئے ، ہندو مسلم کشیدگی بلکہ خونریزیوں کے نئے دروازے کھل گئے۔ وہ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے علمبردار تھے۔ جن کے پس پردہ یہ اصول کارفرما تھا کہ ہندوؤں کا نصب العین ہندو راج ہے۔ ہندو راج کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان میں ہندو قومیت کو فروغ دیا جائے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو شدہ (پاکیزہ) کر لیا جائے۔ یعنی انہیں ہندو بنا دیا جائے۔ نیز ہندوؤں کا سنگھٹن اور تنظیم وقت کی اہم پکار ہے۔ سوامی شردھانند نے ہندو نوجوانوں کا ایک بہت بڑا گروہ کل ہند بنیاد پر منظم کر لیا۔ یہ نوجوان شہر شہر اور بستی بستی پہنچے اور شدھی کا بازار گرم کیا۔ اس گروہ نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایسی اشتعال انگیز زبان استعمال کی اور ایسے ہتھکنڈے استعمال کیے کہ ہندو مسلم نفرت اپنے عروج کو پہنچ

گئی۔ ۱۹۲۶ء کے اواخر میں ایک مسلمان نے اشتعال میں آ کر سوامی شردھانند کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہندو قوم نے اسے ”شہید“ کا نام دیا اور کیا ہندو اخبارات اور کیا ہندو رہنما، سب کے سب اپنی قوم کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے لگے۔ اس پروپیگنڈا مہم کا اصل مرکز پنجاب تھا۔ اس پر مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کرنے کی خاطر جنوری ۱۹۲۷ء کے آخری عشرے میں بکے بعد دیگرے دو جلسے کئے۔ دونوں کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ انہوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا بلکہ اس مسموم فضا میں بھی مصالحت اور رواداری کی شمعیں روشن کیں۔ آپ نے فرمایا۔ ”میرے تصور میں صداقت ایک ایسا تراشا ہوا پیرا ہے جس کے کئی پہلو ہیں۔ اس کے ہر پہلو سے مختلف رنگ کی شعاعیں نکل رہی ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی پسند کے مطابق کسی رنگ کی شعاع کو اختیار کر لیتا ہے اور اپنے نقطہ نگاہ سے صداقت کو دیکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صداقت کو دیکھنے کا ایک مطلق نقطہ نگاہ بھی موجود ہے اور وہی نقطہ نگاہ اسلام ہے۔ اس لیے رواداری کا اصول یہی ہے کہ مثالِ بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی کو یہ نہ کہا جائے کہ تم باطل پر ہو۔“

اقبال یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ ان ہنگاموں کے پیچھے ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کی پالیسی بھی کارفرما ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا: ”ہندوستان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی اغراض کے لیے تمہارے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اگر تم آپس میں لڑو گے تو ملک میں بدامنی ہوگی۔ سب کو تکلیف اٹھانی پڑے گی۔“ ہندو اخبارات اور ہندو رہنماؤں کی ایک تکنیک یہ تھی کہ برعظیم کے مسلمانوں کی پرانی تاریخ سے جھوٹی سچی مثالیں دے کر اپنی قوم کے جذبات کو بھڑکانے لگے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے علامہ نے کہا: ”ہندو پرانے قصے تازہ

کر رہے ہیں ، لیکن گڑے مردوں کو اکھاڑنے سے کیا فائدہ ہے :

قفس میں اے ہم صفیر اگلی شکایتوں کی حکایتیں کیا
خزاں کا دورہ ہے گلستاں میں نہ تو رہے گا نہ ہم رہیں گے

بہر حال فضا مسموم رہی اور ۳ مئی ۱۹۷۷ء کو لاہور میں ایک خونیں ہندو
مسلم فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ پہلے سکھوں نے ہی ، لیکن وہ خود تو
پراسرار انداز میں الگ ہو گئے اور اصل فساد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان
ہوا۔ منظم مقابلے بھی ہوئے اور اکا دکا حملے بھی۔ اور اس دوران دو سو
کے قریب انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ فساد کے پہلے دن ہی حضرت
علامہ ، میاں عبدالعزیز اور شیخ عبدالقادر اندرون شہر جا کر لوگوں کو
صبر کی تلقین کرتے رہے اور یہ سلسلہ فساد کے اختتام تک جاری رہا۔
علامہ نے مولانا ظفر علی خان کو جسہ عام کرنے سے روک دیا تا کہ
حالات زیادہ خراب نہ ہوں۔ ماتمی جلوس میں خود بھی شراکت کی تا کہ
ہجوم کو قابو میں رکھ سکیں۔ حکام سے کہا کہ وہ انصاف سے کام لیں۔
ہندو رہنماؤں سے ملے اور انہیں تلقین فرمائی کہ آپس میں بیٹھ کر تنازعات
کا تصفیہ کیا جائے۔ مسلمان شہداء کے ورثاء کی مدد اور گرفتار شدگان
کو قانونی امداد فراہم کرنے کے لیے جو مرکزی مجلس اعانت قائم ہوئی ،
اس کے صدر علامہ ہی چنے گئے اور انہوں نے پہلے دو دنوں میں ۲۰۰۰
روپے جمع کر لیے۔ ۲

۱۲ مئی کو علامہ اقبال سمیت مسلمان ، ہندو اور سکھ رہنماؤں نے
ایک مشترکہ بیان میں دیسی زبانوں کے اخبارات پر الزام لگایا کہ وہ
فرقہ وارانہ شیدگی کو بڑھا رہے ہیں اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کے
خلاف قانون کی مشینری کو حرکت میں لائے۔ چند دن بعد اس مسئلے پر
لاہور کے واحد مسلمان انگریزی روزنامہ ”مسلم اوٹ لک“ کے نمائندے نے

علامہ سے ملاقات کی۔ علامہ نے کہا کہ میں آزادی مطلق کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ ”ذاتی طور پر میں اخبارات کی آزادی کا بہت بڑی حد تک قائل ہوں۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں آزادی کا حامی ہوں۔ لیکن۔۔۔۔ میں آزادی اور لائسنس (مادر پدر آزادی) کو یکساں نہیں سمجھ سکتا۔ حقیقی آزادی اخلاقی ضبطِ نفس کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ مقصود یہ نہیں کہ اخبارات کی آزادی سلب کر لی جائے۔ بلکہ محض یہ ہے کہ ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا کیا جائے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: ”میرا خیال ہے کہ ہر شخص اس معاملے میں میرے ساتھ اتفاق کرے گا کہ ملک کے بہترین مقاصد کے پیش نظر یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ایسی تحریروں کو، جو فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرتی ہیں، روکا اور دبایا جائے۔ اگر کوئی اور صورت نہ ہو تو قانون ہی کے ذریعے سے اس مقصد کو حاصل کیا جائے۔“

اسی انٹرویو کے دوران میں اس حقیقت پر تاسف کا اظہار کیا کہ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف اپنی حفاظت کے لیے برطانوی تحفظ کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا۔ ”اس حقیقت نے مجھے اپنے سیاسی خیالات اور سیاسی عقائد پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں، خاص طور پر دیہاتی مسلمانوں میں، جو بہاری قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہیں، جمہالت عام ہے اور کسی قسم کی سیاسی یا اقتصادی بیداری پیدا نہیں ہوئی۔ قوم کی قوتوں کو فرقہ بندی اور ذاتوں کی تقسیم نے علیحدہ منتشر کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم سراسر غیر منظم کے غیر منظم ہیں۔ اب میں اس امر کا قائل ہو گیا ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی تنظیم اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔“ ۳

ابھی فساد کے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے کہ ایک مہینے کے اندر اندر ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۲۳ء میں لاہور کے ایک بدباطن ہندو مصنف اور ناشر راج پال نے ”رنگیلا رسول“ کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں حضور سرور کائنات کی مقدس ذات پر نہایت رکیک حملے کئے گئے تھے۔ قدرتی طور پر مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ اٹھی اور اس نے ایک ایسے طوفان کی صورت اختیار کر لی کہ حکومت کو راج پال کے خلاف فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلانا پڑا۔ یہ مقدمہ دو تین سال تک چلتا رہا۔ آخر ماتحت عدالت نے راج پال کو دو سال قید سخت اور ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا دے دی۔ ۳ راج پال نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی اور ہائی کورٹ کے جسٹس دلیپ سنگھ نے بد قسمہ کر راج پال کو بری کر دیا کہ اس مقدمے پر نہ دفعہ ۱۵۳-الف کا اطلاق ہوتا ہے، نہ تعزیرات ہند کی کسی اور دفعہ کا۔ جو بھی یہ فیصلہ شائع ہوا، پورے برعظیم کے مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ اٹھی اور لاہور کے مسلمانوں کے ہیجان نہ تو یہ عالم تھا کہ فسادات کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے حکم نے دفعہ سوم نافذ کر دی۔ پنجاب خلافت کمیٹی نے اس کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور شازی عید الرحمن اور ان کے کچھ ساتھی گرفتار بھی ہو گئے۔

مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ آیا حصول مقصد کا واحد طریقہ سول نافرمانی ہی ہے یا دوسری تدابیر بھی اختیار کی جا سکتی ہیں۔ علامہ اقبال اور بعض دوسرے اکابر کی رائے یہ تھی کہ سول نافرمانی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے ایک وفد کی صورت میں گورنر پنجاب سے ملاقات کی اور اس بات پر زور دیا کہ ایک ایسا قانون نافذ کیا جائے جس کی رو سے

دلآزار تحریروں کی اشاعت کو جرم قرار دیا جائے۔ گورنر نے اس سلسلے میں مدد کا وعدہ کیا۔ بہر حال سول نافرمانی سے جو صورت پیدا ہوئی، اس پر غور کرنے کے لیے ۸ جولائی ۱۹۲۷ء کو مسلم رائے عامہ کے بعض رہنماؤں کا ایک اجلاس ہوا جس کی صدارت شیخ عبدالقادر نے فرمائی۔ موصوف نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کر دیں۔ کیونکہ اس سے خطرناک مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ علامہ نے اس مشورے کی تائید فرمائی۔ ان کارکنوں اور رہنماؤں کی تعریف فرمائی جو یہ سمجھتے ہوئے قید ہوئے کہ وہ ایک پاک مقصد کی خاطر ایثار کر رہے ہیں اور یہ بھی کہا کہ اس مصیبت میں ہمارے لیے فائدے کی یہ صورت نکلی ہے کہ ”جو مسلمان عملاً توحید پر جمع نہ ہوئے وہ نبوت پر متفق ہو گئے“ اور اس طرح وہ اتحاد پیدا ہو گیا جس کی ضرورت عرصے سے محسوس ہو رہی تھی۔ ۵

اس کے بعد ۱ جولائی کو بادشاہی مسجد میں جلسہ عام ہوا۔ مولانا عبداللہ قصوری صدر تھے اور شرکاء میں علامہ اقبال، چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین، مولانا ظفر علی خان اور دوسرے رہنما شامل تھے۔ سب سے پہلے علامہ نے تقریر کی۔ دورِ ابتلا کے دو نتائج کو مبارک قرار دیا۔ اول: خانہ خدا میں مل بیٹھنے کا موقع ملا۔ دوم: مسلمانوں کے وہ فرقے جو آپس میں دست و گریباں رہتے تھے، اس ابتلا کے دوران میں ایک ہو گئے۔ انہوں نے بہ مؤقف اختیار کیا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ناموس رسول کا تحفظ کیا جائے۔ اس کے لیے جدوجہد کی خاطر تمام قوتیں جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ بے شک ناجائز ہے، لیکن اس کی خلاف ورزی میں اپنی قوتوں کا ضیاع مناسب نہیں۔ اس لیے سول

نافرمانی کا التواء ضروری ہے۔ علامہ نے گورنر سے ملاقات کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارے مطالبے کا ایک حصہ پورا کیا جا رہا ہے۔ حکومت نے اسی قسم کا ایک اور مقدمہ ماتحت عدالت سے ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا ہے۔ دو اڑھائی ماہ میں اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اگر یہ ہمارے حق میں ہوا۔ تو پھر کسی مزید فیصلے کی ضرورت نہیں اس لیے اس کا انتظار کر لیا جائے۔ اس پر حاضرین کے ایک گروہ نے شور مچایا کہ جو کرا رہی ہے حکومت کرا رہی ہے۔ علامہ نے کہا۔ آپ میرا مشورہ قبول نہیں کرتے تو اس پر عمل نہ کریں۔ اس پر آوازیں آئیں ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ پہلے رہنماؤں کو چھڑاؤ۔ پہلے رضاکاروں کو چھڑاؤ۔

علامہ کے بعد چودھری افضل حق سٹیج پر آئے۔ سارے معاملے کی وضاحت کرنے کے بعد کہا۔ ”اقبال کی شخصیت نہ صرف ہندوستان میں مسلم ہے، بلکہ کرۂ ارض کے تمام حصے ان کی اصابت رائے کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم سر اقبال کا مشورہ قبول نہیں کرتے، تو اس کا مطلب خلافتِ دمیٹی کی عزت کو نہ صرف ہندوستان میں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے بلکہ ہندوستان سے باہر بھی۔“ مولانا ظفر علی خان نے جسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے ڈاکٹر اقبال کے حضور میں گستاخی کی ہے۔ یعنی ان کی تقریر کے دوران میں اعتراض کیا۔ اقبال پر مسلمان اور سچا عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ وہ روتا ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صلوات والسلام کے عشق میں۔ وہ روتا ہے اسلام کی محبت میں۔ اس پر جمعے کا رنگ بدل گیا اور آوازیں آئیں: ہم ڈاکٹر صاحب سے معذرت چاہتے ہیں۔ یہ گستاخی سی۔ آئی۔ ڈی نے کی تھی، کسی مسلمان نے نہیں کی!“

ہم ایک گذشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں کہ علامہ نے ٹولسل میں اس مضمون کی ایک قرارداد پیش کی تھی کہ حکومت ہند کو ایسا

قانون نافذ کرے جس کی رو سے مذہبی دلازاری پر مبنی لٹریچر کی اشاعت جرم قرار دی جائے۔ اور یہ کہ، حکومت ہند نے ایسا قانون نافذ کر دیا تھا۔ اس دوران میں راج پال پر کیا گذری؟ واقعات کی کڑیوں کو مربوط رکھنے کی خاطر اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۲۷ء کو ایک مسلمان خدا بخش نے راج پال پر ناکام قاتلانہ حملہ کیا، جس کی پاداش میں آسے سات سال قید کی سزا ہوئی۔ دو ہفتے کے اندر اندر ایک اور نوجوان عبدالعزیز نے راج پال کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی ناکام رہی اور آسے چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔ ۶ اپریل ۱۹۲۹ء کو لاہور کے ایک اڈھارہ سالہ نوجوان علم الدین نے راج پال کے چہرا گھونپ دیا اور اس طرح شام رسولؐ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

علم الدین قدرتی طور پر مسلمانوں کا ہیرو بن گیا۔ آسے غازی کا لقب دیا گیا، اس کی بہادری اور جذبہ عشقی رسولؐ کے گیت گئے گئے اور جب آسے سزائے موت کا حکم سنایا گیا، تو سارے برعظیم میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مطالبہ کیا گیا کہ سزائے موت کا حکم عمر قید کی سزا میں بدل دیا جائے لیکن ایسا نہ ہوا۔ جب آسے سرفروش نوجوان کو نختہ دار کی زینت بنایا گیا، تو علم الدین شہید کمیٹی بنائی گئی۔ اس میں علامہ اقبال سر نجد شفیع، سہاں فضل حسین، ملک لال دین قیصر اور دوسرے کارکن اور رہنما شامل تھے۔ اس کے ایک وفد نے گورنر پنجاب سے نعتیہ حوالگی کا مطالبہ کیا، جو اس شرط پر قبول ہوا کہ یہ رہنما اس بات کی ضمانت دیں کہ امن قائم رہے گا۔ نعتیہ مسلمانوں کے حوالے ہو گئی۔ ایک لاکھ مسلمانوں نے نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد امن کے ساتھ منتشر ہو گئے۔

حضرت علامہ نے سوچا کہ علم الدین شہید کمیٹی کے پرچم تلے جو کارکن اور اخبار نویس اکٹھے ہوئے ہیں، ان کی قوتوں کو اس طرح

بروئے کار لایا جائے کہ وہ ملکی سیاست میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں مددگار ہو سکیں۔ بالخصوص مسلمانان پنجاب کے حقوق کی حفاظت کے لیے۔ چنانچہ انہی کے مشورے سے مولانا عبدالعزیز سالک کی صدارت میں کارکنوں کا ایک اجتماع ہوا۔ جہاں چھپن فی صد کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ کمیٹی کا نصب العین یہ تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فی صد ہے، اس لیے انہیں تمام جمہوری اداروں میں چھپن فی صد نیابت دلائی جائے۔ اس کمیٹی میں ملک لال دین قیصر، عبدالعزیز نورانی پروفیسر سید عبدالقادر، غلام مصطفیٰ حیرت اور بہت سے دوسرے دردمند مسلمان شامل تھے۔ اس تحریک نے فوراً عوامی رنگ لے لیا۔ ہر طرف چھپن فی صد کا شعلہ ہوا۔ رضا کاروں کے دستے منظم ہوئے۔ جلسے جلسے ہوئے۔ علامہ اس میں براہ راست شریک نہیں تھے لیکن پس پردہ رہائی دیتے رہے۔

اسی سال مرکزی اسمبلی میں شاردہ بل پیش ہوا، جس کا مقصد یہ تھا کہ چودہ سال سے کم عمر کی لڑکیوں اور اسیارہ سال سے کم عمر کے لڑکوں کی شادی ممنوع قرار دی جائے۔ اس کے خلاف علمائے کرام نے آواز بلند کی اور اسے مداخلت فی الدین قرار دیا۔ اس وقت میں علامہ نے نقطہ نگاہ نہایت متوازن لیا اور شریعت کے مطابق۔ وہ چھپن فی صد کے خلاف تھے، لیکن کہتے تھے کہ اگر والدین اپنی مجاہدوں کے سبب لڑکیوں کی شادیاں کہسنی میں کر دیں تو لڑکی کی رخصتی ہلوسے ہوگی۔ بعد ازاں بہر حال وہ اصولاً مسلمانوں کی شریعت اور خانگی معاملات میں اجنبی حکومت کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے لڑکے اخباری اشروہ میں لکھا: ”اس قانون کے بعد منسوب لڑکیوں کو نہیں رہے۔“ جب اور جس طرح حکومت جانب کی، منسوب لڑکیوں کے ذریعے سے نوڈر سہولت لگی۔ اگر بالفرض محال اس قسم کی لڑکیوں کو شادیاں ہو سکی اور لازم تھا، تو شادی کے منہاں والدین کے وہ اختیارات، جو اسلام نے

عوام کو دے رکھے ہیں ہرگز نہیں چھیننے چاہئیں تھے۔ بلکہ یہ قانون بنایا جاتا کہ شادی کے بعد جو والدین اپنی نابالغ بیٹی کو خاوند کے گھر بھیجیں گے، وہ مستوجبِ مزا ہوں گے۔“ ۸

یوں تو علامہ ساری دنیائے اسلام کے حالات و کوائف اور تعمیری رجحانات میں دلچسپی لیتے تھے، لیکن جغرافیائی قرب کی بناء پر افغانستان سے انہیں کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ افغانستان مدتوں برطانیہ اور روس کی طرف سے مداخلت کا شکار رہا اور اس پر سالہا سال تک برطانیہ کا تسلط رہا۔ اور اس کے بعد افغانستان نے اس جوئے کو آتار پھینکا اور آزادی کی نعمتوں سے لذت اندوز ہونے لگا۔ اور جس تیسری افغان جنگ کے نتیجے میں افغانستان آزادی سے ہمکنار ہوا، وہ اسی دور میں لڑی گئی جب برعظیم کے مسلمان تحریکِ خلافت کی آزمائشوں سے گذر رہے تھے۔ افغانستان غازی امان اللہ خان کے عہد میں آزاد ہوا، اس لیے اقبال کو غازی موصوف سے محبت بھی تھی اور عقیدت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ”پیامِ مشرق“، امان اللہ خان کے نام سے معنوں کی اور ایک طویل نظم میں انہیں خراجِ عقیدت ادا کیا۔ ”پیامِ مشرق“ کے دیباچے میں انہوں نے انتساب کی وجہ یوں بیان کی: ”اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش، جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابلِ احترام ہے۔ اسی بنا پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرماں روا نے افغانستان کے نامِ فاسی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں اور افغانوں کی تربیت انہیں خاص طور پر مد نظر ہے۔ اس عظیم الشان کام میں خدا تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔“ ۹

برطانیہ چاہتا تھا ، کہ افغانستان آزادی کے بعد بھی اس کا مطیع رہے۔ لیکن امان اللہ خان ملتِ افغانہ کو تعمیر اور ترقی کی راہ پر گامزن کرانے کے لیے آزاد خارجہ پالیسی کے قائل تھے۔ انہوں نے اشتراکی روس سے دوستی کا معاہدہ کیا ، ترکیہ اور ایران سے بہتر مراسم پیدا کیے اور اس زمانے کی بڑی طاقتوں کو نظر انداز کر کے جرمنی سے تکنیکی معاہدات کیے۔ برطانیہ کو یہ طرزِ عمل پسند نہ آیا۔ بالخصوص اسے روس کے ساتھ گہرے تعلقات پر اعتراض تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں مغربی طاقتیں روس کو اچھوت سمجھتی تھیں۔ چونکہ امان اللہ خان دباؤ میں نہ آئے ، اس لیے برطانیہ نے ان کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور بعض اصلاحات کے خلاف ملاؤں کو بھڑکا کر بغاوت کرا دی اور برطانوی مبصرین نے یہ چرچا کیا کہ بغاوت کی اصل وجہ اصلاحات کا نفاذ ہے۔ یہ بغاوت ۱۳ نومبر ۱۹۲۸ء کو شروع ہوئی اور ۱۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو حبیب اللہ عرف بچہ سقہ نامی ایک ڈاکو نے کابل پر قبضہ کر کے امان اللہ خان کو نکلانے پر مجبور کر دیا۔ بچہ سقہ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ملک میں انارکی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

۲۶ فروری ۱۹۲۹ء کو لاہور کے انگریزی روزنامے "ٹریبیون" کے نامہ نگار خصوصی نے حضرت علامہ سے ان کا ردِ عمل دریافت کیا ، تو انہوں نے کہا : "اہل ہند افغانستان کی آزادی اور اس کے اتحاد و استحکام کے ساتھ گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ مغرب اور وسط ایشیا کی سیاسی انحطاط ہندوستان اور چین کی ترقی پر رجعت پسندانہ اثر کرنے کا۔ اس لیے اب ان ممالک کے سیاست دانوں سے مطالبہ کیا جانا ہے کہ سیاسی نصب العین کی تنگ نظری کو ترک کر کے معاملات کو زیادہ وسیع نکلنے سے دیکھیں اور اپنی حکمتِ عملی کی تشکیلات اس کے مطابق کریں۔۔۔ میرا ذاتی خیال یہ

ہے کہ نہ صرف افغانستان کے مفاد بلکہ ایشیا کے وسیع تر اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ضروری ہے ، کہ شاہ امان اللہ خان کی حکومت برقرار رکھی جائے ۔“

جب ان سے اس انقلاب کے اسباب دریافت کیے گئے ، تو انہوں نے کسی قطعی رائے کے اظہار سے اس بناء پر انکار کر دیا کہ جو خبریں آ رہی ہیں ، وہ اعتقاد کے قابل نہیں ہیں ۔ بہر حال انہوں نے ایک وسیع تر تناظر میں اس رائے کا اظہار کیا : ”اس امر کے یقینی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ عالم اسلام میں قدامت پسندانہ جذبات اور لبرل خیالات میں جنگ شروع ہو گئی ہے ۔ اغلب ہے ، کہ قدامت پرست اسلام بغیر جدوجہد کے سر تسلیم خم نہیں کرے گا ۔ اس لیے ہر ایک ملک کے مسلم مصلحین کو چاہیے کہ نہ صرف اسلام کی حقیقی روایات کو غور کی نگاہ سے دیکھیں ، بلکہ جدید تہذیب کی صحیح اندرونی تصویر کا بھی احتیاط سے مطالعہ کریں جو بے شمار حالتوں میں اسلامی تہذیب کی مزید ترقی کا درجہ رکھتی ہے ۔ جو چیزیں غیر ضروری ہیں ، ان کو ملتوی کر دینا چاہیے ۔ کیونکہ صرف ضروری چیزیں فی الحقیقت قابل لحاظ ہیں ۔ یہ امر صحیح نہیں کہ مجلسی معاملات میں قدامت پسندانہ طاقتوں کو بالکل نظر انداز کر دینا جائے ، کیونکہ انسانی زندگی اپنی اصلی روایات کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کر منزل ارتقاء طے کرتی ہے ۔“

افغانستان میں حالات تیزی کے ساتھ بدلتے چلے گئے ۔ غازی امان اللہ خان وطن چھوڑ کر یورپ چلے گئے ۔ ان کے بھائیوں سے حالات سنبھالے نہ گئے ۔ دوسری طرف برطانیہ نے بھی محسوس کیا کہ بچہ سقہ کی حکومت زیادہ دیر نہیں چلے گی اور کوئی ایسی متبادل قیادت سامنے لانی چاہیے جس پر لوگ اعتماد کر سکیں ۔ خود افغانستان کے اندر بھی بعض عناصر متبادل

قیادت کے آرزومند تھے۔ چنانچہ انہوں نے پیرس میں مقیم افغان سفیر جنرل نادر خان کو دعوت دی کہ وہ حالات سدھارنے کی سعی فرمائیں۔ ان کے نام سے یہ خوشگوار یاد بھی وابستہ تھی کہ انہوں نے افغانستان کی جنگِ آزادی یا دوسرے لفظوں میں تیسری افغان جنگ میں ٹل کے مقام پر انگریزی فوج کے دانت کھٹے کیے اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ جنرل نادر خان اپنے تین بھائیوں کے ساتھ پہلے برعظیم میں آئے اور اس کے بعد افغانستان میں داخل ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں نے ان کی مدد کی۔ ایک تو ہتھیار فراہم کیے۔ دوسرے، یہ اجازت دی کہ آزاد قبائلی علاقے میں وزیری اور محسود قبائل کی مدد سے لشکر تیار کریں۔ اس مدد کے پس پردہ برطانیہ کا یہ اندیشہ کارفرما تھا کہ کہیں سوویت یونین بعض عناصر کی مدد کر کے افغانستان میں اپنی مرضی کی حکومت قائم نہ کر لے۔ علامہ کی نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں تھی، لیکن افغانستان کے وسیع تر مفاد میں ان کی آرزو تھی کہ جلد از جلد وہاں حالات نارمل ہو جائیں اور ایک پائدار حکومت قائم ہو جائے۔ اس لیے انہوں نے افغانستان کی مدد جاری رکھی۔

جن دنوں نادر خان افغانستان میں سر دھڑ کی بازی لڑتے ہوئے تھے، انہوں نے علامہ کے نام یہ مکتوب لکھا: ”آپ نے اپنے آن مالی حذرانہ ہمدردانہ سے، جو آپ افغانستان کی موجودہ تباہ حالی کے متعلق رنج و غم محسوس کر رہے ہیں اور افغانستان کے عام بھی خواہوں اور فدا کاروں کی رنج و غم محسوس کرنا دیا ہے۔ افغانستان تباہی کے نزدیک ہے، اس کی بے چارہ ملت کہہ سکتے ہیں بڑے تھکے کا سامنا ہے۔ افغانستان اپنے ہندی بھائیوں کی ہر قسم کی امداد و اعانت کا محتاج ہے۔ آپ ایسے وقت میں جو خیر خواہانہ قلم اٹھا رہے ہیں، وہ ہمارے لیے گھاس کا موم ہے۔ خصوصاً مالی امداد کا مستند،

جس کے متعلق میں اخبار ”اصلاح“ کے ذریعے سے اپنے ہندی بھائیوں کے لیے شائع کر چکا ہوں ، بہت حوصلہ افزا ہے ۔ آسید ہے کہ جناب فاضل محترم جو روحاً افغانستان کی موجودہ مصیبت میں شریک ہیں ، اس موقع پر اپنی مساعی سے کام لے کر افغانستان کی رنج زدہ قوم کو ہمیشہ کے لیے ممنون و مشکور فرمائیں گے ۔“ ۱۱

اس اپیل کے جواب میں لاہور کے مسلم اکابر کا ایک اجتماع ہوا ۔ علامہ نے صدارت فرمائی ۔ فیصلہ ہوا کہ ”نادر خان ہلال احمر فنڈ“ کھولا جائے ۔ اس کا دفتر برکت علی اسلامیہ ہال میں کھول دیا گیا ۔ اور حضرت علامہ نے عوام کے نام اپیل جاری کی کہ وہ خود بھی مالی امداد دیں اور کارکن بھی فراہم کریں ۔ تاکہ ان کے ذریعے سے رائے عامہ کو حرکت میں لایا جاسکے اور زیادہ سے زیادہ فنڈ جمع کیا جاسکے ۔ پھر حال انہی دنوں جنرل نادر خان کا لشکر کابل میں داخل ہو گیا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو انہوں نے اپنی پادشاہت کا اعلان کر دیا ۔ اس کے بعد فنڈ جمع کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہ رہی ۔

ستمبر ۱۹۴۹ء میں ایک طرف افغانستان میں نادر خان کی جدوجہد اپنے آخری خونین مرحلے سے گذر رہی تھی ، دوسری طرف فلسطین کے مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا ۔ ان ہنگاموں کے دو پہلو تھے ۔ بنیادی پہلو اور ہنگامی پہلو ۔ بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ حکومت برطانیہ ۱۹۱۷ء میں اعلان بالفور کے ذریعے سے عالمی صیہونی جماعت سے وعدہ کر چکی تھی کہ جنگ کے بعد فلسطین کو ، عربوں کے مفاد کو متاثر کرنے بغیر ، یہودیوں کا قومی وطن بنا دیا جائے گا ۔ چنانچہ ہر سال یہودیوں کی ایک بڑی تعداد فلسطین میں آباد ہونے لگی ۔ عربوں نے قدرتی طور پر اس کے خلاف احتجاج کیا ۔ کیونکہ اس اقدام سے ان کی آزادی سلب ہونے

کا خطرہ تھا۔ یہ احتجاج مسلسل جاری تھا کہ ایک نیا ہنگامی مسئلہ اٹھا۔ وہ یہ کہ یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کے ایک حصے پر مالکانہ دعویٰ کیا۔ اور وہ اس بناء پر کہ یہاں ہزار ہا سال پہلے ہیکل سلیمانی کے نام سے اُن کا معبد موجود تھا۔ اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما یروشلم میں داخل ہوئے، تو ہیکل سلیمانی صدیوں پہلے نابود ہو چکی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اس کا مقام دریافت کیا اور اُس جگہ کو اپنے ہاتھ سے صاف کر کے وہاں نماز ادا کی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے وہاں مسجد اقصیٰ تعمیر کر لی۔ ترکوں کے زمانے میں یہودیوں کی خواہش پر انہیں اجازت دی گئی کہ مخصوص اوقات میں مسجد کی دیوارِ براق کے ساتھ کھڑے ہو کر گریہ و بکا کر لیا کریں۔ اس رعایت سے یہ دیوار ”دیوارِ گریہ“ کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اب انگریزی تسلط کے زمانے میں یہودیوں کو آباد کاری کا حق حاصل ہوا، تو انہوں نے مسجد اقصیٰ کے ایک حصے کی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ اس پر فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ برعظیم کے مسلمان متشوش اور مضطرب ہوئے اور انہوں نے جا بہ جا جلسے کئے اور برطانوی مامراج کو اس صورتِ حالات کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا۔ لاہور میں جو احتجاجی جلسہ ہوا، اُس میں تمام جماعتیں شامل تھیں۔ علامہ نے اس کی صدارت فرمائی اور صدارتی خطبے میں اس پورے مسئلے کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ یہودی بنیادی طور پر بنیا ہے۔ آئیے تو سمجھنے کے لیے ایسی جگہ درکار تھی، جہاں وہ دوسروں کا استحصال کر رہے۔ اس لیے اُن کا فلسطین میں آباد ہونا خود اُن کے اٹنے مفید نہیں تھا۔ ”مگر چونکہ برطانوی مدبروں کا اصل مقصد کچھ اور تھا، اس لیے انہوں نے اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے یہودیوں کو آواز بنا دیا۔ صیہونی تحریک کو فروغ دیا اور اپنی غرض کی تکمیل کے لیے جو ذرائع استعمال

کئے گئے ، ان میں سے ایک کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے - یہودی گریہ و بکا کے بجائے مسجدِ اقصیٰ کے ایک حصے کے مالکانہ تصرف کا دعویٰ کر رہے ہیں - انہوں نے آتشِ فساد مشتعل کر رکھی ہے - مسلمان ، ان کی عورتیں اور بچے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیے جا رہے ہیں۔“ علامہ نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ برطانیہ ان حالات کی تحقیقات کے لیے جو کمیشن فلسطین بھیج رہا ہے ، اس پر مسلمانوں کو کوئی اعتقاد نہیں - ۱۳

اسی دور میں علامہ کی شعری اور علمی سرگرمیاں جاری رہیں - ۱۹۲۷ء میں ان کی کتاب ”زبورِ عجم“ چھپی - اس کے تین حصے ہیں - پہلے حصے میں قطعات اور غزایات ہیں - بقول مالک ”زبورِ عجم“ میں اقبال کی فارسی غزل عین الکمال کو پہنچ گئی اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ بلند سے بلند خیالات اور مؤثر سے مؤثر تلقینات کے لیے بھی غزل سے زیادہ زور دار صنفِ سخن موجود نہیں“ ۱۴ - دوسرا حصہ ”گلشنِ رازِ جدید“ ہے - اس میں علم اور عشق اور مقصود حیات کو ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا - علامہ کو بہ حصہ لکھنے کا خیال یوں آیا کہ محمود شالہستری کی ایک کتاب ”گلشنِ راز“ مدتوں سے موجود تھی - اس میں سوال و جواب کی صورت میں فلسفہ اور تصوف کے بعض مسائل منظوم تھے - لیکن جو نظریات پیش کیے گئے ، اقبال کے نزدیک وہ روحِ اسلام کے منافی تھے - اقبال نے انہی سوالات کے جواب اپنے مطالعہ کی روشنی میں دیئے - اسی اعتبار سے اسے ”گلشنِ رازِ جدید“ کا نام دیا گیا - ”زبورِ عجم“ کا تیسرا حصہ ”بندگی نامہ“ ہے - اس میں پہلے غلامی اور محکومی پر روشنی ڈالی گئی ، پھر غلاموں اور محکوموں کے فنونِ لطیفہ پر تبصرہ کیا گیا -

۱۹۲۷ء میں علامہ نے لاہور میں دو اہم لیکچر دیئے۔ ایک سائنس اور مذہب پر، دوسرا اسلامی ثقافت کی روح پر۔ دونوں لیکچر انگریزی میں دیئے کیونکہ بعض مباحث اسی زبان میں ہو سکتے تھے۔ پھر حال دونوں لیکچروں کے بعد انہوں نے اردو زبان میں ان کے خلاصے بیان کر دیئے۔ سائنس اور مذہب پر لیکچر کے دوران میں کہا: ”مذہب، فلسفہ، طبیعیات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں۔ کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنونِ حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں“ ۱۵۔ اسلامی ثقافت کی روح پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ نے کہا: ”اسلام کا عہدہ یہ ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ مردانہ وار کیا جائے۔ یہی اسلامی آئیڈیل ہے۔ اسلامی نقطہٴ خیال میں یہی معراج ہے کہ مشاہدہ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم رہے۔ لیکن تمرد و سرکشی نہیں۔ بلکہ خدمت و عبادت کے لیے مسلم کو کسی چیز میں فنا نہیں ہونا چاہیے گو وہ فنا ہی اللہ کیوں نہ ہو“ ۱۶۔

۳۰ مئی ۱۹۲۷ء کو مولانا گرامی انتقال کر گئے۔ علامہ کے لیے یہ صدمہ بہت جانکاح تھا۔ کیونکہ ایک تو گرامی اپنے دور کے سب سے بڑے فارسی شاعر تھے۔ دوسرے، حضرت علامہ کے دوست ہی تھے۔ نیازمند بھی تھے۔ دونوں کے درمیان مدتوں خط و کتابت رہی اور بنیادی طور پر عامی نوعیت کی حامل تھی۔ پھر اوبال اگر وہر شاعر کے سلسلے میں یا زبان کے بارے میں کسی سے مشورہ لیتے تھے، تو وہ گرامی ہی کی ذات گرامی ہی! خود مولانا گرامی جو رائے علامہ کے متعلق رکھتے تھے اس کا پھر پور اظہار ان کے اس شعر میں ہوا ہے:

در دیدہ معنی نگہاں ، حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتوان گفت !

حوالے

- ۱ - "گفتار اقبال" - صفحات ۲۰-۲۲ - (بہ حوالہ "زمیندار"، ۲ فروری ۱۹۲۷ء) -
- ۲ - "گفتار اقبال"، - صفحات ۲۸-۳۳ - (بہ حوالہ "انقلاب"، ۱۲ مئی ۱۹۲۷ء) -
- ۳ - ایضاً - صفحات ۳۷ - ۳۳ - (بہ حوالہ "انقلاب" - ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء) -
- ۴ - روزگار فقیر - جلد اول - صفحات ۱۰۹-۱۱۰ -
- ۵ - "گفتار اقبال" - صفحات ۳۱-۳۹ - (بہ حوالہ "انقلاب"، ۱۰ جولائی ۱۹۲۷ء) -
- ۶ - ایضاً - صفحات ۳۶ - ۳۱ - (بہ حوالہ "انقلاب" - ۱۲ جولائی ۱۹۲۷ء) -
- ۷ - "روزگار فقیر"، - جلد اول - صفحات ۱۱۰-۱۱۱ -
- ۸ - "گفتار اقبال"، - صفحات ۹۷-۹۴ -
- ۹ - "پیام مشرق" - دیباچہ - صفحات م - ن -
- ۱۰ - "گفتار اقبال"، - صفحات ۸۶ - ۸۴ - (بہ حوالہ "انقلاب"، یکم مارچ ۱۹۲۹ء) -
- ۱۱ - ایضاً - ص ۹۸ - (بہ حوالہ "انقلاب"، ۲ اکتوبر ۱۹۲۹ء) -

- ۱۲ - ایضاً - صفحات ۹۸ - ۱۰۰ (بہ حوالہ ”انقلاب“، - ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء) -
- ۱۳ - ایضاً - صفحات ۹۳ - ۹۱ (بہ حوالہ ”انقلاب“، - ۱۰ ستمبر ۱۹۲۹ء) -
- ۱۳ - ”ذکرِ اقبال“ - ۲۹۳-۲۹۳ -
- ۱۵ - ”گفتارِ اقبال“، - ص ۲۳ - (بہ حوالہ ”زمیندار“، - ۶ مارچ ۱۹۲۷ء) -
- ۱۶ - ایضاً - ص ۲۵ - (بہ حوالہ ”زمیندار“، - ۲۰ اپریل ۱۹۲۷ء) -



۷

انیسواں باب

اپر انڈیا مسلم کانفرنس

حضرت علامہ کے بارے میں دو تاثرات عام ہیں - اول : وہ ایک فلسفی ، مفکر اور شاعر تو تھے ، لیکن اصلاً میدان سیاست کے کھلاڑی نہیں تھے - دوم : انہوں نے علیحدہ مسلم مملکت کا خواب دیکھا تو اس وقت جب خطبہ الہ آباد ارشاد فرمایا - یہ دونوں تاثرات غیر صحیح ہیں اور نا درست معلومات پر مبنی - حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک گھمبیر ، مستقبل شناس سیاست دان تھے - ان کی سرگرمیاں صرف وہ نہیں ، جو منظر عام پر آتی رہیں وہ پس پردہ بھی مصروف رہے - پہلک سرگرمیوں کا مقصد یہ تھا کہ ایک متحدہ ہندوستان ہی کو وجود میں آنا ہے تو یہ ایک دو قومی وفاق مملکت ہو - جس کے مسلمان صوبے اندرونی طور پر خود مختار ہوں - اور پس پردہ سرگرمیوں کا منشاء یہ تھا کہ ایک علیحدہ اسلامی مملکت کے قیام کے لیے زمین ہموار کی جائے - اس سلسلے میں ایک مثال ہمارے سامنے موجود ہے -

۱۹۲۸ء کے اواخر میں ، جب نہرو رپورٹ کا بڑا جرحا تھا ، مسلمان اس کے خلاف نبرد آزما تھے ، ان دنوں "انقلاب" میں مولانا مرتضیٰ احمد خان کے چار مضامین بکے بعد دیگرے شائع ہوئے - جن میں مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا تصور پیش کیا گیا - پہلے مقالے کا عنوان تھا "مسلمانان ہند کی اجتماعی سیاسی زندگی : فکر و عمل کے انتشار کا دردناک مظاہرہ" - اس میں اس زمانے کی سیاسی صورت حالات میں مسلمانوں کے سیاسی کردار کے اس پہلو پر افسوس و اظہار کیا گیا

کہ ان کی قوتیں منتشر ہیں۔ دوسرے مقالے کا عنوان تھا ”مسلمانان ہند کا سیاسی نصب العین : برادرانِ وطن کی روش کا موازنہ“ ۲ اس میں بتایا گیا کہ نہرو رپورٹ سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ ہندو قوم ایک مضبوط مرکزی حکومت کے ذریعے سے ہندو راج کا قیام چاہتی ہے اور اس مسئلے پر ہندوؤں کے تمام عناصر متحد ہیں اور وہ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو کر اپنی قوتوں کا ضیاع نہیں کرتے۔ تیسرے مقالے کا عنوان تھا ”مسلم ہندی کے لیے وطن کی ضرورت : ہندوستان کی سیاسی الجھنوں کا واحد حل۔“ ۳ اس میں مسائل کے گہرے تجزیے کے بعد لکھا گیا : ”ان حالات کے اندر یہ اشد ضروری ہے کہ مسلمانانِ ہند کے لیے بھی ایک ایسا وطن پیدا کیا جائے جسے وہ اپنا گھر سمجھیں اور جہاں رہ کر وہ اپنی تہذیب، اپنے افکار اور اپنے تمدن و معاشرت کو اپنی منشا اور خواہش کے مطابق ترقی دے سکیں۔ اس طرح کا وطن پیدا کرنا کوئی نئی نظیر نہیں بلکہ سیاسیاتِ عالم کے دورِ حاضر میں اس قسم کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں۔ جنگِ عظیم نے ہر قوم کے لیے ایک وطن پیدا کر دیا ہے۔“ اس کے بعد مثال کے طور پر پولینڈ، چیکوسلوواکیہ اور عرب ممالک کے حقِ خود ارادیت کا تذکرہ کیا گیا۔ کہ ”اتحادِ جاہلیں شورا ئیہ روس (سوویت یونین) نے بھی اپنی مملکت کی تقسیم اسی طرح کی ہے کہ ہر قوم کو جو جداگانہ تمدن و معاشرت رکھتی تھی یا نسل و تاریخ کے اعتبار سے دوسروں سے ممتاز تھی، ایک وطن دے دیا ہے۔ چنانچہ ازبکستان، ترکمانستان اور قفقاز کی مختلف ریاستوں آذربائیجان، ارمینستان اور گرجستان کی تحدید و تقسیم اسی اصول کی مرہونِ احسان ہے۔“ اور آگے چل کر لکھا کہ ”مسلمانانِ ہند کے لیے وطن پیدا کرنے کے واسطے کوئی بہت بڑی جستجو کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف صوبہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو یکجا تصور کر

کے مسلمانانِ ہند کو ایک بنا بنایا وطن مل سکتا ہے۔ اس وطن کی تعمیر، اس کی آزادی، اس کی ترقی و اصلاح مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی روح و رواں ہو سکتی ہے اور اس سے ان کے خیالات و افکار میں یکسانی و وحدانیت، ان کے قلوب میں اطمینان و سکون اور ان کی رُوحوں کے اندر جوشِ عمل اور جذبہٴ فداکاری پیدا کیا جا سکتا ہے۔، مقالے میں کہا گیا کہ اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اپنی جگہ جذبہٴ وطنیت سے سرشار ہو کر اجنبی اقتدار سے نجات پانے کی سعی کر سکیں گے۔

اس دور میں پنجاب کا سب سے بڑا ہندو روزنامہ ”پرتاپ“ تھا اور اس کے مدیر مہاشے کرشن ہندوؤں میں قابض ترین ادیب نثار شہار ہوتے تھے۔ انہوں نے لکھا کہ مسلمانوں نے جو بھی مطالبات اب تک پیش کیے ہیں، ان میں الگ وطن ہی کا تصور مضمحل ہے اور ”مسلمان اس کافرستان میں اسلامستان بسانا چاہتے ہیں۔“ مولانا مرتضیٰ احمد خان نے حقِ خود ارادیت کے اصول کی بنیاد پر اپنے موقف کو دہرایا اور آخر میں لکھا کہ ”کیا ہی اچھا ہو کہ مسلمان ہندوؤں اور ہندو مسلمانوں سے بے فکر ہو کر اپنے اپنے وطن کو آزاد کرانے کی کوشش کریں اور ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کے بجائے اپنی تمام قوتیں اجنبی اقتدار کے خلاف کے لئے وقف کر دیں۔، اس آخری مقالے کا عنوان تھا۔۔ ”مسلم ہندی کے لئے وطن کی ضرورت : پرتاپ کی وساطت سے ہندو ذہنیت کی نقاب کشائی“

پاکستان بننے کے بعد میں نے والدِ مرحوم مولانا عبدالعزیز صاحب سے پوچھا کہ یہ مقالات مولانا مرتضیٰ احمد خان نے اپنے آپ لکھے یا کسی کے کہنے پر؟ انہوں نے بتایا کہ علامہ کے ہاں بہارہ روز کا آنا جانا تھا اور ملاقاتوں میں سیاسی مسائل ہی بیشتر زیر بحث آتے تھے۔ بالخصوص

اس زمانے میں جب سائمن کمشن کے مقاطعہ اور نہرو رپورٹ کے چکر چل رہے تھے۔ اور علامہ اس وقت بھی علیحدہ مسلم مملکت کے قیام ہی کو ہندو مسلم مسئلے کا حل سمجھتے تھے لیکن مسلم لیگ سے وابستگی کی بناء پر وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس قسم کی تجویز پبلک طور پر خود پیش کرتے۔ اگر کرتے تو باقی مسلم قیادت سے آن کا رابطہ ٹوٹ جاتا۔ چونکہ ہم مدیران ”انقلاب“ (مہر و سالک) علامہ اقبال کی رہنمائی میں مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے، اس لیے ہم بھی اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس قسم کی انقلابی تجویز کو پیش کرتے۔ پس باہمی مشورے سے فیصلہ ہوا کہ ہندوؤں کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لیے یہ تجویز مولانا مرتضیٰ احمد خان کی وساطت سے پیش کرائی جائے جو ”انقلاب“ میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور پالیسی کے ذمہ دار نہیں تھے۔ علامہ نے مولانا موصوف کی متصل رہنمائی (BRIEFING) کی اور نتیجے میں یہ مقالات چھاپے گئے۔

دسمبر ۱۹۲۸ کے اواخر میں انڈین نیشنل کانگریس نے گاندھی جی کی تحریک پر حکومتِ برطانیہ کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ تک نہرو رپورٹ میں مندرجہ دستور مکمل طور پر نافذ العمل نہ کیا گیا تو کانگریس ایک عوامی سول نافرمانی کا آغاز کرے گی۔ اس الٹی میٹم کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ لیکن اس سال موسمِ گرما میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ارون برطانیہ گئے اور اربابِ بست و کشاد سے مشورے کے بعد لوٹے تو یہ بیان دیا کہ حکومتِ برطانیہ کا نصب العین یہی ہے کہ ہندوستان کو درجہٴ نو آبادیات دیا جائے۔ لیکن اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے ارتقائی عمل کی ضرورت ہوگی۔ اس کے بعد لارڈ ارون نے اکتوبر ۱۹۲۹ کے اواخر میں اعلان کیا کہ آئینی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے لندن

میں ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے گی اور اس میں شرکت کے لیے تمام سیاسی عناصر کے نمائندے مدعو کیے جائیں گے۔

اس پر علامہ اقبال، سر محمد شفیع، مولوی غلام محی الدین قصوری، خلیفہ شجاع الدین، شیخ نیر محمد، میاں عبدالعزیز، میاں شاہ نواز اور سید محسن شاہ نے ایک مشترکہ بیان ۳ نومبر کو جاری کیا۔ اس میں گول میز کانفرنس کے تصور کا خیر مقدم کیا گیا۔ برطانوی حکومت کے اس اصول کو مدبرانہ فعل قرار دیا گیا کہ ہندوستان کو آگے چل کر درجہ نوآبادیات دیا جائے گا۔ بہر حال ان اکابر نے اس رائے کا اظہار کیا کہ کانفرنس کی کامیابی کا دار و مدار دو شرطوں کی تکمیل پر ہے۔ اول: ہندو مسلم اختلافات کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ہی طے کر لیے جائیں۔ دوم: کانفرنس میں تمام قوموں کے صرف حقیقی نمائندوں کو بلایا جائے۔ ان رہنماؤں نے حکومت کو متنبہ کیا کہ ”اگر مختلف مفادات کے حقیقی نمائندوں کے انتخاب کا خیال نہ رکھا گیا اور زیادہ شور مچانے والے طبقے کو مطمئن رکھنے کے اضطراب کو دستور عمل بنا لیا گیا تو کانفرنس یقیناً ناکام رہے گی۔“

جون جون انڈین نیشنل کانگریس کا لاہور سیشن فریب آ رہا تھا، یہ حقیقت کھل رہی تھی کہ کانگریس ہندو مسلم سیاسی تصفیے سے باز ہو کر اور مسلمانوں کی رائے عامہ سے بالا رہ کر عوامی سول نافرمانی کے ذریعے سے اپنی مس مانی لڑنے پر تلی بیٹھی ہے، نون نون حضرت علامہ بے چین ہو رہے تھے کہ کوئی ایسی صورت نکالے کہ مسلمانوں میں مکمل اتحاد ہو جائے اور وہ متحدہ انداز میں اپنے مطالبات پورے کرا سکیں۔

۱۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو نواب سر ذوالفقار علی خان کے ربر صدارت برلٹ علی

اسلامیہ ہال میں سیاسی صورتِ حال پر غور کے لیے جو جلسہ ہوا ، اس میں علامہ نے ان الفاظ میں اپنے احساسات کا اظہار کیا : ”آپ اگر اپنی حالت پر رحم نہیں کرتے ، تو خدا کے لیے آنے والے مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کے لیے کچھ کرو۔ تمام سٹیجوں کو جلا دو اور ایک متحدہ سٹیج بناؤ اور آئندہ ہونے والی گول میز کانفرنس میں جانے سے پیشتر ایک کانفرنس کر لو۔ ہندوؤں کو ایک موقع دو۔ محض اتمامِ حجت کے لیے ، تاکہ ان سے مفاہمت اگر ممکن ہو تو ہو جائے ، گو مجھے اس کا یقین نہیں انگلستان متحد ہوگا۔ ہندوستان کو بھی متحد ہونا چاہیے اور متحد ہندوستان کو انگلستان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ پہلے مسلمان آپس میں اتحاد کریں پھر ہندو اور مسلم کا اتحاد ہوگا۔ صوبجاتی حکومتیں آزاد ہوں یعنی فیڈرل حکومت ہو تو پچیس فی صد مسلمان بھی اسمبلی میں جائیں تو کوئی اندیشہ نہیں۔“ ۷

دسمبر ۱۹۲۹ء کے اواخر میں لاہور میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ چونکہ حکومت کو الٹی میٹم کی میعاد ختم ہو گئی تھی ، اس لیے درجہ ۴ نوآبادیات کی جگہ کامل آزادی کا حصول کانگریس کا نصب العین قرار پایا۔ اسی رعایت سے نہرو رپورٹ کی تدفین کا اعلان کر دیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ انگریزوں کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے۔ اس کا آغاز مارچ ۳۰ء میں گاندھی جی کے ہاتھوں ہوا اور انہوں نے نمک کی تیاری کے سلسلے میں سرکاری اجارے کے قوانین کی خلاف ورزی کی۔ اس کے ساتھ ہی بدیشی کپڑے اور شراب کی دکانوں پر پکٹنگ شروع ہو گئی۔ اس تحریک میں بہت کم مسلمان شامل تھے۔ مولانا عبدالقادر قصوری ، مولانا ظفر علی خان ، ڈاکٹر محمد عالم اور دوسرے لیڈر پکڑے گئے۔ جیسا کہ ایسی تحریکوں میں اکثر ہوتا ہے۔ اس تحریک نے بھی متشددانہ روپ لے لیا۔ مشرقی بنگال میں انقلاب پسندوں نے دہشت

انگریزی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ صوبہ سرحد کے مسلمان کانگریس میں شامل نہیں تھے، لیکن وہاں انگریزوں کی اشتعال انگیزی کے طفیل خونیں ہنگامے ہوئے۔ ایک مرحلے پر تو پشاور پر کچھ دیر عوامی کنٹرول رہا۔ حکومت نے بے پناہ تشدد سے کام لیا۔ چوک یادگار شہیدوں کے خون سے لالہ رنگ ہو گیا۔ ہزارہا مسلمان پکڑے گئے۔ خان عبدالغفار خان انہی میں شامل تھے۔ وہ اصلاً محض پٹھانوں کے حقوق کے لیے لڑتے تھے لیکن جب انہیں گجرات جیل میں کانگریسی رہنماؤں کے ساتھ رکھا گیا، تو انہوں نے کانگریس کا اثر قبول کر لیا اور سرحدی گاندھی کے نام سے پکارے جانے لگے۔ بہرحال صوبہ سرحد کے سوا باقی سارے برعظیم میں مسلمان من حیث القوم اس تحریک سے الگ رہے۔

جون ۱۹۳۰ء میں سائمن کمشن رپورٹ چھپ گئی۔ آٹھ سو صفحات کی اس بھاری بھر کم دستاویز میں سفارش کی گئی کہ صوبوں میں دو عملی ختم کی جائے۔ صوبائی خود مختاری کا اصول مان لیا جائے۔ برعظیم میں وفاقی نظام قائم کیا جائے۔ گورنروں کے اختیارات بڑھا دیے جائیں۔ ووٹروں کے اوصاف اتنے کم کر دیے جائیں کہ دس فی صد آبادی کو ووٹ کا حق حاصل ہو جائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ صوبوں کی حدود کے بدلے بدل کے لیے انکوائری کمیٹی بٹھائی جائے۔ اس رپورٹ کو نہ ہندوؤں نے پسند کیا نہ مسلمانوں نے۔ حضرت علامہ نے نواب مر ڈوالفقار علی خان کی رفاقت میں ایک بیان جاری کیا جس میں رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ نکات پیش کیے:

اول : فیڈرل اسمبلی کی ترتیب پسندیدہ ہے۔ صوبائی خود مختاری دو بھی تسلیم کرنا مناسب ہے لیکن یہ واضح اور نمایاں نہیں ہے۔

دوم : آٹھ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں ہندو اکثریتی حکومتیں قائم ہو جائیں گی لیکن پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں سے جمہوری حقوق چھین لیے گئے ہیں۔ کیونکہ پنجاب میں انہیں غیر مسلموں کے مساوی نیابت دی گئی ہے اور بنگال میں اقلیت بنا دیا گیا ہے۔

سوم : سندھ کی علیحدگی کے مسئلے سے عملی طور پر بے پرواہی کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ متنازعہ فیہ مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھنے دے گا، جب تک نئے دستور کے نفاذ سے قبل اس کا کوئی اطمینان بخش تصفیہ نہیں ہو جاتا۔

چہارم : شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کے بارے میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی ہے۔ ان دو صوبوں کے ساتھ دوسرے صوبوں سے مختلف سلوک کرنا کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں۔

پنجم : سائمن کمشن نے یا تو میثاق لکھنؤ کو پیش نظر رکھا ہے یا ان چند مسلمانوں کا مشورہ قبول کیا ہے جنہیں رائے عامہ مسترد کر چکی ہے۔

آخر میں ان دو رہنماؤں نے کہا : ”رپورٹ کی سفارشات کی تہ میں جو پالیسی کارفرما ہے، اس کا مطلب ہمارے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے اہم مطالبات کو ٹھکرا کر انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنا مقصود ہے۔ اس وقت جو فوری مسئلہ مسلمانوں کے پیش نظر ہے، وہ یہ ہے کہ آیا ان حالات میں وہ اقلیت کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ ہماری رائے صاف طور پر یہ ہے کہ جب تک حالات ایسی صورت اختیار نہ کر لیں جو مسلمانوں کے مطالبات

کے لیے مفید ہو، کانفرنس میں بہاری شرکت سے قوم کو بچانے فائدے کے نقصان ہوگا۔ ہم مسلمانان ہند سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ فی الفور ایک جداگانہ طریقہ عمل پر گامزن ہونے کے لیے اپنی طاقتوں کو مرکوز کریں۔“

بہر حال مسلمانوں کی قیادت اتنی باشعور نہیں تھی کہ کانفرنس میں شرکت سے پہلے سودے بازی کی سیاست چلائے یا کم از کم اپنی صفوں ہی میں اتحاد پیدا کر لے۔ رہی یہ بات کہ مسلمان گول میز کانفرنس کا مقاطعہ کریں تو اس کی توقع ایک عافیت کوش قیادت سے کرنا شاید سرے ہی سے غلط تھا۔ انہی دنوں برطانوی انتخابات میں لیبر پارٹی بھر کا بیاب ہو گئی اور اس کی حکومت نے سائمن کمشن رپورٹ کو طاق پر رکھ دیا اور گول میز کانفرنس بلا لی۔ اس میں کانگریس تو شریک ہی نہ ہوئی کیونکہ وہ تو سول نافرمانی کی تحریک چلا رہی تھی اور اپنے آپ کو بلا شرکت غیرے سب کی نمائندہ تصور کرتی تھی۔ اس کانفرنس میں کل نواسی (۸۹) مندوب شریک ہوئے۔ ان میں سے اٹھاون مندوبین برطانوی ہند کے مختلف فرقوں اور مفادات کی نمائندگی کے لیے نامزد ہوئے تھے۔ باقی مہاراجاؤں ہند اور برطانیہ کی سیاسی پارٹیوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ہندوستانی نمائندوں نے اپنی قیادت کے لیے سر آغا خان کو چن لیا۔ کانفرنس نے ابتدائی دور میں مسلمان مندوبین کا کردار کیا رہا؟ اس بارے میں ڈاکٹر سید لکھتے ہیں: مسلمانوں کی پوزیشن خاص طور پر مشکل تھی۔ برصغیر کی وزارت واضح طور پر علیحدگی کی سیاست کو ناپسند کرتی تھی۔ اس کے حکومت خود اختیاری خاصی حد تک دینے کی تجویز کی اور اس بات پر آمادہ تھی کہ جو مسائل مسلمانوں کے نزدیک زیادہ بنیادی تنازعات کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے حل نہ ہونے کی صورت میں بھی اپنے فیصلے صادر کر دے۔ اس پوزیشن سے ہندو مندوبین مکمل طور پر مطمئن تھے

اور انہوں نے ایک سخت رویہ اختیار کر لیا۔ بعض مسلمان مندوبین مایوس بھی تھے اور حوصلہ بھی ہار گئے۔ وہ مضطرب تھے کہ حکومتِ وقت کے ساتھ مطابقت جاری رکھیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے مطالبات میں خاصی لچک پیدا کر لی اور ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کے راستے تلاش کرنے لگے۔ ”۹ مسلمان مندوبین کی کیفیت یہ تھی کہ سر محمد شفیع جو جداگانہ انتخاب کے حق میں زبردست مہم چلا چکے تھے، اب اسے چھوڑ کر دوسری تجاویز منوانے کی سعی کرنے لگے اور ہندوؤں کی کم نظری ملاحظہ ہو کہ وہ اس کے باوجود کچھ ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ایسے میں حضرت علامہ نے سر آغا خان کے نام یہ برقیہ بھیجا: ”تازہ خبریں اضطراب انگیز آ رہی ہیں۔ مسلمانانِ پنجاب کی رائے عامہ دہلی مسلم کانفرنس (آل پارٹیز مسلم کانفرنس) کی منظور کردہ قراردادوں پر قائم ہے اور ان میں رد و بدل کو ناقابلِ برداشت خیال کرتی ہے۔ مگر کوئی رد و بدل کیا گیا تو مسلم مندوبین پر اعتماد نہیں رہے گا۔ اگر ہندو مسلم مطالبات کو نہیں مانتے تو مسلمان کانفرنس کو چھوڑ کر چلے آئیں۔“ ۱۰ قریب قریب اسی مضمون کا ایک برقیہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر نواب اسماعیل خان نے سر آغا خان کو بھیجا اور صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمان کسی حالت میں بھی جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

چند دنوں کے اندر اندر مسلم سیاست میں ایک ڈرامائی تبدیلی واقع ہوئی، جس کے بیرو حضرت علامہ تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ گول میز کانفرنس میں مسلمان مندوبین ہندوؤں کے سامنے ہتھیار ڈال رہے ہیں، تو انہوں نے مدیران ”انقلاب“، مہر و سالک، مدیر ”سیاست“، سید حبیب اور مدیر ”مسلم آؤٹ لک“، مجید ملک کو بلا کر تبادلہ خیال کیا اور انہی کے مشورے پر ”انقلاب“ نے ایک مقالہ ”افتتاحیہ میں یہ تجویز پیش

کی کہ شمالی ہند کے مسلمان اپنے مخصوص مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کریں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کی ایک علاقائی کانفرنس کرانے کا منصوبہ باندھا گیا۔ ورنہ اس سے پہلے کانفرسیں صوبائی اور کل ہند سطح پر ہوا کرتی تھیں۔ ”انقلاب“ کے افتتاحیے کے آخر میں کہا گیا کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس کی ضرورت بہت عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی لیکن تازہ حالات نے اسے نہایت ضروری بنا دیا۔ جب تک صوبوں پر مرکز کا کنٹرول ڈھیلا نہیں ہوتا، سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ نہیں ہوتا اور پنجاب میں جدا گانہ انتخاب کے ذریعے سے مسلم اکثریت کا نیشن نہیں ہوتا، شمالی ہند کے مسلمانوں کا سیاسی وجود خطرے میں رہے گا۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ آج وقت کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اس خطے کے مسلمان سوچیں کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کون سے عملی اقدامات ضروری ہیں۔ اگر وہ اس نازک مرحلے پر خاموش رہے تو ہمیشہ کے لیے کیف افسوس میں گئے۔ ۱۱۔ یہ شمارہ ۲۰ نومبر کے شمارے میں چھپا، جس پر رواج کے مطابق ایک دن بعد ہی تاریخ ۲۱ نومبر دی گئی تھی۔ اسی دن حضرت علامہ نے گول میز کانفرنس میں مسلم مندوبین کے طرز عمل کے خلاف ”مسلم آؤٹ لک“ جو شمارہ دیا اور اس کے دوران میں کہا: ”یہ تجویز پیش ہو چکی ہے کہ ہندوستان کے مغربی ہند اور پنجاب کے مسلمان لاہور میں ایک اجلاس منعقد کریں۔ اس کے کردہ مفاہمت کے متعلق اپنی رائے کا پرزور طریق پر اظہار کریں۔ ہندو صوبوں میں مسلمانوں کو یہ اعتبار آبادی اکثریت حاصل ہے۔ ان میں حصول اکثریت کے لیے اصرار ضروری ہے۔ مجوزہ کانفرنس میں پنجاب کے مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ مندوبین (گول میز کانفرنس کے)

متعلق آن کی روش کیا ہوگی۔ نیز یہ کہ ان کے کیے ہوئے سمجھوتے کو قبول کر لینا چاہیے یا مسترد کر دینا چاہیے۔،، ۱۲

۲۳ نومبر ۱۹۳۰ء کو حضرت علامہ نے لاہور کے مسلم اکابر کا ایک اجلاس برکت علی اسلامیہ ہال میں بلایا جس میں ان حضرات نے شرکت کی۔ علامہ اقبال، عبدالمجید سالک، غلام رسول مسہر، مولوی محمد علی، خان سعادت علی خان، حکیم محمد شریف، مولوی غلام محی الدین قصوری، میاں حق نواز، حاجی میر شمس الدین، سید محسن شاہ، خلیفہ شجاع الدین، مولوی فضل الدین، سردار حبیب اللہ خان، ملک محمد دین، میاں فیروز الدین، سید حبیب، سید مراتب علی شاہ، فضل کریم، عبداللہ، محبوب الہی، میر عزیز الدین، خیر الدین اور مجید ملک۔ حضرت علامہ نے جلسے کی صدارت فرمائی اور افتتاحی تقریر میں بتایا کہ ”حالاتِ حاضرہ کے اعتبار سے شمالی ہند کے مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس کا انعقاد ضروری ہے جس میں صوبہ سرحد، بلوچستان، پنجاب اور سندھ کے نمائندے شریک ہوں اور ان صوبوں کے مسلمانوں کو اسلامی حقوق کے حصول کے لیے منظم بنانے اور ان میں جوش و خروش پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔،،

علامہ نے کانفرنس کا جو ڈھانچہ تجویز کیا اور جس سے سب نے اتفاق کیا، وہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے ڈھانچے سے ملتا جلتا تھا۔ کیونکہ فیصلہ ہوا کہ اس کانفرنس میں چاروں صوبوں کی مجالسِ قانون ساز، بلدیات اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے مسلم ارکان، مختلف اسلامی تنظیموں کے نمائندے اور خطے کے دوسرے نمایاں مسلمان رہنماؤں کو مدعو کیا جائے۔ یاد رہے کہ اس وقت صرف پنجاب میں مجلسِ قانون ساز موجود تھی۔ سندھ، مسلمان ہمدینی اسمبلی کے رکن ہوتے تھے، سرحد اور بلوچستان آئینی

اصلاحات سے محروم تھے ، اس لیے مجالس قانون ساز کے مسلم ارکان سے مراد تھی پنجاب کونسل کے مسلم ارکان ، بمبئی کونسل کے سندھی مسلمان ارکان اور مرکزی اسمبلی میں ان خطوں کے مسلمان ارکان ۔ جو حضرات اس اجلاس میں شریک تھے ، وہ سب کے سب مجلس استقبالیہ کے رکن بن گئے ۔ علامہ اقبال صدر منتخب ہوئے ، مجید ملک میکرٹری اور خان سعادت علی خان فنانشل میکرٹری ۔ ۱۳

مجلس استقبالیہ کے دوسرے اجلاس سے پہلے بعض لوگوں نے یہ دو سوال اٹھائے :

۱ - کیا اس کانفرنس کے انعقاد کا مطلب یہ ہے کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کو باقی ہندوستان کے مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں ؟

۲ - اگر بنگال کے مسلمانوں کے مسائل شمال مغربی خطے کے مسلمانوں کے مسائل سے ملتے جلتے ہیں ، تو اس کانفرنس سے بنگال کے مسلمانوں کو کیوں الگ رکھا جائے ؟

حضرت علامہ کی طرف سے ”انقلاب“ نے پہلے سوال کا جواب یہ دیا کہ ساری مخالفت مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کے خلاف مرتکز ہے ۔ جہاں تک مسلم اقلیتی صوبوں کا تعلق ہے ، وہاں کے مسلمانوں کو ویٹیج یا پاسنگ (آبادی کے تناسب سے زیادہ نیابت) ملنے پر اس پدموڈوں نے کوئی خاص اعتراض کیا ہے ، نہ حکومت ہند نے اور نہ سائمن کمشنر نے ۔ ایسے میں مسلم اکثریتی خطوں کے رہنماؤں کے ارمان اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے مشاورت ضروری ہو جاتی ہے ۔ دوسرے سوال کے جواب میں کہا گیا کہ بنگال کو محض اس لیے مدعو نہیں کیا گیا کہ وہ اپنے طریق

ہیں۔ بہر حال اگر وہاں کے مسلمان ایسی ہی کانفرنس منعقد کریں، تو شمال مغربی خطے کے مسلمان ان کی ہر ممکن مدد کریں گے۔

۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو مجلس استقبالیہ کا اجلاس حضرت علامہ کے دولت کدے پر ہوا۔ اس میں ایک تو کانفرنس کا نام اپر انڈیا مسلم کانفرنس طے پایا۔ دوسرے، یہ فیصلہ ہوا کہ کانفرنس دسمبر میں نہیں جنوری، ۱۹۴۸ء کے آخری ہفتے میں ہو۔ تیسرے، جناب مجید ملک کے ساتھ مولانا سید حبیب کو بھی میکرٹری کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ کانفرنس کا دفتر کھولا گیا۔ ایک مختصر سا عملہ مقرر ہوا۔ دسمبر میں کانفرنس نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہی دنوں یہ فیصلہ ہو گیا کہ دسمبر کے اواخر میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جو سالانہ اجلاس الہ آباد میں ہو رہا تھا، اس کی صدارت حضرت علامہ کریں۔ ۱۴

یہ کانفرنس حقیقت میں پاکستان کا پیش خیمہ تھی اور اس کے مقاصد ۱۴ دسمبر کو زیادہ واضح ہو گئے۔ جب ۱۴ دسمبر ۱۹۴۷ء سے ”انقلاب“ کے صفحہ اول پر کانفرنس کی اپیل دو کالمی چوکھٹے میں اس عنوان سے آنے لگی: ”پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان اسلامی ملک ہیں۔ ان میں اسلام کا علم بلند کرو۔“ اس کے دو دن بعد علامہ اقبال اور بارہ اخبار نویسوں اور رہنماؤں کے مشترکہ دستخطوں سے کانفرنس کا ایک مفصل اعلان کیا گیا۔ اس کے پہلے حصے میں کانفرنس کے اجزائے ترکیبی کی وضاحت کی گئی، دوسرے حصے میں مقاصد بیان کیے گئے۔ اس سلسلے میں یہ اقباس خصوصی اہمیت کا حامل ہے:

”اس کانفرنس کے طلب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان صوبجات کے مسلمانوں کو حالاتِ حاضرہ اور آج کی سیاسی تحریکات سے

آگاہ کیا جائے اور ہماری ہمسایہ اقوام اور ہندوستان کی حاکم قوم کی حکمتِ عملی سے واقف کر کے ان خطرات سے آگاہ کیا جائے، جن سے اس وقت ملتِ مرحومہ دوچار ہے، اور اس کے بعد مسلمانانِ ہند کی اس کثرت کو، جو ان صوبجات میں ہے۔ (جن کو خدائے حکیم و علیم و خبیر نے یقیناً بلا مصلحت نہیں، بلکہ کسی ایسی مصلحت کے لیے، جو اربابِ دانش و بینش پر روز بروز عیاں ہوتی چلی جا رہی ہے، بکجا رکھا ہے۔) ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہونے کا پیغام دیا جائے۔“

تیسرے حصے میں ”جناح کے چودہ نکات“ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین سے توقع تھی کہ وہ ان پر قائم رہیں گے۔ چوتھے حصے میں اس بات پر اعتراض کیا گیا کہ دیسی ریاستوں کو بھی ہندوستان کے فیڈرل نظام میں شمولیت کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اس سے برطانوی ہند کی ساری اہمیت ختم ہو جائے گی۔ ”اگر ایسا ہوا، تو ہندوستان کے موجودہ صوبجات کی حیثیت وہی ہوگی جو پنجاب کے لسی ضلع کو اپنے صوبے کے اندر حاصل ہے۔“ بیان میں یہ بھی کہا گیا کہ ہم مسلمان فیڈرل نظام کو تسلیم کیے جانے پر خوش ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ ”اس لفظی ٹٹی کی آڑ میں ہمیں شکار بنایا جا رہا ہے۔“

برعظیم میں حالات نے یہ کروٹ لی، تو گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین کو ہوش آیا اور اس دباؤ کے پیش نظر وہ ایک بار پھر پہلے موقف پر آ گئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحمید رقمطراز ہیں: ”اب کانفرنس پر ہندو مسلم اختلافات محیط ہو گئے اور اس کی بیشتر کارروائی میں رکاوٹیں پڑ گئیں۔ ہندو ایک ایسی مضبوط مرکزی حکومت چاہتے تھے،

جو صوبائی حکومتوں پر غالب ہو۔ اس کے برعکس مسلمان مکمل طور پر خود مختار صوبوں کی ایک ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن چاہتے تھے۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ جداگانہ انتخاب بھی برقرار رہے اور پاسنگ کا اصول بھی۔ ہندو دونوں کی تسمیح چاہتے تھے۔ مسلمان چاہتے تھے کہ پنجاب اور بنگال میں آن کی قانونی اکثریت تسمیح کی جائے۔ ہندو اس کی مزاحمت کرتے تھے اور پنجاب کے بارے میں صورتِ حالات اور بھی پیچیدہ ہو گئی، کیونکہ سکھوں نے اپنے دعاوی کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا۔ "۱۶ مسلمان مندوبین کے موقف میں جو سختی آئی، وہ حضرت علامہ کی اس نفسیاتی جنگ کا نتیجہ تھی جو انہوں نے پنجاب کے اکابر اور اسلامی صحافت کے تعاون سے لڑی، لیکن اس کا اثر عارضی ثابت ہوا اور دیسی ریاستوں کے مندوبین نے بیچ بچاؤ کے بہانے ایک بار پھر مسلمان مندوبین کو افسوسناک لچک پر مجبور کر دیا۔ ایسے میں خطبہ^۴ اللہ آباد ایک ایسا دھماکا تھا جس نے پوری گول میز کانفرنس کو ششدر اور پریشان کر دیا۔

حوالے

- ۱ - "انقلاب"، ۷ دسمبر ۱۹۲۸ء -
- ۲ - ایضاً - ۸ دسمبر ۱۹۲۸ء -
- ۳ - ایضاً - ۹ دسمبر ۱۹۲۸ء -
- ۴ - "پرنپ" - ۱۴ دسمبر ۱۹۲۸ء -
- ۵ - "انقلاب" - ۱۹ دسمبر ۱۹۲۸ء -
- ۶ - "گفتار اقبال"، صفحات ۱۰۲-۱۰۰ - (بحوالہ "انقلاب")
- ۳ نومبر ۱۹۲۹ء -
- ۷ - ایضاً - صفحات ۱۰۶-۱۰۵ - (بحوالہ "انقلاب" ۲۴ دسمبر ۱۹۲۹ء)

- ۸ - ایضاً - صفحات ۱۰۶-۱۰۹ - (بحوالہ "انقلاب" ۲۶ جون ۱۹۳۰ء)
- ۹ - MUSLIM SEPARATISM IN INDIA - ص ۲۰۴ -
- ۱۰ - "گفتارِ اقبال" - ص ۱۰۹ - (بحوالہ "انقلاب" ۱۸ نومبر ۱۹۳۰ء)
- ۱۱ - "انقلاب" - ۲۱ نومبر ۱۹۳۰ء -
- ۱۲ - "انقلاب" - ۲۳ نومبر ۱۹۳۰ء -
- ۱۳ - "انقلاب" - ۲۵ نومبر ۱۹۳۰ء -
- ۱۴ - "انقلاب" - ۹ دسمبر ۱۹۳۰ء -
- ۱۵ - "انقلاب" - ۱۹ دسمبر ۱۹۳۰ء -
- ۱۶ - MUSLIM SEPARATISM IN INDIA - ص ۲۰۴ -



بیسواں باب

خطبہ 'اللہ آباد' : ایک تجزیہ

جہاں تک برعظیم کی سیاسی تقسیم کے تصور کا تعلق تھا ، یہ کوئی تصور نہیں تھا ۔ عبدالعظیم شرر نے اپنے ہفت روزہ ”مہذب“ میں ۱۸۹۰ء ہی میں اس طرف اشارہ کر دیا تھا ۔ ۱۹۱۳ء میں محمد علی نے اپنے ہفت روزہ ”دی کمریڈ“ میں اپنے مزاح نگار رفیق کار ولایت علی بمبوق کی ایک تحریر چھاپی ، جس میں تقسیم کے ساتھ ساتھ تبادلہ آبادی کا بھی تذکرہ تھا ۔ ۱۹۱۷ء میں سٹاک ہوم کی بین الاقوامی سوشلسٹ کانفرنس میں علی گڑھ کے خیری برادران نے یہی تصور پیش کیا ۔ ۱۹۲۰ء میں عبدالقادر بنگرامی نے بدایوں کے رسالہ ”ذوالقرنین“ میں گاندھی جی کے نام ایک مکتوب منسوخ میں تقسیم کا علاقائی منصوبہ بھی پیش کر دیا ۔ ۱۹۲۱ء میں آگرہ کے ایک وکیل نادر علی نے ایک کتابچے میں یہی تجویز پیش کی ۔ ۱۹۳۲ء میں حکومت ہند کی شمال مغربی سرحد کمیٹی میں ڈیرد اسماعیل خان کی اسٹیٹس اسلام کے صدر سردار گل خان نے علیحدہ مسلم مملکت کے قیام پر زور دیا ۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا حسرت موہانی نے اپنا منصوبہ تجویز کیا اور ۱۹۲۵ء میں لالہ لاجپت رائے نے آنے والے پاکستان کا پورا نقشہ تیار کر دیا ۔ لیکن ان سب کا موقف یہ تھا کہ روزمرہ اختلافات اور فسادات کے پیش نظر ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے ، اس لیے ان کے منطقی الگ الگ

کر دیے جائیں۔ بہر حال اقبال برعظیم کی پہلی شخصیت تھے، جنہوں نے علیحدہ مسلم مملکت کے تخیل کو مثبت اور نظریاتی انداز میں پیش کیا اور اس کے لیے منظم اور باقاعدہ طریقے پر زمین ہموار کی۔

جداگانہ انتخاب پر بے پناہ اصرار کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے قومی تشخص کی بحالی کا آغاز ہو جائے۔ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریتوں کو قانونی اکثریتیں تسلیم کرانے کی سعی کا مقصد یہ تھا کہ ان کی مجالس قانون ساز میں مسلم اکثریتیں آگے چل کر وزارتیں بنا سکیں اور اسلامی تہذیب و روایت کو آگے بڑھا سکیں۔ ہندو کی بمبئی سے علیحدگی اور صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی قرار دینے کے مطالبے کے پس پردہ یہ مقصد کارفرما تھا کہ مسلمانوں کے چار صوبے یکجا ہو کر ایک بلاک کی سی صورت اختیار کر لیں اور صوبائی خودمختاری پر زور دینے کا مطلب یہ تھا کہ مسلم اکثریتی صوبے ایک ہندو اکثریتی مرکزی یا فیڈرل حکومت کے اثر سے زیادہ سے زیادہ آزاد ہوں۔ یہ مطالبات صرف علامہ کے مطالبات نہیں تھے اور یہ بھی درست ہے کہ ان پر آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں صناد کیا گیا اور بعد میں یہی ”جناح کے چودہ نکات“ کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ لیکن ایک حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جہاں دوسرے مسلمان رہنا یا جماعتیں ان مطالبات میں لچک کے لیے آمادہ ہوتی رہیں، اور خود ”جناح کے چودہ نکات“ سے منسلک پروٹوکول میں درج ہے کہ اگر سارے مطالبات مان لیے جائیں تو نشستوں کی تخصیص کے ساتھ مخلوط انتخاب فیول کر لیا جائے گا، وہاں علامہ نے جداگانہ انتخاب، صوبائی خود مختاری اور دوسرے مطالبات پر کبھی مصالحت قبول نہ کی۔ اور جب کسی عنصر نے لچک کا مظاہرہ کیا، علامہ نے کہہ لیا کہ ہلا اس

کی مخالفت فرمائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علامہ کے ذہن میں مستقبل کا جو نقشہ موجود تھا، یہ مطالبات اس کے لیے بنیادی نقوش فراہم کرتے تھے۔

مستقبل کے نقشے کے دو اجزا تھے: ایک، فوری نوعیت کی سیاست۔

دوسرا، نظریاتی پہلو۔ خطباتِ مدراس میں انہوں نے اسلامی تفکر کا نیا انداز پیش کر کے اہل علم و دانش کے ذہنوں میں پھیلے پزرنے بہت سے جالے صاف کر دیے۔ اور اس طرح مستقبل کے نقشے کی فکری اساس مہیا کر دی، جو اسلام کے بنیادی اصول اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کا ایک مدلل امتزاج تھی۔ جہاں تک فوری نوعیت کی سیاست کا تعلق تھا، علامہ گول میز کانفرنس میں مسلم مندوبین کے موقف میں حد سے بڑھی ہوئی لچک پر مشوش ہوئے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ قومیتِ متحدہ کی صورت میں نکلتا اور اس طرح مسلم سیاست کی نفی ہو جاتی۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا اور محسوس کیا کہ مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی صوبوں کے مفادات میں اس لحاظ سے بڑا فرق پڑ گیا ہے کہ مسلم اقلیتی صوبوں کے رہنا اپنے ہاں ہانگ (آبادی کے تناسب سے زیادہ نیابت) کے بدلے میں ایسی صورت پیدا کر رہے ہیں کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں وہ اقلیت میں بدل جائیں۔ مفادات کے اس اختلاف نے انہیں اپر انڈیا مسلم کانفرنس کی تجویز پر مجبور کر دیا۔

جب انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد سیشن کی مسابقت کے لیے بلایا گیا تو انہوں نے ایک ایسا عالمانہ اور مدبرانہ خطبہ پڑھا، جس میں برعظیم کے مسلمانوں کے قومی مطالبات، شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی خطے کے مخصوص تقاضوں اور مستقبل کے نقشے کی فکری اساس کے ڈانڈے آپس میں مربوط تھے۔ خطبہ الہ آباد تحریک پاکستان کی ایک

نہایت اہم تاریخی دستاویز ہے جو روسو کی کتاب ”معاہدہ عمرانی“ کی طرح پڑھی کم جاتی ہے لیکن اس کا تذکرہ بہت ہوتا ہے۔ اور بہت سے مصنفین اس کے چند اقتباسات دہراتے چلے جاتے ہیں، لیکن پورے متن کا گہری نظر سے مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے اس کی اصل روح تک نہیں پہنچتے اور بسا اوقات اقتباسات سے نادرست نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس اہم دستاویز کا تفصیل سے تجزیہ کریں تاکہ علامہ کا نقطہ نگاہ زیادہ واضح انداز میں سامنے آسکے۔

حضرت علامہ نے فرمایا کہ ”اسلام اخلاقی نصب العین اور ایک خاص قسم کے نظام سیاست کا امتزاج ہے اور اس نے برعظیم کے مسلمانوں کی زندگی کو گہرے انداز میں متاثر کیا ہے اور انہیں ایسے بنیادی احساسات اور وفاداریاں مہیا کی ہیں، جن سے بکھرے ہوئے افراد اور گروہ ایک واضح اور معین قوم کی ہئیت اختیار کر لیتے ہیں، اور ایک منفرد اخلاقی شعور کے مالک بن جاتے ہیں۔ یہ کہنا حقیقت میں مبالغے سے خالی ہے کہ ہندوستان دنیا کا واحد خطہ ہے جہاں اسلام نے بہترین انداز میں تعمیر قوم کی قوت کا کام دیا ہے۔“ ۲ انہوں نے اس یورپی تصور کو غلط قرار دیا کہ مذہب فرد کا ایک بھی معاملہ ہے اور اسے انسان کی دنیاوی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ انہوں نے کہا: ”اسلام انسان کی وحدت کو روح اور مادے کی ناقابلِ مصالحت ثنویت یا دوئی میں منقسم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ، کیسا اور ریاست باہم مربوط ہیں۔“ ۳ آپ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر مسلمانوں نے یورپی تصور مذہب کو قبول کر لیا، تو وہ اپنی ساری اہمیت، اپنی ساری انفرادیت اور اپنا ملی تشخص کھو بیٹھیں

گے۔ آپ نے کہا: ”اسلام کا دینی نصب العین بنیادی طور پر اسلام کے معاشری نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک کو مسترد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرا بھی مسترد کر دیا گیا ہے۔ اس لیے اگر قومی بنیادوں پر ایک نظام سیاست کی تشکیل کا مطلب یہ ہے کہ یہ اسلامی اصول جمعیت کی جگہ لے لے، تو یہ بات ایک مسلمان کے لیے بالکل ناقابل تصور ہے اور یہی وہ معاملہ ہے جو موجودہ وقت میں مسلمانان ہند سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔“

علامہ نے فرمایا: ”ہندوستان ایک چھوٹا سا ایشیا ہے۔ اس کی آبادی کے ایک حصے کی ثقافت مشرق کی قوموں سے ملتی جلتی ہے اور ایک حصے کی ثقافت وسطی اور مغربی ایشیا کی قوموں سے مماثل ہے۔ اگر ہندوستان میں تعاون کا کوئی مؤثر اصول دریافت کر لیا جائے، تو اس سے اس قدیم سرزمین میں امن اور باہمی خیر سگالی کا دور دورہ ہوگا۔۔۔ اور اس سے ایشیا کا بھی پورا سیاسی مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

علامہ نے افسوس کا اظہار کیا کہ داخلی ہم آہنگی کے اصول کی دریافت ناکام رہی ہے۔ انہوں نے اس کے امکانی اسباب کی طرف بھی اشارے کیے اور پھر کہا: ”جہاں تک میں نے مسلمانوں کے ذہن کا مطالعہ کیا ہے، مجھے یہ اعلان کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اگر مستقبل فرقدوار تصفیے کی بنیاد کے طور پر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستانی مسلمان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ہندوستانی اوطان HOMELANDS میں اپنی ثقافت اور روایت کے خطوط پر بھرپور اور آزاد نشوونما پائے، تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے سب کچھ بازی ہر لگانے کو تیار ہوگا۔ جب یہ اصول بیان کیا جاتا ہے، کہ ہر گروہ کو اس کے اپنے خطوط پر آزادانہ

نشو و نما پانے کا حق حاصل ہے تو اس کا سرچشمہ کوئی ایسا احساس نہیں ہوتا جو تنگ دلانہ فرقہ پرستی پر مبنی ہو۔ فرقہ پرستی کے مختلف مطالب بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی فرقہ دوسرے فرقوں کے بارے میں معاندانہ احساسات رکھتا ہے، تو وہ پستی اور رزالت کا مرتکب ہے۔ میں دوسرے فرقوں کے رسوم و رواج، قوانین اور مذہبی اور معاشری اداروں کا انتہائی احترام کرتا ہوں۔ بلکہ قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق یہ میرا فرض ہے کہ ضرورت پڑے تو ان کی عبادت گاہوں کا بھی دفاع کروں۔ اس کے باوجود میں اس فرقہ وار گروہ سے پیار کرتا ہوں جو میری زندگی اور طرز عمل کا ماخذ ہے اور جس نے مجھے اپنا دین، اپنا ادب، اپنا فکر اور اپنی ثقافت دے کر مجھے وہ بنایا جو میں اس وقت ہوں۔ اس نے میرے موجودہ شعور میں اپنے پورے ماضی کی تخلیق نو کو ایک جیتا جاگتا اور حرکت پذیر عنصر بنا دیا ہے۔“ ۶

علامہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہندوستان انسانی گروہوں کا ایک براعظم ہے۔ یہ گروہ مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف مذاہب پر عقیدہ رکھتے ہیں، اور تو اور ہندو بھی ایک مربوط گروہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لیے جب تک یہاں فرقہ وارانہ گروہوں کی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، اس براعظم پر یورپی جمہوریت کے اصول لاگو نہیں کیے جا سکتے۔ انہوں نے ”ہند کے اندر مسلم ہند“ کے مطالبے کو جائز قرار دیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے دہلی میں جو قومی مطالبات مرتب کیے تھے، ان کا مقصد یہی تھا کہ ہندوستانی فرقوں کی انفرادیت کچلنے کی جگہ انہیں اس طرح پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا جائے کہ وہ ایک دوسرے کے دوش بدوش آگے بڑھ سکیں۔ علامہ نے ان مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ”ذاتی

طور پر میں ان مطالبات پر مستزاد یہ کہوں گا کہ میں پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، سندھ اور بلوچستان کو مدغم کر کے ایک واحد ریاست کی صورت میں دیکھنا پسند کروں گا۔ خود اختیاری حکومت قلمرو برطانیہ کے اندر ہو یا قلمرو برطانیہ کے باہر، ایک مضبوط شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل مجھے کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی آخری منزل نظر آتی ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کی گئی تھی لیکن اسے اس بناء پر مسترد کر دیا گیا کہ یہ ایک اتنی بڑی ریاست ہوگی جس کا نظم و نسق چلانا مشکل ہو جائے گا۔

اس ریاست کے قیام کا مقصد بتانے ہوئے آگے چل کر علامہ نے کہا: ”اس سرزمین میں ایک ثقافتی قوت کی حیثیت سے اسلام کی بقا کا دارومدار اسے ایک مخصوص علاقے میں مرتکز کرنے پر ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفادات کے پیش نظر ایک مربوط مسلم ریاست قائم کر دی جائے۔ اس سے ہندوستان میں طاقت کا اندرونی توازن امن اور سلامتی کا پیام بر ہوگا اور اسلام کو موقع مل جائے کہ وہ اپنے قانون، اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لائے اور انہیں اپنی اس روح اور زمانہ حال کی روح کے قریب لے آئے۔ نیز وہ آسٹریلیا سے نجات حاصل کرے جو عربی سامراج سے دینے پر مجبور تھا۔“

یہاں ایک سوال یہ ابھرتا ہے کہ علامہ نے شمال مغربی ہندوستان کو مسلم ریاست کا تصور تو پیش کر دیا، لیکن بنگال کا ذکر کیوں نہ کیا۔ حالانکہ وہاں بھی مسلمان اکثریت میں تھے؟ یہ سوال وقتاً فوقتاً اٹھاتا رہا ہے، لیکن محض بے خبری کی بناء پر۔ کیونکہ اول تو جب انہوں نے شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل کا مطالبہ کیا تو اس کے ساتھ ہی انہوں نے میرٹے نزدیک کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی منزل

مقصود یہی ہو سکتی ہے۔ ”کم از کم“ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ بنگال بھی ان کے پیش نظر تھا اور اس کا واضح ذکر اس لیے نہ کیا کہ علامہ نے خطبہ ”الہ آباد میں جب ”ریاست“ کا لفظ استعمال کیا، اس سے مراد صوبہ یا وفاقی واحدہ تھا۔ اور ”ریاست“، کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ یہی تھی کہ فیڈرل نظام کے اجزائے ترکیبی کو عام طور پر ”سٹیٹ“، یا ”ریاست“ ہی کہا جاتا ہے۔ شمال مغربی ہند کی ریاست کا خصوصی تذکرہ کرنے کا سبب یہ تھا کہ اس پورے خطے کو ایک ریاست کی صورت دینا مطلوب تھا۔ بنگال پہلے ہی مسلم اکثریتی ریاست تھی، اس لیے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ علامہ مسلم اکثریتی ریاستوں میں غیر مسلم اقلیتوں کے مسئلے سے بھی آگاہ تھے۔ اس لئے انہوں نے شمال مغربی ہند کی ریاست کا ذکر کیا، تو یہ بھی کہہ دیا کہ اس سے انبالہ ڈویژن اور بعض دوسرے ہندو اکثریتی اضلاع الگ کر دیے جائیں تو مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بڑھ جائے گا اور اس ریاست کی حدود کے اندر آباد غیر مسلم اقلیتوں کی بہتر طریقے سے حفاظت ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ انہوں نے دو بار صوبوں یا ریاستوں کی حدود کو از سر نو طے کرنے کی تجویز فرمائی اور عین ممکن ہے کہ اس کے پیچھے یہ خواہش کارفرما ہو کہ بنگال کے غیر مسلم اکثریتی اضلاع بھی الگ کر دیے جائیں۔

اس غلط العام تصور کی تردید بھی ضروری ہے کہ علامہ نے خطبہ ”الہ آباد میں ایک مکمل طور پر آزاد اور خود مختار اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ ہندوستان کے دفاع کے بارے میں انہوں نے جو باتیں کہیں، وہ ایک مختلف سمت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں تین اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں :-

”پس ہندوستان کے سیاسی جسم کے اندر نشوونما کا پورا موقع حاصل کر کے شمال مغربی ہند کے مسلمان ، غیر ملکی یلغار کے خلاف ، خواہ وہ یلغار نظریات کی ہو یا سنگینوں کی ، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔“ ۹

”داخلی امن کو برقرار رکھنے کی خاطر صوبائی افواج کے علاوہ ہندوستانی وفاق کانگریس شمال مغربی سرحد پر ایک ایسی مضبوط ہندوستانی سرحدی فوج رکھ سکتی ہے ، جو تمام صوبوں سے حاصل کردہ یونٹوں پر مشتمل ہوگی اور جس میں افسری کے فرائض تمام فرقوں سے لیے ہوئے چابک دست اور تجربہ کار فوجی ادا کریں گے۔“ ۱۰

”مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ایک وفاق حکومت قائم ہو جاتی ہے تو مسلمان وفاق ریاستیں دفاع ہند کے مقاصد کے لیے بہ رضا و رغبت خود غیر جانب دار ہندوستانی بری اور بحری افواج کی تشکیل سے اتفاق کر لیں گی۔ ہندوستان کے دفاع کے لیے اس قسم کی غیر جانب دار فوجی قوت مفاد حکومت کے دنوں میں ایک حقیقت تھی۔ بلکہ اکبر کے زمانے میں ہندوستانی سرحد کی حفاظت ایسی فوجیں کرتی تھیں ، جن میں ہندو جرنیل افسر ہوا کرتے تھے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وفاق ہند پر مبنی ایک غیر جانب دار فوج کا منصوبہ مسلمانوں میں حب وطن کے احساس کو تیز کر دے گا اور

بالآخر کسی ایسے شبے کو ختم کر دے گا کہ بیرونی حملے کی صورت میں ہندوستانی مسلمان سرحد پار کے مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے۔ ،، ۱۱

برعظیم کے دفاع کے سلسلے میں علامہ نے جو تجویز پیش کی ، اس کی شان نزول یہی تھی کہ ہندوؤں نے مسلسل یہ مہم جاری کر رکھی تھی کہ مسلمان شمال کی طرف سے بیرونی حملے کی صورت میں حملہ آور مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے اور سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے کوئی منصوبہ پیش ہوا ، ہندوؤں نے اسی بناء پر اس کی نہایت شد و مد کے ساتھ مخالفت کی۔ چونکہ حضرت علامہ کا ایسا کوئی یوٹوپیائی خیال نہیں تھا ، اور وہ مسلم اکثریتی علاقوں کو صرف اس لیے یکجا کرنا چاہتے تھے کہ اپنی ثقافت کی حفاظت کریں اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اور جدید دنیا کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ایک اعلیٰ پائے کا منصفانہ اور عادلانہ نظام قائم کریں ، اس لیے آپہیں اس بات میں کوئی عذر نہیں تھا کہ دفاع کے معاملے میں ہندوؤں کے خدشات دور کرنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کر لی جائیں۔ ایسی تدابیر جن سے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی حفاظت کا بندوبست ہو جائے۔

علامہ نے اس خطے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مرتب کردہ قومی مطالبات کی بڑے مدلل انداز میں تائید فرمائی لیکن ان کے ارشادات ان مطالبات سے کچھ بڑھ کر تھے۔ کیونکہ :

۱۔ قومی مطالبات میں سندھ کی علیحدگی اور سرحد و بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی حیثیت دینے پر زور دیا گیا۔ اور

علامہ نے شمال مغربی ہند کے چاروں مسلمان صوبوں کو یکجا کر کے ایک ریاست بنانے کا مطالبہ کیا۔

۲ - پنجاب میں مسلمانوں کو قانونی اکثریت دینے کے مطالبے کی تائید کرتے ہوئے علامہ نے یہ تجویز پیش کی کہ اس سے انبالہ ڈویژن اور بعض ہندو اکثریتی اضلاع الگ کر دیے جائیں تاکہ اس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت اتنی ہو جائے کہ قانونی اکثریت کے مطالبے کی ضرورت باقی نہ رہے۔

۳ - قومی مطالبات میں جتنی صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیا، علامہ نے اس سے زیادہ خود مختاری چاہی اور ہر صوبے یا ریاست کے لیے الگ فوج رکھنے کا بھی مطالبہ کیا۔

۴ - گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین ایک ایسے فیڈرل نظام پر راضی ہو رہے تھے، جس میں برطانوی ہند کے صوبوں کے علاوہ دیسی ریاستیں بھی شامل ہوں۔ علامہ اس کے خلاف تھے۔

۵ - علامہ برطانوی ہند کے لیے جس قسم کے فیڈرل نظام کا تصور کرتے تھے، وہ نام کو تو واقعی فیڈرل تھا لیکن اصل میں ایک قسم کی کنفیڈریشن کا مظہر تھا۔ کیونکہ انہوں نے ایک تو صوبوں کو الگ الگ فوج رکھنے کا حق دیا دوسرے، برعظیم کے دفاع کے لیے مشترکہ فوجوں کا تصور اپنایا۔ تیسرے، یہ کہا کہ فیڈریشن دو صرف وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو خود مختار صوبے آتے ہیں گے اور باقی مادہ یا مابقی اختیارات صوبوں کے پاس رہیں گے۔ چوتھے، وہ فیڈرل نظام چلانے کے لیے ایک ایسی اسمبلی چاہتے تھے جس نے انتخابات براہ راست نہ ہوں۔

ان ارشادات سے اقبال کی مراد کیا تھی؟ یہی، کہ اگر ایسا نظام چل سکے تو فبہا۔ ورنہ مسلمان اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنے مخصوص مفادات کو خطرے میں دیکھ کر اس فیڈریشن یا کنفیڈریشن سے الگ ہو جائیں۔ اور خطبے میں انہوں نے اس طرف اشارے بھی کیے۔ مثلاً انہوں نے کہا: ”میں فرقہ وار مفاہمت کے سلسلے میں ناامید نہیں ہوں۔ لیکن میں اپنا یہ احساس آپ سے چھپانا نہیں چاہتا کہ عین ممکن ہے، موجودہ بحران سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہماری قوم کو مستقبلِ قریب میں ایک آزاد راہِ عمل اختیار کرنی پڑے۔ اور اس قسم کے بحران میں سیاسی عمل کا ایک آزاد راستہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ پوری قوم عزم کر لے کہ وہ اس راستے پر چلنے میں بے پناہ قوتِ ارادی سے کام لے گی۔“ ۱۲ علامہ نے آخر میں یہ بھی کہا: ”۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ ہندوستان میں حالات وہ نہیں جو بظاہر نظر آ رہے ہیں۔ بہر حال اس بات کا مطلب آپ پر اس وقت واضح ہوگا، جب آپ اسے جاننے کے لیے ایک حقیقی اجتماعی اناہ پیدا کر لیں گے۔“ ۱۳

اقبال اس پورے مسئلے کو بین الاقوامی تناظر میں بھی دیکھتے تھے۔ ان کے خطبے کا گہری نظر سے مطالعہ کیجیے، تو معلوم ہوگا کہ وہ ہندوستان کو مسلم اور ہندو خطوں میں تقسیم کر کے پر امن بقائے باہمی کی صورت پیدا کر کے دونوں میں تعاون کی راہیں بھی کھولنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ مسلم انڈیا کے قدرتی ثقافتی روابط وسطی ایشیا اور مغربی ایشیا کے مسلمان خطوں کے ساتھ ہوں گے اور ہندو انڈیا کے مشرقی ایشیا کے ساتھ اور اس طرح برعظیم ہندوستان ایشیا کے دو حصوں کے درمیان ایک پل کا کام دے گا اور یوں ایشیا کے بھی بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ پس وہ صرف شمال مغربی ہند میں دلچسپی نہیں لیتے تھے،

بلکہ ان کی دلچسپی پورے ہندوستان پر مرکوز تھی اور وہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسا کردار تجویز کرتے تھے، جو صرف مسلمانوں کے لیے نہیں پورے برعظیم کے لیے مفید ہو اور اس کے ذریعے سے پورے ایشیا کے لیے بھی۔ اس سلسلے میں خطبہ "الہ آباد کا یہ اقتباس خصوصی اہمیت کا حامل ہے :

”ہندوستان کی تاریخ کا موجودہ بحران تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان قوم مکمل طور پر منظم ہو اور وہ مقصد اور ارادے کے اتحاد سے بہرہ ور ہو۔ اس سے قوم کے اپنے مفادات بھی وابستہ ہیں اور مجموعی طور پر ہندوستان کے مفادات بھی۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی پورے ایشیا کے لیے لا انتہا مصیبت کا باعث رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل کر رکھ دیا اور اسے مکمل طور پر اپنے اظہار کی مسرت سے محروم کر دیا ہے۔ یہ وہی روح تھی جس نے کسی زمانے میں مشرق کو ایک عظیم اور شاندار ثقافت کا خالق بنایا۔ ہندوستان کی طرف سے ہم پر فرض عائد ہوتا ہے، کیونکہ ہمیں یہیں جینا ہے اور یہیں مرنا ہے۔ اور چونکہ ایک واحد ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی آبادی مسلم ایشیا کے سارے ملکوں کی مجموعی آبادی سے متجاوز ہونے کی وجہ سے اسلام کے لیے ایک بہت بیش قیمت اثاثہ ہے، اس لیے جب ہم ہندوستانی مسئلے پر غور کرتے ہیں تو ہمیں صرف مسامحہ نظر نہ لگنا ہی نہیں بلکہ ہندوستانی مسلم نقطہ نگاہ بھی سامنے رکھنا ہے۔ ہم ایشیا اور ہندوستان کے سلسلے میں ایک معینہ مقصد پر ایک منظم قوت ارادی مرکوز کرنے کے بغیر اپنا

فرض پوری وفاداری سے سرانجام نہیں دے سکتے۔ ،، ۱۴

سچ ہوجھنے تو اقبال نے خطبہ 'اللہ آباد میں برعظیم کے مسئلے کا جو حل تجویز کیا، وہ آس زمانے کے حالات کی روشنی میں ایک خالص سائنسی حل تھا۔ کیونکہ آس میں ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے لیے یہ گنجائش موجود تھی کہ اپنے اپنے خطوں میں اپنے اپنے نظریات کی روشنی میں ایک باعزت زندگی گذاریں اور آن کے درمیان مسلسل رابطے کا ایک ایسا ذریعہ موجود ہو، جس سے ایک فریق دوسرے فریق کے معاملات میں مداخلت نہ کر سکے۔ بلکہ دونوں کے درمیان خبر سگالی کے مراسم قائم ہوں اور جہاں تک پورے ہندوستان کے دفاع کا تعلق تھا، دونوں ایک دوسرے کے لیے دست و بازو کا کام دیں اور یہ خطہ، یہ برعظیم پورے براعظم ایشیا میں ایک اہم کردار ادا کر سکے۔ اور یہ منصوبہ ایک ایسے مفکر اور فلسفی نے پیش کیا تھا، جس نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے خطبے کے آغاز میں یہ اعلان کیا کہ "میں کسی پارٹی کا قائد نہیں ہوں اور میں کسی قائد کے پیچھے نہیں چلتا۔" یہ ہندوؤں کی بدنصیبی تھی کہ وہ اس خطبے کی روح تک نہ پہنچ سکے اور حالات کو اتنا بگاڑنے چلے گئے کہ آخر کار ہندوؤں اور مسلمانوں کے راستے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو گئے۔

حوالے

۱ - History of the Idea of Pakistan - حوالوں اور اقتباسات کے لیے

ساتواں باب دیکھیے۔

۲ - Thoughts and Reflections of Iqbal - ص ۱۶۲ -

۳ - ایضاً - ص ۱۶۳ -

- ۴ - ایضاً - ص ۱۶۷ -
- ۵ - ایضاً - ص ۱۶۸ -
- ۶ - ایضاً - ص ۱۶۹ -
- ۷ - ایضاً - صفحات ۱۷۰-۱۷۱ -
- ۸ - ایضاً - ص ۱۷۳ -
- ۹ - ایضاً - ص ۱۷۱-۱۷۲ -
- ۱۰ - ایضاً - ۱۸۱ -
- ۱۱ - ایضاً - ص ۱۸۳ -
- ۱۲ - ایضاً - ص ۱۹۳ -
- ۱۳ - ایضاً - ص ۱۹۳ -
- ۱۴ - ایضاً - ص ۱۹۲-۱۹۳ -



اکیسواں باب

خطبہ اللہ آباد کا فوری ردِ عمل

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خطبہ اللہ آباد کا فوری ردِ عمل کیا ہوا؟ اس سے انگریزوں نے کیا تاثر لیا؟ ہندوؤں نے اسے کس رنگ میں دیکھا؟ اور مسلمانوں کی رائے عامہ پر اس کا کیا اثر ہوا؟

سب سے پہلے انگریزوں کا تاثر بیان کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ بعض ہندوستانی اور مغربی مصنفین کو ابھی تک یہ وہم ہے کہ پاکستان برطانیہ کی شہ پر قائم ہوا۔ یا علامہ اقبال نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے خطبہ اللہ آباد میں شمال مغربی ہند کی ریاست بنانے کا مطالبہ کیا۔ اس نظریے کی تردید دو قسم کی شہادتوں سے ہو سکتی ہے۔ اول: دستاویزی شہادت۔ دوم: فرائضی شہادت۔ پہلے دستاویزی شواہد ملاحظہ ہوں۔ اقبال نے ۲۹ دسمبر ۱۹۰۳ء کو خطبہ ارشاد فرمایا۔ بمبئی کے اخبار ”انڈین ڈیلی میل“ کے نامہ نگار مقیم لندن جناب ایف۔ ڈبلیو۔ ولسن نے ۳۱ دسمبر کو جو برقیہ بھیجا، اس میں بیان کیا کہ ”داکٹر اقبال کے خطبہ صدارت پر وزیر اعظم برطانیہ جناب ریمزے میکڈونلڈ نے حد ناراض ہوتے ہیں۔“ اللہ آباد کے مشہور اخبار ”لیڈر“ کے نامہ نگار لندن نے لکھا:

”فیلڈرل حکومت کے تصور اور اس کے حق میں ہندوستانی رہنماؤں کے خیالات و نظریات پر سر محمد اقبال نے جو حملہ کیا ہے، اس کے خلاف

نہ صرف برطانوی ، بلکہ ہندوستانی حلقے بھی غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ ۲

یہی نہیں ، برعظیم کے دو مؤثر اینگلو انڈین اخباروں نے اپنے اداروں میں علامہ اقبال کی تجویز کو رجعت پسندانہ ، ناقابل عمل اور نامناسب قرار دیا۔ ان میں سے ایک ”پاؤنیر“ تھا۔ دوسرا ”ٹائمز آف انڈیا“۔ یہ حقیقت پر کوئی جانتا ہے کہ اینگلو انڈین اخبار ہمیشہ سامراج کے ناقوسِ خصوصی بنے رہے اور انہوں نے اپنا یہ کردار ۱۹۴۷ء تک جاری رکھا۔

اب ہم قرائنی شہادت کی طرف آتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہوتا کہ تصورِ پاکستان انگریز کے نہاں خانہٴ دماغ کی آبیج تھا ، تو وزیراعظم برطانیہ کیوں ناراض ہوئے؟ برطانوی حلقے غصے میں کیوں آئے؟ سامراج کے پاسبان اخباروں نے اس کی مذمت کیوں کی؟ خاموش کیوں نہ رہے؟ اور اگر برطانیہ مسلمانوں کے عشق میں اتنا ہی مبتلا تھا اور علامہ اس کی کٹھ پتلی بننے کو تیار تھے تو آخر کیا وجہ ہے کہ علامہ اقبال کو پہلی گول میز کانفرنس میں مدعو نہ کیا گیا؟

پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ برعظیم کے اندر جب غیر مسلموں نے خطبہٴ الہ آباد پر نکتہ چینی کی تو آیا کسی نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ اقبال نے سامراج کے اشارہٴ چشم و ابرو پر رقص کیا۔ اس کے لیے ہمیں غیر مسلموں کی آراء کا جائزہ لینا ہوگا۔ لاہور کے ہندو روزنامہ ”ٹریبیون“ نے خطبہٴ الہ آباد پر شدید نکتہ چینی کی اور اپنے ترکش سے یہ تیر نکال کر اپنی طرف سے بڑا تیر مار لیا کہ چونکہ اقبال کو گول میز کانفرنس میں نہیں بلایا گیا ، اس لیے انہوں نے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ پہلے کانفرنس کے مسلمان مندوبین کو تار بھیجا۔ جس میں چند شرائط کے تحت

مخلوط انتخاب قبول کرنے کے خلاف احتجاج کیا اور اس کے بعد خطبہ
 الہ آباد کے ذریعے سے ہندو مسلم سمجھوتے کے امکان کو تارپیڈو کر دیا
 اور یوں نیشنلزم کی لٹیا ڈبو دی ۔ ۳

لاہور میں ہندوؤں کے سارے آردو روزناموں نے اقبال پر ڈالیوں کی
 بوجھاڑ کر دی ۔ سب سے کثیر الاشاعت اخبار ”پرتاب“ نے ایک مضمون
 چھاپا جس کا عنوان تھا ”شہلی ہند کا ایک خوفناک مسلمان ۔ ڈاکٹر اقبال
 کی گستاخیوں پر چند خیالات“ ۔ اس میں علامہ کے بارے میں ”جنونی ۔
 شر انگیز ، احمقانہ ، خوفناک ، زہریلا ، تنگ خیال ، پست نظر ، متعصب ،
 قابل نفرت ، کمینہ اور نالائق“ کے الفاظ کا استعمال کیے گئے ، جو ”انقلاب“
 کے حوالے سے بسم تک پہنچے ۔ کیونکہ ہندو اخباروں کے فائل ہماری
 دسترس سے باہر ہیں ۔ ہندوؤں نے برعظیم کے طول و عرض میں حضرت
 علامہ کے خلاف جو مہم چلائی ، اس کی ہمہ گیری کا اندازہ کرنے کے لیے
 ”انقلاب“ کے ایک افتتاحیے سے اقتباس پیش خدمت ہے :

”حضرت علامہ اقبال کے خطبہ“ صدارت سے ہندو دنیا میں جو
 بلچل برپا ہوئی ، اس سے قارئین کرام اچھی طرح آگاہ ہیں ۔
 شاید ہی کوئی گویا ہندو زبان ہو ، جس نے اس خطبے کے
 خلاف نہایت ناپاک سے ناپاک انداز میں زہر افشانی و زہر ریزی
 نہ کی ہو ۔ اور شاید ہی چند آئی سیدھی اکیریں لکھنے والا
 کوئی ہندو باتو ہو ، جس نے اس خطبے کو ابھی مسموم اور
 قابل صد نفرتین جلالی کا ٹھنڈا مشق نہ بنایا ہو ۔ بلکہ ہم
 کہتے ہیں کہ غالباً حضرت سلطان محمود غزنوی اور حضرت
 عالمگیر اعظم کے خلاف بھی ہندو قوم نے اس بوار ، اس
 تسلسل ، اس جھاڑ اور اس ہمہ گیری کے ساتھ فتنہ پردازیاں

نہیں کہیں ، جن کا مرکز و مرجع حضرت علامہ اقبال کے خطبہٴ صدارت کو بنایا گیا۔ ہندوستان کے شمال ، ہندوستان کے جنوب ، ہندوستان کے مشرق اور ہندوستان کے مغرب میں جہاں کہیں کوئی ہندو بول یا لکھ سکتا تھا ، اس نے خطبہٴ مذکورہ کی انتہائی مذمت میں اس درجہ مستعدی سے کام لیا کہ شاید حکومت انگلشیہ سے آزادی حاصل کرنے میں بھی آج تک ایسی مستعدی کا اظہار نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ جو ہندو ولایت میں بیٹھے تھے ، وہ بھی اس طرح مضطرب ہو کر مخالفت کے میدان میں آئے کہ گویا علامہ اقبال کے خطبے نے ان کے ہاتھ سے وہ چیز چھین لی ہے ، جسے وہ خالصتاً اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔“

اس تمام مہم کے دوران میں ہر قسم کی گالیاں دی گئیں ، بہتان تراشی کی گئی ، لیکن بدترین دشمن نے بھی یہ نہ کہا کہ اقبال نے علیحدہ اسلامی ریاست کا تخیل انگریزوں کی منہ پر پیش کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندو خود برطانوی سامراج کی گود میں بیٹھے تھے اور سامراج سے ان کا گٹھ جوڑ تھا نہ کہ مسلمانوں کا۔

ہندوؤں میں صرف ایک شخص تھا ، جس نے خطبے کا تجزیہ ایک ذہین انداز میں کیا لیکن اس نے اپنے اصل نام کا انکشاف نہ کیا۔ بلکہ ”ایک روشن خیال ہندو“ کا قلمی نام اختیار کیا۔ اس نے ”ٹائمز آف انڈیا“ میں ایک مضمون کے دوران میں لکھا کہ اقبال کی دلیل خاصی وزنی ہے۔ کیونکہ مجوزہ فیڈرل ڈھانچے میں دیسی ریاستوں کی شمولیت سے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی پوزیشن پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ ان حالات میں اقبال کی یہ تجویز ہمدردانہ توجہ کی مستحق ہے کہ

شمال مغرب میں ایک ایسی ریاست قائم کر دی جائے ، جس میں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہو۔ مقالہ نگار نے ہندوؤں کو سمجھایا کہ اگر سندھ ، سرحد اور بلوچستان الگ الگ صوبے بنے تو ان میں ہندوؤں کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ ان صوبوں میں نہایت معمولی اقلیت ہیں۔ لیکن اگر ان تین صوبوں کو پنجاب کے ساتھ ملا کر ایک شمال مغربی مسلم ریاست بن جائے ، تو اس میں ہندو ایک مضبوط اقلیت ہوں گے اور اگر وہ سکھوں کے ساتھ تعاون کریں تو وہ ایک بڑی طاقت بن جائیں گے۔ اس لیے ہندوؤں کو اس تجویز پر خواہ مخواہ مشورہ نہیں ہونا چاہیے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خود مسلمانوں میں خطبے کا رد عمل کیسا تھا؟ جہاں تک مسلمانوں رہنماؤں کا تعلق تھا ، وہ خاموش رہے۔ انہ آباد میشن میں بھی اور اس کے بعد بھی اس خاموشی یا اغماض کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ ، کہ گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے مندوبین کی عدم موجودگی میں خطبے پر تبصرہ مناسب نہ سمجھا گیا ہو۔ یا اپر انڈیا مسلم کانفرنس کی تجویز سے مسلم اقلیتی صوبوں میں اقبال کے خلاف جو تصعب پیدا ہوا تھا ، وہی خاموشی کا باعث ہوا ہو۔ اگر مسلمان رہنماؤں میں کوئی رد عمل ہوا تو وہ مخالفانہ تھا۔ اس سلسلے میں، میڈ نذیر نیازی کی روایت ہے کہ ۱۹۳۱ء کی ابتداء میں دہلی کے ایک محفل میں مختلف خیال لوگ جمع تھے۔ ”ان میں وہ حضرات بھی تھے ، جنہوں نے خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں حصہ لیا تھا اور تبدیلی حالات کے باوجود اپنے مسلک پر قائم تھے۔ اور وہ بھی جو کانگریس کے ہم خیال یا لیگ کے ساتھ تھے۔ دووان گفتگو میں کسی نے کہا۔ ارے صاحب! آپ نے وہ اقبال کا خطبہ سنا دارت بھی پڑھا۔ واللہ کیا خوب شاعری کی ہے۔ آخر شاعر ہی تو ہیں۔ ایسی غزل کہہ گئے

ہیں۔ اس پر بڑے زور کا تقہمہ پڑا۔“ ۶

ایک طرف برطانیہ مخالفت کر رہا تھا، دوسری طرف ہندوؤں نے زبردست پروپیگنڈہ مہم شروع کر رکھی تھی اور تیسری طرف مسلمان رہنا چپ چاپ حالات کا تماشا فرما رہے تھے۔ ایسے میں اقبال کی مدد کو پہنچے تو مسلمان اخبار، جن میں ”انقلاب“ سر فہرست تھا۔ جس نے جنوری ۱۹۳۱ء میں کم و بیش ایک درجن مقالات افتتاحیہ خطبے کے حق میں شائع کیے۔ اس اخبار نے ایک مقالے میں یہ موقف اختیار کیا کہ تقسیم کی تجویز اصلاً ہندو حلقوں سے ابھری تھی۔ سب سے پہلے لالہ لاجپت رائے نے کہا تھا کہ شمالی ہند کے ہندو وسطی اور جنوبی ہند کو منتقل ہو جائیں اور ان علاقوں کے مسلمان شمالی ہند کو اپنا قومی وطن بنا لیں۔ ہندوؤں کے رہنا بھائی پرمانند نے بھی ایسی ہی تجویز پیش کی تھی۔ اور خطبہ الہ آباد سے چند روز پہلے دیسی ریاستوں کے امور میں مہارت رکھنے والے پروفیسر جی۔ آر۔ ابھیانکر نے برعظیم کو تین حصوں میں بانٹنے کا تصور پیش کیا تھا۔ ایک، ریاستی ہندوستان۔ دوسرا، مسلم ہندوستان۔ تیسرا، ہندو ہندوستان۔ ”انقلاب“ نے پوچھا، آخر اقبال کو ایسی تجویز پیش کرنے کا حق کیوں حاصل نہیں؟

دو دن بعد ایک اور افتتاحیے میں ”انقلاب“ نے لکھا کہ اگر ہندوؤں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ محض غالب اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو نظر انداز کر دیں اور ہندو راج کے لیے سعی کریں تو یقیناً مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک ایسے خطے میں مسلم نیشنل سٹیٹ کو اپنا نصب العین بنائیں، جہاں کی آبادی میں انہیں اسی فی صد اکثریت حاصل ہے۔ ”انقلاب“ نے بعض لوگوں کی اس تجویز کا تذکرہ کیا کہ ہندو مسلم مسئلہ لیگ آف نیشنز (جمعیت اقوام) سے حل

کرا لیا جائے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر یہ لوگ جمعیتِ اقوام کے اصولِ حقِ خود ارادیت کے واقعی قائل ہیں، تو بے شک اس جماعت سے پوچھ لیں کہ اسی فی صد مسلم اکثریتی علاقے کو ایک مسلمان حکومت کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ ۸

ایک اور افتتاحیے میں ”انقلاب“ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر اقبال کی تجویز کے مطابق شمالی ہند کے مسلمانوں کا حق آزادی تسلیم کر لیا جائے، تو سارے ہندوستان میں مکمل امن کی ضمانت حاصل ہو جائے گی کیونکہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے منطقوں میں امن اور خوشحالی کی زندگی بسر کریں گے۔ لیکن اگر ہندوؤں نے برطانیہ کی حکمران اتھارٹی کے ساتھ مل کر سازش کر لی اور اپنی مرضی کا سیاسی ڈھانچہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو مسلمان اسے ایک دن کے لیے بھی زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اس کا نتیجہ ایک غیر محتم خانہ جنگی کی صورت میں نکلے گا اور یقیناً یہ چیز ہندوؤں کے لیے زیادہ خوشگوار نہیں ہوگی۔ ۹

چند دن بعد اسی اخبار نے ایک طویل افتتاحیے کے آخر میں اقبال دو یوں خراجِ تحسین ادا کیا :

”حق کی آواز بلند ہو چکی ہے۔ باطل کے قلعے پر آخری ضرب پڑ چکی ہے۔ ہندو قوم کے معاندانہ منصوبوں کا حصار ٹوٹ چکا ہے۔ خدا آس مبارک ہستی دو سلامت رکھے، جس کے پرہیزگار میں سب سے پہلی مرتبہ راہ گم شدہ اور قومیت و جمہوریت کے فریب کارانہ دعاوی سے مسحور ملت کے لیے ہدایت کی حقیقی روشنی کا بندوبست لیا۔ خدا دو منظور ہوا تو یہ روشنی زندگی کی صحیح منزل مقصود تک امتیاز ہند کی رفیق رہے گی۔“ ۱۰

”مسلم آؤٹ لک“ اور ”سیاست“ کے فائل نایاب ہیں۔ لیکن شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں اخباروں نے علامہ کی پوری تائید کی ہوگی۔ کیونکہ ”مسلم آؤٹ لک“ کے مدیر مجید ملک اور ”سیاست“ کے مدیر سید حبیب اس دور کی مجوزہ اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے داعیوں میں شامل تھے۔ لکھنؤ میں روزنامہ ”ہمدم“ نے اقبال کے حق میں ایک افتتاحیہ چھاپا، جس کا ایک اقتباس یہ ہے :

”اس حقیقت کو سائمن کمشن نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ ہندوستان ایک ایسا براعظم ہے جس میں انسانی گروہوں کی مختلف نسلیں آباد ہیں۔ جن کی معاشرت مختلف ہے، جن کی زبانیں مختلف ہیں، جن کی روایات مختلف ہیں۔ ایک خاص تمدنی قوت کے اعتبار سے اس ملک میں اسلام کی زندگی اسی پر منحصر ہے کہ اسے ایک خاص علاقے میں ایک مرکز پر جمع کر دیا جائے۔ لہذا اقبال کا یہ مطالبہ نہایت حق بجانب ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند کے قیام کا موقع ملنا چاہیے اور اس کی بہترین تشکیل اس صورت سے ہو سکتی ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد سلطنت قائم کر دی جائے۔ حق یہ ہے کہ ہندو مسلم تنازعات کا یہ بہترین حل ہے اور اس قابل ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمان متحد ہو کر اس کے لیے جدوجہد کریں اور اپنی قوتِ عمل کا مظاہرہ کر کے اس کو حاصل کر کے چھوڑیں۔“

آہستہ آہستہ مسلم رائے عامہ متاثر ہونے لگی۔ کلکتے سے تین مسلمان طلبہ

راغب احسن ، فضل رسول خان آفریدی اور ایس۔ ایم۔ سلیم نے ایک مشترکہ بیان میں خطبے کی تائید کرتے ہوئے یہ تجویز بھی پیش کی کہ اس تحریک کے علمی اور ذہنی پہلوؤں پر کتابیں اور کتابچے چھاپنے کے لیے ایک "مسلم نصب العین فنڈ" کھولا جائے۔ اللہ آباد کے ایک وکیل جناب عبدالرب اور لاہور کے خان غلام مصطفیٰ خان تائب نے خطبے کے حق میں مضامین لکھے اور سب سے بڑے کر یہ ، کہ لاہور میں اپر انڈیا مسلم کانفرنس کا چرچا زیادہ ہونے لگا۔ اور سندھی مسلمانوں کے ناسور رہنا حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون بھی خطبے اور اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے حق میں کام کرنے لگے۔ پنجاب کے مسلمان اخباروں میں کانفرنس کا ذکر مارچ ، اپریل ۱۹۳۷ء تک آتا رہا۔ اس کے بعد خاموشی ہو گئی اور کانفرنس نہ ہو سکی۔ سید نذیر نیازی کے نام ایک مکتوب میں علامہ نے ۱۹ اپریل ۱۹۳۷ء کو لکھا کہ "اپر انڈیا کانفرنس کا جلسہ بھی انشاء اللہ ہونا۔" نذیر نیازی ہی کے بیان کے مطابق یہ کانفرنس ۱۹۳۷ء میں بھی اقبال کے شہن میں موجود تھی اور انہوں نے موصوف سے کہا ، "التصور کرو۔ تمہیں عقربہ معلوم ہو جائے گا میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔" ۱۳ اپریل ۱۹۳۷ء نذیر نیازی کے اس بیان کی صحت میں بھی شک و شبہ کی جگہاں کیجیٹس نہیں تھیں۔ اقبال اس وقت کے شمال مغربی ہندوستان میں ایک خاص سیاسی جماعت تھیں، حزب جمہور یا حزب عوام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے منادات کو باقی ہندوستان کے مسلمانوں کے منادات سے مختلف ہونے کی بنیاد پر الگ کانفرنس کے منادات کیجئے، ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن نذیر نیازی کا یہ بیان بالکل طور پر درست ہے نہ علامہ نے خطبہ اللہ آباد کے بعد اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد اور اس خطبے کے لیے الگ سیاسی جماعت کے قیام کا فیصلہ کیا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۷ء ایک

گذشتہ باب میں اخباری رپورٹوں کی بنیاد پر یہ بتا چکے ہیں کہ اہر انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلس استقبالیہ خود حضرت علامہ کی صدارت میں نومبر ۳۰ء ہی میں بن چکی تھی اور وہ اس سلسلے میں تعاون کی اپیل بھی کر چکے تھے۔

یہ حیرت کی بات ہے کہ خطبہ اللہ آباد پر ہندوستان گیر یورش ہوئی۔ علامہ کے حامیوں نے میدان میں آ کر مخالفین کے دانت کھٹے کیے۔ لیکن خود علامہ اس بارے میں کافی عرصے تک خاموش رہے۔ شاید اس لیے، کہ خطبہ اللہ آباد میں انہوں نے اپنی ”ذاتی رائے“ کا اظہار کیا تھا اور وہ اسے قومی مطالبات سے غلط ملط نہیں کرنا چاہتے تھے یا شاید اس لیے، کہ دوسری گول میز کانفرنس کی آمد آمد تھی اور ایک بار پھر مسلمانوں کی صفوں میں ”کچھ لو اور کچھ دو“ کی بنیاد پر مفاہمت کی بات چیت ہو رہی تھی۔ بلکہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں بھی تبادلہ خیالات ہو رہا تھا اور علامہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی تجویز کی آڑ لے کر مخالفین ”جناح کے چودہ نکات“ پر غور کرنے ہی سے انکار کر دیں۔ اور اس خاموشی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ علامہ کی تجویز کے حق میں اسلامی صحافت نے تو بہت کچھ لکھا لیکن مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے کسی رہنما نے تائید کی زحمت گوارا نہ کی۔

بہر حال علامہ کا سکوت اکتوبر ۳۰ء میں اس وقت ٹوٹا، جب وہ دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے۔ بات یہ ہوئی کہ برطانیہ کے روزنامہ ”دی ٹائمز“ میں ایک افتتاحیہ ”ہندوستانی اقلیتیں“ کے عنوان سے ۲۹ ستمبر کو شائع ہوا۔ اس کا اصل متن ہمارے سامنے نہیں لیکن ۳ اکتوبر کو ایک پروفیسر ایڈورڈ تھامپسن کا جو مکتوب

اس بارے میں چھپا ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افتتاحیہ نگار نے ”اتحادِ اسلامی یا بین‌الاسلامیہ کی سازش“ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ پروفیسر موصوف نے اس کے لیے علامہ کو ذمہ دار ٹھہرایا اور ان کے خطبے سے وہ اقتباس پیش کیا ، جس میں انہوں نے شمال مغربی ہند میں مسلم ریاست کی تشکیل کے سلسلے میں اپنی ذاتی رائے پیش کی تھی۔ پروفیسر نے لکھا : ”میں شمال مغربی ہند میں مسلمانوں کے فرقہ واریتوں کے قیام کے خلاف کوئی دلیل نہیں دے رہا۔ لیکن سر محمد اقبال جو مطالبہ کر رہے ہیں ، وہ یہ ہے کہ ہندوستانی فیڈریشن کے اندر یا باہر (ان صوبوں کی) کنفیڈریشن بن جائے۔ اب نقشہ دیکھیے اور یہ اندازہ کیجیے کہ باقی ہندوستان کے لیے کس قسم کی قابلِ دفاع سرحد رہ جائے گی۔“ ۱۶ اس مکتوب کا مقصد یہ تھا کہ دوسری گول میز کانفرنس کے مذاکرات کے دوران میں مسلمانوں کا کیس کمزور کیا جائے۔ اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پروفیسر ایدورد تھامپسن مدتوں ہندوستان میں رہے تھے ، ہندوستانی رہنماؤں سے ان کے تعلقات تھے ، رابندر ناتھ ٹیکور کے مداحوں میں سے تھے اور ان دنوں آکسفورڈ میں انڈین سول سروس کے پرویشنرز کو بنیادی زبان پڑھاتے تھے۔

اس کے جواب میں ”دی ٹائمز“ کے ۱۲ اکتوبر کے شمارے میں علامہ کا ایک مکتوب چھپا۔ جس میں انہوں نے کہا کہ میرے خطبے سے یہ اقتباس بلااجازہ سیاق و سباق دے دیا گیا ہے کہ ”میں پنجاب ، شمال مغربی سرحدی صوبہ ، سندھ اور بلوچستان کو ملحد کر کے ایک واحد ریاست کی صورت میں دیکھنا پسند کروں گا۔ خود اختیاری حکومت سمرو برطانیہ کے اندر ہو یا باہر ، ایک مضبوط شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل مجھے کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی آخری منزل نظر آتی ہے۔“ علامہ نے مکتوب کے جواب میں لکھا :

”میں ڈاکٹر تھامپسن کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے قلمروِ برطانیہ کے باہر ایک مسلم ریاست کا مطالبہ نہیں کیا۔ بلکہ محض ایک قیاس پیش کیا ہے کہ جو زبردست قوتیں اس وقت ہندوستانی برعظیم کی تقدیر بنا رہی ہیں، آنے والے مدہم مستقبل میں اس کا ممکنہ نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ کوئی صحیح الدماغ ہندوستانی مسلمان برطانوی دولتِ مشترکہ سے باہر شمال مغربی ہند میں ایک یا ایک سے زیادہ مسلم ریاستوں کے قیام کو عملی سیاست کے منصوبے کی حیثیت سے زیرِ غور نہیں لاتا ہے۔“

اس کے بعد اقبال نے کہا کہ میں نہرو رپورٹ اور سائمن رپورٹ کے تجویز کردہ خطوط پر ہندوستان میں صوبوں کی ایک ایسی از سر نو تقسیم چاہتا ہوں، جس سے ہر صوبے میں کسی ایگ یا دوسری قوم کو مؤثر اکثریت حاصل ہو۔ اور اقبال نے لکھا :

”درحقیقت مسلمان صوبوں کے بارے میں میری تجویز محض اسی تصور کو آگے بڑھاتی ہے۔ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر مطمئن اور اچھی طرح منظم مسلمان صوبوں کی ایک قطار ایشیائی کوہستانوں کی بھوکی نسلوں کے خلاف ہندوستان اور قلمروِ برطانیہ کے لیے ایک فصیل کا کام دے گی۔“ ۱۷

اگر خطبہء الہ آباد کا وہ تجزیہ پیش نظر رکھا جائے جو گذشتہ باب میں پیش کیا جا چکا ہے، تو اقبال کی ان تاویلات میں کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا۔

حوالے

۱۔ ”انڈین ڈیلی میل“۔ یکم جنوری ۱۹۳۱ء۔

- ۲ - ”لیڈر“ اللہ آباد - ۳ جنوری ۱۹۳۱ء -
- ۳ - ”ٹریبیون“ - یکم جنوری ۱۹۳۱ء -
- ۴ - ”انقلاب“ - ۱۷ جنوری ۱۹۳۱ء -
- ۵ - اس مضمون کا ترجمہ ”انقلاب“ میں چھپا تھا -
- ۶ - ”مکتوباتِ اقبال“، ص ۵۵ -
- ۷ - ”انقلاب“، ۷ جنوری ۱۹۳۱ء -
- ۸ - ایضاً - ۹ جنوری ۱۹۳۱ء -
- ۹ - ایضاً - ۱۱ جنوری ۱۹۳۱ء -
- ۱۰ - ایضاً - ۱۷ جنوری ۱۹۳۱ء -
- ۱۱ - ”ہمدرد“، ۵ جنوری ۱۹۳۱ء -
- ۱۲ - ”مکتوباتِ اقبال“، ص ۵۴ -
- ۱۳ - ایضاً - ص ۶۴ -
- ۱۴ - ایضاً - ص ۵۵ -
- ۱۵ - ایضاً - ص ۶۳ -
- ۱۶ - Letters and Writings of Iqbal - ص ۱۱۷-۱۱۸ -
- ۱۷ - ایضاً - صفحات ۱۱۹-۱۲۰ -



٤

بائیسواں باب

بھوپال کانفرنس ، تحریک کشمیر کا آغاز اور پین اسلامزم

۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو پہلی گول میز کانفرنس ختم ہو گئی۔ رادھر ہندوستان میں اہم واقعات رونما ہوئے۔ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی جو تحریک چلا رکھی تھی، اس کے بارے میں وائسرائے لارڈ ارون اور گاندھی جی کے درمیان طویل مذاکرات ہوئے۔ آخر ایک مفاہمت ہو گئی۔ جسے گاندھی - ارون معاہدے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گاندھی جی نے چند معمولی مراعات کے بدلے تحریک بند کر دی۔ اگر مراعات کو دیکھا جائے تو اس میں کانگریس کو جیت نہ ہونی، لیکن اس معاہدے کے نفسیاتی اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لوگوں میں یہ عام تاثر پیدا ہوا کہ حکومت کو جھکنا پڑا ہے۔ اس سے حکومت کی ماڈل میں کمی ہوئی، گاندھی جی کی سزا میں اضافہ ہوا اور کانگریس کی نمائندہ حیثیت تسلیم کر لی گئی۔

یہ صورتِ حالات مسلمانوں کے لیے خطرناک تھی۔ کیونکہ دوسری گول میز کانفرنس کی آمد آمد تھی اور اس دفعہ اس میں کانگریس کو بھی شریک ہونا تھا اور مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ کانگریس اور برطانیہ کے درمیان کٹھ جوڑ سے ان کی جنگ حقوق متاثر ہوگی۔ اب سیر مسلمانوں میں یہ تحریک اٹھی کہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں اور قومی مطالبات کا ایسا فارمولا تیار کریں، جس پر سب مسلمان جماعتوں کو اتفاق ہو۔ تاہم گول میز کانفرنس میں ان کا متحدہ محاذ بن سکے اور وہ کانگریس اور برطانیہ کے مشترکہ دباؤ کا مقابلہ کر سکیں۔

اس سلسلے میں ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے جلسے ہوئے۔ ۲ مئی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں ایک جلسہ عام ہوا، جس کی صدارت علامہ نے فرمائی۔ آپ نے صدارتی خطبے میں کہا کہ مسلمانوں کے دونوں بڑے گروہوں میں تیرہ مطالبات پر اتفاق رائے موجود ہے۔ صرف چودھویں مطالبے پر اختلاف ہے اور وہ بھی کم ہو رہا ہے۔ مسلم کانفرنس جداگانہ انتخاب مستقل طور پر چاہتی ہے۔ نیشنلسٹ مسلمان کہتے ہیں کہ اگر بالغوں کو ووٹ کا حق دے دیا جائے تو مخلوط انتخاب میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان میں مولانا ظفر علی خان کا فارسولا یہ ہے کہ اس سال کے لیے جداگانہ انتخاب قبول کر لیا جائے اور اس کے بعد اگر بالغوں کو ووٹ کا حق مل جائے تو مخلوط انتخاب راج کر لیا جائے۔ حسب معمول حضرت علامہ نے اس تقریر میں بھی مسلمانوں کو مذہبی فرقہ بندیوں سے بالا ہو کر متحد ہو جانے کی تلقین کی اور آخر میں کہا: ”ابھی آپ کو ایک شدید جنگ میں قربانیاں دینی ہیں اور وہ سرمایہ داری کی لعنت کے خلاف جنگ ہے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ اس کے لیے بھی تیار رہیں۔ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ کوئی دوسری قوم یا انگریز اس کی دست گیری کرے گا تو وہ بدبخت ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ، ورنہ تمہیں کوئی حق نہیں کہ زندہ رہو۔“ ۱

چند دن بعد ۱ مئی کو نواب آف بھوپال نے جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے حامی مسلمان رہنماؤں کی ایک کانفرنس بلائی۔ جس میں حضرت علامہ، سر محمد شفیع، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، جناب تصدق احمد خان شروانی، شعیب قریشی اور دوسرے رہنماؤں نے شرکت کی۔ یہاں کھل کر تبادلہ خیال ہوا۔ مختلف فارمولوں کی جانچ پرکھ ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ تمام ارکان ان فارمولوں کو اپنی اپنی جماعت

کے سامنے پیش کریں اور ان کا عندیہ معلوم کر کے یکم جون کو پھر بھوپال میں جمع ہوں۔ حضرت علامہ نے دو بیان جاری کیے۔ ایک سر محمد شفیع، مولانا شوکت علی اور تصدق احمد شروانی کی معیت میں ۲ اور دوسرا نواب محمد اسماعیل خان کی رفاقت میں ۴۔ دونوں بیانات میں خیر منگالی کے جذبات کارفرما تھے اور آنے والی کانفرنس کے بارے میں ایک رجائی نقطہ نگاہ اختیار کیا گیا تھا اور یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی مفاہمت ہو جائے گی۔ لیکن انہی میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے ذریعے سے یہ خبر نشر ہوئی کہ ڈاکٹر انصاری اور شعیب قریشی شملہ پہنچے، گاندھی جی سے ملاقات کی اور انہیں یہ کہا کہ نواب بھوپال کی بلائی ہوئی کانفرنس میں ایک عارضی معاہدہ ہو گیا۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ جداگانہ انتخاب دس سال تک رہے اور اس کے بعد ہر چھ ماہ کے مجموعی انتخاب کے دور دورہ ہوں۔ حضرت علامہ نے اس بات کو غلط قرار دیا اور کہا کہ جو غیر رسمی مذاکرات ہوئے، انہیں عارضی معاہدے کا نام دینا مناسب نہیں۔ اس جلسہ میں اس سے زیادہ کوئی کارروائی نہیں ہوئی کہ نام نہاد مسلمہ نیشنلسٹوں کو انتخابات کے متعلق آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلوں سے قریب تر لانے کے لیے بعض تجاویز پیش کی گئیں، تاہم یہ لوگ پھر شامل مسلم قوم میں شامل ہونے کے قابل ہو سکیں۔ علامہ نے کہا کہ تجاویز پر کوئی بحث نہیں ہوئی۔ صرف یہ فیصلہ ہوا کہ ان پر کسی معاہدے کا رد عمل معلوم کیا جائے۔ علامہ اس بات پر سخت رنجور ہوئے کہ کانفرنس کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال نہ کیا جائے اور انہیں حالات انہوں نے بھوپال کانفرنس کے مجوزہ دوسرے اجلاس کو ضرر رساں قرار دیا۔ اس طرح بھوپال کانفرنس اپنے مقصد میں ناکام ہو گئی۔

اسی دنوں لاہور میں ایک ہنگامہ اٹھا، جسے مغربی پوزیشن راج لاجی

ٹیشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ مغلیہ پورہ انجینئرنگ کالج کے انگریز پرنسپل کمیٹن وٹیکر سے مسلم طلبہ کا ایک وفد ملا اور اپنی بعض شکایات پیش کیں۔ کمیٹن وٹیکر نہایت فرعون مزاج آدمی تھا۔ اس نے تمام مسلمان قوم کے خلاف اہانت آمیز جملے کہے، جس پر مسلم طلبہ مشتعل ہو گئے اور علامہ اقبال اور دوسرے رہنماؤں سے ملے۔ یہاں سے ایک باقاعدہ ایجی ٹیشن کا آغاز ہو گیا۔ جلسے ہوئے، جلوس نکالے گئے اور کالج کے باہر مسلم طلبہ اور رضا کاروں نے پکٹنگ کی۔ اسی سلسلے میں ۳ جون کو ایک جلسہ عام ہوا جس کی صدارت حضرت علامہ نے فرمائی۔ اس میں پرنسپل کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا اور حضرت علامہ نے اپنے صدارتی خطبے میں مسلمانوں سے ایک بار پھر یہی کہا کہ اگر تم عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو متحد ہو جاؤ۔ انہوں نے بڑے درد اور رقت سے فرمایا: ”تم آج تک اپنی مصیبت کے علاج کے لیے ہزاروں تدبیریں کر چکے ہو۔ اب ایک تدبیر محمد عربی صلعم کی بھی آزماؤ۔ حضور صلعم فرماتے ہیں۔ اتحاد اُستی حجة قاطعة۔ ایک دفعہ اتحاد کر کے دیکھو۔ اگرچہ اب تک کی تمام تدابیر ناکام ثابت ہو چکی ہیں لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کا بتلایا ہوا یہ نسخہ شفا کبھی ناکامیاب نہیں ہوگا۔“ ۵ حکومت نے ایک تحقیقاتی کمشن مقرر کیا۔ لیکن مسلمانوں نے اسے اعتماد کے قابل نہ سمجھا اور ایجی ٹیشن جاری رکھی۔ اس پر حکومت کو جھکنا پڑا۔ چنانچہ کمشن میں مسلمانوں کا ایک اور نمائندہ لیا گیا اور فیصلہ ہوا کہ کمشن کے سامنے یہ معاملات پیش ہوں گے۔ اول: آیا وٹیکر نے وہ الفاظ استعمال کیے، جن سے متاثر ہو کر انسٹھ مسلم طلبہ نے کالج چھوڑنے کی درخواست دی۔ دوم: کیا یہ صحیح ہے کہ وٹیکر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا تھا اور ان کے داخلے میں رکاوٹیں

ڈالتا تھا؟ سوم : آیا داخلے کا اختیار پرنسپل کو رہے یا اس کے لیے کوئی الگ بورڈ مقرر کیا جائے؟ ۳ جولائی ۱۳ء کو مسلمانوں کا ایک اور جلسہ عام ہوا جس میں مولانا داؤد غزنوی اور علامہ اقبال کے مشورے سے ایچی ٹیشن بند کر دی گئی اور فیصلہ ہوا کہ کمشن کے سامنے شہادتیں پیش کرنے کا کام تین دہی سے کیا جائے۔ ۶ کچھ عرصہ بعد یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا اور وٹیکر نے مسلمانوں سے معذرت بھی کر دی۔

گاندھی - ارون سمجھوتے سے ہندوؤں میں قوت کا جو نیا احساس پیدا ہوا، وہ ایک تخریبی سمت میں چل نکلا اور ہندوؤں نے سوچا کہ اب مسلمانوں پر تسلط حاصل کرنا آسان ہو گیا ہے۔ چنانچہ گاندھی نے ایک دفعہ پتھر فسادات کا بازار گرم کیا۔ بنارس، آگرہ اور مرزا پور کے بعد کانپور میں بہت بڑے اور منظم انداز میں مسلمانوں کی تہمتیں لگائی گئیں اور فراہم کیا گیا۔ جس پر علامہ نے ایک بیان جاری کیا جس میں انکشاف دیا کہ بہت سے مسلمانوں کو زندہ جلا یا گیا، ہزاروں مکانات جلا دیے گئے، پیشہ وروں کے آلات ہتھیاروں سے کوٹ کوٹ کر پھاڑ کر ڈال دیے گئے، قرآن حکیم کی بے حرمتی کی گئی اور تیس مسجدیں لٹی ہو چکی تھیں۔ پور بھر مسمار کر دی گئیں۔ علامہ نے دوسرے رہنماؤں کی وفات میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ پنجاب، سرحد اور سندھ میں بہت بڑے بڑے جلسے جمع کر کے کانپور ریلیف فنڈ میں داخل کریں۔ گاندھی کے نام سے ایک سلسلے میں مسلمان حرکت میں نہ آئے تو ہندوؤں کو یہ خیال ہو گیا کہ مسلمانوں کو شہر بہ شہر مار لینا آسان ہے۔ "حدائقِ نبویہ" کے خیال اگر دشمنوں کے دل میں پختہ ہو گیا تو وہ دن پر مسلمان کے لیے مصیبت کا ہوا اور سپین والا نظارہ ہندوستان میں نظر آنا کچھ بعید نہ ہو گا۔

اسی دوران میں تحریک دشمنوں نے نہ صرف آغاز ہو چکا تھا بلکہ

اس کی نہایت سنگین صورت بن چکی تھی۔ اس کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں ڈوگرہ شاہی نے مسلمانوں پر عرصہٴ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ نظم و نسق میں مسلمانوں کا تناسب نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایسے قوانین نافذ تھے جن کی رو سے تبدیلیٴ مذہب اور ذبحِ بقر کی پاداش میں جائداد بھی ضبط کر لی جاتی تھی اور دس سال قید کی سزا بھی دی جاتی تھی۔ جبر و تشدد عام تھا اور اس کا تختہٴ مشق مسلمان تھے۔ ٹیکسوں کا بوجھ ناقابلِ برداشت تھا۔ مسلمانوں میں افلاس عام

تھا۔ صنّاع مسلمان ایک تو اکثر مقروض ہوتے تھے، دوسرے ڈوگرہ شاہی آن کے استحصال میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی۔ ایسے میں چند پڑھے لکھے کشمیری مسلمانوں نے لاہور کے روزنامہ ”انقلاب“ کا سہارا لیا اور اس اخبار کے ذریعے سے مظالم کی طرف رائے عامہ کی توجہ دلانے لگے۔ برعظیم میں مسلمان اپنے سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے تھے، اس سے بھی کشمیری مسلمان متاثر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ آن کے ساتھ کم از کم انسانوں کا ما سلوک تو کیا جائے۔ ”انقلاب“ کے مندرجات نے جموں و کشمیر کے مسلمانوں میں بے چینی کی جولہر دوڑائی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جا بجا ڈوگرہ شاہی کے خلاف جلسے ہونے لگے۔ جموں میں ایک ہندو سپاہی نے قرآنِ کریم کو زمین پر دے مارا، اس سے اشتعال بڑھا۔ اتنے میں مہاراجہ کشمیر نے ”انقلاب“ کا داخلہ ریاست میں بند کر دیا۔ اس نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ سری نگر کی خانقاہِ معلیٰ میں ایک لاکھ مسلمانوں کا اجتماع ہوا جس میں صوبہٴ سرحد کے ایک شخص عبدالقدیر نے نہایت جوشیلی تقریر کی۔ جلسے کے فوراً بعد پولیس نے اسے گرفتار کر لیا اور ہری پربت جیل میں بند کر دیا۔ اس پر ہزارہا مسلمانوں نے جیل پر حملہ کر دیا۔ پولیس نے نہایت سنگ دلی کے ساتھ گولی

چلائی - بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہوئے - اس کے باوجود کشمیری مسلمانوں کا حوصلہ نہ ٹوٹا - انہوں نے سری نگر کے بازاروں میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا اور اس طرح یہ تحریک چل نکلی -

آن دنوں ریاست جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی کوئی ہمہ گیر تنظیم موجود نہیں تھی - جموں میں بعض مسلمان نوجوانوں نے بینک مین مسلم ایسوسی ایشن قائم کر رکھی تھی - جس کے رہنما چودہری غلام عباس تھے - یہ جماعت نہایت امن پسندانہ سرگرمیوں میں مصروف تھی - دوسری طرف سری نگر میں شیخ محمد عبداللہ اور آن کے چند ساتھیوں نے مسلم ریڈنگ روم قائم کر رکھا تھا - تاکہ مسلمانوں میں اخبار پھنی کا ذوق بڑھے - ڈوگرہ شاہی نے چودہری غلام عباس ، شیخ عبداللہ ، میر واعظ محمد یوسف شاہ ، خواجہ غلام احمد عشائی ، مولوی محمد سعید اور بے شمار دوسرے کارکنوں کو گرفتار کر لیا - یہی نہیں ، مارشل لا بھی نافذ کر دیا گیا - جا بجا ٹکٹکیاں لگ گئیں ، جن پر باندھ کر کشمیری مسلمانوں کو تازیانے لگانے گئے -

اس صورتِ حالات پر برعظیم کے مسلمانوں نے زبردست احتجاج کیا - اور پنجاب کے مسلمان تو بے حد متاثر اور مضطرب تھے - اس پر حضرت علامہ نے دوسرے مسلمان رہنماؤں کی معیت میں مسلمانوں کے نام پر ایک جاری کی کہ وہ ۳۱ اگست ۱۹۴۷ کو یومِ کشمیر منائیں - اب سے کہہ دو : "مسلمانو! بے در پے حملے کر کے تمہارے دشمن کو اب یہ گمان ہو گیا ہے کہ مسلمان ایک مردہ قوم ہے - اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لیے آپ ۵۱۰ فرض ہے کہ یومِ کشمیر کو لاسیاب بنائیں اور دشمن پر عملاً ثابت کر دیں کہ آپ ظلم و تعدی کو برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں - ۸۰۰۰

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور کے مسلمانوں نے ایک عظیم الشان جلوس نکالا اور اس کے بعد ایک جلسہ عام کیا ، جس کی صدارت حضرت علامہ نے فرمائی ۔ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ نکات پیش کیے :

اول : مسلمانانِ کشمیر کی تحریک نہ بغاوت ہے نہ اسے ہندو مسلم فساد کا نام دیا جا سکتا ہے ۔

دوم : یہ تحریک جائز مطالبات کے لیے شروع کی گئی ہے ۔ ڈوگرہ شاہی سے مسلمانوں ہی کو نہیں ، کشمیری ہندوتوں کو بھی شکایت ہے ۔ وہ میرے پاس آئے تھے ، میں نے انہیں مشورہ دیا کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر متحدہ مطالبات پیش کریں ۔

سوم : حکومتِ کشمیر نے جو تحقیقاتی کمشن مقرر کیا ہے ، مسلمان اس کی ہئیتِ ترکیبی سے مطمئن نہیں ہیں ۔ اس لئے انہوں نے اس کا مقاطعہ کر رکھا ہے ۔ کمشن اس بے کار مشغلے میں مصروف ہے کہ اس تحریک کو ایک ساڑھس قرار دے ۔

چہارم : ”حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک کا اثر اہلِ کشمیر پر بھی ہونا لازمی تھا ۔ چنانچہ وہ بھی اپنے پڑوسیوں کی حالت سے متاثر ہو کر بیدار ہو گئے ۔ زمانہ خود لوگوں کو بیدار کر رہا ہے اور کشمیر میں عرصے سے جو مظالم برپا ہیں ، ان کی موجودگی میں ضروری تھا کہ وہاں کی رعایا بھی اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرتی ۔“

اس جلسے میں جناب سید محسن شاہ نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ اخبار کیسری نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کشمیر کے وزیراعظم بننا چاہتے ہیں اور میں جج بننے کا آرزومند ہوں ۔ اس پر علامہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ۔ ”میں ایسے حاکم کی وزارت پر لعنت بھیجتا ہوں ۔“ ۹

معاملات کی نزاکت کے پیش نظر رائے عامہ کے نمائندوں نے ایک جماعت قائم کی جس کا نام آل انڈیا کشمیر کمیٹی تھا۔ اس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود احمد تھے اور حضرت علامہ ایک نہایت ممتاز رکن تھے۔ اس جماعت کے مقاصد یہ تھے کہ ایک تو کشمیری مسلمانوں کے حق میں رائے عامہ منظم کی جائے۔ دوسرے، ریاست جموں و کشمیر کے اندر اصلاحات کے نفاذ کے لیے جدوجہد کی جائے۔ تیسرے، جو کشمیری مسلمان زیر حراست ہیں، انہیں قانونی امداد فراہم کی جائے اور جن خاندانوں کے لوگ شہید ہو چکے ہیں ان کے ورثاء کو مالی امداد مہیا کی جائے۔

ایک ہندو اخبار نے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ علامہ کشمیر کے وزیراعظم بننا چاہتے ہیں۔ اس کے دس پندرہ دن بعد لاہور کے انگریزی روزنامہ "ٹریبیون" نے ایک شخص راگھون کا مضمون چھاپا۔ جس میں لکھا تھا کہ: "بعض شخصیتوں کی نیتوں کا حال اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شورشِ کشمیر کے دوران ہی میں برطانوی ہند کے ایک ممتاز لیڈر نے کشمیر کی وزارت میں کوئی عہدہ حاصل کرنے کے لیے درخواست دی ہے۔" یہ اشارہ بھی علامہ کی طرف تھا۔ چنانچہ "انقلاب" کے استفسار پر علامہ نے کہا: "میں نے یومِ کشمیر کے جلسے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایسی وزارت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں نے یہ اس وزارت سے بڑی بڑی چیزوں کے لیے کبھی کسی سے درخواست نہیں کی۔ علاوہ اس میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا ممبر ہوں جو کشمیر کے تمام حکومت میں اصلاحات چاہتی ہے۔ میرے نزدیک اس کمیٹی کا ممبر ہونے کی حالت میں کوئی ایسی حرکت کرنا دیانت و امانت کے خلاف ہے۔"

ہندو اور نیشنلسٹ سماں اس دوش میں رہتے تھے کہ حضرت علامہ کے خلاف کچھ کہنے کا موقع ملتا رہے۔ وہ جانتے تھے کہ انگریز

دو چیزوں سے گزرتا ہے۔ ایک بالمشورم بنانا یا مشورم بنانا۔ دوسرا کہ میں اسلام سے
 پٹھانچسوا لکتر انہی چیزوں کی آڑ لے کر انگریزوں پر یہ جھٹکا کرتے تھے کہ
 لقبال آن کے حق میں کھڑا ہوں۔ اس کے وسط کا لکھنا ہے۔ امر
 فرانسیسی نینگ ہسٹریٹ (Sir Francis younghusband) کی ایک کتاب آئی۔
 (Life in the Stars)۔ ”ستاروں میں زندگی“ کے ہمشعلا لکھنے میں لکھ
 سچا لکھنا لکھ۔ نام ایسکا۔ طویل۔ شکرتوب لکھنا۔ جنو
 میں الجولائی کے ”ماول ایند اسٹری، گزشتہ، میں چھپا۔ اس میں انہوں نے
 برعظیم کی سیانت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر برطانیہ نے اگلی
 گول میز کانفرنس میں فرقہ واران اختلافات سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا تو یہ
 برطانیہ اور ہندوستان، دونوں کے لیے برباد کن ثابت ہوگا۔ اگر آپ نے
 سیاسی اقتدار ہندو کے حوالے کر دیا تو مسلمان مجبور ہو جائیں گے کہ وہی
 حرے سوراچی یا اینگو سوراچی حکومت کے خلاف استعمال میں لائیں جو
 گاندھی نے حکومت برطانیہ کے خلاف برتے ہیں۔ اس کے بعد علامہ نے
 یہ بتانے کے لیے، کہ مسلمان قوم کو اپنی جیب میں نہیں سمجھنا چاہیے
 یہ لکھا: ”اس سے یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ پورا مسلم ایشیا روسی
 کمیونزم سے ہم آغوش ہونے پر مجبور ہو جائے اور اس سے، مشرق میں
 برطانوی سیادت پر زد پڑے گی۔ میں نہیں سمجھتا کہ روسی طبعاً غیر
 مذہبی لوگ ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس میرے خیال میں ان میں مضبوط
 مذہبی رجحانات موجود ہیں اور روسی ذہن کی موجودہ منفی کیفیت غیر
 معینہ عرصے تک جاری نہیں رہے گی۔ کیونکہ کوئی معاشری نظام لامذہبی
 بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ جوہی اس ملک میں حالات پر مکون ہونے اور
 لوگوں کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کا موقع ملا، وہ اس نظام کے
 لیے ایک مثبت بنیاد تلاش کر لیں گے۔ اگر بالمشورم میں خدا کا تصور
 شامل کر لیا جائے تو وہ اسلام کے قریب قریب مماثل ہو جاتا ہے۔ اس

لیجے مجھے اس بات پر حیرت نہ ہوگی، اگر آگے چل کر اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر چھا جائے۔ نتیجے کا انحصار میرے نزدیک کافی حد تک اس پوزیشن پر ہوگا جو مسلمانوں کو نئے آئین میں ملے گی۔“ ۱۱

اس بیان کو بنیاد بنا کر بمبئی کے نیشنلسٹ انگریزی روزنامہ ”بمبئی کرائیکل“ کے نامہ نگار نے علامہ سے انٹرویو لیا۔ اس نے پہلے یہ سوال کیا: کیا آپ برطانوی سامراج کو خدا پرست سمجھتے ہیں؟ علامہ نے جواب دیا: ”جو مالک استیصال میں مصروف ہیں وہ خدا پرستی کی نفی کرتے ہیں۔ اس کے بعد نامہ نگار نے دریافت کیا: کیا آپ کا خیال

اب بھی یہی ہے کہ بالشوزم میں خدا کا تصور شامل کر لیا جائے تو وہ اسلام بن جاتا ہے؟ اس سوال میں اگرچہ اقبال کے اصل بیان میں تحریف بھی کی گئی، مگر اقبال نے جواب دیا: ”اسلام ایک اشتراکی انداز کا (Socialistic) دین ہے۔ قرآن مجید مطلق سوشلزم اور نجی اسلاک کے تصورات کے بین بین تعلیم دیتا ہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ جدید ضمیر سامراج اور بالشوزم میں بنیادی تبدیلیاں لائے۔ علاقائی سلطنتوں کے دن بیت چکے ہیں اور مطلق سوشلزم کے معنوں میں بالشوزم میں بھی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ معاشی نقطہ نگاہ میں بنیادی اختلاف کی وجہ سے روس اور برطانیہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جائیں اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ صحیح خیال لوگوں کی بعدردیاں انصاف کی طرف ہوں گی۔“

اس کے بعد نامہ نگار نے لکھا: ”چند اور سوالات سے یہ معلوم ہوا کہ اس موضوع پر شاعر ریڈیکل خیالات رکھتا ہے اور یہ خیالات نجی اسلاک کے اس تصور سے بالکل مختلف ہیں جن پر مسلمان عمل پیرا ہیں۔“

وہ (اقبال) ایک نکتے پر بہت واضح اور واشگاف خیال رکھتا ہے اور وہ یہ کہ قرآنی تعلیم زمین کی نجی املاک کے خلاف ہے۔“

نامہ نگار نے یہ بھی پوچھا کہ پین اسلامزم کے بارے میں آپ کا تصور کیا ہے۔ علامہ نے فرمایا کہ پین اسلامزم کی اصطلاح سب سے پہلے ایک فرانسیسی اخبار نویس نے وضع کی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اسے ایک ”خطرہ“ بنا کر اسلامی ملکوں کے خلاف یورپی جارحیت کے لیے وجہ جواز قرار دیا جائے۔ اسی طرح جیسے ”زرد خطرہ“ کی اصطلاح مشرقی ایشیا میں چین اور جاپان کی پیش رفت کے لیے وضع کی گئی تھی۔ اس کے بعد پین اسلامزم سے مراد ایک سازش تھی جس کا مرکز قسطنطنیہ قرار دیا گیا اور مقصد یہ بتایا گیا کہ یورپی قوموں کے خلاف اسلامی ملکوں کی ایک یونین بنائی جائے گی۔ اس سازش کا بھی کوئی وجود نہیں تھا اور پروفیسر براؤن جیسے نامی گرامی مستشرق نے ثابت کر دیا تھا کہ ان معنوں میں پین اسلامزم کا تصور نہ قسطنطنیہ میں موجود تھا نہ کہیں اور۔ بہر حال یہ تصور سید جمال الدین افغانی سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ اصطلاح استعمال کی تھی یا نہیں۔ لیکن یہ درست ہے کہ اس نے یورپی جارحیت کے خلاف افغانستان، ایران اور ترکیہ کو متحد ہونے کی تلقین کی تھی۔ لیکن یہ ایک خالص دفاعی تجویز تھی اور میرے نزدیک جمال الدین افغانی کا موقف بالکل صحیح تھا۔ علامہ نے کہا کہ اگر پین اسلامزم سے ایک ایسا عالمی معاشری تجربہ مراد لیا جائے جس میں نسل، رنگ اور ذات پات کے تصورات نابود ہوں، تو یہ حقیقت میں اسلام ہی کا دوسرا نام ہے۔ ان معنوں میں پین اسلامزم صرف اتحاد اسلامی ہی نہیں، اتحاد انسانی بھی ہے اور ہر مسلمان اس پر یقین رکھتا ہے۔ بلکہ اس میں پین کا لفظ بھی سراسر

فالتو ہے -

اس زمانے میں بعض حقوق میں یہ تجویز ابھر رہی تھی کہ عرب ملکوں کی ایک فیڈریشن قائم کر لی جائے۔ اس کے بارے میں بھی علامہ سے رائے دریافت کی گئی۔ انہوں نے کہا تجویز اچھی ہے لیکن اس کے راستے میں بہت بڑی مشکلات حائل ہیں۔ اس سے آن کی مراد یہ تھی کہ سوائے سعودی عرب اور یمن کے کوئی آزاد عرب مملکت موجود ہی نہیں تھی۔ شام و لبنان پر فرانس کا قبضہ تھا، فلسطین پر انگریزوں کا، شرقِ اردن برطانیہ کے زیرِ حمایت ایک چھوٹی سی ریاست تھا۔ عراق اور مصر میں برطانوی فوجیں مقیم تھیں۔ ایسے میں اگر عرب فیڈریشن بن بھی جاتی تو وہ برطانیہ اور فرانس کی کٹھ پتلی ہوئی۔ یہ درست ہے کہ وحدتِ عربیہ کی تحریک ایک عرصے سے چل رہی تھی اور دنیا نے عرب کے دانشور بیسویں صدی کی ابتداء ہی میں اس کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ اور پہلی عالمی جنگ کے دوران میں شام و لبنان کے عرب سیاستدانوں نے ترکیہ کے خلاف بغاوت کی تو وہ "غداری" نہیں تھی بلکہ اس آرزو کی مظہر تھی کہ دنیا نے عرب یکجا اور متحد ہو کر ایک اہم کردار ادا کرے۔ لیکن پہلی عالمی جنگ کے بعد برطانیہ اور فرانس نے جزیرہ العرب کا بٹوارہ کر لیا تو پھر عرب فیڈریشن کی جو تجویز ابھری، اس کا سرچشمہ انگریز تھے یا فرانسیسی یا دونوں۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ان کے تسلطِ جزیرہ العرب کے ایسے حصوں پر بھی ہو جائے جو اپنی مسائل کے ساتھ اپنی آزادی اور خود مختاری کو سنبھالے ہوئے تھے۔ علامہ اقبال کی نگاہ دور بین تھی۔ وہ سامراجی عزائم سے باخبر تھے۔ اس لیے انہوں نے عرب فیڈریشن کی تجویز کے مستقبل پر کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔ ہاں اتنا ضرور کہا کہ عربی زبان کا مستقبل روشن ہے اور یہ عرب قوموں میں

اسلام کے بعد سب سے بڑے رشتے کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۳۱ء میں علامہ شاعر کم تھے اور سیاستدان زیادہ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برعظیم کے مسلمانوں کو مقامی، علاقائی اور ملک گیر، بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی بحرانوں کے ایک طویل سلسلے سے نبرد آزما ہونا پڑا اور اقبال جیسا دردمند مسلمان رہنما ان سے الگ نہیں رہ سکتا تھا اور سال کے آخری مہینوں میں ایک اور بڑی مصروفیت سے سابقہ پڑا اور وہ تھی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت!

حوالے

- ۱۔ "گفتار اقبال"۔ صفحات ۱۶۸-۱۶۷۔ (بحوالہ "انقلاب")۔
- ۲۔ ۵۵ مئی ۱۹۳۱ء۔
- ۳۔ ایضاً۔ صفحات ۱۱۹-۱۱۸۔ (بحوالہ "انقلاب")۔ ۱۷ مئی ۱۹۳۱ء۔
- ۴۔ ایضاً۔ صفحات ۱۲۰-۱۱۹۔ (بحوالہ "انقلاب")۔ ۱۷ مئی ۱۹۳۱ء۔
- ۵۔ ایضاً۔ صفحات ۲۳-۲۲۔ (بحوالہ "انقلاب")۔ ۵ جون ۱۹۳۱ء۔
- ۶۔ ایضاً۔ صفحات ۲۵-۲۳۔ (بحوالہ "انقلاب")۔ ۵ جولائی ۱۹۳۱ء۔
- ۷۔ ایضاً۔ صفحات ۲۹-۲۵۔ (بحوالہ "انقلاب")۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء۔
- ۸۔ ایضاً۔ ص ۲۹۔ (بحوالہ "انقلاب")۔ ۱ اگست ۱۹۳۱ء۔
- ۹۔ ایضاً۔ صفحات ۳۲-۳۱۔ (بحوالہ "انقلاب")۔ ۲ اگست ۱۹۳۱ء۔
- ۱۰۔ ایضاً۔ ص ۳۳۔ (بحوالہ "انقلاب")۔ ۲ اگست ۱۹۳۱ء اور ۳ اگست ۱۹۳۱ء۔
- ۱۱۔ "انقلاب"۔ ۳ اگست ۱۹۳۱ء۔
- ۱۲۔ Speeches and Statements of Iqbal۔ صفحات ۶۳-۶۲۔
- ۱۳۔ Letters and Writings of Iqbal۔ صفحات ۵۴-۵۳۔

حضرت علامہ مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی نے ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والے کانفرنس میں شرکت کی۔
 کانفرنس کے دوران میں مولانا صاحب نے اپنے خطاب میں مسلمانوں کے حقوق اور آزادیوں کے متعلق
 اہم باتیں عرض کیں۔

تیسواں باب

کانفرنس کے نام: **گول میز کانفرنس: علمی اور مذہبی سرگرمیاں**

۸ ستمبر ۱۹۴۷ء کو حضرت علامہ نے لاہور سے لندن کا سفر کیا تاکہ دوسری گول میز کانفرنس میں اپنی قوم کی نہایت کا حق ادا کریں۔

اسی دن اخباروں میں جناب محمد علی جناح کا یہ بیان چھپا تھا کہ جمہوری حکومت کا یہ تقاضا نہیں کہ سات کروڑ مسلمانوں کو بے دست و پا کر کے ان پر ہندوؤں کے ایک طبقے کو مسلط کر دیا جائے۔ اگر برطانیہ نے کوئی ایسا دستور نافذ کیا تو مسلمان اس دستور کو تباہ کرنے کے لیے اپنی

پوری قوت صرف کریں گے۔ روانگی سے چند منٹ پہلے علامہ سے کہا گیا کہ قوم کے نام پیغام دیں۔ انہوں نے فرمایا، مسٹر جناح کے پیغام کے بعد مسلمانان ہند کے لیے کسی مزید پیغام کی ضرورت نہیں۔ مختصراً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسا کوئی دستور اساسی پرگز قبول نہیں کیا جائے اور مسلمانوں کے لیے اجتماعی حیثیت سے موت کا پیغام ہو۔

دوسرے دن صبح کے وقت علامہ دہلی پہنچے۔ احباب ہندوؤں کے موجود تھے، مختلف انجمنیں سیاست سے پیش کرنا چاہتی تھیں وہ تم تھا، اس لیے انہوں نے سیاست سے قبول کر لینے لیکن انہیں سنتے سے معذوری ظاہر کی۔ البتہ ایک سیاست سے کو مستثنیٰ کیا گیا جو شیخ العلماء مولانا سید احمد امام جامع مسجد نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صوبائی شاخ کی طرف سے پڑھ کر سنایا۔ علامہ نے جواب میں فرمایا

کہ میں اپنے ساتھ سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ نہیں لے جا رہا ، بلکہ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن پاک) ہے جس کی روشنی میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کروں گا۔ آپ نے کہا۔ اگر پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کو تسلیم نہ کیا گیا صوبائی خود مختاری نہ دی گئی اور مسلمانوں کے دوسرے مطالبات نہ مانے گئے تو جو دستور اساسی بھی ہندوستان کو دیا جائے گا ، مسلمانان ہند اس کے پر خچے اڑا دیں گے۔ ۳

دہلی سے بمبئی پہنچے تو افغانستان کے قونصل مقیم بمبئی سردار صلاح الدین سلجوتی نے اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ وہاں ایک پر لطف علمی صحبت رہی۔ شام کے وقت عطیہ بیگم کے ہاں سماع کی صحبت رہی اور ۱۲ ستمبر کو ایک بجے بعد دوپہر ”ملو جا“ نامی جہاز پر سوار ہو کر عازم لندن ہو گئے۔ چار دن بعد جہاز نے عدن میں لنگر ڈالا تو ایک ہندی مسلمان وکیل شیخ عبداللہ علامہ کو شہر لے گئے۔ ماکولات اور مشروبات کا سلسلہ چلا۔ شہر کی ہلکی پھلکی سیر ہوئی اور شیخ موصوف نے رات کے گیارہ بجے علامہ کو جہاز میں پہنچا دیا۔ آدھ گھنٹہ بعد جہاز روانہ ہو گیا اور نہر سویز سے گذر کر ۲۰ ستمبر کو پورٹ سعید پہنچا۔ وہاں جو بھی مسلمان نوجوان علامہ سے ملا ، اس نے بتایا کہ مصر کے مسلمان عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانان ہند ہندوستان کی آزادی کی راہ میں روڑا اٹکا رہے ہیں۔ علامہ نے ان سب کو اصل صورتِ حالات سے آگاہ کیا۔ علامہ فرماتے ہیں کہ ”میری گفتگو سننے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ تقریر کے بعض حصے انہوں نے نوٹ بھی کر لیے تھے۔“ ۴

پورٹ سعید ہی میں علامہ نے ایک ملاقاتی حاجی حکیم صدیق مجدد کو بتایا کہ مصریوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان شرارت پسند لوگ نفاق ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ بتایا جاتا ہے کہ مصری مسلمانوں نے قرآن، اللہ اور اسلام کو خیر باد کہا دیا ہے اور مصریوں کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ہندی مسلمان آزادی کے راستے میں کانٹا بنے ہوئے ہیں۔ علامہ نے یہ بھی کہا کہ ہندوؤں کو فکر لگی رہتی ہے کہ مسلمان افغانوں، بلوچوں اور مرحد کے مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ مصر آزاد ہو جائے تو مصری اپنا ملک ترکوں کو اس وجہ سے حوالے کر دیں کہ ترک مسلمان ہیں؟

جہاز کے سفر کی جو روداد علامہ نے خود قلمبند کی، اس کے چند اقتباس اس قابل ہیں کہ انہیں پیش کر دیا جائے۔ فرماتے ہیں: ”ملوچا بحرِ روم کی موجوں کو چیرتا ہوا چل رہا ہے۔ سمندر بالکل خاموش ہے، طوفان کا نام و نشان تک نہیں۔ موسم بھی نہایت خوشگوار رہا۔ آسمان بحرِ احمر میں گرمی تھی۔ یہ سمندر عصائے کیم کا ضرب خوردہ ہے گرم مزاج کیوں نہ ہو۔ چاروں طرف جہاں تک نگاہ کام آرتی ہے سمندر ہی سمندر ہے۔ گویا قدرت الہی نے آسمان کے نیلکوں خیمے کو آگ کر زمین پر بچھا دیا ہے۔“

”جہاز کی روزمرہ کی زندگی کی داستان نہایت مختصر ہے۔ میں اس کے قدیم عادت کے مطابق آفتاب نکلنے سے پہلے ہی تلاوت کے شروع ہو جاتا ہوں۔ اس کے بعد دیگر حوائج سے فراغت پاتے جاتے ہیں۔ فاسٹ، رات وقت آ جاتا ہے۔ ’بریک فاسٹ‘ کے بعد عرشہٴ جہاز پر ہمسفروں سے گفتگو یا گول میز کانفرنس پر، جس کی خبریں لاسٹلے کے ذریعے سے ہر روز جہاز پر پہنچ جاتی ہیں، بحث و مباحثہ یا گذشتہ سال کی رہنمائی کے مطالعہ۔“

ہاں کبھی کبھی شعر و شاعری بھی ہو جاتی ہے۔ سید علی امام کو عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ ’الولد سرلابیہ‘ ان کے والد ماجد مولانا نواب امداد امام ادبیاتِ اردو میں ایک خاص پایہ رکھتے تھے۔

”جہاز پر میں نے گوشت کھانا بالکل ترک کر دیا ہے۔ وطن میں بھی بہت کم کھاتا تھا مگر یہاں تو صرف سبزی، ترکاری، مچھلی اور انڈے پر گزارا ہے۔ ایک تو گوشت کی طرف رغبت بہت کم ہے دوسرے ذبیحہ بھی مشتبه ہے۔ البتہ غیر مشتبه ذبیحہ بھی کبھی کبھی مل جاتا ہے۔ وہ اس طرح، کہ سر علی امام کی بیگم صاحبہ، کہ نیک نفسی اور شرافت کا مجسمہ ہیں، اپنے شوہر کے ہمراہ ہیں۔ ذبیحہ کے متعلق خاص طور پر محتاط ہیں۔ اپنا باورچی ساتھ لائی ہیں۔ ان کی عنایت سے غیر مشتبه ذبیحہ اور مغلی کھانا قریباً قریباً روز بہاری میز تک پہنچ جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں میرا حصہ بالعموم سبزی اور چاول تک محدود رہتا ہے۔

”آپ کہیں گے کہ میں سب کچھ لکھ گیا مگر ہمسفروں کے متعلق اب تک خاموش ہوں۔ ہمارے جہاز میں کچھ زیادہ مسافر نہیں۔ گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلمان نمائندے شاید سات آٹھ ہیں۔ راجہ نرندر ناتھ صاحب بھی اسی جہاز میں ہیں۔ چار مسلمان۔ نمائندے ہیں اور چاروں ’مغرب زدہ‘۔ ’مغرب زدہ مسلمان‘ کی اصطلاح جو شاید معارف نے وضع کی تھی، نہایت پر لطف ہے۔ لیکن مسلمانوں کے اس ’مغرب زدہ قافلے‘ کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں دو حافظِ قرآن ہیں۔ یعنی نواب صاحب چھتاری اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین۔ مقدم الذکر ہر روز ورد کرتے ہیں اور منا ہے کہ ہر سال تراویح بھی پڑھاتے ہیں۔

”سید علی امام صاحب کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشہٴ جہاز پر کھڑے تھے، میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ میل و فرلانگ کا حساب کر کے کہنے لگے دیکھو بھائی اقبال۔ اس وقت ہمارا جہاز ساحلِ مدینہ کے سامنے سے گذر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور پر ان کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی۔ ان کی آنکھ نمناک ہو گئی اور بے اختیار ہو کر بولے :

’بلغ سلامی روضۃ فیہا النبی المحترم،

ان کے قلب کی اس کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ باقی رہا میں۔ مغرب زدہ بھی ہوں اور مشرق زدہ بھی۔ البتہ مشرقی ضرب میرے لیے زیادہ کاری ثابت ہوئی۔“

مولانا غلام رسول مہر (مدیر انقلاب) حضرت علامہ کے ہمراہ تھے۔ بقول سالک یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا۔ اول علامہ کے لیے ایک خاص رفیق سفر اور ہم خیال دوست کی ہمراہی موجب آسائش ہوئی۔ دوم : مہر صاحب اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے پرائیویٹ طور پر علامہ اقبال اور دوسرے اردن کانفرنس کے لیے موجب تقویت رہیں گے۔ سوم : وہ روزنامہ ”انقلاب“ کے لیے گول میز کانفرنس کی روداد قلمبند کرنے میں بھیجا کریں گے۔ علامہ کا دربار علمی اور تہذیبی دوائر میں سیاسی اور سیاسی دوائر میں دیا؟ اس پر مولانا غلام رسول مہر نے ان ملامتوں میں مفصل روشنی ڈالی جو لندن سے ”انقلاب“ کے نام پہنچے گئے۔ سیاسی کام کے بارے میں معلومات کا ایک اور ذریعہ بھی ہے اور وہ ہے، حضرت علامہ کا وہ خطبہٴ صدارت، جو انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو لاہور میں منعقدہ آل انڈیا مسلم کانفرنس میں دیا۔ ہم اس باب میں علامہ کی

علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کا تذکرہ کریں گے اور اگلے باب میں سیاسی کردار کا۔

علامہ قیصر سے لندن پہنچے۔ ان سے پہلے گاندھی جی کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے پہنچ چکے تھے اور اپنے لباس، لنگوٹی اور چپل، اپنے چرخے اور اپنی بین الاقوامی شہرت کی وجہ سے لندن میں بہت سی نگاہوں کا مرکز بن چکے تھے۔ اس لیے ان کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ مسلمان مندوبین کے قائد سر آغا خان تھے اور وہ لندن میں مستقل قیام کی وجہ سے اور سیاسی قد کاٹھ کی بناء پر بھی خاصے مشہور تھے۔ لیکن مسلمان مندوبین میں علامہ ہی واحد شخصیت تھے جو علم و ادب اور فلسفے میں اپنے کہالات کی بناء پر بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اور سیاسی دائرے میں خطبہء الہ آباد کی وجہ سے بہت نام پا چکے تھے۔ اس لیے اگر لندن میں کسی مسلمان مندوب کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا یا اس کے اعزاز میں تقریبات برپا کیں تو وہ حضرت علامہ ہی کی ذات گرامی تھی۔

سب سے پہلی تقریب ایران کے سیاستدان سید ضیاء الدین طباطبائی کے ہاں منعقد ہوئی۔ موصوف ایران کی وزارتِ عظمیٰ پر فائز رہے تھے۔ انہی کے اصلاحی اقدامات کی بدولت رضا شاہ وزیر جنگ بنے۔ اس زمانے کے شاہ ایران سے طباطبائی کے اختلافات ہوئے تو موصوف وطن چھوڑ کر سوئزرلینڈ میں آباد ہو گئے۔ علامہ لندن پہنچے تو وہ بھی حسن اتفاق سے آٹھ روز کے لیے انگلستان آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال، مولانا شوکت علی، مولوی شفیع داؤدی اور مسٹر زاہد علی کو دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ علامہ نے "جاوید نامہ" کے بعض اشعار سنائے، تو طباطبائی

بھڑک اٹھے۔ کہہنے لگے ایسی چیزیں آج تک نہیں سنیں۔ مناسب یہ ہے کہ علامہ کے کلام کی نشر و اشاعت ایران میں بھی ہو۔

سفارت خانہ عراق کے میکرٹری افغان بے نے لنچ پر بلایا۔ جہاں مشنوی مولانا روم اور فرقہ مولویہ کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا۔ البانیہ کے سفیر نے اپنے ہاں مدعو کیا اور اسلامیات اور سیاسیات ہند پر گفتگو ہوئی۔ ۸ مسٹر اور مسز پنکھرڈ کی طرف سے ایک دعوت میں علامہ نے ایک پرتائیر تقریر فرمائی اور فلسطین کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انگریزوں کو بحیرہ مردار کے مالی ذخائر اور دوسرے وسائل کے استحصال کا ارادہ ترک کر کے عربوں سے انصاف کرنا چاہیے۔ جس کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اعلانِ بانفور منسوخ کر دیا جائے۔ مشہور مستشرق سر ڈینی سن راس اسلامیات پر لیکچر دینے کے لیے امریکہ جا رہے تھے، وہ علامہ سے ملے۔ دو گھنٹے تک اسلامیات پر گفتگو رہی۔ چوٹی تحریک بھی زیر بحث آئی۔ علامہ نے انہیں بتایا کہ اسلام (DOGMATIC) مذہب نہیں ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ ساری نوع انسانی ایک گھرانہ اور ایک خاندان بن جائے۔ اسلام نے جو فرائض، ارکان یا طریق عبادات مقرر کیے، ان سب کا مدعا یہ ہے کہ انسانی قیوب کو رنگ، نسل اور قوم کے امتیازات سے پاک کر دیا جائے۔ انہوں نے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے حقائق کی بھی وضاحت کی۔ سر ڈینی سن راس نے اس سے پہلے کہا امریکہ جانے سے پہلے ایک اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ محترمہ فاطمہ العابدی کی دی ہوئی ایک پرتکلف دعوت پر لاہور پہنچے، سفیر عراق اور سفیر افغانستان نے بھی شرکت فرمائی۔ ۹

مسجد لندن کے امام کی دعوت میں علامہ اقبال نے علاوہ بہت سے مسلم مندوبین اور نو مسلم انگریز شامل تھے۔ علامہ نے نو مسلمانوں سے

خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کے چالیس کروڑ مسلمان آپ کے بھائی ہیں۔ یہ درست ہے کہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں ترقی کے اوج پر پہنچی ہوئی ہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عربی زبان کا مستقبل بھی درخشاں ہے۔ اس لیے آپ اس سے بھی فائدہ اٹھائیں۔ ۱۰۔

مولانا مہر لکھتے ہیں: ”حضرت علامہ اقبال اہل علم کا مرجع بنے ہوئے ہیں۔ کبھی کوئی پروفیسر آتا ہے اور اسلامیات کے متعلق گفتگو کرتا ہے، کبھی کوئی لیکچر دینے والا تبادلہ خیالات کرتا ہے۔ اترسوں عرب اور افریقہ کے بعض اسلامی ممالک کی مشہور سیاح خاتون روزیٹا فاربس نے مسز سروجی نائیڈو کی وساطت سے حضرت علامہ کو بلایا تھا اور قرآن حکیم کی تعلیمات کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ پرسوں لاہور کے سابق ڈپٹی کمشنر کرنل فیئر آئے تھے، ہندوستان اور عالم اسلام کی اسلامی تحریکات کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ یہاں لندن یونیورسٹی میں مختلف اسلامی ممالک کی تحریکات پر مختلف اصحاب لیکچر دے رہے ہیں۔ کرنل فیئر ہندوستان کی اسلامی تحریکات کے متعلق لیکچر دیں گے۔ وہ بہت سے نوٹ حضرت علامہ سے لکھوا کر لے گئے۔“ ۱۱۔

۴ نومبر ۱۹۳۱ء کو برطانیہ کی نہایت وقیع مجلس انڈیا سوسائٹی نے حضرت علامہ کو خاص طور پر مدعو کیا تا کہ وہ اپنے فلسفے اور شاعری پر ایک لیکچر دیں۔ اس کی صدارت سر فرانسیس ینگ بسبینڈ نے کی۔ علامہ نے فرمایا کہ میرا کوئی منظم و مرتب فلسفہ نہیں ہے۔ البتہ فلسفے کے ایک مسئلے یعنی حیات بعد الموت کے ساتھ مجھے خاصی دلچسپی رہی ہے۔ میں ایک انسان کے شاندار اور درخشاں مستقبل پر پختہ یقین رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان نظام کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے۔ یہ عقیدہ

میرے خیالات و افکار میں آپ کو عموماً جاری و ساری نظر آئے گا۔ علامہ نے اپنے مختلف شعری مجموعوں سے کلام کے نمونے پیش کیے اور ان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس وقت تک ”جاوید نامہ“ تو مکمل ہو چکا تھا لیکن منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔ علامہ نے اس کتاب کا خصوصی تعارف کرایا۔ جس سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے: ”یہ حقیقت میں ایشیا کی ڈیوائن کامیڈی ہے۔ جیسے ڈانٹے کی تصنیف یورپ کی ڈیوائن کامیڈی ہے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ شاعر مختلف ستاروں کی سیر کرتا ہوا مختلف مشابہت کی روحوں سے مل کر باتیں کرتا ہے۔ پھر جنت میں جانا ہے اور آخر میں خدا کے سامنے پہنچتا ہے۔ اس تصنیف میں دورِ حاضر کے تمام جماعتی، اقتصادی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی مسائل زیرِ بحث آگئے ہیں۔ اس میں صرف دو شخصیتیں یورپ کی آئی ہیں۔ اول: کچنر۔ دوم: نٹشے۔ باقی تمام شخصیتیں ایشیا کی ہیں۔ ڈانٹے نے اپنا رفیق سفر یا خضرِ طریق ورجل کو بنایا تھا۔ میرے رفیق سفر یا خضرِ طریق مولانا نے روم میں۔ آپ حیران ہوں گے کہ کچنر اس ضمن میں کیسے آگیا؟ جاوید نامہ میں کچنر اور فرعون آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ فرعون کچنر کو طعنہ دیتا ہے کہ یورپ کے لوگ بڑے بے رحم اور بے درد ہیں۔ انہوں نے ہماری قبریں تک کھود ڈالی ہیں۔ کچنر جواب دیتا ہے کہ ہمارا مقصد سائنس کی خدمت اور علمِ الآثار کی خدمت ہے۔ کچنر نے اپنے لئے کھودی ہیں کہ معلوم ہو آج سے تین یا چار ہزار سال قبل ان کی حالت کیا تھی۔ فرعون اس تشریح کے جواب میں کہتا ہے:

فہر مارا علم و حاکمت بر کھود

لیکن اندر تربت سہدی چہ بود ؟

ایک مقام پر میں نے چار الواح لکھے ہیں۔ لوحِ ہند، لوحِ مسیح،

لوحِ زرتشت اور لوحِ مجد - لوحِ مسیح میں ٹالسٹائے کا ایک خواب ہے -
لوحِ زرتشت میں اسلامی تصوف کے مشہور مسئلہ فضیلتِ نبوت بر ولایت
یا ولایت بر نبوت کے متعلق بحث ہے - لوحِ مجد کا مضمون یہ ہے کہ
کعبہ میں بت ٹوٹے پڑے ہیں ، ابوجہل کی روح گریہ و زاری کر رہی ہے
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ رہی ہے کہ انہوں نے ہمارے
دین کو برباد کیا ، ہماری خاندانی بلند پائیگی زائل کر ڈالی اور مساوات کی
تعلیم دینی شروع کر دی جو مزد کیوں سے حاصل کی گئی ہے ۔۔۔۔ ، ۱۲
علامہ کی لندن میں آمد سے پہلے ہی اقبال لٹریچر ایسوسی ایشن
قائم ہو چکی تھی - اس کی بنیاد جناب نیاز مجد خان (جو بعد میں این - ایم
خان کے نام سے مشہور ہوئے اور مدتوں مول سروس میں رہے) نے اپنے
طالب علمی کے زمانے میں دوسرے مسلم طلبہ اور لندن کے مسلمان شہریوں
کے تعاون سے رکھی تھی - جب علامہ لندن پہنچے تو یہ نوجوان اکثر
ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے - اس ایسوسی ایشن نے ۶ نومبر
کو علامہ کے اعزاز میں لندن کے مشہور ہوٹل والڈورف میں ایک عصرانے
کا اہتمام کیا - اس تقریب کی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ
اس میں سر آغا خان بھی آئے اور گاندھی جی بھی - ۱۳ ان کے علاوہ
تمام مسلمان مندوبین ، سر تیج بہادر سپرو ، مسز سروجی نائیڈو ، پروفیسر
ڈاکٹر نکلسن ، سر عبدالقادر ، خالد شیلڈریک ، علامہ عبداللہ یوسف علی ،
مس مارگرٹ فارکوہرسن اور بے شمار دوسرے لوگ شریک ہوئے - کیمبرج
سے چوہدری رحمت علی اور آن کے ساتھی آئے - ایک وفد آکسفورڈ سے
آیا - ملک خضر حیات خان ٹوانہ کے والد سر عمر حیات خان ٹوانہ میزبان
خصوصی تھے اور سر عبدالقادر صدر مجلس - سب سے پہلے ڈاکٹر نکلسن نے
اپنی تقریر میں اقبال کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا کہ آن کی

شاعری کا مقصد مولانا نے روم کی اصطلاح میں جہادِ اکبر ہے۔ این۔ این۔ ایم خان نے سپاسنامہ پڑھا۔ علامہ نے جوابی تقریر میں پہلی بار انکشاف کیا کہ ”اسرارِ خودی“ کو فارسی میں اکھنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ ”میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے اپنی مثنوی اسرارِ خودی ابتداءً صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی یا سمندر چیر کر یورپ پہنچ جائے گی۔“ ۱۴

کیمبرج سے بھی دعوت آئی ہوئی تھی اور وہ بھی بہت اصرار کے ساتھ۔ چنانچہ علامہ ۱۸ نومبر کو وہاں پہنچے۔ چوہدری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم اور دوسرے حضرات نے پرتپاک خیر مقدم دیا۔ حضرت علامہ پہلے اپنے اساتذہ سے ملے۔ اس کے بعد یونیورسٹی آفس میں، جہاں ان کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا تھا، کیمرج کے اساتذہ ڈاکٹر سارلے، ڈاکٹر نکسن اور پروفیسر لیوی نے مختصر تقریروں میں خراج تحسین ادا کیا۔ انٹرنیشنل سسٹم اسوسی ایشن کے مصری صدر نے علامہ کی خدمات کو سراہا۔ علامہ نے اپنی تقریر میں نوحوانوں سے اس قدر کہا کہ وہ دہریت اور مادیت سے دور رہیں۔ انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ پہلی عالمی جنگ مذہب اور مملکت کی علیحدگی اور دہریت اور مادیت کا نتیجہ تھا۔ نتیجہ تھی اور بالشویزم بھی مذہب اور مملکت کی علیحدگی کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ آپ نے کہا ”مذہب نے ہمہ ضروری چیز ہے۔ مذہب صرف وایقان کا نام ہے۔“ ۱۵ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ سے جس نے کوئی پیغام مانگا، جس نے زندگی کا کوئی رہنما اصول چاہا، جواب یہی ملا کہ

الحاد اور مادہ پرستی سے بچو۔ خدا پر ایمان رکھو۔ مذہب کا دامن نہ چھوڑو۔ ایک کلب میں انگریز خواتین نے کہا، ہمیں کوئی خاص پیغام دیجئے۔ علامہ نے کہا: ”انگلستان کی عورتوں کا فرض ہے کہ آئندہ نسل کو دہریت اور مادیت کے چنگل سے بچائیں۔“

۲۱ نومبر کو علامہ لندن سے روانہ ہوئے۔ ان کی پہلی منزل مقصود روم تھی۔ کیونکہ اب ایک علمی اور تہذیبی دورے کا آغاز تھا۔ لیکن اس کی داستان سنانے سے پہلے ضروری ہے کہ انہوں نے گول میز کانفرنس میں جو سیاسی کردار ادا کیا، اس کا تذکرہ کیا جائے۔ اگلا باب اسی کے لیے وقف ہے۔

حوالے

- ۱ - ”انقلاب“ - ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء -
- ۲ - ایضاً - ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء -
- ۳ - ایضاً - ۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء -
- ۴ - ایضاً - ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء - (علامہ اقبال کا مفصل مکتوب، منشی طاہر الدین کے نام)
- ۵ - ایضاً - ۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء -
- ۶ - ایضاً - ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء - (علامہ اقبال کا مفصل مکتوب، منشی طاہر الدین کے نام)
- ۷ - ”ذکر اقبال“، - ص ۱۵۶ -
- ۸ - ”انقلاب“، - ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء -
- ۹ - ایضاً - ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء -
- ۱۰ - ایضاً - ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۱ء -

- ۱۱ - ایضاً - ۵ نومبر ۱۹۳۱ء -
- ۱۲ - ایضاً - ۲۲ نومبر ۱۹۳۱ء -
- ۱۳ - Thoughts and Reflections of Iqbal - صفحات ۲۲۶-۲۲۵ -
- ۱۴ - ”انقلاب“، ۲۱ نومبر ۱۹۳۱ء -
- ۱۵ - ”انقلاب“، ۱۰ دسمبر ۱۹۳۱ء -



©

چوبیسواں باب

گول میز کانفرنس : سیاسی کردار ، اٹلی اور فلسطین کا دورہ

حضرت علامہ نے کیمبرج میں صحیح کہا تھا کہ گول میز کانفرنس میں میری شرکت بلا واسطہ نہیں ، بلکہ بالواسطہ ہے ۔ یہاں ہندوستان کی مختلف قوموں کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا تھا اور میں نے ضروری سمجھا کہ اس کام میں شریک ہو کر میں بھی اپنے رفقاء کا ہاتھ بٹاؤں ۔ مسلمان مندوبین کے قائد اور ترجہان سر آغا خان تھے ، اس لیے بولنا تو انہی کو تھا ۔ البتہ جو مجالس مشاورت مسلمانوں کے حقیق کے بارے میں منعقد ہوئیں ، ان میں حضرت علامہ بھی بولے اور دوسرے مندوبین بھی ۔ بلکہ انہوں نے نجی محفلوں میں معاملات کو مسجھنے اور سمجھانے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بھی بٹایا ۔

اکتوبر کے اوائل میں علامہ نے وزیر ہند سے ملاقات کے دوران میں مسلمانوں کے مطالبات کو وضاحت سے پیش کیا ۔ وزیر ہند اتنے متاثر ہوئے کہ دوبارہ ملاقات کی آرزو ظاہر کی ۔ لیکن اس کے بعد دینی دنوں کی پارلیمانی انتخابات کا ہنگامہ رہا اور یہ ملاقات نہ ہو سکی ۔ ۲۰ سالہ دور لگتے ہیں : بعض دوست لگتے ہیں کہ حضرت علامہ نے کوئی تقریر نہیں کی ۔ سوال یہ ہے کہ وہ تقریر کہاں کرتے ؟ یہاں اقبالیوں کی کمیٹی کے اب تک صرف تین جلسے ہوئے ۔ پہلا اجلاس معاً دو روز لے لیے ساتویں ہو گیا ۔ اس لیے ، کہ گاندھی جی اور بعض دوسرے مندوبین باہم گفتگو

کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا جلسہ آٹھ روز کے لیے ملتوی ہو گیا۔ اس میں بھی کسی نے اصل مسئلے پر کوئی تقریر نہ کی۔ تیسرے جلسے میں صرف ناکافی مفاہمت کا اعلان ہوا۔ ۳۔

دوسری گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے لیے عمل کا راستہ کیا تھا؟ یہی، کہ پہلے اپنے جائز حقوق کے لیے غیر مسلم ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کی سعی۔ اس کے بعد یہ حیثیتِ مجموعی ملکی آئین کے بارے میں حکومت سے متحدہ مطالبہ۔ اور اگر ان دونوں مقاصد میں ناکامی ہو تو برطانیہ سے مطالبہ، کہ وہ فرقہ واریت مسائل پر اپنا موقف واضح کرے۔ اگر اس سے اپنے مطالبات منظور ہوتے ہوں تو عمومی آئینی مسائل پر مذاکرات۔ ورنہ انقطاع اور علیحدگی۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں اس راستے پر کس حد تک چلے؟ اس کے لیے ہمیں علامہ اقبال کے اس خطبے کے متعلقہ حصے کا تجزیہ کرنا ہے جو انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے دیا اور اس میں گول میز کانفرنس میں اپنے وفد کی کارگذاری کا حال پیش کیا۔ ۳۔

اقلیتی کمیٹی کے دو اجلاس ہوئے۔ ایک ۲۸ ستمبر کو دوسرا یکم اکتوبر کو۔ دونوں مرتبہ اس بناء پر اجلاس ملتوی کر دیے گئے کہ فرقہ واریت مسئلہ کا آپس میں بیٹھ کر تصفیہ کر لیا جائے۔ سہاتما گاندھی نے پہلے یہ پوزیشن لی کہ جب تک مسلم وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی شرکت میں حائل ہے، بات چیت آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جب اس میں ناکام رہے تو انہوں نے کہا کہ میں ذاتی طور پر مسلمانوں کے مطالبات مان لوں گا اور کوشش کروں گا کہ انہیں کانگریس، ہندوؤں اور سکھوں سے بھی منوالوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مسلمان ان تین باتوں سے اتفاق کریں۔ اول: بالغوں کے لیے حق رائے دہی۔ دوم: اچھوتوں

کو کوئی خصوصی نیابت نہ دی جائے۔ سوم : مکمل آزادی کے لیے کانگریس کا مطالبہ۔ پھر حال گاندھی جی نے یہ معاملہ کانگریس کے سامنے پیش کرنے سے انکار کر دیا اور ہندوؤں اور سکھوں سے مسلمانوں کے مطالبات نہ منوا سکے۔ ۷ اکتوبر کو دو ہندو رہنماؤں نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کے مطالبات سات ثالثوں کے ایک بورڈ کے سامنے پیش کر دئے جائیں۔ ہندو اور سکھ مندوبین نے یہ تجویز بھی مسترد کر دی۔ دوسرے دن ۸ اکتوبر کو کانفرنس کا جو اجلاس ہوا، اس میں گاندھی جی نے ایک بالکل نیا موقف اختیار کر لیا۔

وزیراعظم برطانیہ صدر مجلس تھے۔ انہوں نے گاندھی جی سے بولنے کو کہا تو موصوف نے اس رائے کا اظہار کیا کہ متفقہ حل کے لیے جن لوگوں کی ضرورت تھی وہ تو کانفرنس میں موجود ہی نہیں ہیں۔ ان کا اشارہ ڈاکٹر انصاری کی طرف تھا۔ کہ وہی محدود انتخاب کے سبب سے بڑے حامی تھے۔ اس کے بعد کہا : ”مجھے یہ لہنے کی اجازت دیجئے کہ فرقہ واریت کے مسئلے کا حل موراجی آئین کا ناج تو ہو سکتا ہے، لیکن بنیاد نہیں ہو سکتا۔ ہمارے اختلافات سخت ہو گئے ہیں اور یہ پیدا ہوئے تو غیر ملکی غلبے کے سبب سے۔ مجھے اس بات میں ڈراما بھی نہیں کہہ سکتا۔ جب آزادی کا سورج طلوع ہو گا، تو اس کی حرارت سے فرقہ واریت کے اختلافات کا تودہ برف پگھل جائے گا۔“ مطلب یہ کہ فرقہ واریت کے مسائل پر رکھو اور اختیارات ہمارے حوالے کرو۔ اس پر موراجی نے کہا : ”آپ دیانت داری سے کہہ سکتے ہیں اور جتنی سے جتنی مسلمانوں کے مسائل اور اختلافات ہیں۔“ گاندھی نے کہا : ”دیانت داری سے کہہ سکتے ہیں اور جتنی سے جتنی مسلمانوں کے مسائل اور اختلافات ہیں۔“ گاندھی نے کہا : ”دیانت داری سے کہہ سکتے ہیں اور جتنی سے جتنی مسلمانوں کے مسائل اور اختلافات ہیں۔“

علامہ بتاتے ہیں کہ جب گاندھی جی نے مندوبین کی نمائندہ حیثیت کو لٹکارا ، تو سر محمد شفیع نے پر زور الفاظ میں تردید کی اور گاندھی جی کی تجویز مسترد کر دی ۔ اجلاس ختم ہو گیا اور ۱۲ نومبر تک کوئی اجلاس ممکن نہ رہا کیونکہ پارلیمانی انتخاب کی مہم شروع ہو چکی تھی ۔ اس دوران میں ۱۵ اکتوبر سے نجی گفتگو کا پھر آغاز ہو گیا ۔

سر جافرے کاربٹ نے تجویز پیش کی کہ پنجاب سے انبالہ ڈویژن کو الگ کر کے اس صوبے میں مخلوط انتخاب رائج کر دیا جائے ۔ علامہ اس تجویز کے حق میں تھے ۔ کیونکہ اس طرح پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت اتنی نمایاں ہو جاتی کہ مخلوط انتخاب سے کوئی خطرہ باقی نہ رہتا ۔ لیکن ہندوؤں اور سکھوں نے اسے بھی مسترد کر دیا کیونکہ انہیں مخلوط انتخاب کے باوجود مسلم اکثریت قبول نہیں تھی ۔ اس کے بعد حالات نے ایک نیا رخ لیا ۔ اقلیتوں نے آپس میں مشورے کیے اور سوائے سکھوں کے باقی تمام اقلیتوں نے ایک اقلیتی معاہدے پر دستخط کر کے اس کا مسودہ

۱۳ نومبر کو وزیراعظم برطانیہ کے حوالے کر دیا ۔ ۶

اب یہ مسئلہ تھا کہ اگر اقلیتی کمیٹی اپنے مقصد میں ناکام رہی ہے تو فیڈرل ڈھانچے کی کمیٹی میں شرکت کیوں ہو ؟ جب بنیاد ہی ضعیف نہ ہو سکی تو عہارت کھڑی کرنے کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے ؟ چنانچہ مسلم وفد نے فیصلہ کیا کہ فیڈرل ڈھانچے کی کمیٹی میں شرکت سے انکار کر دیا جائے ۔ لیکن ابھی یہ فیصلہ ہوا ہی تھا کہ بعض انگریزوں نے دباؤ ڈال کر مسلم وفد کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ فیڈرل ڈھانچے کی کمیٹی کی کارروائی میں شرکت کر لیں ۔ علامہ کو اس پر مایوسی ہوئی کیونکہ ان کے نزدیک اب کانفرنس میں شرکت لاجواب تھی ۔ چنانچہ انہوں نے مسلم وفد کے قائد سر آغا خان کے نام یہ خط لکھا :-

”میں انتہائی کرب کے ساتھ آپ کے نام یہ خط لکھ رہا ہوں۔
 میں ابتداء سے مسلم وفد کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔
 اس کے ارکان کی خفیہ رقابتوں، سازشوں بلکہ بعض ارکان کی
 بے وفائی سے مجھے بے حد قلق ہوا ہے۔ ایسے طرزِ عمل سے
 متنفر ہو کر میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا
 ہوں کہ آج سے میرا اس گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا،
 جسے مسلم وفد کے ظلی کابینہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔“

یہ خط ۱۶ نومبر کو بھیجا گیا۔ تین دن بعد علامہ کو ہندوستان سے
 مسلم کانفرنس کی قرارداد پہنچی جس میں کانفرنس کے مقاطعہ کا فیصلہ
 درج تھا۔ چنانچہ ۲۰ نومبر کو علامہ نے وزیر ہند کے نام خط لکھا
 کہ مسلمانوں کے اس فیصلے کے بعد میرا یہاں رہنا قطعاً سودمند معلوم نہیں
 ہوتا اس لیے میں ۲۱ نومبر کو جا رہا ہوں۔ ۸ علامہ کے جانے کے بعد
 ۲۶ نومبر کو مسلم سندوبین نے رسمی طور پر اس فیصلے کا اعلان کر دیا
 کہ وہ فیڈرل ڈھانچے کی کمیٹی سے تعاون کریں گے۔ لیکن علامہ کا موقف
 وہی تھا جس کا اظہار انہوں نے خطبہ ”اللہ آباد ہی میں کر دیا تھا کہ
 آل انڈیا فیڈریشن کو تو بنتے بنتے ڈیر لگے گی، اس لیے بہتر یہ ہے کہ
 ہندو مسلم مفاہمت کے بعد پہلے صوبوں کو ذمہ دار حکومت سے لیا
 جائے تاکہ بنیادیں پڑ جائیں اور اس کے بعد تجربے سے یہ حکایمتیں آنے
 والے فیڈرل ڈھانچے کے بوجھ کو برداشت کر سکیں۔“

اس سیاسی ہمہ جہتی سے فراغت پا کر حضرت علامہ ۲۱ نومبر کو
 عازم اٹالیہ ہوئے۔ یہاں کی رائل اکیڈمی نے انہیں مدعو کر رکھا تھا۔

پیرس کے ریلوے مٹیشن پر علامہ کے دوست سردار امراؤ سنگھ اور مشہور جلاوطن انقلابی رہنما اقبال شیدائی پذیرائی کے لیے موجود تھے۔ شام کے وقت ٹرین روم پہنچی تو ہندوستان میں اطالوی قونصل جنرل ڈاکٹر سکارپا اور رائل اکیڈمی کی طرف سے پروفیسر اپرسٹا کو استقبال کے لیے موجود تھے۔ دوسرے دن صبح بعض اربابِ علم سے ملاقات ہوئی۔ رائل اکیڈمی کے نائب صدر پروفیسر نالیکی سے دو گھنٹے تک گفتگو رہی۔ موصوف سنسکرت کے بہت بڑے عالم تھے۔ ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہا۔ وزارتِ خارجہ کے ایک ذمہ دار افسر کے ساتھ یورپی اور ایشیائی سیاست پر تبادلہٴ خیالات ہوا۔ ۲۴ نومبر کو آثارِ قدیمہ کی سیاحت ہوئی۔ شام کو بعض دخمے دیکھے۔ محافظوں نے بتایا کہ یہ زمین دوز اور پریج راستے مسلسل آٹھ میل تک چلے گئے ہیں۔ حضرت علامہ کہنے لگے: ”مذہب بھی کیا چیز ہے۔ کوئی دوسری قوت عقیدے اور ایمان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ جو کچھ ہوا سب مذہبی عقائد کے جوش میں ہوا۔ عقیدہ غلط بھی ہو لیکن جب مذہب کے رنگ میں دل پر قبضہ پا لیتا ہے تو انسان کے عمل میں عجیب و غریب حرارت پیدا کر دیتا ہے۔“

”انسائیکلو پیڈیا اطالیانہ“ کے مدیر پروفیسر جنٹیلی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی صدارت میں ایک علمی مجلس برپا ہوئی، جس میں فنونِ لطیفہ بھی زیرِ بحث آئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ موسیقی اور شاعری کو نصاب سے خارج کر دینا چاہیے۔ علامہ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ قوم کی تعمیر و ترتیب کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ نجویز نہایت مفید معلوم ہوتی ہے۔ جنٹیلی نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ یہ چیزیں لوگوں کو کھینچ لانے کا اچھا ذریعہ ہیں اور اس کے بعد اچھی اور مفید باتیں ذہن نشین کرائی جا سکتی ہیں۔ علامہ نے فرمایا،

اس اعتبار سے بھی یہ طریقہ غلط ہے۔ ہمارے ہاں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ لوگ خوش گلو شاعروں کے اشتہار دے دے کر لوگوں کو جمع کیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب اگر علمی مسائل پر مذاکرے کی دعوت دی جائے تو کوئی بھی نہیں آتا۔ اسی سلسلے میں علامہ نے اسلام کی مثال دی جس میں ان چیزوں کو دبایا گیا تھا۔ پھر فرمایا: ”شعر شعر میں اور موسیقی موسیقی میں فرق ہے۔ اگر کوئی ایسا شاعر پیدا ہو جائے جو دنیا کو حقیقی زندگی، عمل اور حرکت کا مؤثر پیغام دے سکے یا کوئی ایسا موسیقی دان پیدا ہو جائے جو حیاتِ اقوام کے اصول کو محفوظ رکھ کر نئی راگنیاں پیدا کر سکے، تو خیر۔ لیکن جو کچھ اس وقت ہمارے سامنے ہے، اس سے قوتِ عمل میں ضعف و انحطاط پیدا ہونے کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔“ ۱۰

روم کے بعد علامہ مولانا مسہر کی رفاقت میں قاہرہ پہنچے۔ ان کے ذہن میں کچھ ایسا تصور تھا کہ اسلامی دنیا کے نوجوان باشعور نہیں ہیں اور ان کے دلوں پر غفلت کے گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور وہ اسلامی تمدن اور اسلامی تاریخ سے ناواقف ہیں۔ لیکن قاہرہ پہنچے تو یقین ہو گیا کہ غفلت کے پردے اٹھ چکے ہیں۔ انہوں نے خود بتایا کہ ”مصر میں قومیت کا جذبہ اور جوش عمل موجود ہے۔ وہاں ایک ادارہ قائم تھا جو سلطنتِ عثمانیہ کی روایات کا محافظ تھا“ ۱۱

یروشلم میں مؤتمرِ عالمِ اسلامی ہو رہی تھی۔ حضرت علامہ ہندی مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو تھے۔ چنانچہ وہاں پہنچے۔ چند ماہ بعد آپ نے ایک تقریب میں بتایا کہ فلسطین کی مؤتمرِ عالمِ اسلامی میں میں نے دیکھا کہ وہاں کے نوجوان مقررین کی داڑھیاں منڈی ہوئی

تھیں اور وہ کوٹ پتلون میں ملبوس نظر آ رہے تھے اور انہیں علم و فضل اور جوشِ عمل کے اعتبار سے علمائے کرام پر فوقیت حاصل تھی۔ ۱۲۔
 مؤتمر میں شرکت کے لیے بہت سے مسلمان ملکوں کے نمائندے آئے ہوئے تھے۔ وہ قدرتی طور پر سب سے ملے۔ لیکن فرمایا: ”شام کے نوجوان عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ان نوجوانانِ اسلام میں اُس قسم کے خلوص اور دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی، جیسی میں نے اطالیہ کے فاشسٹ نوجوانوں کے علاوہ کسی میں نہیں دیکھی“۔ ۱۳۔ شام کے نوجوانوں سے متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ کیونکہ اس صدی میں بیداری کے اولین آثار اسی خطے میں پیدا ہوئے جو آج کل شام و لبنان کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہونے اور یورپ سے براہِ راست متاثر ہونے کی وجہ سے عربوں کی تحریکِ حریت کا آغاز بھی اسی خطے سے ہوا۔ جہاں تک فاشسٹ نوجوانوں کے بارے میں اقبال کے حُسنِ ظن کا تعلق ہے، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا، کہ علامہ کو فاشزم سے کوئی خصوصی دلچسپی تھی۔ اور اگر تھی تو محض اس حد تک، کہ فاشزم لا مذہب سوشلزم کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ اور اُس کی تنظیم نے اطالیہ کی ترقی میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس زمانے میں علامہ نے فاشسٹ نوجوانوں کی تعریف فرمائی، اُس زمانے تک فاشزم کا بھیانک اور انسان دشمن اور سامرجی کردار ابھی نہیں ابھرا تھا۔

مؤتمرِ عالمِ اسلامی کے انعقاد کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ تحریکِ صیہونیت سے فلسطین کی آزادی سلب ہونے کا جو خطرہ پیدا ہوا تھا، اُس

کے سدِ باب کے لیے دنیائے اسلام کی رائے عامہ ہموار کی جائے۔ علامہ نے ڈٹ کر تحریکِ صیہونیت کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا اور برطانوی ہائی کمشنر کے ساتھ ملاقات کر کے ان کے سامنے کچھ ایسی تجاویز رکھیں، جن کا مقصد یہ تھا کہ فلسطینی فلاحین کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ مؤتمر نے مختلف معاملات پر غور کرنے کے لیے جو سب کمیٹیاں بنائیں، ان میں سے بیشتر میں علامہ شامل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وقت کی کمی کے سبب سے وہ سب کی کارروائی میں شریک نہ ہو سکے۔ ایک سب کمیٹی میں یہ تجاویز پیش ہوئی کہ یروشلم میں قدیم جامعہ ازیہر کی طرز پر ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ علامہ نے اس کی مخالفت فرمائی اور کہا کہ اگر یونیورسٹی کا قیام مقصود ہے تو بالکل جدید طرز پر قائم کی جائے۔ برطانوی خبر رساں ادارے نے یہ خبر نشر کر دی کہ علامہ یروشلم میں کسی قسم کی یونیورسٹی کا قیام نہیں چاہتے۔ اس پر علامہ نے ایک تردیدی بیان جاری کیا۔ جس میں لکھا کہ ”میری یہ پرزور خواہش ہے کہ عربی زبان بولنے والے لوگ صرف ایک نہیں، بلکہ کئی یونیورسٹیاں قائم کر کے علومِ جدیدہ کو زبانِ عربی میں منتقل کر لیں۔ ۱۳۱۱ھ حضرت علامہ نے مؤتمرِ اسلامی میں اپنے اوداعی خطبے میں ارشاد فرمایا کہ اسلام کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اس اتحاد اور اتحاد کا مقابلہ کامیابی سے نہیں کر سکتی جو یورپ بنیاداً ہے۔ دشمنوں کے خارجی دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی خطرہ ہے تو اندرونی دشمنوں سے ہے اور علامہ نے یہ لہجہ کر مستقبل شناسی کا ایک بین ثبوت فراہم کر دیا کہ ”میرا ايمان ہے کہ اسلام کا مستقبل اہل عرب کی ذات سے وابستہ ہے اور ان کا مستقبل ان کے ہاتھی

اتحاد پر موقوف ہے۔ ان کے لیے مقدر ہو چکا ہے کہ عظیم الشان طاقت بن جائیں۔“ ۱۵ یہ بات ایک ایسے وقت پر کہی، جب بظاہر عربوں کی حالت ہرگز قابلِ رشک نہیں تھی۔ شام و لبنان فرانس کے زیرِ تسلط تھے، مصر اور عراق برطانیہ کے ماتحت تھے اور فلسطینی عربوں کی رگِ جاں برطانیہ اور پنجمہٴ یہود میں تھی۔ اور معاشی حالت کا یہ عالم تھا کہ تیل صرف عراق سے نکلتا تھا اور وہ بھی محدود مقدار میں اور سعودی عرب کی معیشت کا دار و مدار حاجیوں کی آمد پر تھا۔

۱۴ دسمبر کو حضرت علامہ یروشلم سے روانہ ہوئے اور ۳ دسمبر کو لاہور پہنچ گئے۔ جہاں ریلوے سٹیشن پر ان کا شاندار استقبال ہوا۔ اتنا شاندار، کہ ہجوم کی کثرت کے سبب سے جمعیتِ اسلام کے ارکان سپاسنامہ بھی رسمی انداز میں پیش نہ کر سکے۔ ۱۶ یہ دورہ حضرت علامہ کی شخصیت کو ابھارنے میں بے حد مددگار ثابت ہوا۔ کیونکہ:

اول : گول میز کانفرنس میں باقی مسلم مندوبین نے برطانوی دباؤ میں آکر اپنے موقف میں لچک پیدا کر لی لیکن علامہ اپنے موقف پر ٹٹے رہے اور ناکامی پر گول میز کانفرنس سے لاتعلقی کا اعلان کر کے انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ کسی بڑے سے بڑے دباؤ میں آ کر بھی اصولوں پر سمجھوتا کرنے کے قائل نہیں ہیں۔

دوم : انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کی ترجہانی بڑے دھڑلے سے کی اور جب جماعت کا حکم ملا کہ گول میز کانفرنس کی فیڈرل سٹرکچر کمیٹی سے تعاون نہ کیا جائے تو وہ واحد مندوب تھے، جنہوں نے جماعتی نظم و ضبط کی پابندی کر کے ایک مثال قائم کر دی۔ گویا ایک نتھرے ستھرے سیاسی کردار کی بنیاد ڈالی۔

سوم : علامہ نے برطانیہ میں مقیم مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کو اسلام کی صحیح روح سے آشنا کیا اور انہیں اس قابل بنایا کہ وہ مسلمانوں کے ملی موقف کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ انہی نوجوانوں میں چوہدری رحمت علی اور آن کے رفقاء شامل تھے جنہوں نے ۱۹۳۳ء میں تحریک پاکستان کا پرچم بلند کیا۔

چہارم : برطانیہ اور اطالیہ میں انہوں نے بے شمار علمی مجالس سے خطاب کیا۔ دوسروں کی آراء کو سمجھا اور سنا اور اہل دانش کو اپنی رائے سے آگاہ کیا اور آن اساتذہ، فلسفیوں اور دانشوروں کو اسلام کے مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا جو مستشرقین کے زمرے میں شامل تھے۔

پنجم : انہوں نے یورپ اور مشرق وسطیٰ کی سیاست کا براہ راست مشاہدہ کیا اور وہاں کے میاں اور دانشوروں کو عظیم کی مسلم سیاست کے بارے میں بھی صحیح معلومات فراہم کر کے آن غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جو ہندی مسلمانوں کے بارے میں مخصوص مفادات کی طرف سے پھیلائی جا رہی تھیں۔

ششم : موتمر عالم اسلامی کے توسط سے دنیائے اسلام کے اہل دانش و دانش رہنماؤں کے مابین رابطہ پیدا کیا۔ انہی میں سے مولانا محمد حسین صاحب الحاج امین الحسینی کی ذات باہر دب بھی تھی جن سے بعد میں بھی تعلقات کی تجدید کا سامان فراہم ہوتا رہا۔

ہفتم : علامہ نے عربوں کو ایک نمائندار مستقبل کی نوید جان فزا منائی۔ اس طرح آن میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی سعی فرمائی۔

حوالے

- ۱ - ”انقلاب“، - ۱۰ دسمبر ۱۹۳۱ء -
- ۲ - ایضاً - ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء -
- ۳ - ایضاً - ۵ نومبر ۱۹۳۱ء -
- ۴ - Thoughts and Reflections of Iqbal - صفحات، ۲۰۲-۱۹۸ -
- ۵ - Muslim Separatism in India - ص ۲۱۰ -
- ۶ - Thoughts and Reflections of Iqbal - صفحات ۱۹۶-۱۹۸ -
- ۷ - Letters and Writings of Iqbal - ۸۰۹ -
- ۸ - ”انقلاب“، ۱۱ دسمبر ۱۹۳۱ء -
- ۹ - Thoughts and Reflections of Iqbal - ص ۲۰۰ -
- ۱۰ - ”انقلاب“، - ۱۳ دسمبر ۱۹۳۱ء -
- ۱۱ - ”انقلاب“، - ۱۳ جون ۱۹۳۱ء -
- ۱۲ - ایضاً - ۱۳ جون ۱۹۳۱ء -
- ۱۳ - ایضاً - ۳ جنوری ۱۹۳۲ء -
- ۱۴ - ایضاً - ۳ جنوری ۱۹۳۲ء -
- ۱۵ - ایضاً - ۱۸ دسمبر ۱۹۳۱ء -
- ۱۶ - ”ذکر اقبال“ - ص ۱۵۹ -



پچیسواں باب

نیا لائحہ عمل ، سرحد اور کشمیر

حضرت علامہ وطن کو لوٹے تو صوبہ سرحد برطانوی مظالم کے زخموں سے چور تھا اور سرزمین کشمیر کے مسلمان دار و رسن کی آزمائش سے گذر رہے تھے۔ گول میز کانفرنس کی ناکامی کی وجہ سے مسلمانوں کا سیاسی مستقبل مخدوش تھا۔ ان کی قیادت میں پنہون لاعلاج معدوم ہوتی تھی۔ کانگریس سول نافرمانی کے احیاء پر تلی بیٹھی تھی تاکہ مسلمانوں سے بالا بالا برطانوی سامراج سے مصالحت کے لیے زمین ہموار ہو سکے۔ برطانیہ میں لیبر پارٹی کا راج تھا۔ جس کی ہندو دوستی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ان حالات میں آل انڈیا مسلم کانفرنس نے لاہور میں اپنا اجلاس بلایا۔ جس کی صدارت حضرت علامہ نے فرمائی۔ علامہ نے ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو جو خطبہ ارشاد فرمایا، وہ نہ صرف برعظیمہ کی مسلم سیاست میں ایک منفرد اہمیت کا حامل تھا بلکہ علامہ کی زندگی میں بھی ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو ہر مسئلے پر نہایت جچے تلیے انداز میں بحث ہوئی۔ دوسرے، خطبہ کا مطالعہ ایک وسیع تر تناظر میں کیا گیا۔ چوتھے، ایک عادلانہ اور منصفانہ معاشی نظام کا بڑے واشگاف انداز میں تذکرہ کیا گیا۔ اس اعتبار سے خطبہ لاہور کو خطبہ الہ آباد پر فوقیت حاصل تھی اور سب سے بڑھ کر یہ، کہ حضرت علامہ نے اس خطبے میں نہایت واضح الفاظ میں

مسلمانانِ ہند کے لیے ایک لائحہ عمل تجویز کر دیا ، جس میں گہرائی بھی تھی اور گیرائی بھی اور جو وقت کی اہم پکار سے پوری مطابقت رکھتا تھا ۔

علامہ نے برعظیم کی سیاست کے نمایاں نقوش کی تصویر کشی کے بعد کہا : ”یہ مظاہر اس آنے والے طوفان کے آثار ہیں جو پورے ہندوستان ، بلکہ پورے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لیے لیے گا ۔ یہ ایک ایسی مکمل طور پر سیاسی تہذیب کا اٹل نتیجہ ہے ، جس نے انسان کو محض استحصال کے قابل چیز سمجھا اور یہ نہ سوچا کہ انسان ایک شخصیت ہے جسے خالص ثقافتی قوتوں سے نشوونما اور ترقی دینا ضروری ہے ۔ مغرب نے جو استحصالی معیشت رائج کی ہے اور جسے مشرق پر ٹھونس رکھا ہے ، ایشیا کی قومیں یقیناً اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی ۔ ایشیا اس جدید مغربی سرمایہ دارانہ نظام کا تصور ہی نہیں کر سکتا جو ایک بے لگام انفرادیت پر مبنی ہے ۔ جس دین کی آپ نمائندگی کرتے ہیں ، وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اسے ایک ایسے نظم و ضبط کے تحت لاتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندگانِ خدا کی خدمت میں صرف کر دے ۔ اس کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے ۔ یہ اب بھی ایک ایسی نئی دنیا تخلیق کر سکتا ہے ، جس میں انسان کی معاشری حیثیت کا تعین نہ ذات پات یا رنگ سے ہوتا ہے نہ اس دولت سے ، جو وہ کھاتا ہے ۔ بلکہ اس طرز زندگی سے ہوتا ہے جو وہ انسان بسر کرتا ہے ۔ ایک ایسی نئی دنیا ، جس میں غریب امیر پر ٹیکس لگاتا ہے ۔ جہاں انسانی معاشرہ مساواتِ شکم پر نہیں ، بلکہ مساواتِ ارواح پر مبنی ہوتا ہے ۔ جہاں ایک اچھوت کسی شاہزادی سے شادی کر سکتا ہے ۔ جہاں نجی املاک ایک امانت کی حیثیت رکھتی ہے اور جہاں سرمائے کے ایسے ارتکاز کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ حقیقی دولت آفرین طبقے پر غالب آ جائے ۔“

علامہ نے فرمایا : ”تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری کلامیوں اور فقیہوں کے فرسودہ اوبام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں، جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو آن معاشی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر بدل دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی آہنگ کو محسوس کرنے لگے۔ ہندی مسلمان اپنی اندرونی زندگی کی گہرائیوں کی تفتیش کو مدت سے ترک کر چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی زندگی میں رنگ و آہنگ اور رونق و درخشانی کا نشان تک نہیں رہا اور ہر وقت اس امر کا خطرہ ہے کہ کہیں وہ بعض طاقتوں سے، جن کے متعلق اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ انہیں کبھی جنگ میں شکست نہیں دے سکتا، بزدلانہ اور نامردانہ سمجھوتا نہ کر لے۔۔۔ بہرا واضح نصب العین یہ ہے کہ آنے والے دستور میں اسلام کے لیے ایسا مقام اور ایسی حیثیت حاصل کریں کہ وہ اس ملک میں اپنی تقدیر کے منشاء کو پورا کرنے کے مواقع پا سکے۔ اس نصب العین کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ قوم کی ترقی پسند طاقتوں کو بیدار کیا جائے اور اس کی حیات قوتوں کو منظم کیا جائے۔ شعلاً حیات دوسروں سے مستعد نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف اپنی روح کے آتش لگنے میں روشن دیا جا سکتا ہے۔“

یہ تھا وہ آئیڈیل، جسے حاصل کرنے کے لیے اقبال نے قوم کے سامنے ایک پنج نکاتی لائحہ عمل پیش کیا۔ اس کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی ساری سیاسی جماعتوں کو توڑ کر صرف ایک سیاسی جماعت

بنائی جائے۔ جس کی شاخیں تمام صوبوں اور اضلاع میں قائم کی جائیں ہر
 ہر دبستان خیال کے حاسی اسی جماعت کی رکنیت اختیار کریں اور اس کے
 آئین میں ایسی گنجائش ہو کہ کسی بھی دبستان خیال کے حامیوں کے
 لیے ممکن ہو کہ وہ اس میں برسرِ اقتدار آجائیں اور اپنی صواب دید کے
 مطابق کوئی پالیسی اختیار کریں۔ برسبیلِ تذکرہ، علامہ کی یہ تجویز
 کانگریس نے اختیار کر لی اور اس کے اندر الگ نظریات کی بنا پر گروپ
 بندی کی گنجائش پیدا ہو گئی۔

دوسرا نکتہ یہ تھا کہ یہ مرکزی جماعت کم از کم پچاس لاکھ روپے
 کا ایک قومی فنڈ جمع کرے۔ علامہ نے کہا، مجھے معلوم ہے کہ ہمارے
 حالات اچھے نہیں لیکن اگر مسلمانوں کو موجودہ صورتِ حالات کی نزاکت
 محسوس کرا دی جائے تو وہ اتنا سرمایہ ضرور اکٹھا کر دیں گے۔

تیسرا نکتہ یہ تھا کہ مرکزی تنظیم کی رہنمائی میں یوتھ لیگیں بنائی
 جائیں اور کیل کانٹے سے لیس رضا کاروں کے دستے منظم کیے جائیں۔ ان
 کے فرائض ہوں۔ خدمتِ خلق، رسوم و رواج کی اصلاح، قوم کی تجارتی
 تنظیم اور شہروں، قصبوں اور دیہات میں معاشی پروپیگنڈہ۔ معاشی
 پروپیگنڈے کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا کہ پنجاب
 کے مسلمان کسانوں کا بال بال قرضے میں بندھا ہے اور حالات ویسی ہی
 منزل پر پہنچ چکے ہیں، جہاں چین میں ۱۹۲۵ء میں پہنچے تھے اور ملک
 بھر میں کسانوں کی انجمنیں وجود میں آ گئی تھیں۔ انہوں نے کہا، پنجاب
 کے کسانوں کا استحصال ساہوکاروں اور تجارتی گہشتوں کے ہاتھوں ہو رہا
 ہے۔ انہیں معاشی غلامی سے نجات دلانے کے لیے یوتھ لیگیں بہت کچھ
 کر سکتی ہیں۔ آپ نے کہا: ”میری رائے میں ہندوستان میں اسلام کے
 مستقبل کا بڑی حد تک دار و مدار پنجاب کے مسلمان کسانوں کی آزادی پر

ہے۔ آتشِ شباب کو آتشِ ایمان سے ملا دو۔ تاکہ زندگی کی چمک دمک دو آتشہ ہو جائے اور مستقبل کی نسلوں کے لیے ایک دنیاۓ عمل تخلیق ہو جائے۔“

چوتھا نکتہ یہ تھا کہ برعظیم کے تمام بڑے شہروں میں مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ کچرل انسٹی ٹیوٹ یا ثقافتی ادارے قائم کیے جائیں۔ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہو اور ان کا فرض صرف یہ ہو کہ اسلام نوعِ انسانی کی مذہبی اور ثقافتی تاریخ میں کیا کچھ کر چکا ہے اور مستقبل میں کیا کچھ کرنے کے قابل ہے۔ یہ ادارے مسلمانوں کی قدیم و جدید درس گاہوں سے رابطہ قائم رکھیں تاکہ بہاری تعلیمی مساعی کے سارے خطوط ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جائیں۔ اس سلسلے میں علامہ نے حکومت ہند کی مقرر کردہ پارٹوگ کمیٹی کی اس سفارش پر عمل درآمد کا مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے اور انہیں زیادہ تعداد میں ابتدائی تعلیم کی رغبت دلانے کے لیے سرکاری مدارس میں دینی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

پانچواں نکتہ یہ تھا کہ علماء کی ایک اسمبلی مقرر کی جائے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کی تجویز کا پورا متن درج کر دیا جائے: ”میری تجویز ہے کہ علماء کی ایک اسمبلی بنائی جائے۔ جس میں ایسے وکلاء بھی ضرور شامل کیے جائیں جو جدید اصول و قانون کی تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ اسلامی قانون کی حفاظت کی جائے، اسے توسیع دی جائے اور ضرورت پڑنے تو جدید حالات کی روشنی میں، لیکن اس کے بنیادی اصولوں کی روح کے فریب رہتے ہوئے، اسلامی قانون کی باز تعبیر ہو سکے۔ اس اسمبلی کو آئینی حیثیت حاصل ہونی چاہیے تاکہ مسلمانوں کے شخصی قانون کو متاثر کرنے والا کوئی مسودہ

قانون اس اسمبلی کی منظوری کے بغیر قانون ساز اداروں میں پیش نہ ہو سکے۔ مسلمانانِ ہند کے لیے اس تجویز کی خالص عملی قدر و قیمت سے قطع نظر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جدید اسلامی اور غیر اسلامی دنیا کو ابھی اسلام کے قانونی ادب کی لامتناہی قدر و قیمت کو دریافت کرنا ہے اور اس عالمِ سرمایہ داری کے لیے بھی اس کی اہمیت سے آگاہ ہونا ہے، جس کے اخلاقی معیار ایک عرصے سے انسان کے معاشی طریقِ کار کی نگرانی سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ میری تجویز کے مطابق اسمبلی بن گئی تو مجھے یقین ہے کہ اس سے کم از کم اس ملک میں اسلام کے عمومی اصولوں کا زیادہ گہرا ادراک پیدا ہوگا۔“

یہ پنج نکاتی لائحہ عمل بھی اقبال کی پیش بینی اور مستقبل شناسی کا بڑا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ چند سال کے اندر اندر آل انڈیا مسلم لیگ برعظیم کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن گئی۔ بہت سی دوسری جماعتیں اس میں مدغم ہو گئیں اور جو الگ رہیں وہ پٹ گئیں۔ تحریک پاکستان اس وقت کامیاب ہوئی، جب پنجاب کے کسان جاگیرداروں کی سیادت کو توڑ کر اس کا ہراول دستہ بن گئے اور جب علیحدہ مملکت بن گئی تو مدتوں کی جدوجہد کے بعد ایک ایسا آئین نافذ ہوا جس میں اسلامی مشاورتی کونسل کا منصب یہ قرار پایا کہ موجودہ قوانین کو مطابق شریعت بنایا جائے اور کوئی ایسا نیا قانون نافذ نہ ہونے دیا جائے جو اسلامی قانون سے متصادم ہوتا ہو۔

خطبے کے ابتدائی حصے میں علامہ نے تین مسائل پر روشنی ڈالی۔

اول : دوسری گول میز کانفرنس میں مسلم وفد کی کارکردگی اور نااہلی کی داستان۔ دوم : صوبہ سرحد کا مسئلہ۔ سوم : کشمیر کا مسئلہ۔ اول الذکر

موضوع پر اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا ، ان کا تجزیہ گذشتہ باب میں ہو چکا ہے ۔ سرحد کے بارے میں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ۱۹۳۱ء میں کس طرح برطانوی سامراج نے پٹھانوں کے جذبہٴ حریت کو بہ نوکِ سنگین کچل دالا ۔ ۱۹۳۲ء میں برطانیہ نے مسئلہ کی اہمیت کو سمجھ لیا اور مسلمانوں کا یہ دیرینہ مطالبہ مان لیا کہ صوبہٴ سرحد میں آئینی اصلاحات نافذ کر دی جائیں ۔ لیکن اقبال نے کہا کہ اس میں جو خوبی کا پہلو تھا ، اسے ایک قسم کا مارشل لاء قائم کر کے ختم کر دیا گیا ۔ ہزارہا مسلمانوں کو نظر بند کیا گیا ۔ ان کے خلاف مقدمات چلائے گئے ۔ حکومت نے ایک ہاتھ سے مراعات دینے اور دوسرے ہاتھ سے ظلم کرنے کی جو پالیسی اختیار کی ، وہ افغانہ جیسی خود دار نسل کے لیے موزوں نہیں ۔ علامہ نے فرمایا : ”عبدالغفار خان یقیناً نوحوان سرحدی افغانہ میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک ہیں ۔ لیکن جس چیز نے ان کے اثر و رسوخ کو پوزے صوبہٴ سرحد کے بے خبر دیہاتیوں تک پھیلا دیا ، وہ ظلم کی پالیسی تھی ۔“ علامہ نے بتایا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی کل بند پالیسی یہ تھی کہ ایسے رجحانات کی روک تھام کی جائے جن کے طفیل سرحد کے مسلمان ان لوگوں سے رشتہ جوڑ لیں جو کانگریس میں مسلمانوں کی غیر مشروط شرکت کے حامی ہیں ۔ بہر حال جب علامہ نے یہ باتیں کہیں تو ، پانی سر سے گذر چکا تھا اور انگریزوں کی مستعدانہ پالیسی نے طفیل سرحد کے مسلمانوں کو عملاً کانگریس سے وابستہ ہو چکے تھے ۔

شعیر کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے علامہ نے کہا کہ جن لوگوں کی اناہ کا شعلہ مدتوں سے بجھ چکا تھا ، وہ ایک بار پھر حیات آشنا ہوئے ہیں ۔ اور اگرچہ یہ عمل اپنے جلو میں المیے بھی لایا ہے لیکن یہ ان لوگوں کے لیے مسرت کا پیام لایا ہے جنہیں جدید ایشیائی قوموں کی

داخلی جدوجہد کا ادراک ہے۔ علامہ نے بتایا کہ بات سیدھی سادی تھی کہ لوگ انسانی حقوق چاہتے تھے۔ لیکن ایک تو ڈوگرہ شاہی نے اسے ہندو مسلم مسئلہ بنایا، دوسرے، ظلم کے پہاڑ توڑے اور اب صورت یہ ہے کہ ہر طرف لاقانونیت کا دور دورہ ہے۔ آپ نے یہ موقف اختیار کیا کہ اب تحقیقاتی کمیٹیوں سے معاملہ حل نہیں ہوگا۔ سیامی شعور اس منزل پر پہنچ گیا ہے کہ عوام نظم و نسق میں دخیل ہونے کے بغیر چین نہیں لیں گے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک منتخب شدہ اسمبلی وجود میں آئے اور اگر حکام نے اور برطانوی راج نے معاملے کی اصل نوعیت کو نہ سمجھا تو پھر یہ مسئلہ روز بروز زیادہ پیچیدہ ہوتا چلا جائے گا۔

اس خطبے سے مجموعی تاثر یہ ملتا ہے کہ علامہ میں بعض سرکار پرست مسلمان رہنماؤں کی طویل صحبت سے جو مصلحت اندیشی پیدا ہو چکی تھی اور جس کی وجہ سے وہ مسائل پر اظہارِ خیال میں کچھ حجابات، کچھ احتیاط کوشی اور کسی قدر عافیت کوشی کی روش پر گزرنے لگے، گول میز کانفرنس کے تجربے نے وہ حجابات توڑ دیے اور وہ ہر مسئلے پر کھرمے کھرمے، جچے تلے انداز میں گفتگو کرنے لگے اور غیر ضروری مصلح سے اجتناب کرنے لگے۔ یہ ایک بڑی تبدیلی تھی جس سے حضرت علامہ کی سیاسی شخصیت میں ایک نیا نکھار پیدا ہو گیا اور وہ عوام میں پہلے سے کہیں زیادہ محبوب و محترم ہو گئے۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے نمایاں اور سربراہانہ رکن کی حیثیت سے حضرت علامہ نے بعض معزز اور تجربہ کار وکلاء کو سری نگر بھیجا تا کہ وہ مسلمان قیدیوں کو قانونی امداد فراہم کریں۔ اندرونِ خانہ علامہ نے اصلاحِ احوال کی سعی جاری رکھی۔ نواب صاحب بھوپال سے آن کے

پرانے روابط تھے اور مہاراجہ کشمیر نواب بھوپال کے دوست تھے۔ اس لیے آپ نے نواب بھوپال سے کہا کہ وہ کشمیری مسلمانوں کے مسئلے میں کچھ مدد دیں۔ چنانچہ آئینی مطالبات پر غور کرنے کے لیے مہاراجہ کشمیر نے گلینسی کمشن قائم کیا۔ لیکن جب ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس ہوا تو کانفرنس نے اس بناء پر اسے ناقابل قبول قرار دیا کہ کمشن کے مسلمان ممبروں کو مسلمانوں کی مرضی لیے بغیر نامزد کر دیا گیا ہے۔ کانفرنس نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ شیخ محمد عبداللہ اور قاضی گوہر رحمن کو جیل سے رہا کیا جائے تاکہ وہ مسلمانوں کے مطالبات کمشن کے سامنے پیش کر سکیں۔ ۲

ایک طرف مجلس احرار اسلام نے کشمیری مسلمانوں کی حمایت میں سول نافرمانی جاری کر رکھی تھی اور اس کے برابر کارکن اور رضاکار جیلوں میں بند تھے۔ دوسری طرف آل انڈیا کشمیر کمیٹی آئینی طریقوں سے کشمیری مسلمانوں کے موقف کو مضبوط بنا رہی تھی اور امدادی کام بھی کر رہی تھی۔ کشمیر کے اندر بعض عناصر مجلس احرار اسلام کے حامی تھے، بعض آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے۔ احرار کی طرف سے یہ الزام دیا جا رہا تھا کہ کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود احمد اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے تحریک احمدیت کو فروغ دے رہے ہیں اور جو لوگ امدادی کاموں کے لیے بھیجے جاتے ہیں وہ ہیں مخصوص مذہبی عقیدے کی نشر و اشاعت بھی کرتے ہیں۔ خود کشمیر کمیٹی کے اندر بھی ایسی شکایات ہو رہی تھیں اور علامہ کو بھی ان شکایات سے اتفاق تھا۔ شاکی حضرات نے سوچا کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کو جو لامحدود اختیارات حاصل ہیں، ان میں کمی کی جائے۔ اس سلسلے میں سالک رقمطراز ہیں: "کشمیر کمیٹی اب تک کسی دستور

کی تدوین کے بغیر ہی کام کر رہی تھی اور صدر یعنی مرزا صاحب کو غیر محدود اختیارات دے گئے تھے۔ لیکن جب تحریک کشمیر نے طول کھینچا تو خیال پیدا ہوا کہ کشمیر کمیٹی کا ایک باقاعدہ دستور تیار کیا جائے۔ اس پر احمدیوں نے مخالفت کی کیونکہ وہ اس ترتیب دستور کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ہم کو اور ہمارے امام کو بے دخل کرنا مقصود ہے۔ اختلاف پیدا ہوا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور علامہ اقبال آن کی جگہ عارضی طور پر صدر منتخب ہوئے۔“ ۳

علامہ نے ریاست الور کے مسئلے میں بھی گہری دلچسپی لی۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ ریاست الور کی چند مسجدوں پر غیر مسلموں نے ایک عرصے سے قبضہ کر رکھا تھا۔ ۱۰۱۸ء سے سکولوں میں اردو اور فارسی کی تعلیم بند تھی۔ مذہبی تعلیم پر پابندیاں عائد تھیں اور ملازمتوں میں بھی مسلمانوں کا حصہ بہت کم تھا۔ مسلمانوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے انجمن خادم المسلمین قائم کی۔ حکومت نے پہلے پکڑ دھکڑ سے کام لیا، اس کے بعد انجمن کو خلاف قانون قرار دیا۔ اس پر مسلمانوں نے مظاہرے کیے۔ آن پر گولی چلائی گئی اور دہشت کا ایسا سماں طاری کر دیا گیا کہ ہزار ہا لوگوں نے ترک وطن کیا۔ حضرت علامہ نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے مارچ سیشن میں مندوبین کی توجہ ان مظالم کی طرف دلائی۔ فیصلہ ہوا کہ مولوی شفیع داؤدی کی رہنمائی میں ایک وفد مہاراجہ الور سے ملے۔ لیکن مہاراجہ نے ملاقات ہی سے انکار کر دیا۔ مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے جون میں ایک غیر جانب دار تحقیقاتی کمیٹی کے قیام کا مطالبہ کیا۔ یہ بھی مسترد ہو گیا۔ اس پر کانفرنس نے

وائسرائے کے نام ایک یادداشت بھیجی ۴۔ بعد میں الور کے حالات اتنے بگڑے کہ سہارا جہ الور گدی سے اتار دیے گئے۔

فروری ۱۹۳۲ء میں حضرت علامہ کی کتاب ”جاوید نامہ“ منظر عام پر آئی۔ اس کا تعارف ہم خود علامہ کی زبانی ایک گذشتہ باب میں کر چکے ہیں۔ ۶ مارچ کو لاہور کی ایک اہم علمی مجلس اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے پہلی مرتبہ یوم اقبال منایا۔ پہلے دن وائی ایم سی اے ہال میں دو نشستیں منعقد ہوئیں۔ ایک کی صدارت پنجاب ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس آغا حیدر نے کی اور دوسری نشست کی ڈاکٹر ثانی سرور بھٹیناگر نے، جو اردو زبان کے بڑے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان نشستوں میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حکیم احمد شجاع، (ڈاکٹر) سید محمد عبداللہ، شیخ اکبر علی ارسطو، محمد دین تاثیر اور دوسرے حضرات نے تقریریں کیں۔ دوسرے دن علامہ کے اعزاز میں لاہور کے مشہور رستوراں ”لورینگز“ میں ایک عصرانہ دیا گیا۔ جس میں مقامی معززین کثرت سے موجود تھے۔ اس دعوت میں علامہ نے اس تحریک کی تحسین فرمائی جو مسلمان نوجوانوں میں اسلامی ادبیات، اسلامی تاریخ اور اسلامی تمدن کی تحقیق کے لیے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی صورت میں ابھری تھی۔ ۵ اسی سال لاہور کے مشہور ادبی رسالے ”نیرنگ خیال“ نے علامہ کے تراجم اور تراجم کے ذریعے اقبال پر ایک ضخیم اقبال نمبر شائع کیا۔

اسی سال جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر راجہ کے مشہور سیامت دان رؤف بے دہلی تشریف لائے۔ موصوف لسی زمانے میں ترہمہ میں وزارت عظمیٰ پر بھی فائز رہے تھے لیکن لہل اتاترک کے زمانے میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے جامعہ ملیہ میں چھ لیکچر دیے، جس

میں دو لیکچروں کی صدارت حضرت علامہ نے فرمائی۔ پہلے لیکچر کے بعد انہوں نے اتحادِ اسلامی پر خود بھی خطبہ دیا۔ لوگ دوسرے دن بھی متوقع تھے کہ رؤف بے کے ساتھ ساتھ علامہ کے ارشادات سے مستفید ہوں گے لیکن دوسرے دن علامہ نے صرف چند منٹ تقریر کی اور آخر میں یہ لطیفہ سنا کر حاضرین کو لوٹ پوٹ کر دیا :

”جنگِ عظیم کے ایام میں ابلیس کے چند مرید اس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھا ہوا سگار پی رہا ہے۔ اس سے بیکاری کا سبب دریافت کیا تو جواب دیا۔ آج کل مجھے پوری فرصت ہے۔ اس لیے، کہ میں نے اپنا سارا کام برطانیہ کی وزارت کے سپرد کر رکھا ہے۔“

۱۹۳۲ء کے وسط میں ایک ایسا علمی مسئلہ اٹھا، جس کے ڈانڈے سیاست سے بھی ملتے تھے۔ اس لیے اس سے عوام بھی متاثر ہوئے اور خواص بھی۔ بات یہ ہوئی کہ پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کا مضمون بی۔ اے پاس کورس میں بھی شامل تھا اور آنرز کورس اور ایم۔ اے میں بھی۔ جب پروفیسر جے۔ ایف۔ بروس یونیورسٹی میں تاریخ کی تدریس پر فائز ہوئے، انہوں نے ہندوؤں کے زیر اثر آ کر یہ تجویز پیش کی کہ بی۔ اے پاس کورس میں سے اسلامی تاریخ کو حذف کر دیا جائے۔ چونکہ علمی اعتبار سے بھی یہ کوئی مناسب تجویز نہیں تھی، اس لیے سینٹ میں اس پر شدید اختلاف رائے ہوا اور تجویز منظور ہوئی تو صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے۔ اس پر مسلمان عوام میں اشتعال پیدا ہوا۔ جلسے ہونے لگے۔ لاہور میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے حضرت علامہ کی صدارت میں ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ علامہ نے فرمایا کہ جو کچھ ہوا شرارت کے طور پر ہوا۔ بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کے نصاب میں

اسلامی تاریخ کو اس لیے برقرار رکھا گیا ہے کہ ان میں امیدواروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور بی۔ اے پاس کورس سے اس لیے حذف کر دیا گیا کہ اس میں امیدواروں کی کثرت ہوتی ہے۔ علامہ نے کہا کہ پروفیسر بروس کا استدلال یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ہندوستان کی تاریخ پڑھنی چاہیے۔ میرے نزدیک یہ دعویٰ غلط ہے کہ کسی قوم کی تاریخ کو اپنی تاریخ نہ سمجھا جائے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے۔ روح انسانی کا کوئی مخصوص ماحول نہیں ہوتا۔ بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہوتا ہے۔ اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے۔ علامہ نے یہ بھی بتایا کہ ایک اطالوی محقق نے اپنی پوری زندگی اور مادی وسائل اسلامی تاریخ کے مطالعے کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اسلامی تاریخ سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ تو اس نے کہا اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے!

علامہ کے کردار کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ جب بھی کوئی بحرانی کیفیت پیدا ہوتی اور جب بھی قوم کسی وقتی مسئلے سے متاثر ہو کر بے چین اور مضطرب ہو جاتی، وہ یہ سوچتے کہ قوم کی صلاحیتوں کو تعمیر کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ چنانچہ اسی جلسے میں انہوں نے اس تجاویز پیش کر دیں:

اول: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے کہا کہ وہ عوام کی رہنمائی کے لیے آسان اردو یا پنجابی میں ایسے لیکچروں کا خاص بندوبست کرے، جن سے عوام اسلامی تاریخ کے نمایاں نقوش سے آگاہ ہو جائیں اور پھر اسی قسم کا اہتمام دوسرے شہروں میں کیا جائے۔

دوم : انجمن حمایتِ اسلام غرض مند ہاتھوں میں ایک کھیلونا بننے کی جگہ تمام آزاد طبع لوگوں کے تعاون سے ایک ایسا ادارہ قائم کرے ، جہاں تاریخِ اسلام کی تعلیم کا بہترین بندوبست ہو۔ اسلامی ممالک کی مجموعی آبادی ہندوستان کی مسلمان آبادی کے قریباً مساوی ہوگی۔ ایسے میں ضروری ہے کہ ہم اس شعبے کی تدوین و تحقیق اور ترتیب و تنظیم پر توجہ دیں۔

سوم : ایک قرارداد کے ذریعے سے برعظیم کی تمام جدید و قدیم دینی درس گاہوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے نصاب میں ترمیم کر کے اسلامی تاریخ کو مسلمانوں کی تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیں۔

چند مہینے بعد انہی تجاویز کے وسعت اور جامعیت حاصل کر کے ایک نئی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ جس میں حضرت علامہ کے ساتھ دوسرے اہل علم و نظر حضرات بھی شامل تھے۔ ہماری مراد ادارہ معارفِ اسلامیہ کے قیام سے ہے۔ اس کا بنیادی مقصد ماضیاتِ اسلام کا تحفظ تھا اور اس کے مجوزہ دستور العمل میں لکھا گیا کہ ”جس حد تک ہندوستانی مسلمانوں اور عام مسلمانوں کی قدیم تاریخ کا تعلق ہے ، از بس ضروری ہے کہ اس مفید سلسلے کی طرف بہترین توجہات منعطف کی جائیں۔ کیونکہ مسلمانوں کو موجودہ دور جمود سے نکالنے اور آن میں ایک معنوی بیداری کی روح پھونکنے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔“ ادارہ معارفِ اسلامیہ کے مقاصد یہ تھے کہ اسلامی علوم کے محققین کے درمیان اشتراکِ عمل پیدا کیا جائے ، ذہنی اور اجتماعی اتحاد وجود میں لایا جائے ، علمی مشاغل میں جو رکاوٹیں اور مشکلات پیش آئیں انہیں دور کیا جائے ، محققین کے اجتماع منعقد کیے جائیں اور بیرونی مستشرقین

کو بھی مدعو کیا جائے۔ ارتقائے تمدنِ اسلامی کے سلسلے میں اہلِ دانش کی مختلف خدمات کو منظرِ عام پر لایا جائے اور جب آمدنی کافی ہو تو ایک دارالکتب، ایک دارالاشاعت اور ایک ایوانِ نواذرِ علمیہ قائم کیا جائے۔ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ ادارے کی وسعتِ کار حسبِ ذیل دوائر پر مشتمل ہوگی: ادبیات و لسانیات، اخبار و آثار، جغرافیہ و سیاحت، مذہبیات، فلسفہ، عمرانیات، فنونِ لطیفہ، علومِ حکمیہ، صنعت و حرفت اور قومیات۔ ۸

اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی حوصلہ افزائی، اسلامی تاریخ کے مطالعے کے لیے انجمنِ حمایتِ اسلام اور دینی درس گاہوں سے اپیل اور ادارہ معارفِ اسلامیہ کا قیام — یہ سب اس قومی لائحہ عمل کے شاخصانے تھے جو حضرت علامہ نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس لاہور میں اپنے خطبہٴ صدارت میں پیش کیا۔ جہاں تک اس لائحہ عمل کے سیاسی پہلوؤں کا تعلق تھا، ان کے سلسلے میں جو پیش رفت ہوئی، اس کی داستان اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیے۔

حوالے

- ۱ - Thoughts and Reflections of Iqbal - صفحات ۲۱۹-۱۹۵ -
- ۲ - "ذکرِ اقبال" - ص ۱۷۳ -
- ۳ - ایضاً - صفحات ۱۷۳-۱۷۳ -
- ۴ - "اقبال کا سیاسی کارنامہ" - صفحات ۱۸۶-۱۸۶ -
- ۵ - "انقلاب" - ۱ و ۹ مارچ ۱۹۳۲ء -
- ۶ - "ذکرِ اقبال" - ص ۱۷۶ -
- ۷ - "انقلاب" - ۱۳ جون ۱۹۳۲ء -
- ۸ - "انقلاب" - ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء -

۷

چھبیسواں باب

حقوق کی جنگ اور کمیونل ایوارڈ

اس صدی کے چوتھے عشرے کے ابتدائی سالوں میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ مؤثر سیاسی جماعت مسلم لیگ نہیں تھی مسلم کانفرنس تھی۔ وہی ، جس کا آغاز آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے نام سے ہوا اور جو بعد میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے ایک مستقل سیاسی جماعت کی صورت اختیار کر گئی۔ مسلم لیگ کی کیفیت یہ تھی کہ ۱۹۳۰ء کے الہ آباد میٹن کے بعد اس کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔ جناب محمد علی جناح حالات سے دل شکستہ ہو کر لندن میں جا بسے تھے۔ ۱۹۳۱ء کے آخر میں مسلم لیگ کا جو میٹن دہلی میں ہوا ، وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ کیونکہ صدارت کے لیے سر ظفر اللہ چنے گئے تھے اور آن کے احمدی عقیدے کی وجہ سے مسلمان مخالف تھے۔ عوامی غصے کا یہ عالم تھا کہ لیگ کا اجلاس ایک نجی مکان میں کرنا پڑا۔ اس کے بعد لیگ آگے از کم تین متوازی جماعتوں میں بٹ گئی اور تینوں بے اثر تھیں۔ ۱۹۳۲ء میں لیگ کا دور اجلاس نہ ہو سکا۔ مسلمانوں کی تیسری سیاسی جماعت آل انڈیا خلافت کمیٹی تھی۔ یہ نام کو تو قائم تھی لیکن اس کا وجود بھی عدم وجود کے برابر تھا۔ کیونکہ کچھ رہنما کانگریس میں شامل ہو گئے ، کچھ مسلم کانفرنس میں ، اور پنجاب کے ایک گروہ نے مجلس احرار کی صورت اختیار کر لی۔

۱۹۳۲ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر حضرت علامہ تھے اور یہی سال مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے سلسلے میں فیصلہ کن سال

تھا۔ اس لیے اس زمانے میں علامہ ہی برعظیم کے مسلمانوں کے سب سے بڑے قائد تھے اور انہوں نے اس قیادت کو خوب نباہا اور مسلمان دشمن عناصر کے خلاف جنگ میں اپنی جملہ صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا اور اس سے ٹھوس نتائج برآمد ہوئے۔ علامہ کی اس جدوجہد کے خدوخال سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل حقائق پیش نظر رکھنے ضروری ہیں :

اول : سکھوں کے سوا باقی تمام اقلیتوں نے فرقہ واریت کے مسئلے پر گول میز کانفرنس کے دوران میں جو مفاہمت کی تھی، اس سے حکومتِ برطانیہ آگاہ تھی۔

دوم : دوسری گول میز کانفرنس کے آخر میں برطانوی وزیراعظم رامزے میکڈانلڈ یہ اعلان کر چکے تھے کہ مندوبین آپس میں معاہدہ نہیں کر سکتے، اس لیے حکومتِ برطانیہ مجبور ہے کہ نہ صرف فرقہ واریت کے مسائل پر اپنا فیصلہ دے بلکہ ایسی صورت بھی پیدا کرے کہ اکثریتی طاقت کی وساطت سے جمہوری اصول کا کوئی جابرانہ استعمال نہ ہو سکے۔

سوم : آل انڈیا مسلم کانفرنس اپنے لاہور سیشن میں قومی مطالبات کو دہرا چکی تھی اور یہ کہہ چکی تھی کہ حکومتِ برطانیہ اپنے فیصلے کا جلد از جلد اعلان کر دے۔ اور اگر یہ اعلان جون ۱۹۴۲ء کے اواخر تک نہ ہو، تو مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ ۳ جولائی کو ایک اجلاس میں ”راست اقدام“ کا پروگرام طے کرے گی۔

چہارم : کانگریس نے حکومتِ برطانیہ سے اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرانے کی غرض سے سول نافرمانی کا بازار پھر سے گرم کر رکھا تھا۔

پنجم : برطانوی وزیراعظم رامزے میکڈانلڈ لیبر پارٹی کے قائد تھے اور اس پارٹی کی ہندو نوازی یا کانگریس نوازی ایک جانی پہچانی بات تھی۔ اسی رعایت سے بعض مسلمان موصوف کو رام جی مکندامل کہتے تھے۔ مسلمانوں کو تشویش تھی کہ جس فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان موصوف کریں گے، شاید وہ ان کے مقاصد کی نفی کرے اور ہندوؤں کی پروپیگنڈا مشینری بھی ایسا ہی تاثر دے رہی تھی کہ یہ فیصلہ مسلمانوں کی آرزوؤں کے مطابق نہیں ہوگا۔

حضرت علامہ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے چومکھی جنگ لڑنا پڑی۔ کانگریس کے خلاف، جو سول نافرمانی کے ذریعے سے حکومت برطانیہ کو بلیک میل کر رہی تھی۔ حکومت برطانیہ کے خلاف، جس کے طرز عمل کے بارے میں مختلف النوع شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ سکھوں کے خلاف، جو ہندوؤں سے گہرا تال میل رکھ کر مسلمانان پنجاب کو قانونی اکثریت سے محروم کرنے پر تلے بیٹھے تھے اور ”قوم پرست مسلمان“، نیک نیتی سے یا بدنیتی سے کانگریس کے آگے کار بن کر مسلم کانفرنس کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنے موقف میں لچک پیدا کرے۔

سکھوں کی آبادی پنجاب میں صرف تیرہ فی صد تھی۔ لیکن وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر پنجاب کونسل میں اکثریت بننے کا خواب لے رہے تھے۔ دوسری طرف یہ کوشش بھی ہو رہی تھی کہ ہندوؤں میں بھی مسلمان قانونی اعتبار سے اکثریت میں نہ رہیں۔ اس پر حضرت علامہ نے حاجی رحیم بخش، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، سید محسن شاہ اور مواوی غلام محی الدین قصوری کی رفاقت میں ایک بیان جاری کیا۔ جس میں لکھا کہ ”ہم اس

اس کا فیصلہ دنیا پر چھوڑ دیتے ہیں کہ جس حالت میں ہندو اور سکھ مسلمانوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ چھ صوبوں اور مرکز میں اپنے آپ کو عظیم ہندو اکثریت کے حوالے کر دیں۔ وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی شدید مخالفت کر کے ہندوستان بھر کی ہندو اکثریت کی نیک نیتی کا نقش کس حد تک بٹھا سکیں گے اور مسلمانوں کے قلوب میں ان کی طرف سے کس حد تک اعتماد پیدا ہوگا۔،، اسی بیان میں پنجاب کے مخصوص مسئلے کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا : ”ان (سکھوں) کی دلچسپ تجویز یہ معلوم ہوتی ہے کہ تیرہ فی صد کی اقلیت اور ستاون فی صد کی اکثریت کے تفاوت کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور ملک بھر کے فرقہ وار مسائل کی اہمیت سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو پنجاب کونسل میں یکساں نیابت دی جائے۔ یا بہ الفاظ دیگر ستاون فی صد کی اکثریت کو چالیس فی صد کی اقلیت میں تبدیل کر دیا جائے اور سکھوں اور ہندوؤں کی آنتالیس فی صد مشترکہ اقلیت کو ستاون فی صد کی اکثریت کے برابر کر دیا جائے۔ یہ وہ استدلال ہے جسے منطق اور عقل و خرد سے کوئی واسطہ نہیں۔،، علامہ اقبال اور آن کے ساتھیوں نے ایک طرف برطانیہ کو انتباہ کیا کہ وہ اس فریب میں نہ آئے اور دوسری طرف مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے آپ کو منظم کریں۔ ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ کے نامہ نگار نے اس اعلان کے بعد علامہ سے ملاقات کی تو انہوں نے فرمایا : ”اس مسئلے پر آل انڈیا نقطہ نگاہ سے غور کرنا چاہیے۔ آٹھ صوبوں میں سے دو میں مسلمانوں کی اکثریت کو یقینی بنا دینے سے مسلمانوں کو آل انڈیا اقلیت کی حیثیت میں اپنی مستقل شخصیت کے اظہار کا موقع ملے گا۔،، ۲

۱۹۳۲ء کے وسط میں حضرت علامہ کی قائدانہ صلاحیت پر ایک کڑی

آزمائش کا وقت آیا۔ کیونکہ جس جماعت کے وہ صدر تھے، اس کے اندر
 ایک بحران پیدا ہوا اور خود علامہ کی ذات گرامی نکتہ چینی کا ہدف بنی۔
 بہر حال انہوں نے بہت جلد اس بحران پر قابو پا لیا۔ نہ صرف ان کی اپنی
 پوزیشن صاف ہو گئی، بلکہ جماعتی اتحاد بھی برقرار رہا۔ بات یہ ہوئی کہ
 جب جون کے اواخر تک وزیراعظم برطانیہ نے فرقہ واریت کے فیصلے کا اعلان نہ
 کیا، تو کانفرنس کے سیکرٹری مولوی شفیع داؤدی نے مارچ سیشن کی
 قرارداد کے مطابق راست اقدام پر غور کرنے کے لیے الہ آباد میں ۳ جولائی
 کو مجلس عاملہ کا اجلاس بلا لیا۔ علامہ نے اسے جولائی کے اواخر تک
 ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا کیونکہ ان کے نزدیک فرقہ واریت کے فیصلے
 میں تاخیر سے زیادہ اہم بات اس کی نوعیت تھی اور نوعیت ہی پر مستقبل
 کے پروگرام کا انحصار تھا۔ ۳ اس پر مولوی شفیع داؤدی مستعفی ہو گئے
 اور ۳ جولائی کو الہ آباد میں ایک جلسہ عام ہوا، جس میں مولانا حسرت
 موہانی نے بھی شرکت کی۔ اس جلسے میں التواء کے اعلان کو علامہ
 کی آمریت بتایا گیا اور جن ارکان کو ان سے اختلاف تھا، انہوں نے
 فیصلہ کیا کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اندر رہ کر ایک انڈی پنڈنٹ
 پارٹی بنائی جائے۔ علامہ کا سیاسی تدبیر ملاحظہ ہو کہ انہوں نے ۳ جولائی
 کو جو وضاحتی بیان جاری کیا، اس میں انڈی پنڈنٹ پارٹی کے قیام کا
 خیر مقدم کیا اور بتایا کہ میں نے تو لاہور سیشن کے خطبہ صدر ہی
 میں یہ تصور پیش کیا تھا کہ مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت کے اندر
 مختلف زاویہ نگاہ رکھنے والوں کے لیے ایسی گنجائش پیدا ہونی چاہیے کہ
 وہ ایک گروپ بنا لیں۔ انہوں نے بتایا کہ التواء کا فیصلہ ارکان کے اصرار
 پر ہوا۔ بلکہ شمال میں مجلس عاملہ نے مولوی شفیع داؤدی سے کہا تھا

کہ اگر فرقہ وار فیصلہ منظرِ عام پر نہ آئے، تو راست اقدام والا اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ حضرت علامہ نے کہا: ”ان حالات میں مجھے آس قرار دینا نامناسب ہے۔ میرے نزدیک ارکان کی اکثریت التواء چاہتی تھی۔ میری اپنی رائے بھی یہی تھی۔ اس مسئلے پر پورے غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگرچہ قوم کا فرض ہے کہ فرقہ وار فیصلہ آس کے خلاف جائے تو وہ حکومت سے برسرِ پیکار ہو لیکن میں صرف اس بناء پر قوم کو راست اقدام کا مشورہ نہیں دے سکتا کہ ایک خاص وقت کے اندر فرقہ وار فیصلے کا اعلان نہیں ہوا۔“، الہ آباد کے جلسہ عام میں یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ اقبال نے ”شملہ کے اشارہ چشم و ابرو، پر التواء کا فیصلہ کیا تھا۔ علامہ نے اس کے جواب میں کہا: ”میں نے اپنی سچی اور اجتماعی زندگی میں کبھی کسی اور شخص کے ضمیر کی پیروی نہیں کی۔ میں اس شخص کو اسلام اور انسانیت کے لیے باعثِ شرم سمجھتا ہوں، جو ایک ایسے وقت پر کسی اور کے ضمیر کی پیروی کرے جب قوم کے اہم مفادات داؤ پر ہوں۔“، آخر میں علامہ نے کہا۔ دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی قوتوں کا غیر ضروری معاملات پر ضیاع نہ کیا جائے۔ بلکہ انہیں حقیقی ضرورت کے وقت کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ اس بیان کے دو اڑھائی ہفتے بعد نئے گروہ کے ارکان حضرت علامہ سے لاہور میں ملے۔ کھل کر تبادلہ خیالات کیا اور آخر میں علامہ کے موقف کو قبول کر لیا۔ ۵ اس طرح مسلم کانفرنس کا داخلی بحران ختم ہو گیا۔

سکھ رہنماؤں کی مہم جاری تھی۔ بیانات، عرض داشتوں اور قراردادوں کا ایک طوفان کھڑا ہو رہا تھا۔ اور ایسی باتیں بھی کہی جا رہی تھیں، جن سے سکھ۔ مسلم کشیدگی سنگین صورت اختیار کر سکتی تھی۔ علامہ

نے اس منفی طرزِ عمل کی شدید مذمت کی اور ہندوؤں کو انتباہ کیا کہ وہ جس انداز سے سکھوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہی نکمے گا کہ اقلیتوں کے شکوک و شبہات اور اندیشے ہندوستان کے مستقبل کی تاریخ کو متاثر کریں گے۔ ۶۔ اتنے میں پنجاب کے وزیرِ زراعت اور علامہ کے پرانے دوست سردار جوگندر سنگھ نے علامہ کو ایک فارمولا بھیج کر ان کی رائے دریافت کی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ لندن میں سکھوں کے سوا باقی اقلیتوں نے جو معاہدہ کیا تھا، اس کی رو سے مسلمان مان گئے تھے کہ انہیں صوبہ پنجاب میں اکاون فی صد نیابت دے دی جائے۔ سردار جوگندر سنگھ نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کو اکاون فی صد نہیں، بلکہ صرف ایک رکن کی اکثریت قبول کر لینی چاہیے۔ لیکن اس کو بھی بڑی رعایت قرار دے کر سردار صاحب نے یہ شرط لکائی کہ مسلمان اس کے بدلے میں سکھوں کے لیے مرکزی مجلس قانون ساز میں پانچ فی صد، سرحد میں چھ فی صد نیابت اور مرکزی کابینہ میں ایک نشست کی حمایت کریں۔ یہ معاملہ ۱۰ اگست کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ میں پیش ہوا، لیکن یہ فارمولا مسترد کر دیا گیا۔ اس سے پہلے مجلس عاملہ نے حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان جلد کرے اور ساتھ ہی علامہ اقبال، مولانا مظہر الدین، مولانا حبیب، مولانا غلام رسول سہر، سید حسن ریاض اور جناب ڈاکٹر حسن پر مشتمل ایک کمیٹی کے سپرد یہ کام ہوا کہ اگر حکومتِ برطانیہ مسلمانوں کے کم از کم مطالبات تسلیم نہ کرنے، تو یہ کمیٹی مجلس عاملہ کے سامنے ایک قومی پروگرام پیش کرے۔ ۱۰

۱۶ اگست کو حکومتِ برطانیہ نے کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلے) کا اعلان کر دیا۔ اس کے مطابق جدا جدا انتخاب کو برقرار رکھا گیا۔

اقلیتوں کے لیے پاسنگ کا اصول لاگو رہا۔ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نیابت دی گئی۔ صوبہ سرحد میں اصلاحات کا نفاذ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب یہ فیصلہ بھی ہو گیا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے صوبے کی حیثیت دی جائے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کو قانونی طور پر تو تسلیم نہ کیا گیا، لیکن ایک ایسا بندوبست کر دیا گیا جس سے انہیں معمولی اکثریت حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ اس طرح، کہ صوبائی اسمبلی کی ایک سو پچھتر نشستوں میں سے چھیالیس نشستیں مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو گئیں اور جو نشستیں مخصوص مفادات کے لیے مخلوط انتخاب کے ذریعے سے پر ہونی تھیں ان میں چار مسلمانوں کو مل سکتی تھیں۔ بہر حال بنگال کے مسلمانوں کو یہ رعایت بھی نہ ملی۔ انہیں چون فی صد آبادی کے باوجود اڑتالیس فی صد سے کچھ زیادہ نیابت دی گئی۔

مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے کمیونل ایوارڈ پر نکتہ چینی کی اور کہا کہ دو اصول پیش نظر رکھنے ضروری تھے۔ کہ کوئی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائے اور اقلیتوں کے مفادات کی حفاظت کے لیے انہیں پاسنگ دیا جائے۔ لیکن دونوں کے نفاذ میں مسلمانوں کو نقصان میں رکھا گیا۔ حضرت علامہ نے ۲۴ اگست کو ایک بیان جاری کیا، جس میں ایوارڈ پر یہ اعتراض کیے:

اول : پنجاب میں سکھوں کو ان کے حق سے زیادہ پاسنگ دے کر۔ مسلم اکثریت کا انحصار اس بات پر ہے کہ مسلمان مخلوط انتخاب کے حلقوں سے کچھ نشستیں حاصل کریں۔

دوم : ہندوؤں کو صوبہ سرحد میں جتنا پاسنگ دیا گیا ہے، اتنا مسلمانوں کو کسی ہندو اکثریتی صوبے میں نہیں ملا۔

سوم : بنگال میں مسلمانوں کی نیابت اڑتالیس فی صد سے کچھ زیادہ رہ گئی ہے۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یورپی آبادی کا پاستنگ بڑھا دیا گیا اور ہندوؤں کو خوش کرنا مقصود تھا۔

علامہ نے بنگال کے مسلمانوں کے مسئلے کا یہ حل تجویز کیا کہ وہاں مجلس قانون ساز کے دو ایوان ہوں۔ ایوان زیریں میں مسلمانوں سے بے انصافی کا ازالہ یوں کیا جائے کہ ایوان بالا میں انہیں آبادی کے مطابق نیابت دی جائے اور یہ پابندی لگا دی جائے کہ جو بھی وزارت بنے گی، وہ دونوں ایوانوں کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ چونکہ دونوں ایوانوں کے ارکان کو ملا کر مسلمانوں کو اکثریت حاصل رہے گی، اس لیے وہ موجودہ فیصلہ قبول کر لیں گے۔ علامہ نے ایک اور نکتہ یہ پیش کیا کہ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ کس فرقے کو کتنی نیابت حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ صوبائی مجالس قانون ساز کو اختیارات کتنے دے جائے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اصل اقتدار منتقل ہو جائے، تو مسلمان اپنے اکثریتی صوبوں میں اپنی گذشتہ تاریخ اور روایات کے پیش نظر ہر قسم کی تنگ نظری سے آزاد ہوں گے اور آن کا اولین فرض یہ ہونا کہ ناخواندگی اور معاشی غلامی کے خلاف جنگ کریں۔ ۹

اس مرحلے میں ایک دلچسپ صورت پیدا ہوئی۔ کمیونل ایوارڈ میں اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق مل گیا تو کاندرم، جی نے وزیر اعظم برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ یہ حق واپس لے لیا جائے، ورنہ میں مرٹن ہرت رکھ لوں۔ علامہ اقبال نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اب ہندو قومیت کے تحفظ کا مسئلہ درپیش ہوا ہے، تو دندھی جی متحدہ قومیت کے اصول کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ آپ نے مرٹن ہرت کو خود کشی سے تعبیر کرتے ہوئے نامردی کا ثبوت قرار دیا اور کہا کہ اگر مسلمانوں میں

اچھوتوں کا وجود ہوتا اور اگر مجھے گاندھی جی کا سا طرز عمل اختیار کرنا پڑتا "تو میں حکومتِ برطانیہ کو دھمکی دینے کی بجائے اپنی قوم کو دھمکی دیتا اور بجائے اس کے ، کہ اچھوتوں کو حاصل شدہ تحفظ سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ، میں اپنی قوم کو اس بات پر مجبور کرتا کہ وہ ایک خاص مدت کے اندر اچھوت اقوام کے ساتھ مذہبی اور معاشرتی اعتبار سے کامل مساوات کے ساتھ پیش آئے۔" ۱۰ بہرحال گاندھی جی نے سن ۱۹۰۷ سے رکھا اور یہ رعایت لینے میں کامیاب ہو گئے کہ اچھوتوں کے لیے زیادہ نشستیں مخصوص کر کے ان کے حلقہ ہائے انتخاب ہندوؤں کے ساتھ مخلوط کر دیے گئے۔

"قوم پرست" یا نیشنلسٹ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کی قیادت ان کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے ، تو انہوں نے اچھوتوں اور ہندوؤں کے درمیان مفاہمت کو نظیر بنا کر ایک بار پھر ہندو مسلم مفاہمت کا شوٹہ چھوڑا۔ بلکہ اکتوبر کے آغاز میں بمبئی میں ہندو رہنماؤں کے ساتھ بات چیت بھی شروع کر دی۔ اس پر علامہ نے دوسرے بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں کی رفاقت میں ایک بیان جاری کیا۔ جس میں کہا کہ ہماری قوم اس نازک وقت میں جداگانہ انتخاب کا تحفظ کسی صورت میں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ بمبئی کے مذاکرات اسی تحفظ سے دست برداری کے لیے ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک جو مسائل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں ، ان کا بمبئی کے مذاکرات میں کوئی ذکر نہیں آ رہا۔ بہرحال بات چیت اس صورت میں ممکن ہے کہ ہندو واضح تجاویز پیش کریں۔ ۱۱

اب نیشنلسٹ مسلمانوں نے علامہ پر پے در پے دباؤ ڈالنا شروع کیا اور علامہ نے بڑے استقلال کے ساتھ مزاحمت فرمائی۔ مولانا شوکت علی اور شیخ عبدالمجید سندھی نے ۱۵ اکتوبر کو لکھنؤ میں مسلمان رہنماؤں

کی کانفرنس بلائی۔ علامہ کو بھی مدعو کیا۔ علامہ نے جواب دیا کہ سب سے پہلے ہندو اپنی قطعی تجاویز پیش کریں۔ پھر خلافت کمیٹی کے صدر کا تار آیا، تو انہیں بھی یہی جواب دیا۔ ۱۲ ڈاکٹر انصاری اور جناب شروانی نے برقیہ بھیجا کہ ہندو۔ مسلم۔ سکھ مسئلے کو حل کرنے کے لیے کانفرنس ہونی چاہیے۔ علامہ نے جواب دیا، پہلے ہندوؤں سے قطعی تجاویز طلب کیجیے۔ ۱۳ ایک اور قوم پرست رہنما سردار سلیمان قاسم مٹھا نے علامہ کو تار بھیجا کہ لکھنؤ کانفرنس سے علیحدگی نہایت مضر ثابت ہوگی۔ اس کے جواب میں علامہ نے فرمایا کہ "خدا کے لیے کانفرنس کو اس وقت تک منعقد نہ ہونے دیجئے، جب تک اکثریت کی طرف سے تجاویز پیش نہ کی جائیں۔ آپ پنجاب، بنگال اور سندھ کی رائے کو مدنظر رکھیں اور اس اتحاد کو ضائع نہ کریں جو بڑی جدوجہد کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔" ۱۴

بہر حال نیشنلسٹ مسلمان باز نہ آئے۔ انہوں نے ۱۶ اکتوبر کو لکھنؤ میں کانفرنس کر لی اور ایک قرارداد منظور کی۔ مالک لکھتے ہیں کہ "اس قرارداد کا منشا یہ تھا کہ اگر ہندو ان تیرہ مطالبات کو قبول کر لیں جو مسلم کانفرنس نے پیش کیے تھے تو مسلمان مخلوط انتخاب کو قبول کر لیں گے۔ چونکہ یہ موقف بالکل وہی تھا جو ابتدا میں مسلم کانفرنس نے اختیار کیا تھا، اس لیے علامہ اقبال نے اس پر اتفاق دیا کہ اس قرارداد سے ہمارے قوم پرست بھائی مسلم عوام سے زیادہ فریب آگئے ہیں۔ اب انہوں نے اس امر پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے کہ وہ انتخاب کے معاملے میں مسلم عوام کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قراردادوں سے اسی فیصلے کا اظہار ہوتا ہے۔ جس حالت میں ہندوؤں نے تیرہ مطالبات

منظور نہیں کیے ، انتخابات کے متعلق مسلمانوں کو کیا مشورہ دیا جا سکتا ہے ؟ لیکن قوم پرست اور مخلوطی (مخلوط انتخاب کو پسند کرنے والے) لیڈروں کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں اور ہندوؤں نے ہندو مسلم مفاہمت کی طرف کوئی قدم نہ اٹھایا ۔ ، ، ۱۵

حضرت علامہ نے اس سال جو جو سیاسی قدم اٹھائے ، ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ برعظیم میں بہتر سے بہتر آئینی اصلاحات نافذ ہوں اور عوام کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دے جائیں ۔ تاکہ حکومت خود اختیاری واقعی مؤثر ہو اور اس کے ذریعے سے عوام اپنے مسائل کو حل کر سکیں ان کے نزدیک اس بنیادی مقصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ جو سیاسی اقتدار حاصل ہو ، وہ ہندو اکثریت کو نہ ملے ۔ بلکہ آبادی کے تمام عناصر کو ان کی تعداد اور اہمیت کے اعتبار سے حاصل ہو ۔ ان عناصر میں مسلمان سر فہرست تھے ۔ علامہ نے مسلمانوں کے قومی مطالبات کے حصول کے لیے پوری جدوجہد کی اور کمیونل ایوارڈ اس کا ثمر تھا ۔ جو اگرچہ مسلمانوں کی خواہشات کے عین مطابق نہیں تھا لیکن اس سے بڑی حد تک مسلمانوں کے قومی تشخص کے محفوظ رہنے کا بندوبست موجود تھا ۔ علامہ کو اس بات پر بھی اعتراض نہیں تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان براہ راست مفاہمت ہو جائے ۔ لیکن ان کی شرط یہ تھی کہ ہندو اکثریت پہلے مسلمانوں کو بتائے کہ اس کی تجاویز کیا ہیں ۔ ہندوؤں نے ایسا نہ کیا ۔ بلکہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی خواہشات کا بھی احترام نہ کیا ۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ حضرت علامہ اور ان کے ساتھیوں ہی کا موقف درست تھا اور بعد کے حالات نے بھی ثابت کر دیا کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ کوئی ایسا تصفیہ نہیں کرنا چاہتے ، جو آبرومندانہ بھی ہو اور منصفانہ بھی ۔ علامہ نے حقوق کی جنگ جس پیمانے پر اور جس انداز سے لڑی ، اس

سے یہ حقیقت بھی واشگاف ہو گئی کہ انہیں آئینی امور کا بھی گہرا ادراک تھا اور وہ مختلف تجاویز کے پس پردہ محرکات اور ان کے ممکنہ نتائج کو بھانپ سکتے تھے۔

حوالے

- ۱ - "مارشل لاء سے مارشل لاء تک"، - صفحات ۱۳۱-۱۳۲ -
- ۲ - "انقلاب"، - ۲۰ اپریل ۱۹۳۲ء -
- ۳ - Speeches and Statements of Iqbal - ص ۱۷۰ -
- ۴ - ایضاً - صفحات ۱۷۳ - ۱۷۱ -
- ۵ - ایضاً - ص ۱۷۳ -
- ۶ - ایضاً - ص ۱۷۶-۱۷۵ -
- ۷ - ایضاً - صفحات ۱۸۱-۱۷۷ -
- ۸ - "اقبال کا سیاسی کارنامہ" - ص ۱۶۳ -
- ۹ - Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۱۸۵-۱۸۲ -
- ۱۰ - "انقلاب"، - ۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء -
- ۱۱ - "انقلاب"، - ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء -
- ۱۲ - ایضاً - ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء -
- ۱۳ - ایضاً - ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۲ء -
- ۱۴ - ایضاً - ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء -
- ۱۵ - "ذکر اقبال" - ص ۱۷۱ -



©

ستائیسواں باب

تیسری گول میز کانفرنس اور آخری دورہ یورپ

انگریز حضرت علامہ سے ناخوش تھے۔ شاید اس وجہ سے، کہ دوسری گول میز کانفرنس میں آن کا رویہ سخت تھا اور انہوں نے وفاق ڈھانچے کی کمیٹی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور کانفرنس کے اختتام سے چند دن پہلے ہی مسلم وفد سے کنارہ کش ہو کر انڈیا سے روانہ ہو گئے۔ اور یہ سبب بھی ہو سکتا تھا کہ علامہ کی صدارت میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا جو اجلاس لاہور میں ہوا، اس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ اگر فرقہ وارانہ فیصلہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہوا تو راست اقدام کیا جائے گا۔ انگریز مسلمانوں سے ایسی چیز کی توقع نہیں کرتے تھے۔ اسی ناخوشی کی وجہ سے وزیر ہند سر سیموئل ہور اس بات کے خلاف تھے کہ آہیں تیسری گول میز کانفرنس میں مدعو کیا جائے۔ یہ ارادہ ایسے بدلا۔ اس پر ڈاکٹر عاتق بٹانوی نے اپنے کتابچے ”اقبال اور تحریک پاکستان“ میں لکھا ہے، کہ وائسرائے نے مسلمان مندوبین کی جو فہرست منظوری کے لیے وزیر ہند کو بھیجی، اس میں علامہ کا نام نہیں تھا۔ وزیر ہند نے یہ نام نامنظور کرنے کی وجہ یہ پیش کی کہ

”اقبال پچھلی کانفرنس میں بالکل خاموش اور چپ چاپ ممانعتی کی حیثیت سے بیٹھا رہا ہے اور کسی بحث میں اس نے حصہ نہیں لیا۔ ایسے خاموش، بے زبان اور دم سخن شخص کو

دوبارہ گول میز کانفرنس کے لیے بلانا بالکل بے کار ہے۔ ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے، جو آئین، دستور اور قانون وضع کرنے کی بحثوں میں حصہ لیں۔ آؤیچ نیچ خود بھی سمجھیں اور ہمیں بھی سمجھائیں اور جس کانسٹی ٹیوشن کا خاکہ ہم تیار کر رہے ہیں، اس میں اگر بہاری رہنمائی نہیں کر سکتے تو کم سے کم امداد تو ضرور کریں۔“

اس پر وائسرائے نے وزیر ہند کو لکھا کہ ”آپ کو غالباً اس بات کا اندازہ نہیں کہ آج اقبال ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا روحانی، معنوی اور سیاسی پیشوا ہے۔ بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کا نوجوان طبقہ تو اقبال کا پرستار ہے۔ جس جلسے میں بڑی بڑی مرصع اور پرجوش تقریریں نہا کام رہ جائیں، وہاں اقبال کا ایک شعر کام کر جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اقبال سے جو عقیدت ہے، اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے کسی قومی اجتماع کو اس وقت تک اپنی نمائندگی کا پروانہ عطا نہیں کرتے، جب تک اقبال اس اجتماع کو اپنی شرکت کا فخر نہ بخشے۔ لہذا اقبال گول میز کانفرنس میں زبان کھولے یا چپ رہے، تقریریں کرے یا ہونٹوں پر مسر سکوت لگا کر بیٹھا رہے، اس کی شرکت مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے ضروری ہے۔“ اس پر وزیر ہند کو اپنی رائے بدلنا پڑی اور علامہ کو تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ بھیج دیا گیا۔ ۱

کانفرنس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوئی تھی لیکن علامہ ایک ماہ قبل ۱ اکتوبر کو روانہ ہو گئے۔ روانگی کی خبر لاہور کے شہریوں سے پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ اس لیے ریلوے سٹیشن پر الوداع کہنے کی خاطر

صرف بیس پچیس ذاتی احباب اور اعزہ موجود تھے۔ ایک ماہ قبل روانگی کی وجہ یہ تھی کہ علامہ لندن پہنچنے سے پہلے وی آنا، بوڈاپسٹ، برلین اور بعض دوسرے علمی مراکز کا مختصر دورہ کرنا چاہتے تھے۔ ۲۔ جانے سے پہلے علامہ نے ایک بیان میں کہا کہ فرقہ واری فیصلے سے بہت سی مشکلات دور ہو چکی ہیں۔ اب باقی اہم مسائل کا حل دریافت کیا جائے گا۔ میرے مسلمانان ہند اور اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلم وفد اپنی طاقت اسلام اور ہندوستان کی خدمت میں صرف کر دے گا۔ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قراردادوں پر جمع رہیں اور اس سلسلے میں آپ نے قرآن مجید کا یہ اصول عمل یاد دلایا کہ ”جب تو نے ایک طریق عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو فی الفور عمل شروع کر دے اور خدا پر بھروسہ رکھ۔“ ۳۔

حضرت علامہ نے روانگی سے پہلے لکھنؤ کے روزنامہ ”مقدم“ کے ڈائریکٹر کے نام ایک مفصل مکتوب میں بتایا کہ لکھنؤ کانفرنس کا انعقاد کیوں ناپسندیدہ تھا اور اس وقت انتخاب کے طریق کار پر از سر نو غور کس طرح نقصان رسا ہو سکتا ہے۔ مکتوب کا یہ اقتباس خصوصی اہمیت کا حامل ہے :

”اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت کے تصفیے سے اور کچھ ہو، نہ ہو، پنجاب کے اندر مسلمانوں کی اکثریت پانچ یا سات کی زیادتی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ صوبہ سرحد کو آئندہ نظام میں مساوات کا درجہ ملتا ہے۔ سندھ کی علیحدگی کے امکانات بھی قریب تر آ گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی جدا گانہ انتخاب بھی قائم رہا ہے۔ جو میری ناقص رائے

میں مسلمانوں کے تمام مطالبات کی اساس ہے۔ جداگانہ انتخابات کو غیر مشروط طور پر رکھ کر حکومت نے مسلمانوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنا مستقبل آپ معین کر لیں۔ چاہیں تو اکثریت میں جذب ہو جائیں اور چاہیں تو کم از کم بعض حصص ملک میں اپنی جداگانہ ہستی کو برقرار رکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ ،، ۴

اس اقتباس کا آخری فقرہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ خطبہ اللہ آباد میں جو تصور دیا تھا، اقبال اس پر قائم تھے۔

اس دفعہ حضرت علامہ کے ہمراہ سید امجد علی تھے۔ وہی، جو بعد میں یونینسٹ پارٹی کے سیکرٹری بنے اور پاکستان بننے کے بعد وزیر خزانہ کے عہدے پر فائز رہے۔ سید امجد علی گول میز کانفرنس کے مسلم وفد کے انریری سیکرٹری تھے۔ دونوں نے اٹلی کی بندرگاہ وینس تک سمندری سفر کیا۔ اس کے بعد بذریعہ ٹرین پیرس پہنچے، جہاں ریلوے سٹیشن پر سردار امراؤ سنگھ پذیرائی کے لیے موجود تھے۔ علامہ نے نپولین کے مقبرے کو دیکھا۔ لیکن سید امجد علی بتاتے ہیں کہ وہ باہر نکلے تو چہرے سے کسی خاص تاثر کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ مشہور فلسفی برگساں سے ملاقات کی خواہش تھی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ نواح پیرس کے کسی گاؤں میں مقیم ہیں، تو علامہ نے کہا انگلستان سے واپسی پر ملیں گے۔ جانے پہچانے فرانسیسی مستشرق میسی نیوں سے البتہ ملاقات ہو گئی اور وہ بھی طویل فرانسیسی عالم نے علامہ سے اس بات میں اتفاق کا اظہار کیا کہ مغربی مؤرخین کو اسلام سے جو تصب تھا، وہ کم ہو رہا ہے اور وہ نسبتاً غیر جانب دارانہ نقطہ نگاہ سے اسلامی تحریکوں کا جائزہ لے رہیں

ہیں - میسی نیوں نے یہ بھی کہا کہ یورپ پر مسلمانوں کے بڑے احسانات ہیں - انہوں نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور تعلیم و معاشرت کے بہت سے شعبوں میں مغرب کی ترقی کے لیے نئے نئے مواقع عطا کیے - سید امجد علی بھی اس ملاقات میں موجود تھے - وہ بتاتے ہیں کہ میسی نیوں علامہ کی باتیں بڑی دلچسپی اور انہماک سے سنتا رہا - ۵

حضرت علامہ اور سید امجد علی پیرس سے بذریعہ ٹرین لندن پہنچے ، تو ریلوے سٹیشن پر مشہور نو مسلم انگریز خالد شیلڈریک علامہ کے استقبال کے لیے موجود تھے - سید امجد علی بتاتے ہیں کہ خالد شیلڈریک نے اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کو مشہور برطانوی سیاستدان جان برائٹ کی تقریروں کا مجموعہ پیش کیا اور کہا کہ آپ کو گول میز کانفرنس کے اہم سیاسی مباحث میں حصہ لینا ہے ، اس لیے میری درخواست ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو ، یہ کتاب ضرور پڑھ لیں - چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اسی رات کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا اور رات کے دو بجے کتاب کو ختم کر کے دم لیا - ۶

اس کتاب میں جان برائٹ کی وہ تقریر خصوصی اہمیت کی حامل تھی جو اس نے ۲۴ جون ۱۸۵۸ء میں برطانوی دارالعوام میں کی - اس کی اثر کا ماحصل یہ تھا کہ ہندوستان ایک نہایت وسیع خطہ ہے - اس میں بیس مختلف قومیں آباد ہیں جو بیس مختلف زبانیں بولتی ہیں - ان سب کو ایک مربوط اور پائدار سلطنت کی صورت میں یکجا رکھنا بالکل ناممکن ہے - اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے ایک سلطنت یا امپائر بنانے کی جگہ پانچ احاطوں (PRESIDENCIES) میں بانٹ دیا جائے - جن کے دارالحکومت شکتہ ،

مدراس ، بمبئی ، آگرہ اور لاہور ہوں - پانچوں کی حیثیت ایک دوسرے کے مساوی ہو - ہر احاطے کی الگ کونسل ہو ، جو مالیات ، محاصل ، عدل و انصاف اور پولیس اور فوج کی ذمہ دار ہو - اب سے ایک سو سال بعد یہ باقاعدہ مملکتوں کی صورت اختیار کر لیں گے اور اگر کبھی مستقبل میں برطانوی سیادت کو اٹھایا جائے ، تو ہم یہ کہہ سکیں گے کہ ہم نے ایسی مملکتیں چھوڑی ہیں ، جو اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتی ہیں - لیکن اگر ہم نے ایسا نہ کیا اور اس خطے کو ایک واحد سلطنت کی صورت میں رکھنے کی کوشش کی ، تو انارکی اور پھوٹ ناگزیر ہو گی - ۷

علامہ نے تیسری گول میز کانفرنس کی کاروائی میں کوئی نمایاں حصہ نہ لیا - جس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں وفاقی ڈھانچے پر بحث ہوتی رہی ، جس میں علامہ کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی - بلکہ ڈاکٹر امبیدکر نے ان سے جو بیان منسوب کیا ، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے کسی وفاق کے قائل نہیں تھے - ڈاکٹر امبیدکر کہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے وفاق کے متعلق اپنا خیال ظاہر کر ہی دیا تھا کہ :

”ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت (خواہ وہ وفاق ہی ہو) قائم ہی نہ کی جائے - بلکہ ہر صوبے کو آزاد ڈومینین DOMINION بنا دیا جائے ، جس کا تعلق ہندوستان کی کسی مرکزی حکومت کے بجائے براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو -“ ۸

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ جان براڈٹ کے خیالات سے بھی متاثر ہوئے - لیکن اگر ۱۹۳۲ء کا خطبہ لاہور دیکھا جائے ، تو معلوم ہو گا کہ علامہ اس وقت بھی وفاق کے بارے میں مضطرب نہیں تھے - بلکہ وفاق

کے قیام کو معرض التواء میں ڈالنا چاہتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے کہا کہ پہلے صوبائی خود مختاری کا تجربہ کر لیا جائے اور صوبوں کی ذمہ دار حکومتیں ٹھیک طرح چل سکیں، تو پھر وفاق کے بارے میں سوچ لیا جائے۔ وہ اس طرح کی باتیں کیوں کرتے تھے؟ اس لیے، کہ ان کی ذاتی رائے تو وہی تھی جو ۱۹۳۰ء کے خطبہٴ الہ آباد میں ظاہر کی گئی اور جس میں فیڈریشن کی جگہ ایک ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ لیکن انہیں آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ میں اپنے ساتھیوں کو ماتھ لے کر چلنا تھا۔ اس لیے مصلحتاً متفقہ قومی مطالبات سے گریز ممکن نہیں تھا۔ ذاتی رائے اور اجتماعی موقف کے درمیان یہ تضاد ایک مدت تک قائم رہا اور انہوں نے ذاتی رائے پر اجتماعی رائے کو اس لیے بھی ترجیح دی کہ مسلمان چاہیں تو فیڈریشن کا تجربہ کر لیں۔ پھر اس تجربے کا ثبوت علامہ کی اس تقریر سے ملتا ہے، جو انہوں نے لندن میں نیشنل لیگ کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک اہم تقریب میں ۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو کی۔ اس اجتماع میں غیر ملکی سفارتی نمائندے، دارالعوام اور دارالامراء کے ارکان اور مسلم وفد کے ارکان اور دوسرے معززین شامل تھے۔ اس تقریر میں علامہ نے کہا کہ ”میں نے تو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسئلے کا یہ ممکنہ حل تجویز کیا تھا کہ مغربی ہند میں ایک مسلم ریاست قائم کر دی جائے۔ میری تجویز مسلمانوں کے لیے مطالبے میں شامل نہ کی گئی لیکن میری ذاتی رائے میں یہی تجویز واحد ممکن حل ہے۔ بہر حال میں انتظار کروں گا کہ تجربے سے میری تجویز کا جواز یا عدم جواز ابھرے گا، اب اس اہمیت کی روشنی میں قومی مطالبات کے سلسلے میں اقبال کے وہ نکات ملاحظہ فرمائیے، جو اس تقریر میں پیش کیے گئے:

اول : ہم سب سے زیادہ زور صوبائی خود مختاری پر دیتے ہیں اور مسلمانان ہند اس معاملے میں میرے ساتھ متفق ہیں کہ صوبائی خود مختاری ہمارے مطالبات کی روح کی حیثیت رکھتی ہے ۔

دوم : ہم جن صوبوں میں اکثریت میں ہیں ، وہاں اس اکثریت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں ۔ سندھ کو الگ صوبہ بنانا چاہتے ہیں ، صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی حیثیت دینا چاہتے ہیں ، بلوچستان میں آئینی اصلاحات کا نفاذ چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ برطانوی بلوچستان اور قلات اور لس بیلہ کی ریاستوں پر مشتمل ایک بلوچستان فیڈریشن بنا لی جائے ۔

سوم : ہماری آبادی سات کروڑ سے زیادہ ہے ۔ نصف سے کم آبادی تمام ملک میں بکھری ہوئی ہے ۔ لیکن آبادی کا بڑا حصہ شمال مغربی ہند میں مرتکز ہے اور ہماری آرزو ہے کہ اپنی زندگی اپنے نقطہ نگاہ کے مطابق بسر کریں اور اپنے ثقافتی خطوط پر ترقی کریں ۔

چہارم : ہم پر فرقہ پرستی اور پین اسلامزم کا الزام لگایا جاتا ہے ۔ حالانکہ اپنی ثقافت کی حفاظت حب وطن کے منافی نہیں ہے ۔ آخر انسان کس چیز کے لیے جیتتا ہے اور جان کی بازی لگاتا ہے ۔ اپنے دین کے لیے ، اپنی ثقافت کے لیے ، اپنی روایت کے لیے ۔

پنجم : ہمارے نزدیک ہندوستانی وفاق میں ایک تہائی نیابت کے بغیر ہمارے حقوق کی حفاظت کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے ، اس لیے ہم اس پر اصرار کرتے ہیں ۔

پس اگر علامہ کی ذاتی اور اجتماعی آراء میں کوئی تضاد تھا ، تو وہ

آسے اس طرح دور کرنے کی سعی کرتے رہے کہ قومی مطالبات کی پیشکش کے دوران میں بھی آن کی ذاتی رائے کی تکمیل کی جانب پیش رفت جاری رہے۔ وہ اس بارے میں بعض برطانوی سیاستدانوں سے نجی سطح پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اس سلسلے میں لارڈ لوتھین سے بھی ملاقات ہوئی اور انہوں نے علامہ کو بتایا کہ ہندوستان کے مصائب کا حل وہی ہے، جو آپ بتاتے ہیں۔ لیکن اس تک پہنچنے میں پچیس سال لگیں گے۔ ۱۰۔ بہر حال اقبال کی مستقبل شناسی کی جس لارڈ لوتھین سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ فیڈریشن کا تصور معلق رہتے رہتے آخر کار نابود ہو گیا اور پچیس سال کی جگہ پندرہ سال کے اندر اندر پاکستان بن گیا۔ اور یہ بھی اقبال کی دور بینی کا ایک بین ثبوت ہے کہ علامہ جس قسم کا صوبہ بلوچستان چاہتے تھے، آخر کار ویسا صوبہ ہی بنا، کہ ریاستیں آس میں مدغم ہو گئیں۔

برطانیہ کی نیشنل لیگ کی صدر مس فارکو ہارمن علامہ کی عقیدت مند تھیں۔ اس لیے انہوں نے ۲۴ نومبر کو علامہ کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا۔ جس میں بڑی بڑی شخصیات شریک ہوئیں۔ لارڈ لیمنکن نے انہیں خراج عقیدت ادا کیا اور علامہ نے مختصر تقریر میں امید ظاہر کی کہ گول میز کانفرنس میں جو آخری تصفیہ ہوگا، آس میں مسلمانوں کے جائز دعوای اور آرزوؤں کی تکمیل کا مکمل سامان فراہم ہوگا۔ ۱۱۔

۱۹۳۲ء کے اواخر میں گول میز کانفرنس سے فراغت کے بعد علامہ

یورپ کے علمی دورے پر نکلے۔ پہلے پیرس پہنچے۔ فرانس کے مشہور فلسفی برگساں سے خاصی طویل ملاقات کی۔ اس میں برگساں کے نظریہ واقعیت زمان ہر سیر حاصل بحث ہوئی۔ علامہ نے برگساں کو حضور سرور کائنات کی یہ حدیث سنائی کہ "زمانے کو برا مت دہو۔ اللہ تعالیٰ فرمانا ہے

کہ میں خود زمانہ ہوں۔، اس پر برگساں حیران رہ گیا اور بار بار علامہ سے دریافت کرتا رہا۔ ”کیا یہ صحیح قول ہے؟“ ۱۲

اس کے بعد علامہ سپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں پہنچے۔ تاکہ ایک تو اندلس کی اسلامی تہذیب کے آثار کا مشاہدہ کریں۔ دوسرے، دبستانِ عرب سے تعلق رکھنے والے ہسپانوی دانشوروں سے تبادلہٴ خیالات کریں۔ وہاں ایک مشہور دانشور آسین پلاسیوز سے خاص رابطہ رہا۔ جو اپنی کتاب ”اسلام اور ڈیوائن کامیڈی“ کی وجہ سے یورپ کے علمی حلقوں میں ممتاز مقام کے مالک تھے۔ انہوں نے میڈرڈ یونیورسٹی کے شعبہٴ فلسفہ و ادب میں علامہ کو مدعو کیا اور اپنے افتتاحی خطبے میں کہا کہ علامہ آن گئے چنے دانشوروں کی ایک اور مثال ہیں، جنہوں نے اسلامی ہسپانیہ میں شاعری اور مابعدالطبیعات میں بیک وقت دسترس حاصل کی تھی۔ انہوں نے اقبال اور گاندھی جی کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی جی خالص سیاستدان ہیں لیکن اقبال دانش ور قسم کی شخصیت ہیں۔ سیاست اور گول میز کانفرنس میں شرکت ان کے لیے محض ایک حادثہ ہیں۔ گاندھی جی یورپی طور طریقوں سے عدم مطابقت رکھتے ہیں لیکن اقبال یورپی لباس پہنتے ہیں اور صرف سر کا لباس ان کا ممتاز قومی نشان ہے۔ آسین پلاسیوز نے اقبال کی تصانیف بالخصوص اسرارِ خودی کا تذکرہ بھی کیا اور کہا کہ اقبال کہتے ہیں، ہندوستان اور اندلس دنیائے اسلام کے دو انتہائی سروں پر واقع ہیں اور یہ دونوں ثقافت کے مؤرخ کے لیے یہ مشترکہ نقش فراہم کرتے ہیں کہ دونوں ثقافتی امتزاج کی تجربہ گاہوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ کے لیکچر کا موضوع تھا — ”سپین اور اسلام کی عقلی دنیا۔“

جس ہسپانوی اخبار نے اس تقریب کی روئداد چھاپی ، اس کے نامہ نگار نے لکھا کہ ”اس سفر میں علامہ کے ہمراہ آن کی بیٹی ہے ۔ جو پتلی دہلی اور یورپی باشندوں کی طرح سفید قام ہے ۔“ ۱۲ حقیقت میں یہ لڑکی علامہ کی دختر نہیں ، سیکرٹری تھی اور وہ بھی دلچسپ قسم کی ۔ اسی کے بارے میں علامہ نے عطیہ بیگم کے نام ایک خط میں یہ دلچسپ بات لکھی کہ ”سپین میں میری پرائیویٹ سیکرٹری ایک انگریز لڑکی تھی ۔ اس نے اچانک میری جانب اپنا طرزِ عمل بدل ڈالا اور میری خدمت یوں کرنے لگی ، جیسے وہ پرائیویٹ سیکرٹری نہیں ، ایک مرید ہے ۔ میں نے اس سے پوچھا کہ طرزِ عمل بدلنے کا سبب کیا ہے ؟ اس پر اس نے کہا ، مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ آپ ایک آسانی و خود ہیں ! میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ اپنے آپ کو مثبت انداز میں پیش دروں ۔ بہر حال میں منفی طور پر صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں احمق نہیں ہوں ۔“

میڈرڈ میں قیام کے دوران میں علامہ سے ایک عرب محقق محمود خضیری کی ملاقات ہوئی ۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام (جو ۱۹۳۷ء میں یورپ میں تھے) ایک خط میں لکھا ، ”محمود خضیری سے میں سپین میں ملا تھا ۔ وہ اس وقت فقہ اسلام پر ریسرچ کر رہے تھے ۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ نصیر الدین طوسی پر مقالہ پڑھیں گے ۔ ان سے کہہ دیجئے کہ نصیر الدین طوسی کی تحریروں کا وہ حصہ ، جس میں طوسی نے اقلیدس کے PARALLEL POSTULATE کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ، بالخصوص مطالعہ کریں ۔ بلکہ اس ضمن میں ان کے معاصرین کی تحریروں کا مطالعہ بھی کریں ۔ اس تحقیق سے ان کو معلوم ہو گا ، کہ مسلمان ریاضی دان قرون وسطیٰ میں ہی اس نتیجہ

تک پہنچ چکے تھے کہ یہ ممکن ہے کہ مکان کے ابعاد (Dimensions) تین سے زیادہ ہوں۔ اور ہمارے اسلامی صوفیہ تو ایک مدت سے تعددِ زمان و مکان کے قائل ہیں۔ یہ خیال یورپ میں سب سے پہلے جرمن کے فلسفی کانٹ نے پیدا کیا تھا۔ لیکن مسلمان صوفیہ اس سے پانچ چھ سو سال پہلے اس نکتے سے آشنا تھے۔ - ۱۴

علامہ کی یہ رائے کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ فنونِ لطیفہ میں سے اگر کسی میں اسلامی روح دخیل ہوئی یا منعکس ہوئی، تو وہ فن تعمیر ہے۔ انہوں نے پروفیسر حمید احمد خان مرحوم سے گفتگو کے دوران میں کہا کہ اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے، تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصرِ زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے، مسجدِ قرطبہ مہذب دیووں کا اور الجمرا محض مہذب انسانوں کا۔ اور پھر حضرت علامہ نے مسکرا کر کہا: ”میں الجمرا کے ایوانوں میں جا بہ جا گھومتا پھرا۔ مگر جدھر نظر گذرتی تھی دیوار پر ہوا غالب لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے۔ کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو۔“ - ۱۵ شیخ مجد اکرام مرحوم کے نام ایک مکتوب میں لکھا: میں اپنی سیاحتِ اندلس سے لے کر لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجدِ قرطبہ پر لکھی۔ جو کسی وقت شائع ہوگی۔ الجمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا، جو پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ - ۱۶ آپ

کا جی چاہا کہ تحیتہ المسجد کے نفل ادا کریں۔ عمارت کے نگران سے پوچھا، وہ بڑے پادری سے پوچھنے کے لیے گیا۔ لیکن بے چینی کا یہ عالم تھا کہ اس کے جاتے ہی علامہ نے نیت باندھ لی۔ اور وہ لوٹا، تو آپ نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ ۱۷۔ بہر حال سید امجد علی کا بیان ہے کہ علامہ نے ان کے نام خط میں یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ انہوں نے اذان بھی دی تھی۔ ۱۸۔

حضرت علامہ نے میڈرڈ اور قرطبہ کے علاوہ غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کا دورہ بھی کیا۔ سپین کے وزیرِ تعلیم سے ملاقات کی۔ جن کے عہد میں غرناطہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کو توسیع حاصل ہوئی۔ علامہ نے ایک بیان میں بتایا کہ جنوبی ہسپانیہ کے لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ اندلسی عربوں کی اولاد ہیں۔ اور انہیں ایسی عمارت اور آثار پر ناز ہے، جو اسلامی ثقافت کے مظہر ہیں۔

ابھی علامہ لندن ہی میں تھے کہ انہیں اٹلی کے امرِ مطلق مسولینی کی طرف سے ملاقات کی دعوت موصول ہوئی۔ چنانچہ سپین کے دورے کے بعد آپ روم پہنچے۔ عبدالسلام ندوی بتاتے ہیں کہ مسولینی "امرار خودی" کا انگریزی ترجمہ پڑھ چکا تھا۔ جب علامہ ان سے ملے۔ تو مسولینی نے کہا، اٹلی کے نوجوانوں کے لیے کچھ نصیحت کریں۔ علامہ نے کہا، اٹلی ابھی ایک نوجوان قوم ہے اور اگر وہ صحیح راہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو اسے مغرب کی زوال پذیر تہذیب سے منہ موڑ کر مشرق کی روحانی اور زندگی بخش تہذیب کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ آپ نے کہا کہ اٹلی کی حالت قبل از اسلام کی طرح ہے۔ ایران کی تہذیب فرسودہ تھی اور اسے تازہ

خون کی ضرورت تھی۔ عربوں نے ایران کو تازہ خون دیا اور وہ ایک پرشکوہ تہذیب کا علمبردار بن گیا۔ اسی طرح روسا کے زوال کے بعد اٹلی کو گاتھ اور جرمن قوم نے تازہ خون فراہم کیا اور آسے قرونِ وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی۔ اب ایران اور اٹلی، دونوں کو پھر تازہ خون کی ضرورت ہے۔ ایران اب بھی خوش قسمت ہے کہ اس کے شمال میں ترکمان موجود ہیں اور جنوب میں عرب کے جری قبائل۔ یہ قومیں اپنا خون دے کر ایران کو پھر زندہ اور قوی کر دیں گی۔ لیکن موجودہ اٹلی کے گرد اسی کی طرح کی مہذب قومیں آباد ہیں، جن میں صحرائی وحشت اور تازگی نام کو موجود نہیں۔ پھر اٹلی نازہ خون کہاں سے لائے گا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مسولینی اس اچھوتے خیال سے متاثر ہوا۔

مسولینی کے ساتھ ملاقات کا کوئی باقاعدہ ریکارڈ موجود نہیں، اس لیے حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کن موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ بہر حال اس کا کچھ اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں۔ مسولینی فاشسٹ پارٹی کا بانی اور قائد تھا۔ بالشوزم یا کمیونزم کا شدید دشمن تھا۔ دنیاۓ اسلام میں دلچسپی لیتا تھا۔ لیبیا اور اطالیوی صومالی لینڈ (جو اب صومالیہ میں شامل ہے) اٹلی کے زیرِ نگیں تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر فاشزم، کمیونزم اور اسلام اور دنیاۓ اسلام کے حالات زیرِ بحث آئے ہوں گے اور اگر ہم علامہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ان اشارات ۱۹ کا تجزیہ کریں، جو انہوں نے روم میں لیکچر کے لیے تیار کیے تھے، تو ان سے بھی موضوعاتِ گفتگو کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس لیکچر کے اشارات پانچ حصوں میں منقسم ہیں۔ مناسب معلوم

ہوتا ہے کہ ان کی تلخیص پیش کر دی جائے:

(۱) جدید تاریخ کا اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ اسلام مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے اور روس مشرق کی طرف۔ اگر ہمیں جدید تہذیب کے اسکانی حشر اور اخلاقی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے دنیائے اسلام کے ساتھ اسلام کے تعلق کو سمجھنا ہے، تو اس کے لیے اسلام اور روس کے رجحانات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

(ب) آج کی دنیا میں تین قوتیں کارفرما ہیں۔ اول: مغربی تہذیب، جس کی تشکیل میں مسیحیت سے روشنی، سائنسی طریق کار، کیسا اور مملکت کی علیحدگی، ایک نئے اخلاقی لہجے اور علاقائی وطنیت کے نشو و ارتقاء نے حصہ لیا۔ دوم: کمیونزم، جو کیسا کی نفی اور زندگی کے فلسفے کے طور پر مادیت کی سیادت کا مظہر ہے۔ سوم: اسلام، جو ایک طرف ذاتی تنور اور دوسری طرف معاشری تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذاتی تنور کی بنیاد خودی پر ہے اور معاشری تجربے کی حیثیت سے یہ نوع انسانی کے لیے ایک ایسا تصور ہے جو خون کے رشتوں اور زمینی رشتوں سے بالا ہے، جسے اجتماعی عبادات اور اداروں سے تقویت حاصل ہوتی ہے اور جس میں ایک قسم کا سوشلزم موجود ہے۔

(ج) یورپ کی طرف اسلام کی حرکت زوال کی نہیں، بلکہ اس کی بیداری اور اقتدار کی ایک نئی تلاش کی علامت ہے۔ وہابیت بابیت اور سرسید احمد خان کی تحریکیں اسی نئی بیداری کے سلسلے کی مختلف لڑیاں ہیں۔

(د) برطانیہ کے بارے میں دنیائے اسلام کو کچھ شبہات ہیں۔ اگر برطانیہ کو دنیائے اسلام کا دل موہنا ہے، تو اسے اس پر اعتماد

کرنا ہوگا۔ جس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ شمال مغربی ہند میں
اسلام کو منظم ہونے میں مدد دی جائے اور دوسرا یہ ہے کہ
کہ فلسطین، عرب دنیا اور کشمیر کے مسائل حل ہوں۔

(۵) اسلام کی دوستی حاصل کر کے مغرب فائدے میں رہے گا۔ ۲۰

یہ حقیقت ہے کہ علامہ مسولینی کی شخصیت سے متاثر ہوئے۔ اسی
لیے انہوں نے مسولینی کے بارے میں اس قسم کے اشعار کہے :

نُدرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ؟ ذوقِ انقلاب
نُدرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ؟ ملت کا شباب
نُدرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
نُدرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب
رومتہ الکبریٰ دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
ابن کہ می بینم بہ بیداری مت یارب یا بہ خواب
نعرہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
نغمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب

اور

فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثل شعاعِ آفتاب

اس سے بعض لوگوں نے یہ تاثر لیا کہ علامہ فاشزم کے فلسفے سے متاثر
ہوئے ہیں، یا اس کے حاسی ہیں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔
بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس وقت تک فاشزم کے چہرے کا وہ نقاب
نہیں اٹھا تھا، جس نے اس کی عربانیوں اور انسان دشمنیوں کو چھپا رکھا
تھا اور نہ مسولینی نے اس وقت تک کوئی ایسی حرکت کی تھی، جس

سے ظاہر ہوتا کہ وہ سامراجی عزائم لے کر اٹھا ہے۔ علامہ کی آمد سے دس سال پہلے جب مسولینی نے اقتدار پر قبضہ کیا تو اٹلی ایک پسماندہ ملک تھا، اس میں زندگی بے ترتیب اور منتشر تھی، نظم نسق کا شیرازہ پارہ پارہ ہو چکا تھا اور معاشی حالت ابتر تھی۔ مسولینی نے زندگی میں نظم و ضبط پیدا کیا، نظم و نسق کی چولیں درست کیں معاشی حالت کو بہتر بنایا اور قوم کی پوری قوتیں تعمیر پر مرتکز کر دیں۔ ایسے میں اگر علامہ اس کی شخصیت یا کام سے متاثر ہو گئے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ بہر حال جب مسولینی کے چہرے سے نقاب اٹھا تو علامہ نے اس کی مذمت میں بھی نظمیں لکھیں۔ اس پر پروفیسر آل احمد سرور نے ۱۹۳۷ء کے آغاز میں ایک مکتوب کے دوران میں اقبال پر تناقض کا الزام لگایا۔ علامہ نے اس کا جواب یہ دیا :

”مسولینی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس میں آپ کو تناقض نظر آتا ہے۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ لیکن اگر اس بندہ خدا میں DEVIL اور SAINT دونوں کی خصوصیات جمع ہوں، تو اس کا میں کیا علاج دروں؟ مسولینی سے اگر کبھی آپ کی ملاقات ہو، تو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے۔ جس نے شعاع آفتاب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ہم از خود خود اسی قسم کا احساس ہوا۔“ ۲۱

حضرت علامہ فروری ۱۹۳۳ء کے اواخر میں لاہور واپس آ گئے۔ انہوں نے دورہ یورپ سے جو مجموعی تاثر لیا، وہ ۲۶ فروری کو ایک بیان کی صورت میں پیش کیا۔ جس کے ایک اقتباس سے ہم اس باب کو ختم کرتے ہیں :

”یورپ کے مختلف ملکوں میں پھرنے اور جدید دنیا کے عمومی اخلاقی انتشار کے مشاہدے کے بعد میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک دین اور عقیدے کے اعتبار سے اسلام کے لیے ایک عظیم موقع پیدا ہو چکا ہے۔ یورپ کے لاکھوں مرد اور عورتیں اسلام اور اس کے ثقافتی نصب العین کو جاننے کے لیے مضطرب ہیں۔ اس حقیقت کو مسلمانوں کی نوجوان نسل جتنی جلد محسوس کر لے، اس کے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔ یورپی مسلمانوں نے یہ حقیقت پہچان لی ہے۔“ ۲۳

حوالے

- ۱ - ”اقبال اور تحریک پاکستان“ - صفحات ۳-۱
- ۲ - ”ذکر اقبال“ - ص ۱۷۸-۷
- ۳ - ”انقلاب“ - ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء -
- ۴ - ”انقلاب“ - ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء -
- ۵ - ”روزگارِ فقیر“ - جلد اول - صفحات ۱۳۶-۱۳۳
- ۶ - ایضاً - ص ۱۳۳-۱۳۲
- ۷ - Evolution of Pakistan - ص ۱۴ -
- ۸ - ”ذکر اقبال“ - ص ۱۷۹ - (بحوالہ ”پاکستان“، مؤلفہ ڈاکٹر اسمبید کر ص ۳۲۹) -
- ۹ - Letters and Writings of Iqbal - صفحات ۷۶-۷۰
- ۱۰ - ”Iqbal's Letters to Mr. Jinnah“ - ص ۲۱
- ۱۱ - ”Letters and Writings of Iqbal“ - صفحات ۷۰-۶۸
- ۱۲ - ایضاً - صفحات ۷۹-۷۷
- ۱۳ - ایضاً - صفحات ۱۱-۱۰

- ۱۴ - "اقبال نامہ"، - جلد دوم - صفحات ۳۴۳-۳۴۳
- ۱۵ - "ملفوظاتِ اقبال" - صفحات ۱۸۵-۱۸۶
- ۱۶ - "اقبال نامہ"، - جلد دوم - صفحات ۳۲۱-۳۲۲
- ۱۷ - "ذکرِ اقبال"، - ص ۱۸۲ -
- ۱۸ - "روزگارِ فقیر"، - حصہ اول - صفحات ۱۳۸-۱۳۹
- ۱۸ - الف - "اقبالِ کامل"، - صفحات ۲۷-۲۸
- ۱۹ - Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۱۹۰-۱۹۱
- ۲۰ - "Letters and Writings of Iqbal" - صفحات ۸۰-۸۲
- ۲۱ - یہ اشارات کا ترجمہ اور بعض جگہ تالیخیز ہے۔ چونکہ اشارات فقروں کی صورت میں نہیں تھے، اس لیے ترجمہ و تالیخیز میں قدرے ابہام رہ گیا ہے۔
- ۲۲ - "اقبال نامہ"، - حصہ دوم - ص ۳۱۵ -
- ۲۳ - Speeches and Statements of Iqbal - ص ۱۹۰ -



•

اٹھائیسواں باب

قرطاسِ ایبض ، کشمیر کمیٹی اور ”پین اسلامزم“

حضرت علامہ ۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو لاہور پہنچے تو ریلوے سٹیشن پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ جمیعتہ الاسلام نے ایک سپامنامہ پیش کیا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ ”خدا کے لیے آپ اپنے ان تمام اختلافات کو ، خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی ، بالکل مٹا دیں اور ایک ہو جائیں۔ اس وقت تمام اسلامی سلطنتوں نے بڑی حد تک ان تقاضوں کو دور کر دیا ہے۔ آپ کو بھی ان کی تقلید کی کوشش کرنی چاہیے۔ ۱۰۰ دن بعد انہوں نے آس آئین کو ہندوستانیوں کے لیے بہترین راستہ قرار دیا ، جو گول میز کانفرنس میں بنایا گیا تھا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے آپ کو نئے آئین کے تحت انتخابات کے لیے منظم کریں اور اپنی جہالت میں تفرقہ پیدا نہ ہونے دیں۔ ۲

بہر حال آنے والے آئین کے بارے میں علامہ نے جس حسن ظن کا اظہار کیا تھا ، وہ وفاقی ڈھانچے کے سلسلے میں نادرست ثابت ہوا۔ ان کے مہینے میں حکومتِ برطانیہ نے ایک قرطاسِ ایبض اوائٹ پیپر شائع کیا ، جس میں ہندوستان کے وفاقی دستور کا ایک خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ حضرت علامہ نے اس پر شدید نکتہ چینی فرمائی۔ جس کے نمایاں پہلو یہ تھے :

۱۔ وفاقی پارلیمنٹ کے ایوانِ زیریں کی تین سو پچھتر نشستوں میں

سے صرف بیاسی مسلمانوں کے لیے مخصوص کی گئی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نیابت بائیس فی صد سے بھی کم ہوگی۔ اس کے برعکس دیسی ریاستوں کو ان کی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے پچیس فی صد نشستیں ملنی چاہئیں تھیں لیکن انہیں ایک تہائی نیابت دے دی گئی ہے۔ گویا آٹھ فی صد پاسنگ دے دیا گیا ہے۔ اس پاسنگ کے اصل حقدار مسلمان تھے۔

۲۔ عورتوں کو دو نشستیں دی گئی ہیں اور چونکہ حلقہ ہائے انتخاب مخلوط ہوں گے، اس لیے مسلمان عورتوں کے لیے منتخب ہونا ناممکن ہو گا۔

۳۔ ایوانِ بالا کے ارکان واحد قابلِ انتقال ووٹ کے نظام کے تحت صوبائی مجالسِ قانون ساز کے ارکان چنیں گے۔ گویا یہاں بھی مخلوط انتخاب کو رواج دینے کا ارادہ ہے۔ ظاہر ہے، مسلمان اس ایوان میں مناسب نیابت حاصل نہیں کر سکیں گے۔

۴۔ صوبوں میں وزراء کے اختیارات کم ہیں اور گورنروں کے بہت زیادہ۔

۵۔ بلوچستان کے بارے میں جو منصوبہ وضع کیا گیا ہے، اس سے نہ بلوچی مطمئن ہوں گے نہ مسلمانانِ ہند۔

۶۔ اس سکیم میں مسلمانوں کے شخصی قوانین کے لئے بھی مناسب تحفظات فراہم نہیں کیے گئے۔

اس دوران میں ریاست جموں و کشمیر میں حالات پھر بگڑ گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ گینسی کمشن کی سفارشات پر عمل نہیں کیا

گیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ کشمیری مسلمان دو تین سیاسی جماعتوں میں بٹ گئے تھے اور ایک دوسرے کو زچ کرنے لگے تھے۔ تیسرے، حکومت نے مختلف جماعتوں کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ مظاہرے ہوئے، تو ایک بار پھر ”گولی لاٹھی کی سرکار“، حرکت میں آگئی۔ عورتوں اور بچوں کو بھی نہ چھوڑا گیا اور سزائے تازیانہ کی وحشیانہ رسم کا احیاء کیا گیا۔ اس پر حضرت علامہ نے ایک سخت بیان جاری کیا۔ ریاستی حکومت کی جابرانہ پالیسی کا پردہ چاک کیا اور مسلمانوں کو بھی مشورہ دیا کہ وہ دھڑے بندی کو چھوڑ کر، تمام پارٹیاں توڑ کر، ایک پارٹی بنائیں اور اس کے پرچم تلے ایک مؤثر جدوجہد کا آغاز کریں۔ ~

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی سیاست بھی ایک نیا رنگ لے چکی تھی۔ ہم کسی گذشتہ باب میں بتا چکے ہیں کہ اس جماعت کے چہلے صدر تحریک احمدیہ کے امام مرزا بشیر الدین محمود احمد تھے۔ اسی دستور کی عدم موجودگی میں انہیں وسیع اختیارات حاصل تھے۔ احمدیوں کے مخالفوں کی معلومات کے مطابق موصوف اس جماعت کو اپنے عقیدے کی نشر و اشاعت کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ مخالفین نے سوچا کہ جماعت کا ایک دستور بنا لیا جائے، تاکہ ہر کام ایک طریقے کے مطابق ہو سکے۔ احمدیوں کی سوچ یہ تھی کہ دستور کی تشکیل کا مقصد ان کے امام کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنا ہے۔ اس لیے مرزا بشیر الدین محمود احمد صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن آل کی جماعت کے افراد بدستور کشمیر کمیٹی کے رکن رہے۔ حضرت علامہ دو قائم مقام صدر چنا گیا۔ حضرت علامہ نے دستور کا ایک مسودہ تیار کرایا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اس جماعت کو زیادہ سے زیادہ عناصر کی نمائندہ بنایا جائے۔ لیکن جب اجلاس میں مسودہ پیش ہوا، سو احمدی ارکان نے اس کی

مخالفت کی - جب بحث آگے بڑھی ، تو علامہ نے محسوس کیا کہ یہ حضرات کشمیر کمیٹی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے ڈرے ہیں - یہ صورت علامہ کو منظور نہیں تھی - چنانچہ انہوں نے استعفیٰ دے دیا - علامہ نے ۲ جون ۱۹۳۳ء کے مفصل بیان میں کہا کہ احمدی حضرات کے نزدیک صرف اپنے امام سے وفاداری ہی واحد وفاداری ہے ، جس کے وہ پابند ہیں - اور ایک احمدی وکیل نے تو اپنے پبلک بیان میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہم کسی کشمیر کمیٹی کو تسلیم نہیں کرتے اور جو کچھ کرتے ہیں ، صرف اپنے امام کے حکم پر - علامہ نے کہا کہ مجھے کسی شخص یا گروہ کے عقیدے سے واسطہ نہیں - نہ اس بات سے واسطہ ہے کہ وہ کسی کو اپنا پیر مانتا ہے - جہاں تک کشمیر کمیٹی کی عمومی پالیسی کا تعلق ہے ، اس پر کوئی اختلاف نہیں اور اگر پالیسی کے اختلاف کی بناء پر کوئی پارٹی بنائی جائے ، تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں - لیکن یہاں پالیسی کی بناء پر نہیں ، بلکہ اس سے لاتعلق امور کی بناء پر دھڑے بندی چل رہی ہے - اس لیے مجھے اس کمیٹی کی صدارت منظور نہیں - بہر حال اگر مسلمانان ہند چاہیں ، تو اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد کے لیے ایک اور کشمیر کمیٹی بنا سکتے ہیں - ۵

چنانچہ اس کے فوراً بعد مسلمانوں کے ایک نمائندہ اجتماع میں پرانی کشمیر کمیٹی کو کالعدم قرار دیا گیا اور ایک نئی آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کر دی گئی - جس کے صدر حضرت علامہ تھے اور سیکرٹری ملک برکت علی ایڈووکیٹ - ان دونوں کی طرف سے مسلمانوں کے نام ایک مشترکہ اپیل جاری ہوئی - جس میں کہا گیا کہ مظلومین کشمیر کی قانونی اور دوسری امداد کے لیے مسلمان چندہ دیں - علامہ نے اس بیان میں

کشمیری مسلمانوں کے بارے میں جو نکتہ آفرینی کی ، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

”اہلِ خطّہ (کشمیر) ملتِ اسلامیہ ہند کا جزو لاینفک ہیں اور ان کی تقدیر کو اپنی تقدیر نہ سمجھنا تمام ملت کو تباہی و بربادی کے حوالے کر دینا ہے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں فی الحقیقت ایک مضبوط و مستحکم قوم بننا ہے ، تو ان نکتوں کو ہر وقت ذہن میں رکھنا ہو گا۔ اول یہ ، کہ شہل مغربی سرحدی صوبے کو مستثنیٰ کرتے ہوئے حدود ہندوستان کے اندر جغرافیائی اعتبار سے کشمیر ہی وہ حصہ ہے جو مذہبی اور کچھ حثیت سے خالصتاً اسلامی ہے۔ اور ایسا اسلامی ، کہ اسلام نے وہاں خدا نخواستہ جبر و اکراہ سے گھر پیدا نہیں کیا بلکہ یہ بارور پودا حضرت شاہ بھمدان جیسے نیک و کامل بزرگانِ دین کے پاک ہاتھوں کا لایا ہوا ہے۔ اور انہی کی مساعیٰ تبلیغِ دین کا نتیجہ ہے ، جنہوں نے گھر بار اور وطن محض اس لیے ترک کیے کہ رسول اللہ ﷺ نے لائے ہوئے پیغام سے ان دیار و ممالک کے بسنے والوں کو بہرہ ور کریں اور الحمد للہ ، کہ وہ بدرجہ اتم کامیاب ہوئے۔ دوسری بات ، جسے مسلمانانِ ہند ذہنی نظر انداز نہیں کر سکتے ، یہ ہے کہ ان کی تمام قوم میں سب سے بڑھ کر ، اگر صناعی و ہنر مندی اور تجارت کو بخوبی چلانے کے جوہر نمایاں طور پر کسی طبقے میں موجود ہیں ، تو وہ اسی اہلِ خطّہ کا گروہ ہے۔ افسوس ہے کہ اہلِ کشمیر کی زبانوں حالی انہیں اپنی

قوم کا مفید عنصر بننے کے راستے میں مانع ہے بلکہ اقوامِ عالم کی اس نوع کی ترقی ان کی خدمات سے محروم ہے۔ ورنہ اگر ان کی زندگی بھی زندہ قوموں کی زندگی ہو تو صناعی اور ہنرمندی کے طبعی جوہر ہندوستان کی اقتصادی حالت کو بدل دینے میں مدد ثابت ہوں۔ بہر حال اہلِ خطہ قومیتِ اسلامیہ ہند کے جسم کا بہترین حصہ ہیں اور اگر وہ حصہ درد و مصیبت میں مبتلا ہے، تو ہونہیں سکتا کہ باقی افرادِ ملت فراغت کی نیند سوئیں۔“ ۶

جولائی کے اواخر میں حکومتِ کشمیر نے ایک اعلامیے میں نظم و نسق کے سلسلے میں چند اصلاحات کا اعلان کیا۔ علامہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور یہ توقع بھی ظاہر کی کہ گینسی کمشن کی دوسری سفارشات پر بھی عمل ہوگا۔ انہوں نے ریاست کے انگریز وزراءِ اعظم کرنل کلون سے مطالبہ کیا کہ حکومت اور عوام کے درمیان خیر سگلی پیدا کرنے کی خاطر وہ فوجداری مقدمات، واپس لے لیے جائیں، جو بارہمولا اور میرپور میں کارکنوں کے خلاف چل رہے تھے۔ ۷

احمدی حضرات نے فیصلہ کیا کہ ”تحریکِ کشمیر“ کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کی جائے اور علامہ کو اس کی صدارت پیش کی گئی۔ علامہ نے جواب دیا کہ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مشورہ لینا ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ علامہ ذاتی طور پر صدارت قبول کرنے کے لیے راضی ہیں۔ اس پر علامہ نے ایک بیان میں کہا کہ جن وجوہ کی بناء پر میں نے نئی آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنائی تھی، وہ بدستور قائم ہیں۔ اور قادیانیوں کی طرف سے ابھی تک کوئی ایسا اعلان نہیں ہوا کہ اگر وہ مسلمانوں کی

کسی سیاسی جماعت میں شامل ہوں گے ، تو ان کی وفاداریاں منقسم نہیں ہوں گی ۔ علامہ نے یہ بھی کہا کہ ”شریک کشمیر“ کے مقاصد آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مختلف ہیں اور محرکات بھی مختلف ہیں ۔ ایسے میں میرے لیے اس کی صدارت قبول کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ انہی دنوں کشمیر کے اندر جنگ قیادت نے ایک افسوس ناک صورت لیے رکھی تھی اور کشمیری کارکن بہت سے دھڑوں میں بے میں ہوئے تھے ۔ شیخ عبداللہ نے چاہا کہ تمام کارکنوں کی ایک کانفرنس سری نگر میں بلائی جائے اور اختلافات دور کئے جائیں ۔ انہوں نے علامہ کو مسلم کانفرنس کے اس اجتماع میں شریک ہونے کی دعوت دی ۔ علامہ نے اپنے دوسرے مشاغل کی بناء پر معذرت کر بھیجی اور شیخ عبداللہ کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں دعا فرمائی کہ ”میرے کشمیر بہت جلد اپنے معاملات سلجھا لیں ۔ آپ نے لکھا : ”سہ ہے ، مختلف جماعتیں بن گئی ہیں ۔ اور ان کا باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی نگاہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہو گا ۔ ہم آپ کی ہی ایک ایسی چیز ہے ، جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے ۔ ہندی مسلمانوں کے دم اب تک محض اس وجہ سے بگڑنے رہے کہ یہ قوم ہم آپ تک نہ ہو سکی اور اس کے افراد اور بالخصوص علماء اوروں کے ہاتھ میں کتنی پتلی بننے رہے ۔ اس وقت میں “ ۔ ۹

تقریباً تین مہینے بعد کشمیر کے سلسلے میں فرنچائز رپورٹ سامنے آئی ۔ معلوم ہوا کہ جو اسمبلی قائم ہوئی ، اس کی پچھتر نشستوں میں سے صرف تینتیس کے لیے انتخاب ہو ۵ ۔ باقی نشستیں نامزدگیوں سے پر کی

جائیں گی - اور اسمبلی کی کل نشستوں میں سے صرف آدھی مسلمانوں کو
 ملیں گی - حالانکہ آن کی آبادی اسی فی صد تھی - اس پر فروری ۳۴ء میں
 مسلم کانفرنس کا ایک اجلاس سیالکوٹ میں ہوا ، جس میں یہ رپورٹ مسترد
 کر کے راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا - اور چوہدری غلام عباس کو
 تحریک کا پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا - وہ جموں پہنچے ، تو آپہیں اور آن
 کے بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ڈوگرہ شاہی نے ایک بار
 پھر ظلم و جور کا بازار گرم کر دیا - ۱۰ اس پر حضرت علامہ نے ۲۲
 فروری ۳۴ء کو وائسرائے کے نام ایک تار میں لکھا : ”کشمیر سے نہایت
 خوفناک اطلاعات موصول ہو رہی ہیں - بلا امتیاز بید زنی کی جا رہی ہے
 اور گولی چلائی جاتی ہے - صورتِ حالات کا اقتضا یہ ہے کہ ہزایکسی
 لنسی فوری طور پر توجہ فرمائیں - ورنہ انتہائی افسوس ناک نتائج کا اندیشہ
 ہے“ - ۱۱ چند دن بعد علامہ نے ”جمعیتِ اقوام (لیگ آف نیشنز) اور
 برطانیہ کے ممتاز روز نامہ ”دی ٹائمز“ کے نام اس مضمون کے برقیے روانہ
 کئے کہ حکومتِ کشمیر سیاسی ایجنٹوں کو وحشیانہ سزائے
 بید زنی دے رہی ہے - میں اپن کرتا ہوں کہ اس انسانیت سوز سزا
 کے خلاف آواز اٹھائیے“ - ۱۲ حضرت علامہ کشمیری مسلمانوں کے جذبات
 کی ترجمانی تو کرتے رہے ، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آل انڈیا کشمیر
 کمیٹی کارکنوں اور پیسے کی کمی کی وجہ سے زیادہ فعال نہ رہی اور
 آہستہ آہستہ منظر سے غائب ہو گئی -

اس دور میں حضرت علامہ کی جو تصویر ابھرتی ہے ، وہ ایک بے چین
 اور مضطرب روح کی تصویر ہے - اور یہ بے چینی اور اضطراب کیوں ؟
 محض اس لیے : کہ برعظیم کے اندر اور باہر مسلمان اپنے دکھوں سے نجات
 پائیں اور اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کریں - چینی ترکستان کے

مسلمانوں نے ۱۹۳۳ء میں ایک سترہ سالہ نوجوان کی رہنمائی میں انقلاب کا پرچم بلند کیا ، تو علامہ کی روح تڑپ اٹھی اور انہوں نے ایک اور اسلامی مملکت کے قیام کا خواب دیکھا۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ یہ انقلاب کامیاب ہوا تو ہندوستان اور روس کے درمیان ایک ایسی خوشحال اور مضبوط اسلامی مملکت وجود میں آ جائے گی ، جو بالشوزم کی ملحدانہ مادیت کو ہندوستان سے اور دور رکھنے میں مدد دے گی۔ ۱۳ فلسطین میں عربوں پر جور و استبداد کا نیا سلسلہ شروع ہوا تو وائسرائے کے نام تار بھیجا کہ وہ ہندی مسلمانوں کے یہ مطالبات حکومت برطانیہ تک پہنچا دیں کہ حالیہ واقعات کی فوراً تحقیقات کی جائے ، یہودیوں کا داخلہ روکا جائے اور اعلان بالفور کو واپس لیا جائے۔ ۱۳ اور نیشنل لیگ (لندن) کے نام برقیے میں لکھا کہ یہودیوں کا مزید داخلہ بند کیا جائے ، تاکہ مسلمانوں اور برطانیہ کے درمیان کشیدگی نہ بڑھے۔ ۱۵ جب یہ معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی اسلامی کمپنی نے جدہ اور مکہ کے درمیان ریلوے لائن بنانے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے ، تو اس پر مسرت کا اظہار کیا۔ ۱۶

پنجاب کے مشہور سیاست دان میاں سر فضل حسین نے جب ایک تقریر میں کہا کہ ”سیاسی بین اسلامزم“ کا وجود نہ ماضی میں تھا ، نہ اب کسی کے پیش نظر ہے۔ تو علامہ نے اسے صحیح قرار دیا اور کہا کہ ممکن ہے ترکہ کے سلطان عبدالحمید خان نے اسے سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا ہو۔ لیکن سید جمال الدین افغانی نے بھی ، جنہیں بین اسلامزم سے وابستہ کیا جاتا ہے ، کبھی یہ خواب نہیں دیکھا تھا کہ مسلمانوں کا اتحاد ایک سیاسی مملکت کی صورت میں ہو۔ یہاں تک ، کہ عربی ، فارسی اور ترکی زبانوں میں بین اسلامزم کے مترادف کوئی لفظ موجود ہی

نہیں۔ علامہ نے کہا کہ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام ایک معاشرے کی حیثیت سے صرف نسلوں اور قوموں کا ہی نہیں، بلکہ تمام مذاہب کا ایک ایسا استزاج ہے، جو نسل و قومیت کی رکاوٹوں اور جغرافیائی سرحدات کو تسلیم نہیں کرتا۔ آپ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ ایشیا کی دوسری مسلمان قوموں کی طرح اپنے آپ میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پائیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔ ۱۷ چند دن بعد علامہ نے اسی مسئلے پر ایک اور مفصل بیان جاری کیا۔ جس میں بتایا کہ پین اسلامزم کی اصطلاح یورپی قوموں نے وضع کی اور وہ بھی آن چیرہ دستیوں کے جواز کے طور پر، جو اسلامی ممالک کے خلاف روا رکھی جاتی ہیں۔ علامہ نے ہندوستانی اخباروں میں اس اصطلاح کی آڑ میں مسلمان دشمن پروپیگنڈے کی مذمت کرتے ہوئے کہا: ”پین اسلامزم سے اسلام کی عالمگیر سلطنت بہت مختلف ہے۔ اسلام ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے، جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان پادشاہتوں اور سرمایہ داریوں کی گنجائش نہیں ہوگی۔ دنیا کا تجربہ خود ایسی سلطنت جیسا کہ دے ۵۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ محض خواب ہو لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔“ ۱۸ علامہ نے اس مسئلے پر پے در پے دو بیان اس لیے بھی جاری کیے کہ پین اسلامزم کا ہوا ہندو اخبار بھی دکھاتے تھے۔ اور مسلمان اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے جو سعی کرتے، انہیں یہ اخبار ”پین اسلامزم“ قرار دیتے تھے۔

۱۹۳۳ء ہی میں حضرت علامہ نے افغانستان کا دورہ کیا۔ لیکن

اس کی روئداد اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

حوالے

- ۱ - ”انقلاب“ - ۲۷ فروری ۱۹۳۳ء -
- ۲ - ایضاً - یکم مارچ ۱۹۳۳ء -
- ۳ - Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۱۹۰-۱۹۱
- ۴ - ایضاً - صفحات ۱۹۷-۱۹۸
- ۵ - ایضاً - صفحات ۱۹۹-۲۰۱
- ۶ - ”انقلاب“ - ۳ جون ۱۹۳۳ء -
- ۷ - Speeches and Statements of Iqbal - ص ۲۰۳ -
- ۸ - ایضاً - صفحات ۲۰۲-۲۰۳ -
- ۹ - ”شیرِ کشمیر“ - صفحات ۱۳۱-۱۳۲
- ۱۰ - ”کشمکش“ - صفحات ۱۵۲-۱۵۳
- ۱۱ - ”انقلاب“ - ۲۷ فروری ۱۹۳۳ء -
- ۱۲ - ”انقلاب“ - ۳ مارچ ۱۹۳۳ء -
- ۱۳ - Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۱۹۰-۱۹۱
- ۱۴ - ”انقلاب“ - ۹ نومبر ۱۹۳۳ء -
- ۱۵ - ”انقلاب“ - ۲۰ نومبر ۱۹۳۳ء -
- ۱۶ - ”انقلاب“ - ۱۴ نومبر ۱۹۳۳ء -
- ۱۷ - Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۲۰۷-۲۰۸
- ۱۸ - ”انقلاب“ - ۲۸ ستمبر ۱۹۳۳ء -



•

آنتیسواں باب

افغانستان کا دورہ

برعظیم کے مسلمانوں کو ہمیشہ سے دنیائے اسلام سے پیار رہا ہے اور وہ اسلامی ملکوں کے دکھ درد میں ہمیشہ شریک رہے۔ انہی ملکوں میں افغانستان شامل ہے، جس کے ساتھ جغرافیائی قرب کی وجہ سے بھی دینی اور ثقافتی اور علمی رشتے خاصے مضبوط رہے۔ جب ۱۹۱۹ء میں افغانستان برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہوا اور امان اللہ خان نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، تو مسلمانانِ ہند کو ان سے خصوصی لگاؤ پیدا ہوا۔ تحریک ہجرت شروع ہوئی، تو ہزار ہا مہاجرین نے افغانستان ہی کی طرف رخ کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ افغانستان کی بعض مجبوریوں کے پیش نظر انہیں ٹوٹنا پڑا۔ حضرت علامہ کو بھی افغانستان سے پیار تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے ”پیامِ مشرق“ مرتب کی، تو اسے غازی امان اللہ خان کے نام سے معنون کیا اور دیباچے میں اس کا جواز یہ پیش کیا کہ ”اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی دوشش، جس کا مقصد افراد و اقوام کی ناکہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے، ان میں ایک صحیح اور قوی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابلِ احترام ہے۔ اسی سہ پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرماں روا نے افغانستان کے نام نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں اور افغانوں کی تربیت انہیں خاص طور پر مد نظر ہے۔“ انہی نہیں، کتاب کے آغاز میں ایک طویل نظم میں امان اللہ خان سے بہت بڑی توقعات باندھیں اور لکھا:

اے ترا فطرت ضمیر پاک داد
 از عمر دین سینہ صد چاک داد
 تازہ کن آئین صدیق رض و عمر رض
 چوں صبا بر لاله صجرا گذر
 ملت آوارہ کوه و دمن
 در رگ او خون شیراں موجزن
 زیرک و روئیں تن و روشن جبیں
 چشم او چوں جُتره بازاں تیز بین
 جاں تو بر محنت پیہم صبور
 کوش در تہذیب افغان غیور
 تا ز صدیقان این امت شوی
 بہر دین سرمایہ قوت شوی ۲

ایک کتاب ”مادرن افغانستان“ کے دیباچے میں حضرت علامہ نے
 ملتِ افغانہ سے تین اہم خصوصیات منسوب کیں — گہرا دینی جذبہ -
 خاندان ، نسل اور حیثیت کے امتیازات سے مکمل آزادی اور دین اور قومی
 منازل مقصود کے درمیان مستقل توازن - انہوں نے لکھا ”روحِ قدامت
 ہمیشہ سے افغانہ کے لیے قوت کا ایک عظیم سرچشمہ رہی ہے اور ہمیشہ
 رہے گی - اس کے ذریعے سے ماضی کے ساتھ زندہ رابطہ قائم رہتا ہے -
 لیکن یہ رابطہ نئے زمانے کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے میں حائل نہیں
 ہوتا - ان کی قدامت پسندانہ دانش انہیں روایت سے پیار سکھاتی ہے لیکن
 روایات کا بوجھ داخلی روح کی پیش قدمی کے جذبے کو مردہ نہیں کرتی -
 افغانستان کو ہمیشہ ایشیا کی سیامت اور تاریخ میں ایک کلیدی حیثیت
 حاصل رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی -“ ۳

اسی خیال کو اقبال نے احمد شاہ ابدالی کی زبان سے ”جاوید نامہ“ میں یوں پیش کیا :

آسیا یک پیکر آب و گل است

ملت افغان در آل پیکر دل است

از فسادِ او فسادِ آسیا

در کشادِ او کشادِ آسیا

اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال نے لکھا : ”افغانستان کی تاریخ کی تحریر اور تحسین ابھی باقی ہے۔ واقعات کا محض ریکارڈ تاریخ نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف تاریخ کے لیے مواد ہوتا ہے۔ واقعات الفاظ کی طرح ہوتے ہیں اور ان کے معانی دریافت کرنا حقیقی مؤرخین کا فرض ہے۔ افغانہ کی تاریخ کے سلسلے میں یہ کام ابھی افغانستان اور ہندوستان، دونوں میں ہونا ہے۔ ایک ایسی ملت کو ایشیا کی زندگی میں ایک اہم عنصر مانے بغیر نہیں رہا جا سکتا، جس نے محمد غوری، علاؤالدین خنجی، شیر شاہ سوری، احمد شاہ ابدالی، امیر عبدالرحمن خان، نادر شاہ غازی اور سب سے بڑھ کر سید جمال الدین افغانی جیسی شخصیت پیدا کی، جو بہت سے معاملات میں عظیم ترین مسلمان اور یقینی طور پر آج کے وقتوں کی عظیم ترین ایشیائی شخصیات میں شامل ہے۔“

ہم ایک گذشتہ باب میں بتا چکے ہیں کہ جب ۱۹۲۹ء میں امان اللہ خان کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور بیچہ سقاہ برسر اقتدار آ گیا، تو اقبال کے جذبات کا کیا عالم تھا اور جب جرنیل نادر خان ملت افغانہ کے نجات دہندہ کی حیثیت سے ابھرنے، تو اقبال نے کس شد و مد کے ساتھ ان کی تائید و حمایت میں آواز بلند کی۔ اور نادر خان نے بھی ایک مکتوب میں ان سے مدد چاہی، جس کے جواب میں اقبال نے چندے

کی اپیل جاری کی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرنے کے قابل ہے۔ جرنیل نادر خان پیرس میں افغان سفیر تھے۔ جب وہ اپنے ملک کو بچہ سقمہ کے تسلط سے بچانے کے لیے آئے، تو پہلے بمبئی پہنچے اور پشاور جاتے جاتے لاہور سے گذرے۔ حضرت علامہ انہیں ریلوے سٹیشن پر ملے اور کچھ گفتگو کے بعد ایک طرف لے گئے۔ اور ان سے کہا کہ میں نے زندگی بھر میں دس ہزار روپے کی ایک پونجی جمع کر رکھی ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے چندے کے طور پر قبول فرمائیں۔ نادر خان کو اگرچہ روپے کی ضرورت تھی لیکن انہوں نے علامہ کی پونجی لینے سے معذرت کر دی۔ جب علامہ نے اصرار کیا تو اس بات پر مفاہمت ہو گئی کہ علامہ یہ روپیہ اپنے پاس رکھیں اور نادر خان کو جب اشد ضرورت پڑے گی، وہ سنگوا لیں گے۔ نادر خان کو اس روپے کی ضرورت نہ پڑی۔ بہر حال اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ کے دل میں افغانستان کے لیے کتنی محبت تھی۔

جب نادر خان نے حالات پر قابو پا لیا، پادشاہت منبہال لی اور معاملات پرسکون ہو گئے، تو نادر شاہ غازی نے علامہ کے نام مکتوب میں ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ چونکہ اس سے کچھ غلط فہمی بھی پیدا ہو سکتی تھی، اس لیے نادر شاہ غازی سے کہا گیا کہ ملاقات کے لیے کوئی تقریب، کوئی جواز پیدا کریں۔ اس زمانے میں افغانستان تعمیر کے راستے پر گامزن تھا، اس لیے کابل یونیورسٹی کا منصوبہ بھی زیر غور تھا۔ ایسے میں نادر شاہ غازی نے محسوس کیا کہ تعلیمی اصلاحات کے لیے حضرت علامہ سے مشورہ لیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر ہندوستان سے علامہ کے علاوہ سر راس مسعود اور مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے۔ چنانچہ تین ارکان کا ایک وفد اپنے سیکرٹریوں سمیت ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو پشاور سے کابل روانہ ہوا۔ ایک

رات جلال آباد میں گذاری۔ دوسرے دن کابل روانہ ہوئے اور شام کے وقت منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ ابھی کابل آٹھ میل دور تھا، کہ حکومت افغانستان کے ایک وزیر احمد شاہ خان نے وفد کی پذیرائی کی اور انہیں شاہی مسہان کی حیثیت سے دارالاسان میں رکھا گیا۔

اس وقت تک علامہ کا رابطہ صرف نادر شاہ غازی اور آن کے بھائیوں ہی کے ساتھ نہیں تھا، افغانستان میں آن کی خاصی شہرت تھی۔ افغانستان کے قونصل مقیم بند سردار صلاح الدین سنجوقی سے تو اقبال کا دوستانہ بہت عرصے سے تھا۔ وہاں کے مشہور ادیب جناب سرور خان گویا آن کے مداح خصوصی تھے۔ چنانچہ جب گویا کی ادارت میں انجمن ادبی کے اہتمام میں جون ۱۹۳۰ء میں ماہ نامہ "کابل" جاری ہوا، تو اس میں علامہ کا کلام بھی چھپنے لگا اور آن کی شعری و مقالات بھی آنے لگے۔ ۱۹۳۱ء میں آقائے سرور خان گویا نے ایک مقالے میں علامہ کی فارسی تصانیف اور بانگ درا کا اجمالی تذکرہ دیا۔ ۱۹۳۲ء میں انجمن ادبی کے ڈائریکٹر شہزادہ احمد علی خان درانی نے ایک مقالے میں برعظیم ایران اور ترکیہ کے چار بڑے شعراء — اقبال، شمس، مہار، شمسادی اور نامق کمال پر مفصل انداز میں لکھا۔ لیکن زیادہ تفصیل علامہ کے بارے میں دی۔ "جاوید نامہ" پر تبصرہ بھی چھاپا گیا۔ گویا علامہ افغانستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں خاصے معروف تھے۔

جس خصوصی مشن پر علامہ، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کابل پہنچے تھے، اس بارے میں علامہ نے روانگی سے پہلے ہی ایک بیان جاری کر دیا تھا۔ اس میں آپ نے کہا کہ دہلی میں نئی یونیورسٹی

کے قیام اور پشاور کے اسلامیہ کالج کو یونیورسٹی کی صورت دینے سے
 افغان - ہند سرحد کے آرپار آباد افغان قبائل کی فلاح و بہبود کے راستے
 کھل جائیں گے۔ آپ نے فرمایا: ”اعلیٰ حضرت فرماں روا نے افغانستان
 نے ہمیں دعوت دی ہے کہ کابل کی مجوزہ یونیورسٹی کے سلسلے میں آن
 کے وزیر تعلیم کو مناسب مشورے دیں۔ ہم نے اپنا فرض جانا کہ یہ
 دعوت قبول کرنی جائے۔ کابل کی مختلف مطبوعات سے ظاہر ہوتا ہے
 کہ افغانستان کی جدید نسل کی مخلصانہ آرزو ہے کہ وہ جدید علم سے
 اس طرح استفادہ کرے کہ وہ آن کے مذہب اور ثقافت سے ہم آہنگ
 ہو۔ ملتِ افغانہ ایک عمدہ قوم ہے۔ اور ہم ہندوستانیوں کا فرض ہے
 کہ اسے آگے بڑھنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دیں۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا
 ہوں کہ اسلامی ملکوں میں خاص طور پر تعلیم کو مکمل طور پر سیکولر
 بنانے کے اچھے نتائج نہیں آتے اور نہ کوئی نظامِ تعلیم حرفِ آخر کی
 حیثیت رکھتا ہے۔ ہر ملک کی اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں اور انہی کی روشنی
 میں اس کے مسائل پر غور کرنا اور ان کا حل دریافت کرنا مناسب
 ہے“ ۹

علامہ اور نادر شاہ غازی کے درمیان دو بار ملاقات ہوئی۔ ایک بار
 سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی بھی ہمراہ تھے اور دوسری بار اکیلے
 میں۔ دوسری ملاقات میں حضرت علامہ نے قرآنِ حکیم کا ایک نسخہ
 پیش کیا اور کہا ”میں آپ کی خدمت میں قرآنِ مجید پیش کرتا ہوں
 کہ میرے پاس یہی موجود ہے۔ میں تو ایک فقیر ہوں۔“ ۱۰ اس ملاقات
 میں کیا باتیں ہوئیں؟ اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ لیکن اس کا اندازہ
 کونا مشکل نہیں۔ کیونکہ دنیائے اسلام اور افغانستان کے بارے میں اقبال

کے خیالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے اور ان کا اظہار اقبال کے مجموعہ ہائے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔

انجمن ادبی کابل نے تینوں مسلمانوں کے اعزاز میں ایک خصوصی محفل برپا کیا۔ جس میں پہلے ایک افغان شاعر عبداللہ خان نے خیر مقدم کے عنوان سے نظم پڑھی، جس میں اقبال کا خصوصی تذکرہ تھا اور کہا گیا تھا کہ ان سے ”طرزِ مولائے روم“ زندہ ہو گئی ہے۔ پھر سپاسنامہ پیش ہوا اور سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے بعد علامہ نے ایک تقریر فرمائی۔ آپ نے پہلے ادب برائے مقصد کے نظریے پر زور دیتے ہوئے کہا: ”میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معاری۔ ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت کر ہے۔ اسی بناء پر آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں، نہ کہ محض آئینہ تفریح۔ شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔ بس میری خواہش یہ ہے کہ افغانستان کے شعراء اور انشاء پرداز اپنے ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں۔“ اس کے بعد حضرت علامہ نے ایک اور نکتہ ان الفاظ میں پیش کیا: ”مسوایی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے کہ اٹلی کو جانے کی نئی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑ ہتی پیدا کرے، جو اس ملک کے گریبان کو ایندو سیکسن اقوام کے قرضے سے نجات دلا سکے۔“ نئے کولمبس کو پیدا کرنے، جو ایک نئے ”اعظم“ بنا سکے۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کریں، تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو وبائی زندگی سے نکال کر وحدت ملی کی زندگی سے آشنا کر سکے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ افغانستان کو ایک ایسا مرد کامل مل گیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ

کی شخصیت کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ افغانستان کو ایشیا میں
ایک نئی قوم بنا کر دنیا سے متعارف کرائیں۔،، ۱۱

تعلیمی نظام پر سلسلہ مشاورت ختم ہوا ، تو حضرت علامہ نے بابر
کے مقبرے پر حاضری دی ۔ احمد شاہ ابدالی کی قبر پر فاتحہ خوانی کی ۔
پھر غزنی گئے ۔ سلطان محمود غزنوی ، حکم سنائی اور حضرت داتا گنج بخش
علی بجویری کے والد محترم کے مزارات پر فاتحہ پڑھی ۔ پھر قندھار پہنچ
کر خرقہ شریف کی زیارت کی ۔ واپسی پر چمن اور کوئٹہ کے راستے لاہور
پہنچے ۔ جہاں ۶ نومبر ۱۹۳۳ء کو سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی
رفاقت میں ایک بیان جاری کیا ۔ جس میں بتایا کہ افغانستان میں مکمل
امن ہے ۔ علماء کے طبقے اور نوجوان طبقے کے درمیان کوئی اختلاف رائے
نہیں اور تعلیم پر خاص توجہ دی جا رہی ہے ۔ وفد کے ارکان نے اس یقین
کا اظہار کیا کہ اگر نئی قیادت کو کام کا موقع دیا گیا ، تو افغانستان کی
خوشحالی کا تیقن ہو جائے گا ۔ ۱۲ اس کے چند دن بعد یہ المناک خبر آئی
کہ کسی نے نادر شاہ غازی کو شہید کر دیا ہے ۔ لیکن یہ محض ایک
جنونی کی حرکت تھی ۔ کیونکہ افغانستان مکمل طور پر پر امن رہا اور
نادر شاہ کے فرزند ظاہر شاہ کو سب نے پادشاہ تسلیم کر لیا ۔ علامہ اقبال
کو نادر شاہ سے جو محبت اور شیفتگی تھی ، اس کے پیش نظر ان کے
صدے کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ۔ انہوں نے ظاہر شاہ کو تعزیتی پیغام
بھیجا اور یہ بھی لکھا کہ ”ملتِ افغانہ نے اتفاقِ آرا سے آپ کے حضور
میں اطاعت کر کے جس دانش مندی اور جذباتِ تشکر کا ثبوت دیا ہے ،
اس کی تحسین میں ساری دنیا ہم زبان و ہم آہنگ رہے گی ۔“ ۱۳

۱۹۳۴ء کے اواخر میں حضرت علامہ کی ایک چھوٹی سی کتاب
منظرِ عام پر آئی ۔ جس کا نام تھا — ”مسافر یعنی سیاحتِ چند روزہ

افغانستان،، - اس میں سب سے پہلے نادر شاہ شہید کو خراج عقیدت پیش کیا گیا پھر اقوامِ سرحد کو پیغامِ عمل و اتحاد دیا گیا۔ ایک نظم میں نادر شاہ شہید سے ملاقات کے تاثرات بیان کیے گئے۔ ایک نظم کا عنوان ہے، "برسزارِ شہنشاہ بابر خدہ آشیانی"۔ دوسری نظموں کے عنوان یہ ہیں:

سفر بہ غزنی و زیارتِ مزارِ حکیم سنائی رح - برسزارِ سلطان محمود علیہ الرحمۃ - مناجاتِ مردِ شوریدہ، در ویرانہ غزنی - قندھار و زیارتِ خرقہ مبارک - غزل - برسزارِ حضرتِ احمد شاہ بابا علیہ الرحمۃ، موسسِ ملتِ افغانیہ - خطاب بہ پادشاہِ اسلامِ اعلیٰ حضرت نادر شاہ - ماہِ نامہ "کابل" میں اس کتاب پر مفصل تبصرہ کیا گیا اور اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ اقبال کی نظر صرف مسلمانانِ ہند پر نہیں، ساری دنیا کے اسلام پر ہے۔ اور "فازِ ادب کو ناز کرنا چاہیے کہ آج سے روسی، سعدی، حافظ اور بہت سے چلے بڑے استادوں کے بعد اقبال ملا ہے۔ جس میں ان سب کی خصوصیات موجود ہیں۔" علامہ کا انتقال ہوا، تو ماہِ نامہ "کابل" کی ایک اشاعت ان کی شعر و شاعری اور پیغام کے لیے مخصوص کی گئی۔

ہنکے بعد میں برسیاں بھی سنائی گئیں اور علامہ کی فہرستِ تعویذ بھی حکومتِ افغانستان کی طرف سے فراہم کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان اور برعظیم کے مسلمانوں کے درمیان عرصہ دراز تک رشتہ دوستی اور تعلقات میں کوئی رخنہ پڑا، تو قیامِ پاکستان کے بعد۔

حوالے

- ۱ - "پیامِ مشرق" - دیباچہ - صفحات ۴ - ۵ -
- ۲ - ایضاً - ص ۵ -
- ۳ - Thoughts and Reflections of Iqbal - صفحات ۲۳۲ - ۲۳۱ -
- ۴ - "جاوید نامہ" - ص ۲۰۸ -

- ۵ - Thoughts and Reflections of Iqbal - ص ۲۳ -
- ۶ - Glimpses of Iqbal - ص ۱۳۳ -
- ۷ - The Poet of the East - ص ۳۰ -
- ۸ - اقبال ، افغانستان میں (مقالہ مندرجہ ”المعارف“ مئی ۱۹۷۷ء) -
صفحات ۲۶-۲۷ -
- ۹ - Speeches and Statements of Iqbal - ص ۲۰۹ -
- ۱۰ - The Poet of the East - ص ۳۰ -
- ۱۱ - ”مقالات اقبال“، - صفحات ۲۲۰-۲۱۷ -
- ۱۲ - Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۲۱۱-۲۱۰ -
- ۱۳ - ”انقلاب“، - ۱۵ نومبر ۱۹۳۳ء -
- ۱۴ - اقبال ، افغانستان میں - ”المعارف“ مئی ۱۹۷۷ء - ص ۳۱ -



تیسواں باب

علالت اور سیاست میں محدود دلچسپی

۱۹۳۳ء کے اواخر میں علامہ سیاسی مشاغل سے قدرے بیزار ہو چکے تھے۔ کیونکہ مسلمانوں میں نفاق ختم ہونے میں نہیں آتا تھا اور علامہ بھی تو کوئی ایسے سیاستدان نہیں تھے، جو عزلت نشینی کو ترک کر کے، شعر و شاعری اور علمی مشاغل کو چھوڑ چھاڑ کر سیاست ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے۔ وہ تو زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتے تھے کہ سیاسی مذاکرات میں حصہ لیتے، قوم کے ذہن میں اپنی تحریروں اور نظموں سے نکھار پیدا کرتے اور کبھی کبھی کسی اجتماع سے خطاب کر کے یا کوئی اخباری بیان دے کر سوچ کی نئی راہیں کھول دیتے۔ یہ سب کچھ انہوں نے کیا۔ لیکن سیاست کا تقاضا کچھ اور تھا، جسے وہ پورا نہیں کر سکتے تھے اور انتشارِ فکر تھا کہ بڑھتا چلا جاتا۔ ایسے میں وہ دل شکستہ سے ہو گئے اور سیاست سے بڑی حد تک کنارہ کش ہو گئے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۳۳ء کو سید سلیمان ندوی کے نام لکھا: ”میں خود مسلمانوں کے انتشار سے بے حد درد مند ہوں اور گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے سخت افسردہ کر دیا ہے۔ آپ کا طرزِ عمل اختیار کرنے سے گریز جاری نہیں۔“ چند دن بعد مولانا عبدالہاجد دریا بادی نے جب پوچھا کہ آپ فلاں قومی اجتماعات میں شریک ہو رہے ہیں یا نہیں۔ تو علامہ نے لکھا: ”گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے بہت درد مند کر دیا ہے۔ اس لیے جلسوں میں میرے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ میں کہیں نہیں

جا رہا۔ نہ پٹنہ، نہ کانپور،، - ۲ چند مہینے بعد وہ ایسے علیل ہوئے کہ مسلسل علاج کے باوجود کبھی مکمل طور پر صحت مند نہ ہوئے۔

۱۔ جنوری ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے، عید الفطر کا دن تھا۔ حضرت

علامہ، چودہری محمد حسین، جاوید اقبال اور اپنے پرانے اور وفا شعار ملازم علی بخش کے ساتھ کار میں سوار ہو کر بادشاہی مسجد کو گئے۔ لباس کا چنداں خیال نہیں کرتے تھے۔ گلوبند سے نفرت تھی۔ شلواری کوٹ پہن رکھا تھا۔ موزے نہایت باریک تھے۔ سردی بہت سخت تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس پر مستزاد مسجد کے دروازے سے محراب تک ٹھنڈے یخ فرش پر چل کر پہنچے۔ نماز ادا کی اور واپسی پر ایک بار پھر ٹھنڈے فرش پر چلنا پڑا، جس سے پاؤں کو کچھ زیادہ ہی سردی لگی۔ گھر پہنچے تو والد مرحوم کی روایت کے مطابق سویاں دہی کے ساتھ کھائیں۔ اگلے روز نزلے کی شکایت ہو گئی۔ جو ظاہر ہے سردی اور دہی کھانے کی وجہ سے ہوا۔ یہ نزلہ پندرہ دن تک جاری رہا۔ حالانکہ ایلوپیتھک علاج بھی کیا اور یونانی علاج بھی۔ ایک رات دو ڈھائی بجے سے صبح تک شدید کھانسی جاری رہی۔ اس دفعہ ان کے لیے مسہل تجویز ہوا۔ نزلہ بھی ختم ہو گیا اور کھانسی بھی ۳ لیکن گلا بیٹھ گیا۔ بہت علاج کیے، ڈاکٹری اور یونانی اور ریڈیائی لیکن یہ تکلیف رفع نہ ہوئی۔ کبھی کبھی عارضی طور پر تھوڑا سا افاقہ ہو جاتا تھا لیکن یہ عارضہ آخری دم تک رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریروں کا سلسلہ بند ہو گیا۔

لاہور میں ڈاکٹری علاج ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دہلی سے حکیم زابینا جیسے مشاق اور مشہور طبیب دوائیں بھیجتے رہے۔ علامہ دو مرتبہ بھوپال گئے، جہاں برقی علاج کا اعلیٰ بندوبست موجود تھا۔ ٹوٹکے بھی استعمال کرتے رہے۔ پرہیز بھی کم کرتے تھے۔ ایک طریق علاج میں

دوسرا طریقِ علاجِ دخیل کر دیتے اور دوسرے میں تیسرا طریقِ علاج - خود ذاکٹروں اور اطباء نے وقتاً فوقتاً جو تشخیص کی ، اس میں بہت فرق تھا - علامہ کبھی ایک تشخیص سے اتفاق کرتے ، کبھی دوسری تشخیص سے - بیماری کے اس دور کی پوری تفصیل جناب سید نذیر نیازی نے اپنی تالیف ”اقبال کا مطالعہ“ کے آخری باب میں اور اپنی ایک اور تالیف ”مکتوباتِ اقبال“ میں قلم بند کر رکھی ہے - بالخصوص یونانی علاج کی تو پوری جزئیات بیان فرمائی ہیں - کیونکہ حکیم نابینا اور اقبال کے درمیان وہی رابطے کا ذریعہ بنے رہے اور وہی دہلی سے علامہ کو دوائیں بھیجتے رہے تھے -

ترکیہ کی انجمن اتحاد و ترقی کے رہنما ڈاکٹر بہجت وہبی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر کچھ لیکچر دینے کے لیے پیرس سے دہلی آئے ، تو حضرت علامہ سے کہا گیا کہ ایک نشست کی صدارت فرمائیں - لیکن گلا بیٹھنے کی وجہ سے انہوں نے معذرت کر دی - غلامت کے دوران میں بھی قوہ کی بھلائی کی تدبیریں سوچتے تھے - جناب سید نذیر نیازی کو لایا کہ میں ایک ایسے ادارے کے قیام کا آرزومند ہوں ، جو مفید کتابوں کی اشاعت کرے - نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ ادارے کا مقصد یہ تھا کہ ”عصر حاضر کے جدید افکار اور رجحانات کے پیش نظر اسلام کی ترقی نئے نئے علمی تنازوں کے علاوہ اس کے عمرانی ، تاریخی اور تمدنی مسائل کا ابحاث و لکھتے ہوئے اس طرح کی جائے کہ عالم اسلام میں شہ اور ممتاز جو انتشار پھیل رہا ہے ، اس کا ازالہ ہو جائے - لیکن اس ادارے میں ، قدیم و جدید کی غلط بحث کو سر آٹھانے کا موقع نہ ملے ۔۔۔“

۱۹۳۳ء کے وسط میں حضرت علامہ ، جاوید اقبال کو اپنے ڈاکٹر دن کے لیے سرہند شریف گئے - اس کا سبب علامہ کی اہلیہ بن ملاحظہ فرمائیں :

چند روز ہونے ، صبح نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی ۔ خواب میں کسی نے مندرجہ ذیل پیغام دیا — ہم نے جو خواب تمہارے اور شکیب ارسلان ۵ کے متعلق دیکھا ہے ، وہ سرہند بھیج دیا ہے ۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بہت بڑا فضل کرنے والا ہے — پیغام دینے والا ، معلوم نہیں ہو سکا ، کون ہے ۔ اس خواب کی بناء پر وہاں کی حاضری ضروری ہے ۔ اس کے علاوہ جاوید جب پیدا ہوا تھا ، تو میں نے عہد کیا تھا کہ جب وہ ذرا بڑا ہوگا تو اسے حضرت کے مزار لے جاؤں گا ۔ ” کچھ عرصہ بعد علامہ نے ایک خط میں لکھا : ” سرہند خوب جگہ ہے ۔ مزار نے میرے دل پر بڑا اثر کیا ہے ۔ بڑی پاکیزہ جگہ ہے ۔ پانی اس کا سرد اور شیریں ہے ۔ شہر کے کھنڈرات دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آ گیا ، جس کی بنا حضرت عمر بن العاص نے رکھی تھی ۔ اگر سرہند کی کھدائی ہو ، تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے کیا انکشافات ہوں ۔ “

انہی دنوں علامہ کی پریشانیوں میں ایک اور اضافہ ہوا ۔ اور وہ تھی والدہ جاوید کی علالت ۔ بہت سے ڈاکٹری علاج آزمانے کے بعد حکیم نابینا کی طرف رجوع کیا ۔ چنانچہ اب دونوں کی ادویات وہیں سے آنے لگیں ۔ اپنا مکان بنانے کے لیے سیوروی پر سات کنال اراضی کا ایک قطعہ خریدا اور کوٹھی بنانے کے لیے پیسے کی تگ و دو بھی شروع ہو گئی ۔ علامہ چاہتے تھے کہ ان کی بعض کتابیں جامعہ ملیہ اسلامیہ چھاپ لے ، تاکہ یافت کی صورت پیدا ہو ۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور آخر کار کتابوں کی اشاعت کا بندوبست لاہور ہی میں ہوا ۔ ادھر علی گڑھ میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا ، جس سے علامہ کو بے حد صدمہ ہوا ۔ وہاں کے کچھ نوحوانوں نے تجدد کے جوش میں آ کر سب حدود پھلانگ ڈالیں اور ایک خدا دشمن

مجلس قائم کر لی۔ علامہ نے نذیر نیازی کے نام خط میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا: ”— میں نے کسی سے سنا تھا۔ جس کا مجھے اس قدر رنج ہوا کہ تمام رات بے خواب گزری اور صبح کو نماز میں گریہ و زاری کی کوئی حد نہ رہی۔“ ۸

۱۹۳۵ء کے آغاز میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر خالدہ ادیب خانم توسیعی خطبات دینے دہلی آئیں۔ موصوفہ اعلیٰ پائے کی ادیب اور دانش ور تھیں۔ سیاست میں بھی عمل دخل رکھتی تھیں۔ ترکیہ کی جنگ آزادی میں کمال اتاترک کی ساتھی تھیں۔ لیکن اختلافات نے ایسی نوعیت اختیار کر لی تھی کہ وہ جلاوطن ہو کر پیرس میں مقیم ہو گئیں۔ علامہ سے کہا گیا کہ وہ ایک خطبے کی صدارت فرمائیں لیکن انہوں نے علالت کی بناء پر معذرت کر دی۔ بہر حال علاج کے لیے بھوپال جانا پڑا اور راستے میں والدہ جاوید کے بارے میں طبی مشورے کے لیے دہلی جانے کا فیصلہ ہوا تو انہوں نے اس شرط پر صدارت قبول کر لی کہ ان سے تقریر کی فرمائش نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ دہلی میں تالیف کی وجہ سے وہ اس سے قاصر تھیں۔ جنوری کو علامہ دہلی پہنچے۔ افغان قونصل سردار صلاح الدین ساجوقی کے ہاں قیام فرمایا۔ حکیم نابینا سے طبی مشورہ حاصل کیا اور اسی شام خالدہ ادیب خانم کے لیکچر کی صدارت فرمائی لیکن تقریر نہ کی۔ موصوفہ کے ساتھ کچھ باتیں لیں۔ لیکن اختلافی مسائل اس لیے نہ چھیڑنے کہ علامہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے مسلمان کے دل میں کدورت پیدا ہو۔ بہر حال انہیں خالدہ ادیب خانم کے بعض خیالات سے شدید اختلاف تھا۔ چنانچہ انہوں نے نذیر نیازی کے نام ایک خط میں لکھا: ”خالدہ خانم کے متعلق آپ کی رائے درست ہے۔ مشرق کی روحانیت اور مغرب کی مادیت کے متعلق جو خیالات انہوں

نے ظاہر کیے ، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی نظر بہت محدود ہے ۔
 انہوں نے انہی خیالات کا اعادہ کیا ، جن کو یورپ کے سطحی نظر رکھنے
 والے مفکرین دہرایا کرتے ہیں ۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ مشرق و مغرب
 کے کلچرل تصادم میں اسی عرب کی نبوت اور قرآن نے کیا کام کیا ہے ،
 مگر یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے ۔ کیونکہ مسلمانوں کی فتوحات نے
 اسلام کے کلچرل تاثرات کو دبائے رکھا ۔ نیز خود مسلمان دو ڈھائی سو
 سال تک یونانی فلسفے کے شکار ہو گئے ۔ ، ، ۱۰

دہلی سے علامہ بھوپال گئے ۔ وہاں پانچ ہفتے تک برقی علاج ہوتا رہا ۔
 لاہور پہنچے تو والدہ جاوید پہلے سے زیادہ بیمار تھیں ۔ علامہ نے چاہا کہ
 حکیم نابینا لاہور آ کر انہیں دیکھ لیں ۔ کچھ دیر خط و کتابت ہوتی رہی ۔
 حکیم صاحب مان گئے ۔ لیکن اس سے پہلے ، کہ انہیں بلایا جاتا ، ۲۳ مئی
 ۴۵ء کو شام کے چھ بجے والدہ جاوید اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں ۔
 اس کا ایک اور المناک پہلو یہ تھا کہ مرحومہ کو جاوید منزل میں صرف
 تین دن بسر کرنے کی مہلت ملی ۔ والدہ جاوید کا انتقال ایک صدمہ جاں
 کاہ تھا کہ وہ ایک ایسے وقت پر فوت ہوئیں ، جب علامہ کو آن کی
 رفاقت کی بے انتہا ضرورت تھی ۔ اور اب دوسرا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ بچوں
 کی پرورش کیسے ہو ۔ جون کا مہینہ انہی پریشانیوں میں گذرا ۔ جولائی کے
 وسط میں علاج کی تجدید کے لیے ایک بار پھر بھوپال گئے اور اگست کے
 اواخر میں واپسی ہوئی ۔ اس دوران میں اطمینانِ قلب کی ایک صورت یہ
 نکلی کہ نواب صاحب بھوپال کی طرف سے پانسو روپیہ ماہانہ کا وظیفہ
 مقرر ہوا ۔ اس سے علامہ کے حالات قدرے بہتر ہو گئے ۔ کیونکہ علالت
 کی وجہ سے وکالت کا کام بند تھا اور یافت کی کوئی خاص صورت موجود
 نہیں تھی ۔ اکتوبر کے اواخر میں پانی پت میں مولانا حالی کی سالگرہ کے

سلسلے میں ایک عظیم الشان تقریب ہوئی۔ نواب صاحب بھوپال نے صدارت فرمائی۔ اس مسعود بھی موجود تھے۔ علامہ بھی مدعو تھے لیکن اس وقت تک آواز کا ضعف بڑھ چکا تھا۔ نذیر نیازی لکھتے ہیں: ”یہ امر بڑا تکلیف دہ تھا کہ اس تقریب میں حضرت علامہ اگرچہ مسند پر تشریف فرما رہے، لیکن نہ اپنا مشہور قطعہ

مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفی نیک می دانم

چو محمل را گراں بیمِ حدی را تیز تر خوانم

خود پڑھ سکے، نہ ان تعریفی کلمات کے جواب میں بطور شکر ہی کچھ فرمایا جو اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال اور دوسرے حضرات نے ان کی شان میں کہے۔۔۔ ۱۱

عالات اور دوسری پریشانیوں کے باوجود حضرت علامہ مئی اور مئی کی سیاست سے مکمل طور پر لائق نہیں رہے اور وقتاً فوقتاً اہم مسائل پر اظہارِ رائے کرتے رہے۔ اس زمانے میں لوگوں کا سیاسی شعور پہلے سے زیادہ بیدار تھا۔ معاشی مسائل بھی گہنہیں ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایسے میں سوشلزم کا چرچا بھی بڑھ رہا تھا۔ کانگریس کے اندر سوشلسٹ پارٹی قائم ہو چکی تھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو بھی سوشلزم کے مساعین میں سے ہوتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی بھی موجود تھی۔ بلکہ اس میں بڑے ہونے پیدا ہو رہی تھی۔ علامہ بھی ان حالات سے آگاہ تھے۔ ان حالات میں ان کا ایک بیان ملاحظہ فرمائیں:

”امیروں کے خلاف ملک میں عام جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ

محسوس کر رہے ہیں کہ نازک مرحلوں پر امیر طبقہ ہمیشہ

آن سے غداری کرتا ہے۔ جو حکومتیں کبھی سرمایہ پرستی کی پوجا کرتی تھیں آج مزدوروں اور کسانوں کے رحم پر جی رہی ہیں۔ سب طرف بے چینی کی چنگاریاں ساگ رہی ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت ایسی خطرناک صورت اختیار کر لیں کہ ایک زبردست آگ بن کر دنیا کے موجودہ نظام کو بھسم کر دیں۔ جب ساری دنیا میں مساوات کی لہر چل رہی ہے، تو ہندوستان کب تک اس کے اثر سے خالی رہ سکتا ہے؟ یہاں کے غریبوں میں اب بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اس وقت تک حکومت اور ہمارے لیڈر ان کی طرف سے بے پرواہ رہے ہیں۔ لیکن یہ حالت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ سوشلسٹی ایک خطرناک دور سے گذر رہی ہے اور سوشلسٹ خیالات محض روسی پروپیگنڈہ ہی کی وجہ سے نہیں پھیل رہے ہیں، بلکہ اور بہت سے اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن سے ملک کی اقتصادی حالت میں تبدیلی کا ہونا لازمی ہے۔ سوشلسٹ پارٹی کو اگرچہ پٹنہ میں شکست ہوئی ہے لیکن اس کے سامنے مستقبل ہے۔ گو اس کا انحصار زیادہ تر کانگریس سے علیحدگی پر ہے۔“ ۱۲

علامہ کے اس بیان کے پس پردہ اس زمانے کی مسلم قیادت کے بعض طبقات کا یہ احساس بھی کارفرما تھا کہ سوشلزم ہندو سرمایہ داری کا توڑ ثابت ہو گا اور اگر ایک منصفانہ نظام قائم ہوا، تو اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہو گا۔ یہ توقع بھی کی جا رہی تھی کہ سوشلسٹ پارٹی ہندو مہاسبھا اور کانگریس میں مہاسبھائیت کو ختم کرنے میں مدد دے گی۔ بہر حال مسلمانوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ہندو سوشلسٹ ہو یا کچھ اور، وہ اصلاً

ہندو ہوتا ہے اور ان تمام تعصبات کا حامل ، جن سے ہندو معاشرہ عبارت ہے ۔

مسلمانوں کی پس ماندگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ تعلیم پانے اور مناسب تعلیمی اوصاف سے بہرہ ور ہونے کے باوجود انہیں سرکاری ملازمتوں تک بہت کم رسائی حاصل تھی ۔ ۱۹۲۵ء میں حکومت ہند نے مسلمانوں کے مطالبے پر ملازمتوں میں فرقہ وارانہ توازن قائم کرنے کے لیے کچھ تدابیر اختیار کی تھیں ، جو غیر مؤثر ثابت ہوئیں اور عدم توازن برقرار رہا ۔ ۱۹۳۳ء کے وسط میں حکومت ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ براہ راست پُر ہونے والی اسامیوں میں مسلمانوں کو پچیس فی صد نیابت دی جائے ۔ اور اگر بذریعہ مقابلہ پُر ہونے والی اسامیوں میں مسلمانوں کا تناسب کم رہ جائے ، تو اس کمی کو نامزدگیوں سے پورا کیا جائے ۔ حضرت علیؓ نے خان بہادر حاجی رحیم بخش کی رفاقت میں ایک بیان دیا ، جس میں مطالبہ دیا کہ یہ تناسب پچیس فی صد نہیں ، تینتیس فی صد ہونا چاہیے ۔ کیونکہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے تینتیس فی صد نیابت طے ہوئی ہے ۔ بلکہ اس سے بڑھ کر انہوں نے یہ مطالبہ دیا کہ ملازمتوں میں پرانی کمی کو دور کرنے کے لیے نئی اسامیوں میں مسلمانوں کا تناسب تینتیس فی صد سے بھی زیادہ ہونا چاہیے ۔ ۱۳ اس سے اگلے دن علیؓ کا ایک اور بیان آیا ۔ جس میں انہوں نے ایک تو یہ مطالبہ دیا کہ حکومت ہند نے فیصلے کو صوبوں پر بھی لاگو کیا جائے ۔ دوسرے کسی کسی مؤثر مشینری کے قیام پر زور دیا ، جو ان پر فیصلوں پر عمل درآمد میں مدد دے ۔ ۱۴

دمیونل ایوارڈ کے بارے میں مسلمانوں کا موقف یہ تھا کہ اس فیصلے کو صرف اس صورت میں بدلا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے

درمیان ایک ہمہ گیر سیاسی تصفیہ ہو جائے اور جب تک ایسا نہ ہو، یہ ایک آخری اور قطعی اور ناقابلِ تبدیلی بندوبست ہے۔ جب کانگریس نے یہ فیصلہ کیا کہ کمیونل ایوارڈ کو نہ منظور کیا جائے، نہ مسترد کیا جائے اور اس پر نکتہ چینی بھی کی، تو علامہ نے جون ۱۹۴۷ء میں کانگریس کو یاد دلایا کہ کمیونل ایوارڈ ایک ایسا فیصلہ ہے، جو برطانوی وزیراعظم نے خود کانگریسی رہنماؤں کی درخواست پر دیا۔ ۱۵ یاد رہے کہ جب گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلے میں کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکا، تو سب نے یہی کہا کہ وزیراعظم اپنا فیصلہ دے دیں۔

اگلے سال جب برطانوی پارلیمنٹ میں گورنمنٹ آف انڈیا بل پیش ہوا، تو اس میں کمیونل ایوارڈ کی وہ دفعہ درج نہیں تھی جس میں کہا گیا تھا کہ مجالسِ قانون ساز متعلقہ اقوام کی مرضی لیے بغیر کوئی ترمیم نہیں کریں گی۔ اس پر علامہ اور دوسرے مسلمان رہنماؤں نے پے در پے دو مفصل بیان جاری کیے۔ جن میں مطالبہ کیا گیا کہ کمیونل ایوارڈ کو دس سال کی مدت کے لیے بعینہ برقرار رکھا جائے۔ اس کے بعد جو تبدیلی کی جائے، اس میں مسلمانوں کی قومی مرضی دریافت کی جائے اور قوموں کی باہمی رضامندی معلوم کرنے کا ایک طریقہ کار طے کر لیا جائے۔ مثلاً دس سال بعد اگر کوئی صوبہ ترمیم کرنا چاہے، تو جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے سوال پر ریفرنڈم کرایا جائے۔ پھر جو نئی مجلسِ قانون ساز بنے، اس میں اسی مسئلے پر رائے شماری کرائی جائے اور ترمیم کے لیے ضروری ہو کہ اسے تین چوتھائی مسلمان ارکان قبول کر لیں۔ دونوں بیانات کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ کمیونل ایوارڈ کا نعم البدل دس سال کے بعد ایک خالص، حقیقی اور مستند بین الاقوامی راضی نامہ ہی ہو سکتا

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی ہی کا طوطی بولتا تھا۔ اور جہاں اس کی پالیسی میں کچھ پہلو اچھے تھے، وہاں یہ خرابی بھی تھی کہ اس کی بدولت شہری اور دیہاتی کے امتیازات نے کشیدگی کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ علامہ نے کونسل کی ممبری کے دوران ہی میں اس خرابی کو بھانپ لیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام میں خیر مقدمی سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے مسلمانوں کے باہمی نفاق پر اظہارِ افسوس کیا اور پنجاب کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اپنی قوم میں کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کریں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت علامہ نے ایک بیان میں کہا: ”لیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ حکومت خود اپنے اعمال و افعال کا بھی محاسبہ کرے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت پنجاب کے مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی جو خوفناک تفریق قائم ہو چکی ہے اور جس تفریق نے اس صوبے کے مسلمانوں کو دو متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے، وہ کس کی قائم کی ہوئی ہے؟ سر ہربرٹ ایمرسن نے تو مسلمانوں میں حقیقی لیڈر شپ کے فقدان پر اظہارِ افسوس کیا ہے، میں اس کے برعکس اس بات پر افسوس کا اظہار کرنا ہوں کہ حکومت نے جان بوجھ کر ایسا طرزِ عمل اور پالیسی اختیار کر رکھی ہے، جس نے اس صوبے میں اصلی اور بااقتدار لیڈر شپ کے پیدا ہونے کی تمام آمیدوں کا قلع قمع کر دیا ہے۔“

اپریل ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے مشہور سیاستدان بہاؤ بخش حسین وائسرائے کی ایکزیکیوٹو کونسل کی رکنیت سے سبکدوش ہو کر لاہور آئے۔ ان کا مشن یہ تھا کہ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کو از سر نو منظم کریں تا کہ نئے آئین کے تحت انتخابات کے معرکے میں حصہ لیا جائے۔ انہوں نے ایک بیان میں حکومت پر نکتہ چینی کی کہ وہ مسلمانوں میں محبوب

ڈال رہی ہے اور کہا : "ذاتی رقابتوں کو زور شور سے ہوا دی جاتی ہے ۔
فرقہ واریت اور جماعت سازی کے جذبے کو ابھارا جاتا ہے اور جب ان
حربوں سے بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی ، تو پھر قوم کے ادنیٰ
اور غلیظ طبقے سے لیڈروں پر کیچڑ اچھلوائی جاتی ہے ۔ نتیجہ کیا ہوتا
ہے ؟ حکومت کو اپنے حسبِ منشا کام کرنے کی کھالی چھٹی مل جاتی
ہے ۔ ان حالات میں صوبائی وزیروں کی حیثیت سوائے اس کے اور کیا رہ
جاتی ہے کہ وہ معمولی تحصیل داروں کی طرح گورنروں کے اشارے پر
ناچتے پھریں ۔" علامہ کو اصولی طور پر اس بیان سے اتفاق تھا ۔ لیکن
وہ اس صورتِ حالات کی ذمہ داری میاں فضل حسین ہی پر ڈالتے تھے ۔
انہوں نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس سے خطاب فرماتے ہوئے
کہا : " . . . یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ پنجاب میں شہری دیہاتی
کا جو جھگڑا چل رہا ہے ، اسے سر فضل حسین کی امداد حاصل ہے ۔
فضل حسین کو ابتداء میں قیادت کا منصب اس لیے حاصل نہیں ہوا کہ
وہ دیہاتی تھے ، بلکہ اس لیے ، کہ وہ صوبے کے مسلمانوں کے لیڈر تھے ۔
لیکن انہوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری دیہاتی
جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا ، تاکہ اس طرح ان کا منصب بحال
رہے ۔ اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بعض ایسے ناکارہ اور
تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا ، جو حکومت کے
قطعاً اہل نہیں تھے اور جن میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ وہ اس
اقتدار اور وقار کو برقرار رکھ سکیں جو وزارت کا لازمہ ہوتا ہے ۔" ۱۸
یہیں سے حضرت علامہ اور یونینسٹ پارٹی کے ان اختلافات کا آغاز ہوتا
ہے ، جنہوں نے بعد میں زیادہ شدت اختیار کر لی ۔

اس دور میں حضرت علامہ انجمنِ حمایتِ اسلام کی صدارت پر ایک

بار پھر فائز ہو چکے تھے - ۱۴ جولائی ۱۹۳۳ء کو انہوں نے انجمن کی جنرل کونسل میں ایک تقریر سیکرٹری سے سنوائی - کیونکہ گلے میں تکلیف کی وجہ سے خود بولنا دوپہر تھا - اس تقریر میں انہوں نے بعض اہم تجاویز پیش کیں - مثلاً انجمن کی درس گاہوں میں زمانہ حال کے تقاضوں کے مطابق دینی اور اخلاقی تعلیم کا بندوبست کیا جائے - لڑکیوں کے لیے ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے ، جو خود ہی نصاب تجویز کرے اور خود ہی منادات تقسیم کرے اور رفتہ رفتہ اسی کو عورتوں کی ایک آزاد یونیورسٹی کی صورت دے دی جائے - وقت گذرتا گیا ، نومبر ۱۹۳۳ء میں علامہ نے محسوس کیا کہ صدارت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکیں گے - اس کی ایک وجہ تو مسلسل علالت تھی اور دوسری انجمن کی دھڑلے بندی ، جس سے علامہ نفور تھے - اس لیے انہوں نے استعفیٰ داخل کر دیا - بہر حال انجمن نے اسے قبول نہ کیا اور چھ ارکان کا ایک وفد اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ علامہ استعفیٰ واپس لے لیں اور وعدہ دیا کہ تمام خرابیوں کا ازالہ کیا جائے ۵ - اس پر علامہ مجبور ہو گئے اور انہوں نے استعفیٰ واپس لے لیا - ۱۹

علامہ کا وقار اتنا بلند تھا کہ ان کی بات سب مان لیتے تھے - ۱۹۳۳ء میں پنجاب کونسل کے انتخاب آئے ، تو میاں عبدالعزیز اور سید امجد علی شاہ ایک ہی حلقے سے کھڑے ہوئے - دونوں نے سوچا کہ پانچویں آرائی اور محاذ آرائی سے گریز دیا جائے - چنانچہ انہوں نے یہاں سے اور ملک فیروز خان نون سے کہا کہ آپ فیصدہ لریں کہ ہم میں سے نون الیکشن لڑے اور کون اپنا نام واپس لے لے - بالٹوں نے میاں عبدالعزیز کے حق میں فیصلہ دیا اور سید امجد علی شاہ نے اسے خندہ بستانی سے قبول کر لیا - ۲۰

حوالے

- ۱ - "اقبال نامہ"، - حصہ اول ص ۱۶۹ -
- ۲ - ایضاً - ص ۲۴۳ -
- ۳ - "اقبال کا مطالعہ"، - صفحات ۹۷-۹۸ -
- ۴ - "مکتوباتِ اقبال" - ص ۱۲۸ -
- ۵ - امیر شکیب ارسلان شامی دروزیوں کے مشہور رہنما اور اتحادِ اسلامی کے بڑے داعی تھے -
- ۶ - "مکتوباتِ اقبال" - ص ۱۶۱ -
- ۷ - ایضاً - ص ۱۶۴ -
- ۸ - ایضاً - ص ۲۰۲ -
- ۹ - ایضاً - صفحات ۲۵۵-۲۵۶ -
- ۱۰ - ایضاً - صفحات ۲۵۰-۲۵۱ -
- ۱۱ - ایضاً - ص ۳۰۱ -
- ۱۲ - یہ اقتباس "اوراقِ گم گشتہ"، (ص ۴۴-۴۵) میں یکم جون ۱۹۳۴ء کے ہفت روزہ "منادی"، کے حوالے سے دیا گیا ہے -
- "انقلاب"، (۲۶ مئی ۱۹۳۴ء) میں بھی اسی بیان کا ایک مختصر حصہ چھپا - جو "گفتارِ اقبال"، (صفحات ۱۸۳-۱۸۴) میں شامل ہے -
- ۱۳ - "انقلاب"، - ۱۰ جولائی ۱۹۳۴ء -
- ۱۴ - "انقلاب"، - ۱۱ جولائی ۱۹۳۴ء -
- ۱۵ - Speeches and Statements of Iqbal - ص ۲۱۷ -

- ۱۶ - ”انقلاب“ - ۵ جولائی ، ۱۸ جولائی ۶۳۵ -
- ۱۷ - ”اقبال کے آخری دو سال“، - صفحات ۲۷۱-۲۷۳
- ۱۸ - ایضاً - صفحات ۲۷۱-۲۶۹
- ۱۹ - ”اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام“، - صفحات ۱۳۱-۱۲۶
- ۲۰ - ”انقلاب“ - ۲۹ ستمبر ۶۳۵ -



•

اكتیسواں باب

دو علمی معرکے : احمدیت اور وطنیت

حضرت علامہ نے تحریک احمدیت کے سلسلے میں جو موقف اختیار کیا ، اسے سمجھنے کے لیے پس منظر جاننا ضروری ہے ۔ اور یہ پس منظر جزوی طور پر انہوں نے خود ۱۹۳۵ء میں پیش کیا ۔ وہ لکھتے ہیں :
” . . . مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی ۔۔۔ لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی ۔ یہ اپنے آپ کو الم نشرح کرنے کے لیے کئی عشرے لیتی ہے ۔ اس تحریک کے دو گروہوں کے درمیان اندرونی اختلافات بھی اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ جو لوگ بانی تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے ، وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ تحریک آگے چل کر کیا صورت لے گی . . . درخت دو جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے ۔ اگر میرے موجودہ رویے میں کوئی تناقض ہے ، تو یہ بھی ایک جیتے جاگتے ، سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل لے ۔ بقول ایمرسن صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدلتے ۔“

تحریک احمدیت دو حصوں میں منقسم ہے ۔ ایک قادیانی احمدی ، دوسرے لاہوری احمدی ۔ اول الذکر بانی سلسلہ کو نبی مانتے ہیں اور مسیح موعود ۔ موخر الذکر مجدد مانتے ہیں اور مسیح موعود ۔ قادیانی احمدی ان لوگوں کو مسلمان نہیں سمجھتے ، جو ان کی صف میں شامل

نہیں ہیں۔ لاہوری احمدی تکفیر کے قائل نہیں ہیں۔ قادیانی احمدی عام مسلمانوں کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہیں کرتے اور نہ ان سے رشتے ناطے کرتے ہیں۔ اسی پالیسی کی وجہ سے ان کے عام مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ سے طویل فاصلے رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا تعلق تھا، اس کے ابتدائی دور میں قادیانی احمدی بھی شامل تھے اور علامہ اس پر معترض نہ ہوئے۔ لیکن بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں جب آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنی، تو اس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود احمد تھے اور سیکرٹری عبدالرحیم درد۔ گویا قیادت احمدیوں کے ہاتھ میں تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ احمدی حضرات نے کشمیر کمیٹی کے پلیٹ فارم کو اپنے عقیدے کی پیش رفت کا ذریعہ بنایا۔ یہ صورت عامۃ المسلمین کے لیے قدرتی طور پر ناگوار تھی۔ علامہ نے یہ صورتِ حالات دیکھی، تو ایک نئی آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنا لی اور جب انہیں ایک نئی قادیانی تنظیم ”تحریکِ کشمیر“ کی صدارت پیش کی گئی، تو انہوں نے اس بناء پر اسے قبول نہ کیا کہ قادیانی حضرات دوہری وفاداریاں رکھتے ہیں۔ اگر وہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں، تو ان کی اولین وفاداری صرف تنظیم سے ہونی چاہیے۔ دوسری طرف مجلسِ احرار اسلام نے احمدیوں کے خلاف ایک تحریک برپا کی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ انہیں ایک الگ اقلیت قرار دیا جائے۔ کیونکہ وہ دائرہ اسلام میں شامل نہیں ہیں۔ ختمِ نبوت کے دینی عقیدے کے علاوہ احرار کی طرف سے مخالفت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ برطانوی سامراج کے خلاف برسرِ پیکار تھے اور احمدیوں کے بانی سلسلہ نے انہیں انگریز سے غیر متزلزل وفاداری کا درس دے رکھا تھا۔

یہ تھے وہ مختلف عناصر، جنہوں نے اقبال کو مجبور کیا کہ احمدیوں

کے عقائد کا گہرا مطالعہ کریں - چنانچہ انہوں نے وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں بیانات بھی جاری کیے ، مقالے بھی لکھے اور جب پنڈت جواہر لال نہرو خواہ مخواہ اس بحث میں احمدیوں کی طرف سے کود پڑے ، تو علامہ نے ان کے مقالات کا بھی مدلل جواب دیا - ختم نبوت کے اصول کو تو علامہ ہمیشہ سے اسلام کا بنیادی اصول سمجھتے آئے تھے - اور انہوں نے خطباتِ مدراس میں بھی اس پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی تھی اور کہا تھا کہ ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اب دین مکمل ہے اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی رائے کو مسلمانوں پر ٹھونسنے کے لیے کسی الہامی ذریعے کا حوالہ دے - احمدیت پر بحث کا دروازہ علامہ نے نہیں ، پنجاب کے گورنر سر بربرٹ ایمرسن نے کھولا تھا - کیونکہ انہوں نے احمدیت کے خلاف احرار کی ایچی ٹیشن کا حوالہ دیتے ہوئے مسلمانوں کو رواداری کا درس دیا تھا - یہ ایک مداخلت بے جا تھی - جس کے جواب میں علامہ نے تحریک احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان جاری دیا - آپ نے کہا کہ اسلام نسلی تصور کی مکمل نفی کرتا ہے اور اس کی بنیاد صرف اور صرف مذہبی تصور پر ہے - اس لیے جب اس مذہبی تصور کو مسخ کیا جاتا ہے ، تو مسلم معاشرہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کا مقصد اس کی وحدت اور سالمیت کو ضعف پہنچانا ہے - جو گروہ اپنی بنیاد کے طور پر ایک نئی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور جو اسے اسے قبول نہیں کرتا ، اسے کافر قرار دیتا ہے ، تو مسلمان قدرتی طور پر اپنے اتحاد کے لیے ایک خطرہ قرار دیتے ہیں - اور یہ بات جائز بھی ہے ہے کہ صرف ختم نبوت کے تصور ہی سے اسلامی معاشرے کی سالمیت کا تحفظ فراہم ہوتا ہے - اقبال اس تصور کو نوع انسانی کی ثقافتی تاریخ میں سب سے زیادہ بدیع تصور قرار دیتے تھے - کیونکہ اسلام سے پہلے نبوت

کے تسلیم کی وجہ سے انسان کسی نہ کسی کے ظہور کا منتظر ہوتا تھا اور اس سے مذہبی مہم جوؤں کو کُھل کھیلنے کا موقع مل جاتا تھا۔ قبل از اسلام مجوسیت نے اس دور میں دو تحریکوں کو جنم دیا۔ ایک بہائیت، دوسری قادیانیت۔ لیکن بہائیت اس اعتبار سے زیادہ دیانت پر مبنی ہے کہ وہ کھلم کُھلا اسلام سے انحراف کا اعلان کرتی ہے اور قادیانیت اسلام کے ظواہر کو برقرار رکھ کر اس کی روح سے انحراف کرتی ہے۔ علامہ کے بیان کے مطابق ”ظل“ اور ”بروز“ اور ”حلول“ کی اصطلاحات مسلم ایران میں اسلام سے باغی تحریکوں کی ایجاد ہیں اور ”مسیح موعود“ کی اصطلاح بھی مسلم مذہبی شعور کی تخلیق نہیں۔

علامہ نے سر ہربرٹ ایمرسن کے درسِ رواداری کو مسلمانوں کے مخصوص ثقافتی نقطہ نگاہ سے بے خبری پر معمول قرار دیا اور کہا کہ برطانوی راج کو اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد برقرار رہتا ہے یا نہیں۔ اس کا مفاد صرف اس میں ہے کہ جو مذہبی مہم جو ابھرے، وہ برطانیہ کی وفاداری کا دم بھرے اور اس سلسلے میں اکبر الہ آبادی کا یہ شعر پیش کیا:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ

”انا الحق“، کہو اور پھانسی نہ پاؤ

علامہ نے کہا کہ یہ انصاف کی بات نہیں کہ اسلام کے باغی گروہ کو تو نھلی چھٹی دی جائے لیکن ہم کوئی دفاعی تدبیر اختیار کریں، تو ہمیں رواداری کا درس دیا جائے۔ اگر حکومت اس گروہ کو خصوصی خدمات کی بنا پر پسند کرتی ہے، تو وہ اسے معاوضہ دینے میں آزاد ہے۔ لیکن یہ زیادتی ہے کہ ہم اپنے معاشرے کی سالمیت کے دفاع کے لیے سعی

سے روکے جائیں۔ علامہ نے فرمایا کہ حاکموں کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ قادیانیوں کو ایک الگ کمیونٹی قرار دے دے۔ ۲

احمدی اخباروں نے قدرتی طور پر اعتراض کیے۔ علامہ نے جواب دیے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس مناظرے میں شامل ہوئے اور کلکتہ کے رسالہ ”ماڈرن ریویو“ میں مسلمان اور احمدیت کے موضوع پر تین مضامین لکھ ڈالے۔ علامہ نے ان مقالات کا ایک نہایت جامع جواب لکھا۔ پوری بحث کو سمیٹنا تو ہزرے لیے نہ ممکن ہے، نہ یہ کتاب اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔ لیکن علامہ کے جوابی مضمون میں سے یہ اقتباس خصوصی اہمیت رکھتا ہے :

”یہ ظاہر ہے کہ ہندوستانی قوم پرست (نہرو) جس کے سیاسی آئیڈیلزم نے حقیقت کی جس کو عملاً نابود کر دیا ہے، مسلمانوں کی اس خواہش کو برداشت نہیں کرتا کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو حق خود ارادیت حاصل ہو۔ میرے نزدیک اس کی یہ سوچ غلط ہے کہ ہندوستانی نیشنلزم کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ مختلف ثقافتی وحدتوں کو مکمل طور پر کچل دیا جائے۔۔۔“ ۳

ختم نبوت اور تحریک احمدیت پر علامہ کے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے سالک رقمطراز ہیں : ”ان مضامین کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے انتہائی اشتعال اور ناراضی کی حالت میں بھی بانی احمدیت، امام جماعت احمدیہ اور احمدیوں کے خلاف کوئی دہاڑا لفظ نہیں لکھا۔ بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نہایت متین و منجیدہ الفاظ انداز

اختیار کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان تحریروں میں علامہ نے بعض ایسے نکات پیش کیے ہیں ، جن کا جواب اب تک کسی سے نہیں ہو سکا۔ ، ، ،

دو سال بعد حضرت علامہ اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان وطنیت کی اساس کے مسئلے پر ایک علمی معرکہ ہوا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے ایک تقریر میں کہا کہ ”موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔ دیکھو ، انگلستان کے بسنے والے سب ایک قوم شمار کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان میں یہودی بھی ہیں ، نصرانی بھی ، پروٹسٹنٹ بھی اور کیتھولک بھی۔ یہی حال امریکہ ، جاپان اور فرانس وغیرہ کا ہے۔“ چونکہ مولانا کانگریس کے حامی تھے ، اس لیے علامہ نے اس بیان سے یہ تاثر لیا کہ ان کے نزدیک قوم یا قومیت کی اساس وطن پر ہوتی ہے اور انہوں نے یہ تین شعر کہے :-

عجم ہنوز نہ داند رسوزِ دین ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ابن بوالجہی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ مجدِ عربی است

یہ مصطفیٰ برسوں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی است

اس پر مولانا حسین احمد مدنی نے لکھا کہ ”میں نے اپنی تقریر میں لفظ قومیت کا کہا ہے ، ملت کا نہیں کہا ہے۔ دونوں لفظوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ملت کے معنی شریعت یا دین کے ہیں اور قوم کے معنی عورتوں اور مردوں کی جماعت کے ہیں۔۔۔ اگر میری تقریر کے سیاق و سباق کو بھی حذف کر دیا جائے اور عبارت میں تحریف کر کے حسبِ اعلان

جریدہ 'احسان'، قوم یا قومیت کی اساس وطن پر ہوتی ہے، بتائی جائے، تب بھی میں نے کب کہا کہ ملت یا دین کی اساس وطن پر ہے؟"۔

حضرت علامہ نے تسلیم کیا کہ "سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است" میں انہوں نے ملت کا لفظ قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ "اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ اور بالخصوص قرآن مجید میں شرع اور دین کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن حال کی عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں بہ کثرت سندت موجود ہیں کہ ملت قوم کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔" علامہ نے اپنے موقف کے حق میں جو نکات پیش کیے، ان کی تلخیص ملاحظہ ہو۔ جو بیشتر علامہ ہی کے اپنے الفاظ پر مشتمل ہے:-

اول : جغرافیائی اصطلاح کے اعتبار سے یہ بات اسلام سے متصادم نہیں کہ اقوام اوطان سے بنتی ہے۔ اس لیے کہ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے، ہئیت اجتماعیہ انسانیت کا۔ اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہئیت اجتماعیہ انسانیت کا ایک قانون ہے، اس لیے کہ اسلام نے وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے، تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

دوم : مولانا کے استدلال سے یہی نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ مسلمان بہ حیثیت قوم اور ہو سکتے ہیں اور بہ حیثیت ملت اور۔ اور از روئے قوم چونکہ وہ ہندوستانی ہیں، اس لیے انہیں باقی اقوام

ہند کی قومیت یا ہندومتانیت میں جذب ہونا چاہیے - یعنی یہ ، کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں - اس ملک میں رہنا ہے ، تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ سمجھو اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو - سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم نہ تصور کرو اور اکثریت میں مدغم ہو جاؤ -

سوم : قرآنِ کریم میں مسلمانوں کے لیے امت کے سوا اور کوئی لفظ نہیں آیا - قوم رجال کی جماعت ہے اور یہ جماعت بہ اعتبار قبیلہ ، نسل ، رنگ ، زبان ، وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے - لیکن ملت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی - گویا ملت یا امت جاذب ہے ، اقوام کی - خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی -

چہارم : حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہٴ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے ، جو قادیانی افکار میں انکارِ خاتمیت کا ہے - جس طرح قادیانی نظریہٴ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ مجددیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے ، بعینہٴ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے - بظاہر نظریہٴ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی انکارِ خاتمیت الہیات کا ایک مسئلہ ہے - لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے -

پنجم : ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے، ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے، تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لالٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔ ۸

بہر حال اس علمی تبادلہٴ خیالات کا انجام خوشگوار ہوا۔ اس کا سہرا ایک صاحب ”طالوت“ کے سر تھا۔ جو حضرت علامہ کے بھی عقیدت مند تھے اور مولانا حسین احمد مدنی کے بھی۔ انہوں نے دونوں کے ساتھ خط و کتابت کی اور آخر میں مسئلہ سلجھ گیا۔ علامہ نے اپنے خط میں لکھا کہ ”آج کی قومیں اوطان سے بنتی ہیں“ کے فقرے سے مولانا کا مقصد ایک امر واقعہ کو بیان کرنا ہے، تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ فرنگی سیاست کا نظریہ ایشیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ البتہ اگر آن کا یہ مقصد تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریے کو قبول کر لیں، تو پھر بحث کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ علامہ نے یہ بھی لکھا کہ ”کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈا کرنا نہ میرا اس سے پہلے مقصد تھا، نہ آج مقصود ہے۔ بلکہ وہ شخص جو دین کو سیاسی پروپیگنڈے کا پردا بنا رہا ہے، میرے نزدیک لعنتی ہے۔“ ۹ جناب طالوت نے اس خط کا متن مولانا مدنی کو بھیج دیا۔ مولانا نے جواب لکھا ”میرے محترم سر صاحب (اقبال) کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا، تو اس میں کوئی کلام نہیں۔ اگر مشورہ مقصود ہے، تو وہ خلاف دیانت ہے۔ اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ

تقریر کے لاحق و سابق پر نظر ڈالی جائے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ مودودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریات اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیے۔ خبر ہے، منشاء نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورہ کو ذکر بھی نہیں کیا، پھر اس مشورے کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے۔“ آگے چل کر مولانا نے بتایا کہ میں آن ذلتوں کو گنوا رہا تھا، جو انگریز کے ہاتھوں ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کو درپیش رہی ہیں۔ میں نے اگر کوئی مشورہ دیا، تو صرف یہ کہ ہندوستان کو جلد از جلد آزاد کرایا جائے۔ ”باقی رہا، ملت اسلامی کا بلا انصاف، بلا الوان، بلا اوطان، بلا صنائع وغیرہ متحد ہونا اور کرنا، تو یہ دوسرا امر ہے۔ اس کو بھی ہم جانتے ہیں۔ بہاری گھٹی میں پڑا ہے۔ اس کی بناء پر ہم مالٹا میں قید رہے، ہم نے کراچی کا جیل کاٹا اور سینکڑوں مصائب اٹھائے اور بچپن سے اس کی تعلیم پائی۔ قرآن کی آیات، احادیث صحیحہ اور روایات آج نہ سطور میں، بلکہ صدر میں موجود ہیں۔ جن کو بارہا مناہر پر، مجامع میں ہم پڑھتے اور اس کا وعظ سناتے ہیں۔ کوئی تو اس کا قوال ہی ہوگا۔ ہم قوال اور فعال دونوں ہیں۔“، ۱۰

اس سے علامہ کا اطمینان ہو گیا اور انہوں نے مدیر ”احسان“ کے نام ایک خط میں ”طالوت“ کے نام مولانا کے خط کا اقتباس درج کر کے لکھا:

”خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانان ہند کو جدید نظریہ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے

اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق آن پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے آن عقیدت مندوں کے جوش عقیدت کی قدر کرتا ہوں، جنہوں نے ایک دینی امر کے توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گلیاں دیں۔ خدا تعالیٰ انہیں مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔ نیز آن کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں آن کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔“

علامہ کا یہ بیان ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کے ”احسان“ میں شائع ہوا۔ اگر وہ ”ارمغانِ حجاز“ کی ترتیب اپنی زندگی میں کرتے، تو شاید وہ تین اشعار درج نہ کرتے، جن میں مولانا حسین احمد مدنی پر چوٹ کی گئی تھی۔ بہر حال یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ کی وفات کے بعد مولانا حسین احمد مدنی نے اس مسئلے پر ایک مفصل مقالہ لکھا۔ جس میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ کے بعض خیالات سے اختلاف ظاہر کیا۔

حوالے

- ۱ - Speeches and Statements of Iqbal - صفحات ۱۰۱-۱۰۲
- ۲ - ایضاً - صفحات ۹۸-۹۱
- ۳ - ایضاً - ص ۱۱۰
- ۴ - ”ذکر اقبال“ - ص ۲۱۱
- ۵ - ”متحدہ قومیت اور اسلام“ - ص ۶
- ۶ - ”ارمغانِ حجاز“ - ص ۲۷۸
- ۷ - ”متحدہ قومیت اور اسلام“ - ص ۶

۸ - "مقالات اقبال" - صفحات ۲۲۱-۲۳۸

۹ - "متحدہ قومیت اور اسلام" - صفحات ۱۷-۱۸

۱۰ - ایضاً - صفحات ۱۹-۲۱

۱۱ - ایضاً - صفحات ۲۳-۲۴

۷



بتیسواں باب

اعلانِ جنگ ، دورِ حاضر کے خلاف

”بانگِ درا“ کی اشاعت کے پورے گیارہ سال بعد ”بالِ جبریل“، منظرِ

عام پر آئی۔ اور اس کے ایک سال بعد ”ضربِ کلیم“ جسے علامہ نے ”دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ“ قرار دیا۔ حقیقت میں ان کی پوری شاعری اس بنیادی رُوح کی حامل ہے۔ اقبال قومی اور بین الاقوامی سطح پر عصرِ حاضر سے بیزار تھے اور ایک نئے نظام کی تلاش میں تھے۔ ایک ایسا نظام، جو معاشی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی استحصال سے پاک ہو۔ ان کے نزدیک ایسے نظام کی تخلیق صرف اسلام کے ذریعے سے ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ اس کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک جدید اندازِ تفکر کی بنیاد ڈالی جائے۔ یہی ان کی زندگی، شاعری اور سیاست کا منتہائے مقصود تھا۔ انہیں جس نظام میں کوئی ایسی بات نظر آئی، جو اسلام کے قریب تھی، اس کی تحسین و ستائش کی۔ اور جس چیز کو اسلام کے منافی پایا، اسے مسترد کر دیا۔ **پہرچا خلاف تھے**۔ علامہ اشرفی کے صریحاً خلاف تھے۔ وہ حقیقت کے مادی تصور کی وجہ سے اشرفیت سے بیزار تھے۔ اور اسے مساواتِ شکم کا مذہب قرار دیتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ نوعِ انسانی کی نجات کا ذریعہ کون سا ہے۔ اور ایک مثالی نظام کے تقاضے کون کون سے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سیاست، معیشت، اور ثقافت پر اقبال کی نظر بہت گہری تھی۔ اور یہ دونوں

کتابیں اس کی بہترین عکاس ہیں - بہر حال اقبال کے خیالات کے تجزیے کے لیے ضروری ہے کہ جس زمانے میں یہ دونوں کتابیں منظرِ عام پر آئیں ، اس کا پس منظر بہارے سامنے آ جائے -

اقبال کی شاعری نے اصل نمو پائی ، تو دو عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے میں - اور اس زمانے کی تاریخ تین ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے -

اول : پہلی عالمی جنگ کے بعد صلح کے تصفیے - دوم : لیگ آف نیشنز یا جمعیت اقوام کی صورت میں ایک نئے بین الاقوامی نظام کا قیام اور ترک جنگ کا عالمی معاہدہ پیرس - سوم : نئے بین الاقوامی نظام کا زوال اور قوموں کے درمیان کشمکش کے ایک نئے دور کا آغاز -

”ہال جبریل“ اور ”ضربِ کلیم“ اس آخری دور کی عکاس کرتی ہیں - لیکن تصویر کا ایک اور پہلو بھی ہے - اور وہ ہے ایشیا میں بیداری کا ایک نیا دور ، جو اس دور کے ساتھ ساتھ چلا اور وہ بھی اس کلام میں منعکس ہے -

سوویت یونین مدتوں بین الاقوامی برادری سے کٹا رہا - کیونکہ اسے عملاً اچھوت سمجھا جاتا تھا - لیکن جب ۱۹۲۹ء میں عالمی معاشی بحران نے امریکہ ، مغربی یورپ ، بلکہ یورپی طاقتوں کے زیرِ تعین افریشیائی دنیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دنیا نے دیکھا ، کہ سوویت یونین اس بحران سے قطعی طور پر متاثر نہیں ہوا ، تو جن لوگوں نے مغربی طاقتوں کے پورے معاشی ڈھانچے کو ٹوٹتے دیکھا اور جو متبادل معاشی نظام کی تلاش میں تھے ، ان کی نظروں میں سوویت یونین کے لیے اور اس کے نظام کے لیے احترام کے جذبات پیدا ہوئے - عالمی معاشی بحران کا

ایک اور نتیجہ یہ تھا کہ یورپ میں جمہوریت کے سیاسی نظام کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اور یہ رُجحان عام ہوا کہ اگر بربادی سے بچنا ہے تو جمہوریت کی جگہ آمریت کو اپنانا ہوگا۔ سچ پوچھئے، تو اس سے پہلے ہی اس رُجحان کا آغاز ہو چکا تھا۔ اٹلی میں فاشسٹ آمریت داخلی سیاسی اور معاشی خلفشار کو دور کر کے ایسا تاثر پیدا کر چکی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی آن ملکوں میں بھی آمریت آنے لگی، جہاں جمہوری بنیادیں مضبوط نہیں تھیں۔ عالمی معاشی بحران نے اس رُجحان کو تیز تر کر دیا۔ اور جرمن میں نازیت برسرِ اقتدار آئی تو انہی سالوں میں، جب عالمی معاشی بحران نے جرمن معیشت کا تیا پانچہ کر رکھا تھا، آمریت کے رواج نے تنگ دلانہ وطنیت کو فروغ دیا۔ اور آن یورپی قوموں دو سامراجیت کی طرف زیادہ سائل کیا، جن کی نو آبادیاں پہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں چھن چکی تھیں یا جو یہ سمجھتی تھیں کہ انہیں زیادہ نو آبادیات کی ضرورت ہے۔ آمریت کی علمبردار یورپی قوموں نے وہ بند ٹوڑ کر رکھ دیا جو صلح کے معاہدات اور جمعیتِ اقوام نے باندھ رکھا تھا۔ چنانچہ جرمن نے یورپ کے اندر توسیع پسندانہ عزائم کا عمل شروع کیا۔ اٹلی نے حبشہ کی آزادی سب دری، مشرقِ بعید میں جاپان نے چین پر یہ غارتگری اور چونکہ جمعیتِ اقوام پر پرانی سامراجی طاقتوں نے غیور ہوا، اس لیے وہ اس رُجحان کو روک نہ سکی۔ ہمکنہ عضوِ معطی بن کر رہ گئی۔ ان حالات نے یورپ کو جنگ کے دہانے پر لا ڈھرایا۔

ایشیا میں بیداری کے آثار نمایاں تھے۔ افغانستان، ایران اور ترکیہ آزادی اور استحکام کی منازل سے گذر کر معاہدہ سعد آباد کی صورت میں ایک دوسرے کے دست و بازو بن چکے تھے۔ برطانیہ، مسر اور عراق کی آزادی تسلیم کر چکا تھا۔ یمن اور سعودی عرب آزاد تھے۔ فلسطین نے

عرب مجلس الاعلیٰ و الاسلامی کے پرچم تلے صیہونیت کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ - شام و لبنان میں فرانسیسی انتداب کے خلاف جدوجہد جاری تھی۔ برعظیم پاک و ہند میں آزادی کی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ - جاپان ایک عظیم صنعتی ملک بن چکا تھا۔ - چین سن یات سین کی قیادت میں جمہوریہ بن چکا تھا اور آس کا جانشین چیانگ کائی شیک ایک ایشیائی رہنما کی حیثیت سے نام پا چکا تھا۔ - دوسری طرف چین کے اندر ماؤسی تنگ کے زیرِ قیادت کمیونسٹ پارٹی بھی بہت فعال تھی اور وسطی ایشیا کی پرانی اسلامی مملکتیں سوویٹ یونین کے اندر شامل ہو کر ایک نئے نظام کو اپنا چکی تھیں۔ - اگرچہ افریقہ ابھی تک ایک تاریک براعظم تھا لیکن شمالی افریقہ کے مسلمان ملکوں میں آزادی کی تحریکیں موجود تھیں۔ -

آس زمانے میں سوشلزم صرف سوویٹ یونین میں رائج تھا اور یہ ایک عظیم تجربہ تھا۔ اس لیے اقبال نے تسلسل اور تواتر سے اس کا تذکرہ کیا۔ ”لینن خدا کے حضور میں“، ”فرشتوں کا گیت“ اور ”فرمانِ خدا“، محض ایک ڈرامے کی مختلف کڑیاں نہیں تھیں بلکہ علامہ کے اپنے دل کی دھڑکنوں کی عکاسی کرتی تھیں اور حالات کا ایک ایسا تجزیہ پیش کرتی تھیں، جو اقبال نے خود کیا۔ لینن ازم اور مارکس ازم میں خدا کا کوئی وجود تسلیم نہیں کیا جاتا۔ لیکن ان مسائل میں خدا کو لانے کا مطلب یہ تھا کہ علامہ سوشلزم کے مادیت نواز عنصر کو نظر انداز کر کے آس کے معاشی پہلو کو پیش کرتے تھے۔ جو ان کے نزدیک اسلامی نظریات سے بہت حد تک ملتا جلتا تھا اور علامہ کا یہ شعر —

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی^۲

ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک استحصال سے پاک اور منصفانہ اور عادلانہ نظام تو چاہتے تھے لیکن پرولتاری آمریت کے تصور کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ روس کی دہریت سے آشنا تھے :

یہ وحی دہریتِ روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات ۳

”اشتراکیت“ کے عنوان سے جو نظم لکھی ، اس میں روس کی گرسی رفتار اور شوخی، افکار کی تعریف کی اور ساتھ ہی لکھا :

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار ۴

اقبال جاگیرداری کے نظام کو غلط قرار دیتے تھے اور زمین کی نجی ملکیت کا تصور نہیں مانتے تھے۔ اس بناء پر ، کہ یہ اسلام کی روح کے منافی ہے۔ ”الارض للہ“ کے عنوان سے جو نظم لکھی ، وہ اس کی شاہد ہے۔ جس کا آخری شعر ہے :

دہ خدایا یہ زمین تیری نہیں ، تیری نہیں !
تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں ، میری نہیں ! ۵

یہاں یہ صراحت شاید لازمی ہے کہ جاوید نامہ میں علامہ نے اپنے افکار کا اظہار جمال الدین افغانی کی زبان سے دیا ہے اور ان سے واضح ہوتا ہے کہ روسی تحریک کو علامہ ایک منفی حیثیت دیتے تھے۔ یعنی سرمایہ داری کی نفی کا۔ چنانچہ ان کی نظر میں روس لا کے مقام پر ہے اور جب

تک وہ الا کی طرف سفر نہ کرے گا اور ذاتِ وحدت کا اقرار دل و جان سے نہ کرے حقیقی فلاح نہ پا سکے گا۔

علامہ کی نگاہیں دور بین تھیں۔ وہ مستقبل شناس تھے۔ یورپی سیاست میں سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی اولاد سامراجیت جو کھیل کھیل رہے تھے، علامہ اس کے انجام سے باخبر تھے۔ ان کی نظر آنے والی عالمی جنگ اور اس کے نتائج پر تھی :

شفق نہیں مغربی آفاق پر ، یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکرِ گستاخ جس نے عرباں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
آسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے آس کا آشیانہ
جہان نو ہو رہا ہے پیدا ، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قہار خانہ

جمعیتِ اقوام سے اقبال کو کبھی حسنِ ظن پیدا نہ ہوا۔ بلکہ وہ ہمیشہ
اسے سامراجی طاقتوں کی باندی سمجھتے رہے۔ انہوں نے یہ تو پہلے ہی
کہہ دیا تھا کہ

من ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

لیکن جب بار بار اس کی نااہلی کا مظاہرہ ہوا اور یہ نہ صرف کمزور قوموں
کی مدد کے ناقابلِ ثابت ہوئی بلکہ سامراجی طاقتوں کے باہمی اختلافات
کا بھی اکھاڑہ بن گئی ، تو اقبال نے بھانپ لیا کہ اب اس کی موت
قریب ہے :

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
 ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
 تقدیر تو مہرم نظر آتی ہے و لیکن
 پیرانِ کایسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
 ممکن ہے کہ یہ داشتہ پیرکِ افرنگ
 ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

اور اب دنیائے اسلام کے استحصال کی طرف آئیے۔ فرانسیسی سامراج کا
 شیوہ یہ تھا کہ جہاں اپنا منجوس قدم رکھتا، وہاں حقائق سے عوام کی
 توجہ کو ہٹانے کے لیے شراب اور زنانِ بازاری کو ارزاں کر دیتا۔
 چنانچہ یہی شام و لبنان میں کیا۔ اس شیوے کو اقبال نے بڑی خوبصورتی
 سے پیش کیا :

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا
 نبیِ عفت و غم خواری و کم آزاری
 صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے
 مے و قہار و ہجومِ زنانِ بازاری

اور

رندانِ فرانسیس کا مے خانہ سلامت
 پڑے مئے گل رنگ سے ہر شیشہ حلب کا

فلسطین کے مسئلے پر علامہ د اضطراب آن کی تشریحی تحریروں، بیانات اور
 خطبات سے بھی واضح ہے اور شاعری سے بھی۔ انہوں نے انتداب کے
 پورے تصور کی مخالفت کی اور صیہونیت کی مسلسل مذمت فرمائی اور کہا :

ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا۔

اور ملوکیتِ انگلیس کا مقصد وہ اپنے بیانات میں بتاتے رہے ہیں کہ وہ
دنیاۓ عرب کے سینے میں ایک مستقل ناسور بن کر اپنے سامراجی عزائم
کی پیش رفت کا سامان مہیا کر رہی ہے۔ اس زمانے میں امریکہ بظاہر
اس مسئلے سے لاتعلق تھا لیکن اندر ہی اندر وہ صیہونیت کی پرورش کرتا
رہا۔ اور جب برطانیہ نے فلسطین سے انخلا کیا، تو امریکہ نے اسرائیل
کو اپنا فوزندِ دل بند بنا لیا۔ تاکہ اس کے توسط سے دنیاۓ اسلام میں
اپنے عالمی سامراجی عزائم کو آگے بڑھائے۔ علامہ نے فلسطینی عرب سے
خطاب فرماتے ہوئے کہا:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگ جاں پنجمہ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے آستوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

پوری ایک تہائی صدی بعد علامہ کے اس خواب کی تعبیر آزادیِ فلسطین
کی تنظیم اور فدائین کی سرفروشی کی صورت میں منظر عام پر آئی اور خودی
کی پرورش اور لذت نمود کے نتائج سامنے رہے ہیں۔

حضرت علامہ نے مسولینی کی آدم کشی اور غارت گری کا تذکرہ کیا۔ حبشہ کی آزادی پر یلغار ہوئی، تو پکار اٹھے:

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہرگز کو ہے برہ معصوم کی تلاش ۱۲

جہاں جہاں ایشیا میں بیداری کے آثار دیکھے، اس پر اظہار مسرت کیا:

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ ۱۳

اور

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست لڑی خوار ہے
زمین میر و سلطان سے ہزار ہے

کیا دور سرمایہ داری کیا
تاشا دہا در مدارِ کیا

گراں خواب چینی منبھانے لگے
بہالہ کے چشمے آہانے لگے

دلِ طورِ مینا و فاراں دویم
تجلی کا پھر منتظر ہے کایم ۱۴

یہ درست ہے کہ اقبال نے بعض سلاطین سے آمیدیں باندھیں۔ مثلاً نادر شاہ غازی سے۔ لیکن ان کا مدعا اس سے ماوراء تھا۔ وہ مشرق میں ایک نئی قیادت کے آرزومند تھے۔ ایک نئے بدن کی تلاش میں تھے، جس میں روحِ مشرق اپنی پوری توانائیوں اور تابانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہو:

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبحِ چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ مشرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزہ کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی ۱۵

وہ اس قیادت کو نقطہٴ ماسکہ بنا کر سامراج کے خلاف ایک وسیع تر محاذ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جمعیتِ اقوام کی جگہ یا اس کے مقابلے پر یا ایک آزاد حیثیت سے جمعیتِ اقوامِ شرق کا تصور پیش کیا:

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
تہراں ہو اگر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرہٴ ارض کی تقدیر بدل جائے ۱۶

اس خواب کی تعبیر کا آغاز بھی اقبال کی وفات کے کم و بیش ایک تہائی صدی بعد اسلامی ملکوں کی تنظیم اور تیسری دنیا کے اتحاد کی صورت میں ہو رہا ہے۔

علامہ کی پوری شاعری عصر حاضر کے خلاف اعلان جنگ کی مظہر ہے اور ”بال جبریل“، اور ”ضربِ کیم“، اسی اعلان جنگ کے حامل ہیں۔ یہ جنگ سرمایہ داری کے خلاف ہے، سامراجیت کے خلاف ہے، محکومی اور غلامی کے خلاف ہے، بے انصافی، استحصال اور ظلم کے خلاف ہے، الحاد کے خلاف ہے، وطنیت کے تنگ دلانہ نظریے کے خلاف ہے، نئی تہذیب کی خرابیوں کے خلاف ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ یہی، کہ ایشیا اور افریقہ کی مظلوم و متہور قوموں میں بیداری اور احساس خودی پیدا ہو۔ اور وہ اس دنیا میں ایک ایسے عادلانہ اور منصفانہ نظام کی داعی ہوں، جس میں خلقِ خدا چین سے زندگی بسر کرے۔ اور اقبال کے نزدیک یہ چیز صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اسلام کی حقیقی روح کو پہچانا جائے، اپنایا جائے اور آسے عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں عمل میں لایا جائے۔

حوالے

- ۱ - بال جبریل - صفحات ۱۵-۱۴۴
- ۲ - ایضاً - صفحات ۶۱-۶۲
- ۳ - ضربِ کیم - ص ۱۴۴
- ۴ - ایضاً - ص ۱۳۸
- ۵ - بال جبریل - ص ۱۶۱
- ۶ - ایضاً - ص ۱۷۶

- ۷ - ضربِ کیم - ص ۱۵۸ -
- ۸ - ایضاً - ص ۱۵۰ -
- ۹ - ایضاً - ص ۱۵۹ -
- ۱۰ - ایضاً - ص ۱۵۹ -
- ۱۱ - ایضاً - ص ۱۶۳ -
- ۱۲ - ایضاً - ص ۱۴۷ -
- ۱۳ - بالِ جبریل ص ۸۰ -
- ۱۴ - ایضاً - ص ۱۶۴ -
- ۱۵ - ضربِ کیم - ص ۱۴۴ -
- ۱۶ - ایضاً - ص ۱۴۹ -

۷



تینتیسواں باب

علمی عزائم : جو پورے نہ ہو سکے

حضرت علامہ نے علم و ادب اور سیاست کے دواثر میں جو خدمات سرانجام دیں ، وہ سب کے سامنے ہیں ۔ لیکن ان کے شوق کی بلندی کا کوئی عالم نہیں تھا ۔ بے شمار علمی عزائم باندھے لیکن انہیں پورا نہ کر سکے ۔ پہلے اس میں قوت لایموت کے لیے جدوجہد حائل رہی ، پھر سیاست نے فرصت کے لمحات چھین لیے ۔ مسلسل علالت بھی سہ راہ ثابت ہوئی ۔ وکالت کا پیشہ ترک کرنے کے بعد بھی کچھ لکھنے کا ارادہ نہیں لیکن نہ یک سوئی نصیب ہوئی ، نہ ایسے حالات ، نہ خاطر جمع ہو کر سکون کے ساتھ کام کر سکیں ۔

علامہ کی آرزو تھی کہ اپنی کہانی خود اپنی زبانی مرتب کریں ۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں سید سلیمان ندوی کو لکھا : "میں اپنے دل و دماغ کی سرگذشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگذشت کلام روشنی ڈالنے کے لیے مہایت ضروری ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہے ، اسے تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا ۔" اس کے بعد "عزت" کو لکھا : "میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو انہوں کے لیے سبق آموز ہو سکے ۔ ہاں خیالات و تدریسی اصلاحات سبق آموز ہو سکتا ہے ۔ اگر کبھی فرصت ہو کئی تو لکھوں گا ۔ فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے ۔" ۲۰ نومبر ۱۹۱۹ء کو لکھا : "میں

کے رسالہ ”نقیب“ کے مدیر وحید احمد کے نام لکھا : ”حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگذشت قلمبند کروں گا۔ جس سے مجھے یقین ہے، بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا۔“ ۳

”اسرار خودی“ کے بعد ”رموز بے خودی“ تکمیل کے قریب پہنچی، تو خیال آیا کہ اسی سلسلے کی تیسری کڑی بھی لکھی جائے۔ مولانا گرامی کے نام ایک مکتوب میں اس کا یوں تذکرہ کیا :

”مثنوی کا دوسرا حصہ قریب الاختتام ہے۔ مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آ رہا ہے اور مضامین دریا کی طرح آمدے آ رہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کونوٹ کروں۔ اس حصے کا مضمون ہوگا، حیات مستقبلہ اسلامیہ۔ یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعت اسلامیہ، جس کی تاسیس دعوت ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات و حوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے۔ اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔ میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف و واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا اور بعض آیات اور سورتوں پر مہینوں، بلکہ برسوں غور کیا اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں۔ مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس کا لکھنا آسان نہیں۔ بہر حال

میں نے یہ قصد کر لیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں
 گا اور اس کی اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی یا جب
 اس کا وقت آئے گا اشاعت ہو جائے گی۔۔۔

یہ ارادہ قائم رہا۔ چنانچہ ”رموزِ بے خودی“ کے دیباچے میں علامہ نے
 بتایا کہ مسلمانوں کے انحطاط کو دور کرنے اور ان کی زندگی کو مضبوط
 و مستحکم بنانے کے جس عملی اصول کو ”اسرارِ خودی“ اور ”رموزِ بے
 خودی“ میں مجمل انداز میں بیان کیا گیا ہے، مثنوی کے تیسرے حصے
 میں اسی کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

۱۹۱۶ء میں تصوفِ اسلامیہ پر ایک کتاب یا تحقیقی مقالہ لکھنے کا
 ارادہ تھا، جب ”اسرارِ خودی“ پر ایک علمی بحث چھڑ گئی۔ اور خواجہ
 حسن نظامی اور دوسرے حضرات نے اس کے مطالب کے بعض پہلوؤں پر
 نکتہ چینی کی، تو علامہ نے نامور عالمِ دین شاہ سلیمان پھنواروی کے نام
 ایک مکتوب میں لکھا کہ تصوف میں جو غیر اسلامی تصورات دخیل ہیں،
 ان کی نشان دہی تصوف کی مخالفت نہیں، خیر خواہی کی علامت ہے۔ انہی
 عناصر کی بناء پر مغربی محققین نے سارے تصوف کو غیر اسلامی قرار دیا
 ہے اور حقیقت میں یہ حملہ اسلام پر ہے۔ اس کے بعد علامہ نے لکھا:
 ”ان حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ تصوفِ اسلامیہ
 کی ایک تاریخ لکھی جائے۔ جس سے معاملہ صاف ہو جائے اور غیر اسلامی
 عناصر کی تنطیع ہو جائے۔ سلاسلِ تصوف کی تاریخی تفہیم بھی ضروری ہے
 اور زمانہ حال کا علم النفس جو مسائلِ تصوف پر حملہ کرنے کے لیے تیار
 کر رہا ہے، اس کا پیش تر سے ہی علاج ہونا ضروری ہے۔ میں نے اس پر
 کچھ لکھنا شروع کیا ہے مگر میری بساطِ کچھ نہیں۔۔۔ نام اصل میں

کسی اور کے بس کا ہے۔ میں صرف اس قدر کام کر سکوں گا کہ جدید مذاق کے مطابق تنقید کی راہ دکھلا دوں۔ زیادہ تحقیق و تدقیق مجھ سے زیادہ واقف کار لوگوں کا کام ہے۔“ ۶ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی کے ایک مضمون ”سر اسرار خودی“ کے جواب میں علامہ نے ایک مضمون لکھا۔ جس میں بتایا: ”میں تصوف اسلامیہ کی تاریخ پر ایک مفصل مضمون لکھ رہا ہوں جو عنقریب علامہ ابن جوزی کی کتاب ’تلبیسِ ابلیس‘ کے اس حصے کے ساتھ شائع ہوگا جو انہوں نے وحدت الوجود کے رد میں لکھا ہے۔ اس مضمون سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا کہ وحدت الوجود کیا چیز ہے۔ اسلام میں یہ تحریک کس طرح پیدا ہوئی اور جن لوگوں کو صوفیا کا امام سمجھا جاتا ہے، انہوں نے اسلامی تاریخ اور تفسیر قرآن میں کس قدر بے پروائی سے کام لیا ہے۔“ ۷ سوال یہ ہے کہ علامہ کتاب لکھنا چاہتے تھے یا مقالہ۔ اکبر الہ آبادی کے نام ایک مکتوب سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ علامہ لکھتے ہیں: ”میں تصوف کی تاریخ پر ایک مبسوط مضمون لکھ رہا ہوں۔ جو ممکن ہے، ایک کتاب بن جائے۔“ ۸

۱۹۱۹ء میں یہ خیال آیا کہ رامائن کو اردو میں منتقل کر دیا جائے۔ سر کشن پرشاد شاد کے نام ایک مکتوب میں یہ ارادہ ظاہر کرنے کے بعد لکھا: ”سرکار کو معلوم ہوگا، مسیح جہانگیری نے رامائن کے قصے کو فارسی میں نظم کیا ہے۔ افسوس ہے، وہ مثنوی کہیں سے دستیاب نہ ہوئی۔ اگر سرکار کے کتب خانے میں ہو تو کیا چند روز کے لیے عاریتہ مل سکتی ہے؟ میرے خیال میں اس کا تتبع کرنا بہتر ہوگا۔ اس کے متعلق اور مشورے سے بھی سرکار دریغ نہ رکھیں۔“ ۹ مولانا غلام بھیک نیرنگ بتاتے ہیں کہ عنقوان شباب میں علامہ اکثر اس ارادے کا اظہار کیا

کرتے تھے کہ میں واقعات کربلا کو ایسے رنگ میں نظم کروں گا کہ ملٹن کی (Paradise Regained) کا جواب ہو جائے۔ مگر اس تجویز کی تکمیل کبھی نہیں ہو سکی۔ ۱۰۔ ۱۹۲۲ء میں علامہ نے گرامی کے نام ایک خط میں لکھا: ”آردو نثر میں بھی ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ انشاء اللہ شائع ہونے پر آپ کی خدمت میں مرسل ہوگی۔“ ۱۱۔ خدا جانے یہ کتاب کس موضوع پر تھی۔ لکھی بھی گئی تھی یا نہیں۔ ممکن ہے خاکہ تیار کیا ہو اور پھر وقت نہ ملنے کی وجہ سے ارادہ ترک کر دیا ہو۔

۱۹۲۵ء میں حضرت علامہ نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام ایک خط میں لکھا کہ میں نے اجتہاد پر ایک مضمون لکھا تھا۔ لیکن لکھتے لکھتے خیال آیا کہ یہ کم اتنا آسان نہیں جتنا میں نے سمجھا تھا۔ دوسرے، اس میں جو باتیں مختصر طور پر اشارۃً بیان کی گئی ہیں وہ تفصیلی بحث کی محتاج ہیں۔ اس لیے اسے شائع نہیں کرایا گیا۔ اس کے بعد علامہ نے لکھا: ”اب میں انشاء اللہ اسے ایک کتاب کی صورت میں منتقل کرنے کی کوشش کروں گا۔ جس کا عنوان یہ ہوگا۔ Islam as I understand It۔ اس عنوان سے مقصود یہ ہے کہ کتاب کا مضمون میری ذاتی رائے تصور کیا جائے۔ جو ممکن ہے، غلط ہو۔“ ۱۲۔

نومبر ۱۹۲۹ء ۵ ذی قعدہ، علامہ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈینٹس یونین نے بلایا اور ان کی خدمت میں ایک سائنس نامہ پیش کیا۔ اس کے جواب میں علامہ نے جو تقریر کی، اس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا: ”میں گذشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں۔ ہر روز تلاوت کرتا ہوں مگر ابھی یہ بھی نہیں دیکھا کہ“

اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلمبند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس مطمح حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے، جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔“ ۱۳

۱۹۳۱ء کے اواخر میں حضرت علامہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے، تو بمبئی میں ”بمبئی کرانیکل“ کے نامہ نگار نے ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے آخری مرحلے میں علامہ نے اپنے دو منصوبوں کا تذکرہ کیا۔ آپ نے ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں میں نے جدید علوم کی روشنی میں اسلام کے مذہبی فلسفے کا تجزیہ کیا ہے۔ اب میرا ارادہ یہ ہے کہ اسی انداز میں فقہ پر کام کروں۔ کیونکہ اس پہلو کو ہمارے علماء نے صدیوں سے نظر انداز کر رکھا ہے۔ ان کا دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ تمام اسلامی ملکوں کا دورہ کر کے ”جدید دنیائے اسلام“ پر ایک کتاب لکھیں۔ لیکن انہوں نے خود ہی بتایا کہ دورے کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔ اگر پیسہ فراہم ہو گیا تو دورہ کروں گا۔ ۱۴ بہر حال ایسا نہ ہو سکا اور علامہ یہ کتاب بھی نہ لکھ سکے۔

۱۹۳۳ء کے اواخر میں لارڈ لوتھیان نے علامہ کو دعوت دی کہ وہ لندن آئیں اور روڈز ٹرسٹ کے زیر اہتمام چند لیکچر دیں۔ علامہ نے ان لیکچروں کے لیے ”فکر اسلامی میں مکان و زمان کا تصور“ کا موضوع تجویز کیا۔ علامہ جانتے تھے کہ یہ موضوع بہت کٹھن ہے اور اس کے لیے خاصی تحقیق کرنی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے لارڈ لوتھیان کو لکھا کہ ان لیکچروں کی تیاری اور تحریر کا کام تین چار مہینے میں ممکن نہیں۔ اس لیے

وقت میں توسیع کر دی جائے۔ چنانچہ یہ طے پا گیا کہ علامہ یہ لیکچر ۱۹۳۵ء میں دیں۔ ۱۵ اس دوران میں علالت نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ اب لیکچر دینے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس لیے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو ان لیکچروں سے ایک کتاب مرتب کی جا سکتی تھی۔

”ایک دفعہ یہ ارادہ ہوا کہ جس طرح نٹشے نے Thus Spake Zarathustra (زر دشت نے یوں کہا) لکھ کر بعض حقائق کو نہایت دلاویز پیرائے میں ظاہر کیا ہے، اسی طرح علامہ بھی ایک کتاب لکھیں The Book of an Unknown Prophet (ایک گمنام نبی کی کتاب)۔ منشاء یہ تھا کہ بعض مابعد الطبیعی اور طبیعی حقائق و معارف بائبل کے طرز پر لکھے جائیں۔ علامہ اس کے لیے نثر کا ادبی اسلوب سوچ رہے تھے۔ ۱۶

سالک رقمطراز ہیں: اواخر حیات میں قریب قریب ہر روز یہی ذکر رہتا تھا کہ میں ایک کتاب لکھ کر چھوڑ جاؤں ۵۔ جس کا منشاء یہ ہوتا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعہ قرآن کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے اور جتنے نظریے یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیات اسلامی کے متعلق قائم کر رکھے ہیں، وہ سب کے سب خاک میں مل جائیں۔ اس کتاب کا نام کبھی کبھی Aids to the Study of Quran بتایا کرتے تھے۔

۱۹۳۵ء میں علامہ اس سلسلے میں بہت مضطرب تھے۔ حاجے تھے کہ ریاست بھوپال کی طرف سے ایک وظیفہ مقرر ہو جائے اور وہ روزی کے فکر سے آزاد ہو لیں۔ اس کتاب کی تحریر میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔ ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء کو اس سلسلے میں راس مسعود کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے میں بہت خوش تھا، لیونکہ میں نے سوچا

آپ اس معاملے میں کاسیاب ہو جائیں گے اور میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ
 جدید تفکر کی روشنی میں قرآن حکیم پر وہ یادداشتیں قلمبند کروں ، جن
 کے بارے میں مدت سے سوچ رہا ہوں - بہر حال میں محسوس کرتا ہوں کہ
 شاید میرا خواب پورا ہو جائے - اگر مجھے اس قابل بنا دیا جائے کہ
 زندگی کے باقی ماندہ سال اس کام کے لیے وقف کر دوں تو میرے نزدیک
 دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے میرا یہ بہترین تحفہ ہوگا - دیکھیں کیا ہوتا
 ہے - ہر چیز خدا کے ہاتھ میں ہے - اگر وہ جدید اسلام کی اس خدمت کو
 پسند کرے گا تو اس کی تکمیل کے لیے مجھے ضروری وسائل بھی مہیا
 کر دے گا ۱۸ - ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو راس مسعرد کے نام لکھا : میں
 نے جو درخواست کی ہے ، وہ خصوصیت سے ایک ایسے مرتے ہوئے انسان
 کی درخواست ہے جو اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے کوچ کرنے سے پہلے
 کچھ کرنا چاہتا ہے - ۱۹ دسمبر بعد ریاست بھوپال کی طرف سے
 پانسو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا ، جو اقبال جیسے درویش طبع انسان
 کے لیے بہت کافی تھا - چنانچہ انہوں نے قرآن حکیم کے بارے میں مجوزہ
 کتاب کی تحریر کی جانب کچھ پیش رفت فرمائی اور اسی سال احمدیت پر
 علمی معرکے کے سلسلے میں ”سٹیٹمین“ میں ایک مکتوب بنام مدیر کے
 دوران میں لکھا کہ میں نے ”تشکیل جدید النہیات اسلامیہ“ میں اسلام
 سے مجموعیت کی گرد اتارنے کی کوشش کی تھی اور مجھے آسید ہے کہ اپنی
 اگلی کتاب Introduction to the Study of the Quran میں اس سلسلے
 میں مزید کام کر سکوں گا - ۲۰

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ علامہ نے Introduction to the Study
 of Islam کی یادداشتوں کا جو خاکہ میاں محمد شفیع (م - ش) کے حوالے
 کیا تھا ، آیا وہ مندرجہ بالا منصوبے سے تعلق رکھتا تھا یا اس سے مختلف

کوئی منصوبہ تھا۔ ممکن ہے صرف موضوع کے الفاظ کا فرق ہو اور اس سے ایک ہی کتاب مراد ہو۔ لیکن جو خاکہ میاں نذیر شفیع کے حوالے کیا گیا، اس کا متن غور سے پڑھیے گا ۲۱ تو معلوم ہوگا کہ یہ دو لیکچروں کا خاکہ تھا۔ اور چونکہ جس زمانے کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں، اس میں گلا بیٹھنے کی وجہ سے علامہ لیکچر دینے کے قابل نہ تھے، اس لیے عین ممکن ہے کہ یہ خاکہ اس دور میں مرتب کیا گیا ہو جب اقبال صحت مند تھے۔ ایک لیکچر کا موضوع ہے، اسلام کیا ہے؟ اس میں مختلف مذاہب کے ساتھ تقابل کے بعد اسلام کی برتری ثابت کی گئی ہے۔ کیسا اور ریاست کا تعلق واضح کیا گیا ہے اور آخر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسلام عیسائیت کا نہ دشمن ہے، نہ حریف۔ بلکہ تہذیب کے عمل میں اس کا رفیق کار ہے۔ دوسرے لیکچر کا موضوع ہے: اسلام کا قانون۔ اس کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور دوسرے امور کے علاوہ شعوب و قبائل کے خاتمے، معاشی مساوات، مملکت اور منہب، اسلام اور سرمایہ داری، اسلام اور عورت، نجات کا مفہوم اور ایمان کے موضوعات شامل ہیں۔ نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں جو مختلف تحریکیں اٹھیں، ان کا بھی تجزیہ مقصود تھا۔

علامہ کی یہ آرزو بہت تھی کہ اسلامی فقہ پر کام لیا جائے۔ یہ بتاتے ہیں کہ ”وہ جوانی ہی کے زمانے میں محسوس کر چکے تھے کہ اسلام کو ایک ضابطہ حیات کی حیثیت سے آج کے زمانے میں کامیاب اور آبرومند بنانا ہے، تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ زمانہ حال کے ’جورس پروڈنس‘ یعنی اصول قانون کی روشنی میں شرع اسلامی کے امامت دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اور دلیل و برہان سے اصول فقہ اسلامی کی

برتری آج کل کے قانون پر ثابت کی جائے۔ مجوزہ کتاب کا نام تھا "Reconstruction of Islamic Jurisprudence"۔ ۲۲ قیاس ہے کہ "اسلام کا قانون"، کے نام سے نکات اور یادداشتوں کا جو خاکہ علامہ نے میاں محمد شفیع کے حوالے کیا، وہ اسی مجوزہ کتاب سے تعلق رکھتا تھا۔

علامہ کے علمی عزائم کا کوئی حد و شمار نہیں تھا۔ بیشتر وقت شاعری لے لیتی تھی۔ جس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ قوم میں بیداری پیدا ہوئی تو شاعری کے طفیل۔ اور اس شاعری نے ہم عصر ادب کو بھی بے حد متاثر کیا۔ جہاں تک علمی کاموں کا تعلق ہے، علامہ کا اہم یہ تھا کہ وہ بہت سے مختلف النوع موضوعات پر تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ اور ظاہر ہے، سب کا احاطہ ناممکن تھا، دوسرے، "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ"، کی تحریر سے انہوں نے تحقیق اور تفکر کا ایک اعلیٰ معیار قائم کر دیا اور اسے برقرار رکھنے کی خاطر بے پناہ ریاض کی ضرورت تھی۔ لیکن ریاض کیسے ہوتا، کہ یہ وقت چاہتا ہے اور وقت اسی صورت میں مل سکتا تھا کہ وہ فکر روزگار سے آزاد ہوتے۔ اور معاشرہ ایسا بندوبست کرنے سے عاجز تھا۔ پہلے وکالت کرتے تھے جو بہت وقت لیتی تھی۔ اور یافت کے لیے امتحانی پرچے بھی دیکھنے پڑتے تھے، جو ایک آکتا دینے والا کام ہے۔ علالت نے آلیا، تو یافت کا صرف ایک ہی سامان باقی رہ گیا اور وہ تھا، کتابوں کی رائٹنگ کا ذریعہ۔ لیکن یہ نا کافی، بلکہ بہت کم تھا۔ بھوپال سے وظیفہ مقرر ہوا، تو روزی کمانے کے چھنجھٹ سے آزادی ملی۔ لیکن اتنے میں آنکھوں میں موتیا آتے آتے اور لکھنا پڑھنا موقوف ہوا۔ اب ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ کتاب تصنیف کرتے، تو املا کرا کے۔ اور علمی کام املا سے نہیں ہوتے۔ بہر حال اسلام پر کام بے حد

ضروری تھا اور اس کے لیے ایک سبیل پیدا ہو گئی اور وہ تھی دارالاسلام کا قیام ۔

۱۹۳۷ء کے اواخر کا ذکر ہے کہ ایک دین دار اور صاحب ایثار بزرگ چودھری نیاز علی خان نے پٹھان کوٹ (ضلع گورداسپور) سے کوئی ایک دو میل دور قلعہ جہاں پور میں دارالاسلام کے نام سے ایک دینی ادارہ قائم کیا اور ایک بہت بڑا قطعہ اراضی اس کے لیے وقف کر دیا ۔ تاکہ یہاں کتب خانہ ، دارالمطالعہ اور مصنفین کے لیے مکانات اور دفاتر تعمیر کر دیے جائیں ۔ یہ بھی فیصلہ کیا کہ جو علماء اور فضلاء ادارے سے منسلک ہوں گے ، ان سب کے معاش کی کفالت موصوف کی زرعی جائداد کی آمدنی سے کی جائے ۔ چودھری نیاز علی علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مشورے اور تعاون کے طلب کر ہوئے ۔ علامہ نے اس منصوبے کا خیر مقدم کیا ۔ چونکہ مشہور نو مسلم نذیر احمد لیو پوٹ وائس وپس موجود تھے ، اس لیے سب سے پہلے انہی کا نام تجویز کیا ۔ چودھری نیاز علی نے یہ تجویز قبول کر لی لیکن ساتھ ہی کہا کہ مجھے تو کارکنوں کی ایک پوری جماعت درکار ہے ۔ علامہ نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام تجویز فرمایا ، جو اس زمانے میں حیدر آباد دکن سے ”ترجمان القرآن“ نکالتے تھے ۔ علامہ نے کہا ”میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں ۔ ان کے ساتھ ساتھ وہ مسٹر نلر حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں ۔ ان کی کتاب ”الجہاد فی الاسلام“ مجھے بہت پسند آئی ہے ۔“ چنانچہ مولانا کو بلائے اور فیصلہ ہو گیا ۔ نذیر نیازی کا بیان ہے کہ مولانا نے انہی نے علامہ کی طرف سے خط لکھا اور وہ ۱۸ یا ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو حیدر آباد دکن سے پٹھان کوٹ پہنچے ۔ دو دن بعد علامہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور مودودی صاحب ان سے ملاقات نہ کر سکے ۔

بہر حال زیادہ قابل اعتماد بات وہ معلوم ہوتی ہے جو مولانا مودودی نے سٹی ۶۳ء کے ماہ نامہ ”سیارہ“ میں بیان فرمائی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصلاً علامہ نے انہیں مدعو کیا تھا۔ اور ۷۳ء کے وسط میں وہ خود بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ شمالی ہند کام کے لیے زیادہ مناسب جگہ ہے۔ چنانچہ وہ اگست ۷۳ء کے اواخر میں لاہور آئے۔ علامہ سے تفصیلی گفتگو کی۔ وہ لکھتے ہیں: ”انہوں (اقبال) نے مجھ سے فرمایا کہ چودہری نیاز علی صاحب نے جو جگہ وقف کی ہے، میں اسی کا انتخاب کروں۔“ جناب عابد نظامی کے ایک خط کے جواب میں مولانا نے بتایا کہ علامہ سے ان کی مراسلت ایک سے زائد مرتبہ ہوئی۔ لیکن مشرق پنجاب کے ہنگاموں میں اس کا ریکارڈ تلف ہو گیا۔ اس پر عابد نظامی نے ایک خط چودہری نیاز علی صاحب کے نام لکھا اور انہوں نے اپنے جواب مورخہ ۳ جولائی ۶۹ء میں تفصیلاً بتایا کہ مولانا مودودی کو کس طرح اس کام پر آمادہ کیا گیا۔ وہ لکھتے ہیں: ”... چند روز میرے پاس ٹھہرے۔ اس کے بعد میں مولانا صاحب کو لاہور لے آیا اور اپنے ایک قدیم مہربان بزرگ کے ہاں ٹھہر کر حضرت علامہ کے ساتھ مولانا صاحب کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کرایا۔ ہم تین روز لاہور ٹھہرے اور تینوں روز مولانا صاحب کی طویل ملاقاتیں حضرت علامہ کے ساتھ ہوتی رہیں۔ لاہور سے واپسی پر حضرت مولانا صاحب نے مجھے فرمایا کہ اچھا، میں آپ کے ادارے میں آجاتا ہوں۔ میں نے کہا، الحمد للہ۔“ ۲۵

یہی وہ ادارہ تھا، جس کے بارے میں حضرت علامہ نے جامعہ ازہر کے سربراہ علامہ مصطفیٰ المراغی کو بھی ایک خط میں لکھا تھا کہ ہم پنجاب کے اسلامی مرکز کے ایک گاؤں میں ایک ایسا دینی ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں علوم دینیہ کے ایسے ماہرین اکٹھے کیے جائیں

گے جو اپنی زندگیاں خدمت اسلام کے لیے وقف کرنے کو تیار ہوں۔ ان کے لیے اقامت گاہ بھی ہوگی، کتب خانہ بھی۔ علامہ نے المراغی سے ایک ایسا معلم مانگا ”جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں بصارت تامہ رکھتا ہو اور نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو۔“ تاکہ وہ مسلمانوں کو اسلام کی روح سے آشنا کرے اور تفکرِ اسلامی کی تجدید میں مدد دے۔ ۲۶

حوالے

- ۱ - ”اقبال نامہ“، جلد اول - ص ۱۰۹ -
- ۲ - ایضاً - جلد اول - ص ۴۲۶ -
- ۳ - ”انوارِ اقبال“ - ص ۱۷۶ -
- ۴ - مکتیبِ اقبال بنام گرامی - ص ۸۴ -
- ۵ - ”مقالاتِ اقبال“، - ص ۱۹۲ -
- ۶ - ”انوارِ اقبال“، - صفحات ۱۸۱-۱۸۲ -
- ۷ - ”مقالاتِ اقبال“، - صفحات ۱۷۱-۱۷۲ -
- ۸ - ”اقبال نامہ“، - جلد دوم - صفحات ۵۱-۵۲ -
- ۹ - ایضاً - ص ۱۹۷ -
- ۱۰ - ”مطالعہ اقبال“ - ص ۲۴ -
- ۱۱ - مکتیبِ اقبال بنام گرامی - ص ۲۰۳ -
- ۱۲ - ”اقبال نامہ“، - جلد اول - ص ۴۶-۴۷ -
- ۱۳ - ”انقلاب“، - ۱۰ دسمبر ۱۹۲۵ء -
- ۱۴ - Letters and Writings of Iqbal - صفحات ۶۱-۶۲ -
- ۱۵ - ایضاً - صفحات ۳۴-۳۵ -

۱۶ - ”ذکر اقبال“، ص ۲۱۲ -

۱۷ - ایضاً - ص ۲۱۲ -

۱۸ - Letters and Writings of Iqbal - ص ۱۷ -

۱۹ - ایضاً - ص ۱۹ -

۲۰ - Speeches and Statements of Iqbal - ص ۱۰۳ -

۲۱ - Letters and Writings of Iqbal - صفحات ۸۶-۹۵ -

۲۲ - ”ذکر اقبال“ - صفحات ۲۱۱-۲۱۲ - کتاب میں Construction

لکھا ہے - چونکہ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، اس لیے اسے اقتباس

میں بدل کر Reconstruction کر دیا گیا ہے -

۲۳ - ایضاً - ص ۲۱۳ -

۲۴ - ”اوراقِ گم گشتہ“ - صفحات ۸۱-۸۳ -

۲۵ - ایضاً - صفحات ۸۳-۹۱ -

۲۶ - ”اقبال نامہ“، جلد اول - صفحات ۲۵۱-۲۵۲ -



چونتیسواں باب

تحریک مسجد شہید گنج

زندگی کے کم و بیش آخری تین سالوں میں علالت اور بینائی میں کمی کے باوجود حضرت علامہ نے سیاست میں ایک ایسا کردار ادا کیا ، جس کے نتائج دور رس اہمیت کے حامل تھے ۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود آن کا مشاہدہ نہ کر سکے ۔ اس دور میں آن کی توجہ بیک وقت تین مسائل پر مرکوز رہی ۔ مسجد شہید گنج کا مسئلہ ، پنجاب میں لیگ ۔ یونیورسٹی کشمکش اور برعظیم کے مسلمانوں کا سیاسی مستقبل ۔ اگر علامہ کی تمام سرگرمیوں کی داستان زمانی ترتیب سے بیان کی جائے ، تو واقعات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں گے اور قارئین کے لیے الجھاؤ کا مسئلہ پیدا ہوگا ۔ اس لیے ہم ان تینوں مسائل کے سلسلے میں علامہ کا کردار الگ الگ باب کی صورت میں پیش کریں گے ۔

۱۹۳۵ء کے وسط میں مسجد شہید گنج کا مسئلہ آگیا ۔ اس وقت لاہور کے پس منظر پر تھا کہ لاہور کے لنڈا بازار کے قریب سادہ چہان کے عہدے میں ایک مسجد بنی ، جس کا نام مسجد عبداللہ خان تھا ۔ جب مسلمانوں کا راج آیا ، تو انہوں نے اس سے قریب ہی ایک کوردوارہ بنا لیا اور مسجد پر قبضہ کر لیا ۔ مدتوں اس سارے رقبے پر مکھڑی قابض رہے ۔ لیکن مارچ ۱۹۳۵ء میں حکومت نے یہ رقبہ کوردوارہ پر بندھک لگانی کے سہارے

کر دیا ، جو ۱۹۲۴ء کے گوردوارہ ایکٹ کی رو سے سکھوں کے تمام اوقاف کی قانونی جانشین تھی ۔ اس کمیٹی نے عمارت کی شکست وریخت کا سلسلہ شروع کیا ، تو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ مسجد کو بھی مسامحہ کیا جائے گا ۔ سکھوں کا دعوئے تھا کہ مسجد پر آن کا قانونی حق ہے ۔ مسلمان کہتے تھے کہ مسجد کو منہدم نہیں ہونے دیا جائے گا ۔ مسلمانوں کی طرف سے مظاہروں کا خطرہ پیدا ہوا ، تو سکھوں نے جوانی مظاہروں کے لیے باہر سے جتھے منگوا لیے ۔ جب کھنچاؤ بڑھا ، تو پنجاب کا گورنر سر ہربرٹ ایمرسن ۶ جولائی کو لاہور پہنچا ۔ اس سے مسلمانوں کا ایک وفد ملا ۔ جس نے مطالبہ کیا ، کہ اگر مسجد پر سکھوں کا قانونی حق فائق ہے ، تو حکومت کم سے کم اتنا تو کر سکتی ہے کہ انہیں مسجد کا معاوضہ دے کر اسے آثارِ قدیمہ کے محکمے کے حوالے کر دے ۔ گورنر نے غور کرنے کا وعدہ کیا ۔ لیکن سکھوں نے ۸ جولائی کی رات کو مسجد گرانی شروع کر دی اور صبح تک ملبے کا ڈھیر کر دیا ۔ اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ سب کچھ فوج اور پولیس کے پہرے میں ہوا ۔ گویا ایک لحاظ سے اس سنگ دلی اور دھاندلی کے پیچھے حکومت کا ہاتھ کام کر رہا تھا ۔

اعتدال پسند مسلمان رہنماؤں نے عوام کا جوش ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ۔ حکومت نے ایک طرف کرفیو لگایا اور اخبارات پر سنسر شپ عاید کیا ۔ دوسرے ، مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے مسجد شاہ چراغ واگذار کر دی ۔ یاد رہے ، کہ یہ مسجد جو ہائی کورٹ کے متصل واقع ہے ، اس وقت تک سرکاری دفاتر پر مشتمل تھی ۔ بہر حال مسلمانوں کا جوش سرد نہ پڑا ۔ ۱۴ جولائی کو باغ بیرون سوچی دروازہ میں آن کا ایک زبردست جلسہ ہوا ، جس سے ظفر علی خان اور دوسرے رہنماؤں نے خطاب

کیا اور سول نافرمانی کے لیے تیاری کا اعلان بھی کر دیا۔ مولانا نے کہا کہ ہم نے مجلسِ احرار کے رہنماؤں کو دعوت دی کہ اس جلسے میں شامل ہوں لیکن انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ یہاں سے احرار کے خلاف نفرت کا ایک ایسا سلسلہ جاری ہوا، جس کی صداۓ بازگشت مدتوں تک سنائی دیتی رہی۔ اور مجلسِ احرار اپنی وہ بردلعزیزی کھو بیٹھی، جو اس نے تحریکِ کشمیر اور تحریکِ ختمِ نبوت میں حاصل کی تھی۔ حکومت نے راتوں رات مولانا ظفر علی خان، ملک لال دین قیصر، میاں فیروز الدین احمد، ملک لال خان، سید حبیب اور دوسرے لیڈروں اور نمایاں کارکنوں کو نظر بند کر لیا۔ چونکہ مجلسِ احرار کنارہ کش تھی اور تحریکِ شہید گنج کے رہنما نظر بند تھے، اس لیے تحریکِ کچھ نوجوانوں کے قبضے میں آگئی۔ انہوں نے مسجدِ شہید گنج کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ پولیس اور فوج نے روکا، وہ نہ رکے۔ اس لیے فوج نے گولی چلائی اور بہت سے نوجوان شہید ہو گئے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً بعض نوجوان کارکنوں نے سول نافرمانی کا بازار گرم رکھا۔

جب ہنگاموں کا آغاز ہوا، تو علامہ بسترِ علالت پر تھے۔ ان کا دل تو بہت دکھا ہوا تھا لیکن بے بس اور لاچار تھے اور ۱۵ جولائی کو وہ برقی علاج کے لیے عازمِ بھوپال ہو گئے۔ وہاں قریب قریب چھ ہفتے علاج کا عمل جاری رہا۔ واپسی پر ۲۹ اگست کو دہلی پہنچے۔ ان کا کانگریسی رہنما ڈاکٹر سید محمود سے ملاقات ہوئی۔ جہاں دوسرے مسائل زیرِ بحث آئے، وہاں سید نذیر نیازی کے بیان کے مطابق انہوں نے سید محمود سے شہید گنج کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "اب مسلمانوں سے مایوس کیوں ہیں۔ آپ نہیں جانتے، حکومت اور حکومت کے طرفداروں نے انہیں کس طرح دبا رکھا ہے۔ ورنہ شاید اس ایک مسجد کے بدلے میں لیا کچھ

ہو جاتا۔ مسلمانوں میں قربانی کا بڑا مادہ ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ ان کی صفیں منظم نہیں۔ نہ کوئی ایسا صاحبِ نظر اور اولوالعزم انسان ہے جو ان کی رہنمائی کرے۔“ ۲ لاہور پہنچے، تو تحریک کو منتشر پایا۔ اس لیے خاموش رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تحریک کے اصل رہنما اسیرِ فرنگ تھے۔

فروری ۱۹۴۶ء کے آخری عشرے میں قائداعظم محمد علی جناح کو کچھ لوگوں نے لاہور بلایا تاکہ وہ کوئی مفاہمت کرا دیں۔ لیکن انہی دنوں بھوپال میں برقی علاج کا اگلا کورس ہونا تھا، اس لیے علامہ بھوپال چلے گئے۔ اور ان کی غیرحاضری میں قائداعظم کو بلایا گیا تاکہ وہ مفاہمت کی کوئی صورت نکالیں۔ انہوں نے لیڈروں سے بھی ملاقات کی اور گورنر سے بھی۔ ”گورنر نے گہا کہ اگر سول نافرمانی بند کر دی جائے اور مسلمان مسجد کی بازیابی کے لیے آئینی طریق سے جدوجہد کریں، تو وہ تمام قیدی رہا کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ تحریک کے کارکن سول نافرمانی بند کرنے پر رضامند ہو گئے اور رات بھر میں جیلوں سے تمام قیدی اور دور دراز مقامات سے نظر بند لیڈر رہا ہو کر لاہور پہنچنا شروع ہو گئے۔“ قائداعظم نے سکھوں کو بھی سمجھایا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی سعتول سمجھوتہ کر لیں اور اس سلسلے میں ایک شہید گنج مصالحتی بورڈ نامزد کر دیا۔ جس کے ارکان یہ تھے: علامہ اقبال، مولوی عبدالقادر قصوری، میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء، راجہ نریندر ناتھ، پنڈت نانک چند بار ایٹ لاء، سردار بوٹا سنگھ ایڈووکیٹ، سردار آجمل سنگھ، سردار سمپورن سنگھ اور میاں احمد یار خان دولتاناہ (کنوینر)۔ ۳ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علامہ کو ان کی غیرحاضری میں نامزد کیا گیا۔

اس دوران میں مسلمانوں نے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں ایک مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ بنائے دعویٰ یہ تھی کہ شریعت کی رو سے مسجد ہمیشہ مسجد رہتی ہے اور کوئی شخص اس پر قابض ہو کر مسلمانوں کو ادائے نماز سے نہیں روک سکتا۔ ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء کو یہ دعویٰ اس بناء پر خارج ہو گیا کہ عام جائداد غیر منقولہ کی طرح مسجد بھی فریق ثانی کے قبضہ مخالفانہ میں جا کر اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔ چونکہ مصالحتی بورڈ بھی اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا، اس لیے حضرت علامہ کے مشورے سے ڈسٹرکٹ جج کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی۔ اس دوران میں آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ اہم سالانہ اجلاس اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ کے مقام پر ہوا، جہاں سے لیگ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ اس میشن میں مسجد شہید کالج پر ایک جامع قرارداد منظور ہوئی اور قائد اعظم نے وعدہ کیا کہ اگر اس مسئلے کا کوئی مناسب فیصلہ نہ ہوا، تو مسلم لیگ کا ایک خصوصی میشن منعقد کیا جائے گا۔

۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو پنجاب ہائی کورٹ نے مسلمانوں کی اپیل خارج کر دی۔ فل بنچ میں چیف جسٹس اینگ، مسٹر جسٹس پنڈت اور مسٹر جسٹس دین بند شامل تھے۔ اول الذکر دو ججوں نے فیصلہ دیا کہ چونکہ مسجد قبضہ مخالفانہ کا تعلق ہے، مسجد کو عام جائداد نہیں سمجھنا اور اگر ایسا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے مسجد شہید کالج میں مسلمانوں کا نماز ادا کرنے کا حق مدثری پہلے ساقط ہو چکا ہے۔ مسٹر جسٹس دین بند نے اس رائے سے اختلاف دیا اور اپنا فیصلہ الگ دیا۔

جس دن مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ان کی اپیل خارج ہوئی ہے،

آن کے غصے اور اضطراب کی کوئی حد نہ تھی؟ بادشاہی مسجد میں جلسے کا اعلان ہوا۔ شہر کے مختلف حصوں سے جلوس نکالے۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے بھی جلوس نکالا۔ یہ سب جلوس بادشاہی مسجد میں ختم ہوئے اور کم از کم پچاس ہزار کا اجتماع ہو گیا۔ اس جلسے میں مولانا ظفر علی خان نے لوگوں کو صبر کی تلقین فرمائی۔ اس سے اگلے دن مولانا ظفر علی خان علامہ سے ملے۔ اس سلسلے میں علامہ نے سید نذیر نیازی کو بتایا ”مولوی صاحب پوچھتے تھے، اب کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا، میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ قانون شکنی کی تحریک عام کر دی جائے۔ بلکہ اس میں مارا ہندوستان شریک ہو۔ یوں مسجد تو شاید نہ ملے لیکن یہ تو ظاہر ہو جائے گا کہ مسلمان اپنے حقوق کے لیے ایچی ٹیشن کرنا جانتے ہیں۔ مسجد کی قربانی اگر مسلمانوں کے لیے زندگی کا وسیلہ بن جائے، تو کیا بُرا ہے؟ ایچی ٹیشن ہوئی، تو ہو سکتا ہے کہ اس سیلاب میں کچھ خس و خاشاک بھی بہ جائیں۔“ علامہ کے نزدیک ہائی کورٹ کے فیصلے میں قانون سے بڑھ کر سیاسی مصالح کا لحاظ رکھا گیا۔ وہ جسٹس دین محمد کے فیصلے کو صحیح سمجھتے تھے۔ کیونکہ ”اسلامی فقہ کی رو سے جائداد میں، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو وقف ہو یا غیر وقف، منقولہ اور غیر منقولہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ اس پر کوئی حق ملکیت قائم ہو سکتا ہے۔ نہ قانون تحدید املاک کا اطلاق ممکن ہے۔“ علامہ نے یہ بھی کہا کہ ”حکومت بظاہر قانون کی آڑ لے رہی ہے۔ لیکن قانون کے پردے میں ایک بہت بڑا سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ حکومت چاہتی ہے، مسلمانوں کے مقابلے میں سکھوں کو مضبوط کرے۔ ہندوؤں کے لیے بھی کسی توڑ کی ضرورت ہے۔ حکومت جو کچھ کر رہی ہے،

وہ قانون ہے ، نہ سیاست ، نہ کسی قوم کے مذہبی جذبات ، نہ معاہدہ کا احترام ۔ ۴

اربابِ حکومت چاہتے تھے کہ مسلمان پریوی کونسل میں اپیل کریں تاکہ اس دوران میں ان کے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں ۔ سر مکندر کی وزارت کا زمانہ تھا ۔ موصوف نے بعض یونینسٹ رہنماؤں کو علامہ کے پاس بھیجا تاکہ ان سے ایک بیان دلائیں کہ ابھی پریوی کونسل میں اپیل کا مرحلہ باقی ہے ۔ علامہ نے ایسا بیان دینے سے انکار کر دیا اور جب اخباروں میں یہ خبر چھاپی گئی کہ علامہ کے ہاں رہنماؤں کے اجتماع میں اپیل کا فیصلہ ہوا ہے ، تو انہیں اس پر بہت غصہ آیا اور انہوں نے ایک تردیدی بیان جاری کیا ۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں ہوا ۔ جہاں دو فیصلے ہوئے ۔ ایک یہ ، کہ یکم فروری کو سارے ہندوستان میں یوم شہید گنج منایا جائے ۔ دوسرے ، اس مسئلے پر آئندہ پروگرام بنانے کے لیے لیگ کا اجلاس خصوصی بلایا جائے ۔ بہر حال حضرت علامہ نے ایک ایسا اقدام لیا ، جس سے عارضی طور پر پنجاب کی وزارت ڈولنے کا سامان فراہم ہو گیا ۔ انہوں نے ملک بریت علی سے کہہ کر پنجاب اسمبلی میں تحفظ مساجد کا بل پیش کرا دیا ۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مساجد کو رائج الوقت قانون سے مستثنیٰ کیا جائے اور اس کا اطلاق ماضی پر بھی ہو ۔ اگر یہ قانون منظور ہو جائے تو مسجد شہید گنج کے بارے میں ہائی کورٹ کا فیصلہ خود بخود باطل ہو جاتا ۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اس بات کے گواہ ہیں کہ اس قانون کا پورا خا کہ علامہ اقبال نے تجویز کیا لیکن عبارت ملک بریت علی کی تھی ۔ ۵ راقم الحروف ان دنوں پنجاب مسلم سٹوڈینٹس فدریشن کا سیکرٹری تھا ۔ ہم نے اس بل کے حق میں ایک جلسہ عام بریت علی اسلامیہ ہال میں

منعقد کیا۔ اور مقامات پر بھی جلسے ہوئے۔ سر سکندر اس قانون کے مخالف تھے۔ والد مرحوم (مولانا عبدالمجید سالک) کی زبانی مخالفت کی بناء پر یہ معلوم ہوئی کہ اگر ہندو اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں نے آن منادر کی بازیابی کے لیے ایسے قوانین منظور کرا لیے، جن کے مقامات پر بعد میں مساجد تعمیر ہوئیں تو اس سے مسلمانوں کو بہت نقصان ہوگا۔ یہ دلیل آس وقت تو صحیح معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن آج درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ پاکستان بننے کے تیس سال بعد بھی ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ گوردوارہ شہید گنج کا وہ حصہ مسجد کی صورت میں بدل لیں جہاں اصل مسجد واقع تھی۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہندوستان میں ایسی مساجد پر غیروں کا قبضہ ہو جائے جو مسلمانوں کے عہد حکومت میں مندروں کی جگہ تعمیر ہوئی تھیں۔

بہر حال ملک برکت علی کے بل کے حق میں یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ارکان نے ووٹ دینے کا وعدہ کیا۔ اس کا تذکرہ علامہ نے وفات سے ڈیڑھ ماہ پہلے آس خط میں کیا تھا جو انہوں نے جناب غلام رسول پیرسٹر کی وساطت سے قائداعظم کے نام بھجوایا۔ اس میں کہا گیا کہ شہید گنج کے مسئلے پر لیگ کا خصوصی اجلاس لاہور میں ہو، بریوی کونسل میں اپیل کی تجویز سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا گیا، ملک برکت علی کے بل کی حمایت کی گئی اور قائداعظم کو بتایا کہ سول نافرمانی کی تحریک روز بروز تقویت پکڑ رہی ہے۔ آثار ایسے تھے کہ اس مسئلے پر یونینسٹ پارٹی میں پھوٹ پڑ جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ سر سکندر نے اپنے ساتھیوں کو اس قانون سے پیدا ہونے والے وسیع تر خطرات سے آگاہ کیا اور آن گی پوری تائید و حمایت حاصل کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسودہ قانون پیش ہی نہ ہو سکا۔

تحریک مسجد شہید گنج میں حضرت علامہ نے براہ راست کوئی حصہ نہ لیا اور نہ ایسا کرنا ممکن تھا۔ کیونکہ وہ تو بستر علالت پر دراز تھے۔ تقریر کرنے کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیان بھی لکھتے نہیں تھے بلکہ لکھواتے تھے۔ وہ تو محض مشورہ دے سکتے تھے۔ لیکن صورت حالات یہ تھی کہ احرار بدنام و رسوا ہو کر گوشہ نشین تھے۔ مولانا ظفر علی خان مصالحت پسندی کی طرف راغب تھے۔ لے دے کے مسلم لیگ کا برکت علی گروپ تھا جو علامہ کا مشورہ قبول کرتا تھا۔ لیکن عوام میں اس گروپ کی جڑیں مضبوط نہیں تھیں۔ ویسے بھی جب سے سر سکندر صوبہ لیگ کی قیادت پر قابض ہوئے تھے، اس گروپ کی اہمیت پہلے سے بھی کم ہو چکی تھی۔ بس ایک پنجاب مسلم سٹوڈینٹس فیڈریشن تھی جو جلسے کرنے پر قادر تھی۔ لیکن وہ جلسوں سے زیادہ لیا کر سکتی تھی؟

مسجد شہید گنج کی بازیابی علامہ کے نزدیک ایک اہم مسئلہ تھی۔ لیکن وہ تو پورے شمال مغربی ہند اور شمال مشرقی ہند کو مسجد بنانا چاہتے تھے۔ ان کی نظر بلندیوں پر تھی اور وہ ان قانون نمکی کی تحریک کا اجراء چاہتے تھے، تو اس لیے، کہ مسلمانوں میں ایک نیا احساس ہوت پیدا ہو اور وہ آنے والی بڑی جنگ کے لیے تیار ہوں

حوالے

- ۱ - "مارشل لاء سے مارشل لاء تک" - صفحات ۱۰۰-۱۰۱
- ۲ - "مکتوبات اقبال" - ص ۲۸۸
- ۳ - "اقبال کے آخری دو سال" - صفحات ۵-۱-۵
- ۴ - "اقبال کے حضور" - صفحات ۱۲۱-۱۲۲
- ۵ - "اقبال کے آخری دو سال" - ص ۵۹۰

•

پینتیسواں باب

مسلم لیگ ، انتخابات ، یوم اقبال

اپریل ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ نئے آئین کے تحت صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوں ، تو آن میں اپنے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کرے۔ لیکن برعظیم کے مسلم اکثریتی صوبوں میں ایسے مضبوط عناصر بھی موجود تھے جو مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے بارے میں تو لیگ سے متفق تھے لیکن انتخابات میں حصہ لینے کے لیے صوبائی پارٹیاں بنا رہے تھے۔ بنگال میں مولوی فضل الحق کی کرشک پروجا پارٹی سرگرم عمل تھی ، سندھ میں سر عبداللہ ہارون نے یونائیٹڈ پارٹی بنائی۔ سرحد میں صاحبزادہ سر عبدالقیوم نے بھی اسی قسم کی جماعت بنائی اور پنجاب میں سر فضل حسین نے یونی نسٹ پارٹی کو از سر نو منظم کیا۔ لیکن وہ جلد انتقال کر گئے اور آن کی جگہ سردار سکندر حیات خاں نے پارٹی کی قیادت سنبھال لی۔

قائداعظم چاہتے تھے کہ صوبائی پارٹیاں ختم کر دی جائیں ، ہر جگہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابات لڑا جائے۔ حنائیہ وہ پہلے آئے اور میاں فضل حسین سے ملاقات کی۔ قائداعظم نے اپنا موقف واضح دیا اور کہا ، کہ انتخابات کے بعد میاں فضل حسین ، حوبدیری چھوٹو رام کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہیں۔ لیکن اسمبلی کے باہر تمام مسلمان مسلم لیگ کے پرچم تلے انتخابی جنگ لڑیں۔ میاں فضل حسین نے کہا کہ

پنجاب اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت صرف اکیاون فی صد ہے۔ ان میں سے دو چار نشستیں دوسری پارٹیاں لے جائیں گی۔ ہمیں وزارت کی تشکیل کے لیے کسی ایسے ہندو گروہ کے تعاون کی ضرورت ہے، جس سے ہمارے معاشی مفادات مشترک ہوں۔ اور یہ گروہ چوہدری چھوٹو رام کا ہے۔ اس لیے ہم نے ایک غیر فرقہ واری پارٹی بنا رکھی ہے۔ چونکہ دونوں کے نقطہ ہائے نگاہ میں بنیادی اختلاف تھا، اس لیے بات چیت ٹوٹ گئی۔

اس کے بعد قائد اعظم نے علامہ اقبال کی طرف رخ کیا۔ ان دونوں میں چند سال پہلے جداگانہ انتخاب کے مسئلے پر شدید اختلاف رہا تھا۔ یہاں تک، کہ علامہ جناح لیگ کی حریف جماعت شفیق لیگ کے سیکرٹری رہے۔ اور اس کے بعد قائد اعظم برطانیہ میں مقیم ہوئے اور علامہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کے فرائض ادا کرتے رہے۔ دونوں کے درمیان کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ لیکن ڈاکٹر عاشق حسین بالوی بتاتے ہیں کہ جب دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں علامہ لندن آئے اور اقبال ایسوسی ایشن نے ان کے اعزاز میں تقریب برپا کی، تو اس میں نہ صرف محمد علی جناح شامل تھے بلکہ انہوں نے علامہ کی مدح و ستائش میں ایک فصیح تقریر بھی کی تھی۔ اور جب علامہ تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن پہنچے، تو وہاں مختصر قیام کے دوران ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ابھر حال اس ربط و ضبط کی کوئی دستاویزی شہادت موجود نہیں ہے۔ ہوتی، تو ڈاکٹر صاحب اس کا حوالہ دیتے۔

دونوں کی ملاقات میں کیا ہوا۔ یہ علامہ کے ایک دیرینہ نیازمند

فضل کریم خان درانی کی زبانی سنئے: مسٹر جناح اپنی روایتی جامہ زیبی

اور خوش پوشاکی کا ایک دلاویز مرقع بنے ہوئے تشریف لائے۔ اعلیٰ درجے کی ولایتی دکان کا سلا ہوا بیش قیمت سوٹ پہن رکھا تھا اور چال جیسے کڑی کہان کا تیر۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کی درویشی اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جسم پر سوائے بنیان اور دھوتی کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ جب گفتگو شروع ہوئی، تو ڈاکٹر صاحب نے امداد کا پورا وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ اودھ کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں ہے۔ میں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں۔ یہ بات سن کر مسٹر جناح ڈرسی سے دو ایچ آٹھے اور بڑے جوش سے کہنے لگے، مجھے صرف عوام کی مدد درکار ہے۔ علامہ سے ملاقات کے بعد مجلس احرار اور مجلس اتحاد ملت کے رہنماؤں سے گفتگو ہوئی۔ مجلس احرار نے لیگ پارلیمانی بورڈ میں شرکت کے لیے دو شرطیں پیش کیں۔ اول: لیگ کا نصب العین درجہ نو آبادیات کی جگہ کامل آزادی ہونا چاہیے۔ دوم: قادیانیوں کو لیگ میں شامل نہ کیا جائے۔ قائداعظم ان چیزوں کے بارے میں کوئی فوری یقین دہانی نہیں کرا سکتے تھے۔ لیونکے فیصلے کا اختیار تو مسلم لیگ کو تھا۔ بہر حال یہ دونوں جماعتیں تعاون پر راضی ہو گئیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجلس اتحاد ملت کے صدر مولانا ظفر علی خان تھے اور یہ جماعت تحریک مسجد شہداء گنج میں احرار کے خلاف رد عمل کے طور پر اور ایک حریف جماعت کی حیثیت سے ابھری تھی۔ ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال اور مسلم لیگ کے دوسرے لیڈروں نے ایک مشترکہ بیان میں قائداعظم پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور اس بات کی تردید کی کہ پنجاب میں آن کا مشن نام رہا ہے۔ چار دن

بعد لاہور میں لیگ کے رہنماؤں کا ایک اجلاس ہوا - جس کی صدارت حضرت علامہ نے فرمائی - یہاں انہیں صوبہ مسلم لیگ کا صدر چن لیا گیا -

۲۱ مئی ۱۹۳۶ء کو قائداعظم نے لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے ارکان کے اسماء کا اعلان کر دیا - جس میں پنجاب سے یہ حضرات نامزد کیے گئے تھے - علامہ اقبال ، مولانا ظفر علی خان (اتحاد ملت) ، مولانا محمد اسحاق مانسہروی (اتحاد ملت) ، سید زین العابدین شاہ گیلائی (اتحاد ملت) ، میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء ، مولانا عبدالقادر قصوری ، راجہ غضنفر علی خان ، شیخ حسام الدین (احرار) ، چودہری افضل حق (احرار) ، چودہری عبدالعزیز بیگوال (احرار) ، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ (احرار) - ان گروپوں کے مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھے - اس لیے اتحاد باقی رہنا ممکن نہیں تھا - چنانچہ چند دنوں کے اندر اندر مولانا ظفر علی خان اس بناء پر اپنے ساتھیوں سمیت الگ ہو گئے کہ مجلس اتحاد ملت آزادی کی داعی ہے اور لیگ درجہ نو آبادیات کی - ان کے بعد احرار بھی اسی قسم کا کوئی بہانہ بنا کر نکل گئے اور اس طرح لیگ بے دست و پا ہو کر رہ گئی -

برکت علی گروپ تو یونینسٹ پارٹی سے کسی مفاہمت کو برداشت نہیں کرتا تھا لیکن حضرت علامہ پنجاب کے سیاسی مزاج سے آگاہ تھے - اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ اگر کوئی مفاہمت ہو جائے تو اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہوگا - چنانچہ انہوں نے ۲۵ جون ۱۹۳۶ء کو قائداعظم کے نام ایک ”نجی اور خفیہ“ خط میں لکھا : ”احمد یار دولتانا مجھے کل شام ملے - وہ کہتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ارکان یہ اعلان کرنے کو تیار ہیں کہ ایک گل ہند اقلیت کی حیثیت سے مسلمان قوم کے ساتھ تعلق

رکھنے والے تمام مخصوص معاملات میں وہ لیگ کے فیصلوں کے پابند ہوں گے اور اس معاملے میں صوبائی اسمبلی کے اندر کسی غیر مسلم گروپ کے ساتھ کبھی کوئی معاہدہ نہیں کریں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ صوبہ لیگ یہ اعلان کرے کہ جو لوگ لیگ ٹکٹ پر اسمبلی کے رکن چنے جائیں گے، وہ اس پارٹی یا گروپ سے تعاون کریں گے جس میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد شامل ہوگی۔ ازراہ کرم مجھے بتائیے کہ اس سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے۔،، ۳ اسی خط میں علامہ نے قائداعظم کو بتایا کہ سر سکندر حیات آپ سے بمبئی میں ملیں گے۔ اگر آپ انہیں اپنے موقف کا قائل کر لیں، تو ممکن ہے وہ ہمارے ساتھ مل جائیں۔ حقیقت یہ تھی کہ میاں فضل حسین بستر مرگ پر تھے۔ سکندر حیات ان کی جگہ لینے والے تھے۔ لیکن وہ عبوری دور میں دونوں فریقوں کے ساتھ رابطہ رکھنا چاہتے تھے۔ ۹ جولائی کو میاں فضل حسین انتقال کر گئے اور ان کے بعد سر سکندر یونیٹسٹ پارٹی کے لیڈر بن گئے۔

اگست میں حضرت علامہ صوبہ مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ کیونکہ علالت کی وجہ سے ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ ہر اجلاس میں شرکت کرتے۔ بہر حال ان کی رکنیت برقرار تھی اور وہ بہر حال صوبہ مسلم لیگ کے صدر تو تھے۔ ان کا اب بھی یہ خیال تھا کہ یونیٹسٹ پارٹی کے ساتھ مفاہمت ہو جائے تو اس سے جتنا نتیجہ برآمد ہوگا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو لوگ صوبہ مسلم لیگ میں پیش پیش ہیں، وہ خلوص نیت کے باوجود اتنا اثر نہیں رکھتے کہ انتخابات میں کامیابی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے ۲۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم کے نام ایک اور خط میں لکھا: "پنجاب ایک پارلیمانی بورڈ اور

یونینسٹ پارٹی کے درمیان مفاہمت کا کچھ چرچا ہو رہا ہے۔ میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ایسی مفاہمت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے اور آپ اس کے لیے کون سی شرائط تجویز فرماتے ہیں۔ میں نے اخباروں میں پڑھا ہے کہ آپ نے بنگال پروجیکٹ اور لیگ پارلیمانی بورڈ کے درمیان ایک سمجھوتہ کرایا ہے۔ میں اس کی شرائط معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ پروجیکٹ پارٹی بھی یونینسٹ پارٹی کی طرح غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے، اس لیے بنگال میں آپ کا سمجھوتہ یہاں بھی مددگار ہو سکتا ہے۔

علامہ کی دوسری خواہش یہ تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا پارلیمانی بورڈ جو منشور شائع کرے، اس میں واضح طور پر بتائے کہ حکومت اور ہندوؤں کے درمیان مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے۔ وہ منشور کا متن بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ اس خواہش کا اظہار انہوں نے قائداعظم کے نام ۹ جون ۱۹۴۶ء کے مکتوب میں کیا تھا۔ بہر حال یہ معلوم نہیں کہ علامہ کو منشور کا متن اشاعت سے پہلے دکھایا گیا یا نہیں۔ یہ منشور بہت سی باتوں میں کانگریس کے منشور سے ملتا جلتا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے میثاق لکھنؤ کو ایک سنگ میل اور مشعل راہ قرار دیا گیا۔ لیکن یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اسے حرفِ آخر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کمیونل ایوارڈ کو قبول کیا گیا۔ مجوزہ فیڈریشن کو برطانوی ہند کے لیے حد درجہ مہلک، نقصان دہ اور رجعت پسندانہ قرار دیا گیا اور ناقابل عمل بھی۔ ایک منصفانہ اور عادلانہ معاشی اور معاشری نظام کے قیام پر زور دیا گیا لیکن ذاتی املاک کی ضبطی کی مخالفت کی گئی۔

صوبائی مسلم لیگ کا منشور بھی انہی خطوط پر تیار کیا گیا لیکن اس میں چند نئی باتیں بھی شامل تھیں۔ مثلاً قانون انتقال اراضی کی حمایت

انکم ٹیکس کے اصول پر مالیے کی تشخیص ، مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کے امتیازات کا خاتمہ ، اسلامی تمدن کی حفاظت ، اوقات کی بہتر تنظیم کے لیے شرع اسلامی کے مطابق مؤثر قوانین کا نفاذ ، مساجد اور دوسرے مقدس مقامات کی مرمت اور حفاظت کا محکمہ بندوبست - ظاہر ہے ، اس منشور کی ترتیب میں علامہ کے مشورے شامل تھے - بہر حال انتخابات میں کامیابی کے لیے محض منشور کافی نہ تھا - بالخصوص آس زمانے میں ، جب سیاسی جماعتیں پہلی مرتبہ منشور جاری کر رہی تھیں - کامیابی کے لیے ایک تو مضبوط تنظیم درکار تھی اور ایسے کارکن بھی ، جن کا رابطہ عوام کے ساتھ محکم ہو - اور صوبہ مسلم لیگ ان دونوں اہم عناصر سے محروم تھی - یہی وجہ ہے کہ وہ عوام کو حرکت میں نہ لاسکی - اگر احرار ، اتحاد ملت اور مسلم لیگ کا اتحاد باقی رہتا ، تو شاید یونینسٹ پارٹی کے مقابلے میں کسی قدر جدوجہد ہو سکتی - لیکن ان سب کی قوتیں تو منتشر تھیں - دوسری بات یہ تھی کہ احرار اور اتحاد ملت والے تو پہلے جلسے کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن مسلم لیگ کا یہ خانہ بھی خالی تھا - چنانچہ جب ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ نے اپنی انتخابی مہم کا پہلا جلسہ کیا اور آس سے قائداعظم نے بھی خطاب کیا ، تو مسلم لیگ کے اپنے پرجوش کارکن ڈاکٹر عاشق حسین بنالوی کے قول کے مطابق "جلسہ نہایت مختصر اور بے رونق تھا - حاضرین کی تعداد مشکل سے ہزار کے قریب کے قریب تھی - ۶۰۰ آدمی ایک بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام میں مسلم لیگ کے اثر و رسوخ کا کیا عالم تھا -

جب آمیدوار لہڑنے ہونے کا وقت آیا ، تو مسلم لیگ صرف سات مسلم حلقوں میں اپنے آمیدوار لہڑنے لڑ سکی - ان میں صرف دو کامیاب ہوئے - ایک ملک برکت علی ، دوسرے راجہ حفیظ علی خان - دوسرے یہ ،

کہ واجہ صاحب کامیاب ہوتے ہی یونینسٹ پارٹی سے جا ملے اور ملک برکت علی اکیلے رہ گئے۔ احرار اور اتحاد ملت اور کانگریس نے دو دو مسلم نشستیں جیتیں۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوئے اور ڈاکٹر عاشق بٹالوی کے بیان کے مطابق انہیں حضرت علامہ کی تائید حاصل تھی۔ باقی ساری مسلم نشستوں سے یونینسٹ پارٹی کے امیدوار کامیاب ہو گئے۔ اس لیے نہیں، کہ یونینسٹ پارٹی کوئی عوامی جماعت تھی، بلکہ محض اس لیے کہ اس میں جاگیردار اور زمیندار جمع تھے اور اپک جزوی سبب یہ بھی تھا کہ دیہاتیوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اس پارٹی کے ماضی کے بعض کاموں سے متاثر تھا۔

مسلم لیگ اگر کچھ مقبول ہونے لگی تو انتخابات کے بعد۔ جناب خالد لطیف گابا اتحاد ملت کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن چنے گئے، تو انہوں نے مرکزی اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس مرکزی حلقے سے مولانا ظفر علی خان امیدوار ہوئے تو کانگریس نے ان کے مقابلے پر ایک غیر سیاسی، مال دار ٹھیکیدار عبدالعزیز کو کھڑا کر دیا۔ اس سے کانگریس کے وقار میں کمی ہوئی۔ دوسری طرف کانگریس کے مسلم دشمن رویے کے پیش نظر کیا یونینسٹ اور کیا مسلم لیگ، سب نے تہیہ کر لیا کہ مولانا ظفر علی خان کو کامیاب کرایا جائے۔ حریف امیدوار پر زیادہ دباؤ پڑا تو اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے عزت و آبرو کے ساتھ دستبردار ہونے دیا جائے۔ چنانچہ حضرت علامہ نے ایک ثالثی بورڈ قائم کیا۔ جس میں ملک برکت علی اور میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء کے علاوہ یونینسٹ پارٹی کی وزارت کی پارلیمانی سیکرٹری بیگم شاہ نواز بھی شامل تھیں۔ ان تینوں نے مولانا ظفر علی خان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ چنانچہ عبدالعزیز نے اپنا نام واپس لے لیا اور مولانا منتخب ہو گئے۔

انہی دنوں مولانا ظفر علی خان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ چونکہ وہ ایک خالص عوامی شخصیت تھے، اس لیے آن کی اور آن کے ماتھیوں کی بدولت صوبہ مسلم لیگ کی بے دست و پائی کا دور ختم ہوا اور وہ بھی زندوں میں شہر ہونے لگی۔

جب کانگریس نے چھ ہندو اکثریتی صوبوں میں اپنی وزارتیں بنائیں، تو ان میں وہی اگا دکا مسلمان وزیر بنا لیا جو اتفاق سے کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوا اور مسلم لیگ پارٹیوں سے کولیشن کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ان صوبوں میں وہی مسلمانوں کی صحیح نمائندہ تھیں۔ دوسرے، کانگریس نے اقتدار کے نشے میں آ کر مسلمانوں سے زیادتیاں شروع کر دیں۔ تیسرے، بڑے دھڑلے سے اعلان کیا کہ ہندوستان میں دو ہی قوتیں ہیں۔ ایک حکومت، دوسری کانگریس۔ تیسری کوئی قوت موجود نہیں۔ چوتھے، مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے مسلم عوام سے براہ راست رابطے کی مہم شروع کی اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے روئے کا بے دریغ استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سارے برعظیم میں چو لانا ہونے لگے اور انہوں نے محسوس کیا کہ نجات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ یہی وہ فضا تھی جس میں پنجاب مسلم سٹوڈینٹس فیڈریشن نے جنم لیا اور حضرت علامہ کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی اور مسلم طلبہ کے جوش و خروش کی بدولت صوبائی سیاست کا ایک نیا منظر بن گیا۔

جب اکتوبر ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا، تو اس میں شرکت کے لیے وہ تمام عناصر آئے جو پہلے لیگ سے روٹھے ہوئے تھے۔ بنڈل کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق، آسام کے وزیر اعلیٰ مر سعد اللہ اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار گلشن

حیات اپنی اپنی پارٹیوں کے سارے ارکان سمیت مسلم لیگ سے آ ملے۔
 یہیں سے محمد علی جناح قائد اعظم کے نام سے یاد کیے جانے لگے۔ کیونکہ
 اب وہ دھڑلے کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی
 واحد سیاسی اور نمائندہ جماعت ہے۔ سردار سکندر حیات اور آن کے ساتھیوں
 کی لیگ میں شمولیت اس مفاہمت کا نتیجہ تھی جو آن کے اور قائد اعظم
 کے درمیان ہوئی اور جس کا یہ متن لکھنؤ سیشن میں سنایا گیا :-

۱۔ سر سکندر حیات خان واپس پنجاب جا کر اپنی پارٹی کا ایک
 خاص اجلاس منعقد کریں گے۔ جس میں پارٹی کے آن تمام
 ممبروں کو، جو ابھی تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے،
 ہدایت فرمائیں گے کہ وہ سب مسلم لیگ کے حلف نامے پر
 دستخط کر کے لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اندرین حالات
 وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈ کے
 قواعد و ضوابط کی پابندی کریں گے۔ لیکن یہ معاہدہ
 یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

۲۔ اس معاہدے کے قبول کے بعد آئندہ مجلس قانون ساز کے
 عام اور ضمنی انتخابات میں، وہ متعدد فریق، جو موجودہ
 یونینسٹ پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں، متحدہ طور پر ایک
 دوسرے کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔

۳۔ یہ کہ مجلس قانون ساز کے وہ مسلم ارکان، جو مسلم لیگ
 کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں یا اب لیگ کی رکنیت قبول
 کرتے ہیں، اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی متصوّر ہوں گے۔
 ایسی مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی کہ وہ آل انڈیا مسلم

لیگ کی سیاسی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی دوسری پارٹی سے تعاون یا اتحاد کرے۔ اس قسم کا تعاون انتخابات کے ما قبل یا ما بعد، ہر دو صورتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ نیز پنجاب کی موجودہ متحدہ جماعت اپنا موجودہ نام یونینسٹ پارٹی برقرار رکھے گی۔

۴۔ مذکورہ بالا معاہدے کو مد نظر رکھتے ہوئے پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل از سر نو عمل میں لائی جائے گی۔“ ۷

اس مفاہمت کے متن سے علامہ ناآشنا تھے۔ اصولاً وہ مفاہمت کے قائل تھے۔ لیکن جب مفاہمت کی تاویل کے سلسلے میں فریقین میں بحث چھڑ گئی اور اس نے ناخوشگوار صورت اختیار کر لی، تو ان کے دل میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہوئے۔ ۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو قائد اعظم کے نام مکتوب میں انہوں نے اس افواہ کا تذکرہ کیا کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک گروہ لیگ کے فارم رکھتے ہوئے دستخط نہیں کرنے نا اور سر سکندر اور ان کے ساتھی لیگ کے آنے والے لاہور سیشن تک دستخطوں سے گریز کریں گے۔ اور یہ، کہ سر سکندر صوبہ مسلم لیگ کی سرگرمیوں کو سرزد کرنا چاہتے ہیں۔ دو دن بعد یکم نومبر ۱۹۷۳ء کو انہوں نے قائد اعظم کے نام ایک اور نجی اور خفیہ خط لکھا۔ جس میں بتایا کہ ان کے ساتھ سر سکندر کے لچھو ساتھی مجھ سے ملے۔ یونینسٹ، ایک اختلافات پر مشتمل کمیٹی چیت ہوئی۔ دونوں فریق اپنے اپنے رنگ میں اس مفاہمت کی تاویلات کر رہے ہیں، جس سے غلط فہمیاں بڑھ گئی ہیں۔ اندر ہی حالات علامہ نے ایک تو مفاہمت کا مکمل متن طلب کیا۔ دوسرے، یہ پوچھا کہ اب یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ صوبائی لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں یونینسٹ پارٹی

کو اکثریت حاصل ہوگی؟ ۸۔ ۱۰ نومبر کو ایک اور خط لکھا۔ جس میں درج تھا کہ سر سکندر اور آن کے دوستوں سے بہت سی ملاقاتوں کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سر سکندر لیگ کی تنظیم اور پارلیمانی بورڈ، دونوں پر مکمل کنٹرول چاہتے ہیں۔ سر سکندر بتاتے ہیں کہ آپ نے یونینسٹوں کو بورڈ میں اکثریت دینے سے اتفاق کر لیا ہے۔ میں نے اس بیان کی صحت و عدم صحت کے بارے میں آپ سے دریافت کیا تھا لیکن آپ نے جواب نہیں دیا۔ ذاتی طور پر مجھے اس بات میں چنداں نقصان نظر نہیں آتا کہ اگر وہ اکثریت چاہتے ہیں، تو دے دی جائے۔ لیکن وہ تو مفاہمت کی حدود سے آگے بڑھ کر صوبہ لیگ کے عہدہ داروں کو بھی بدلنا چاہتے ہیں۔ لیگ کی مالیات کو بھی کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اسے ختم کرنے کے آرزومند ہیں۔ صوبے کی ریلوے عامہ کو دیکھتے ہوئے میں اس بات کی ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ لیگ کو سر سکندر اور آن کے دوستوں کے حوالے کر دوں۔ کیونکہ لیگ کا وقار مفاہمت کی وجہ سے پہلے ہی گر چکا ہے اور یونینسٹوں کے داؤ پیچ لیگ کو زیادہ ضرر بھی پہنچا سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے ابھی تک رکنیت کے فارموں پر دستخط نہیں کیے اور نہ میری معلومات کے مطابق ایسا کریں گے۔ بلکہ سر سکندر تو صوبے میں زمیندارہ لیگ بھی قائم کر کے اس کی شاخیں بنا رہے ہیں۔ ۹

یہ خط قائداعظم کے نام علامہ کا آخری خط تھا۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ علامہ کے خدشات درست تھے۔ پارلیمانی بورڈ میں تین چوتھائی ارکان یونینسٹ پارٹی کے تھے اور ایک چوتھائی پرانی لیگ کے۔ صوبہ لیگ کو توڑ کر قائداعظم نے ایک آرگنائزنگ کمیٹی بنائی۔ اس میں بھی نمائندگی کا وہی تناسب تھا۔ اس کے صدر سر سکندر حیات اور

سیکرٹری میاں رمضان علی تھے۔ قائداعظم کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت منوانے کے لیے ضروری تھا کہ سر سکندر حیات اور آن کے ساتھیوں کو مطمئن کر کے انہیں لیگ کے اندر رکھا جائے۔ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ اسمبلی کے اکیاسی مسلمان ارکان کے رہنے پر سکندر ہیں اور صرف ایک رکن ہرانی لیگ کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایسے میں وہ دونوں کو برابری کی سطح پر کیسے رکھ سکتے تھے؟ دوسری طرف حضرت علامہ بھی اپنے موقف میں حق بجانب تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ جن لوگوں نے انتہائی نامساعد حالات میں لیگ کا پرچم بلند رکھا، انہیں یوں طاق پر رکھ دینا مناسب نہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ سر سکندر کی صدارت میں جو آرگنائزنگ کمیٹی بنی، وہ مدتوں تساہل کا شکار رہی اور لیگ کی تنظیم وجود میں آئی تو ایک عرصہ بعد۔ اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ سر سکندر حیات کی وفات کے بعد ملک خضر حیات ٹوانہ نے "سکندر جناح پیکٹ" کی اڑ لے کر شہساز ٹھیل کھیلا اور اس کا حشر کیا ہوا؟

ہم ایک گذشتہ باب میں بتا چکے ہیں کہ پہلا یوم اقبال ۱۹۳۰ء میں منایا گیا تھا۔ لیکن اقبال کی زندگی میں یوم اقبال کی تقریبات پورے سڑک و احتشام سے برپا ہوئیں تو ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو انور الہیٹ مسابہ برادر باد کے اہتمام میں۔ پہلے یہ فیصلہ ہوا تھا کہ یہ یوم اقبال کو یوم منایا جائے۔ اس پر سر سکندر حیات نے ایک طویل خط میں اس کا خیر مقدم کیا۔ علامہ کو ایشیا کی فرزندِ جلیل، امیرِ فاضلی اور عظیم المرتبت ماعر قرار دیتے ہوئے تمام مشرقی ممالک کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دی اور کہا: عرصہ دراز کی گراں خوابی کے بعد اگر آج ہمیں مسلمانوں میں بیداری کے آثار نظر آتے ہیں، تو یہ سب اچھے اقبال کی

پرجوش آواز کا اثر ہے۔ ادھر ہندوستان کے باشندوں میں بھی جو تڑپ اور بلند نگہی پیدا ہو رہی ہے، وہ بھی اس نابغہ عظیم کی مساعی کی شرمندہ احسان ہے۔ لہذا ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ یومِ اقبال کو ایک مقدس قومی فریضہ سمجھ کر اس میں سرگرمی سے حصہ لے۔، سر سکندر حیات نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ جہاں جہاں یومِ اقبال منایا جائے، وہاں کے باشندے شاعرِ اعظم کی خدمت میں ایک تھیلی نذر کریں۔ حضرت علامہ نے سر سکندر کے جذباتِ محبت کے لیے شکر یہ ادا کیا لیکن تھیلی کی تجویز یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ ”بہاری قوم کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے سامنے ایک شخص کی ضرورتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہر چند کہ اس شخص کی شاعری نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی روح کو کیوں نہ جلا بخشی ہو۔ فرد اور اس کی احتیاج بہر حال ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ لیکن قوم اور اس کی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔“ اس کی جگہ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ لاہور کے اسلامیہ کالج میں اسلامی علوم کی تحقیق سے لیے ایک خصوصی شعبہ قائم کیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک سو روپیہ پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ سر سکندر اپنے اثر سے کام لے کر اس فنڈ کو جمع کرنے میں مدد دیں گے۔ تجویز کے جواز میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ”اب وقت آ گیا ہے کہ اسلامی فکر اور اسلامی طرزِ حیات کا بغور مطالعہ کر کے ہم عوام کو بتائیں کہ اسلام کا اصل مقصد کیا تھا اور اس مقصد اور پیغام کو کس طرح تمہ در پردوں میں چھپا دیا گیا ہے۔ نیز یہ، کہ ہندوستان کے اندر موجودہ اسلام کی روح کو کیونکر مسخ کیا گیا ہے۔ ان پردوں کو اب اٹھانا چاہیے تاکہ نئی نسل کے نوجوان اسلام کی حقیقی شکل و صورت سے آگاہ ہو سکیں۔“

۹ جنوری کو یومِ اقبال منایا گیا۔ ۱۰ جنوری کو حیدر آباد دکن کے صدر اعظم سر اکبر حیدری نے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا اور ساتھ لکھا کہ ”یہ رقم شاہی توشتحے خانے سے، جس کا انتظام میرے ذمے ہے، بطور تواضع بھیجی جا رہی ہے۔“ علامہ نے چیک لوٹا دیا اور سید نذیر نیازی کو بتایا کہ ”جس کا انتظام میرے ذمے ہے“ کے الفاظ نہایت تکلیف دہ ہیں۔ اس پر علامہ نے کچھ اشعار بھی لکھے جو ”ارمغان حجاز“ میں شامل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

سر اکبر حیدری کے نام

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہ پرویز
 دو قلندر کو کہ ہیں اس میں مدوکنہ صفات
 مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
 حسن تدبیر سے دے آئی و فانی کو ثبات
 میں تو اس بار امانت کو آٹھاتا سر دوش
 کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند ثبات
 غیرت فتر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
 جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محبت اور حبیبی احترام کی کوئی تحفہ پیش ہوتا تھا تو وہ قبول کر لیتے تھے۔ علامہ نے یہ سب دعویٰ دو آن سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ یہی کیفیت اس مسعودی تھی۔ وہاں سے پانسو روپے ماہانہ کی پنشن ملی تو علامہ نے قبول نہ کی۔ اسی طرح میاں تھانہ نواز سے اقبال کے مراسم انتہائی دوستانہ تھے اور دونوں میں بڑی محبت تھی۔ چنانچہ ۳ جنوری ۱۹۳۱ء کو علامہ نے تھانہ

نذیر نیازی کو بتایا کہ ”پانچ مربعے جو میاں صاحب نے جاوید کے نام
 بہہ کیے تھے ، ان میں پانچ اور کا اضافہ کر دیا ہے۔“ اور دیر تک میاں
 صاحب کے جذبہٴ محبت کی تعریف کرتے رہے - ۱۲

۹ جنوری کو جو یومِ اقبال منایا گیا ، وہ شان و شوکت کے اعتبار
 سے بے نظیر تھا۔ یہ تقریب بیرعظیم کے گوشے گوشے میں سنائی گئی۔ دنیا
 بھر سے خود مختار حکومتوں کے نمائندوں ، ریاستوں کے ولی عہدوں ، سیاسی
 رہنماؤں ، ادیبوں اور دانش وروں نے پیغامات بھیجے۔ شاید ہی ہندوستان
 کا کوئی اخبار ہو ، جس نے علامہ کو خراج عقیدت ادا نہ کیا ہو۔ ۱۳
 لاہور کے مینارڈ ہال میں جو تقریب ہوئی ، اس میں مقالات پڑھے گئے اور
 ہجوم اتنا تھا کہ ہال سے باہر بھی لوگ جمع تھے۔ اور علامہ کا رد عمل
 کیا تھا؟ یہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کے نام اس مکتوب سے واضح ہوتا
 ہے ، جس کے شروع میں لکھا : ”وہ تقریب جسے یومِ اقبال کے نام سے
 موسوم کیا جاتا ہے ، اس میں میرے لیے صرف یہ خیال باعثِ طہانیت
 قلب ہے کہ جس زمین میں نے اپنا بیج پھینکا تھا وہ زمین شور
 نہیں۔“ ۱۵

حوالے

- ۱ - ”اقبال کے آخری دو سال“، - صفحات ۳۱-۳۰۹
- ۲ - ایضاً - ص ۳۰۷ -
- ۳ - Iqbal's Letters to Mr. Jinnah - صفحات ۱-۹
- ۴ - ایضاً - ۱ -
- ۵ - منشور کا مکمل متن ”اقبال کے آخری دو سال“ میں ضمیمہ اول

میں درج ہے۔ صفحات ۶۵۹-۶۴۶

۶ - ”اقبال کے آخری دو سال“، ص ۳۵۲ -

۷ - ایضاً۔ صفحات ۳۸۸-۳۸۷

۸ - Iqbal's Letters to Mr, Jinnah - صفحات ۲۹-۲۷

۹ - ایضاً۔ صفحات ۳۱-۲۹

۱۰ - ”اقبال کے آخری دو سال“ - صفحات ۵۳۳-۵۳۱

۱۱ - ”ارمغان حجاز“، صفحات ۲۷۸-۲۷۷ (مہینہ نذیر نیازی نے ”اقبال

کے حضور“ میں غلط لکھا ہے کہ یہ اشعار ”بال جبریل“ میں

درج ہیں)۔

۱۲ - ”اقبال کے حضور“، ص ۱۷ -

۱۳ - مقالاتِ یومِ اقبال - مقدمہ - ص ۱ -

۱۴ - ایضاً - مقدمہ - ص ۱ -



•

چھتیسواں باب

قائد اعظم کے نام خطوط

حضرت علامہ نے جب سے سیامت میں دلچسپی لینی شروع کی ، پاکستان آن کے ذہن میں موجود تھا ۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے کھل کر اس کا اظہار نہ کیا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہ تدریجی انداز میں مسلمانوں کو اس نصب العین کی طرف لانا چاہتے تھے ۔ دوسرے ، وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے سیاسی رہنا کر بند بنیادوں پر سوچنے کے عادی ہیں ۔ ایسے میں اگر اچانک بالکل مختلف راستہ تجویز کر کے اس پر زور دیا جاتا ، تو مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو جاتا اور اصل مقصد فوت ہو جاتا ۔ جب انہوں نے جداگانہ انتخاب کی جنک لڑی ، صوبائی خود مختاری پر تسلسل اور تواتر کے ساتھ زور دیا ۔ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ ، سندھ کی علیحدگی ، پنجاب اور بنکال میں مسلمانوں کی قانونی اکثریت کے تیقن اور ایک وفاق تصور حکومت پر اصرار کیا ، تو اس کا مقصد یہی تھا کہ برعظیم کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں آباد مسلمان اپنے اپنے خطے میں یک جا ہو کر اپنے مستقبل کے لیے اپنی قدروں کے سانچے میں ڈھالنے کے قابل ہو جائیں ۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اسلامی نظریہ حیات کو جدید تقاضوں کی روشنی میں اور عملی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیش لیا جائے ۔ چنانچہ انہوں نے خطبات مدراس میں اجتہاد کی ضرورت واضح کی ۔ اجراع کو دور حاضر کے جمہوری طور طریقے کی روشنی میں آسان بنایا ۔ یہ لکھا کہ خلافت یا امامت ضروری

نہیں ، کہ کسی فرد کی ذات میں مرتکز ہو ۔ اور آج کی دنیا میں اسے جمہور کے منتخب شدہ اداروں میں بھی مرتکز کیا جا سکتا ہے ۔ گویا اس مملکت کی بنیادیں طے کر دیں جو ان کے ذہن میں موجود تھی ۔

خطبہ 'الہ آباد میں حضرت علامہ نے دو متوازی نقطہ ہائے نگاہ پیش کیے ۔ ایک نقطہ 'نگاہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے جو قومی مطالبات پیش کیے اور جن کی تشکیل میں ان کا اپنا ہاتھ بھی تھا ، ان کی منظوری کے لیے جدوجہد کی جائے ۔ دوسرا نقطہ 'نگاہ یہ تھا کہ شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی خطوں کو یک جا کر کے ایک سٹیٹ بنا دیا جائے ۔ اسی طرح باقی ہندوستان میں لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر صوبوں کی از سر نو تقسیم کر کے انہیں بھی ریاست کا درجہ دیا جائے ۔ یہ تمام ریاستیں خود مختار ہوں ۔ اتنی خود مختار ، کہ ان کی الگ الگ فوجیں بھی ہوں ۔ اس کے بعد شمال مغربی سرحد پر ان سب کی ملی جلی فوج رکھی جائے ۔ گویا آزاد ریاستوں کی ایک کنفیڈریشن کا تصور پیش کیا ۔ جس میں پرامن بقائے باہمی کے اصول پر ہندو اور مسلم نظریات حیات کو پنپنے اور پھلنے پھولنے کا موقع حاصل ہو ۔ دونوں نقطہ ہائے نگاہ میں کوئی تضاد نہیں تھا ۔ بلکہ دونوں کے ڈانڈے آپس میں یوں مل جاتے تھے کہ "جناح کے چودہ نکات" یا مسلمانوں کے قومی مطالبات کی تکمیل کے بعد دوسرے نقطہ 'نگاہ پر عمل درآمد کے لیے زمین تیار ہو سکتی تھی ۔

۱۹۳۲ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدارتی خطبے میں انہوں نے جو پینچ نکاتی منصوبہ پیش کیا ، اس کے نمایاں پہلو یہ تھے ۔ مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت کا قیام ، یوتھ لیگوں کے توسط سے مسلمانوں کی معاشی حالت میں بہتری ، تنظیم کے لیے پچاس لاکھ روپے کا فنڈ ، بڑے شہروں میں اسلامی ثقافتی اداروں کا قیام اور سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں

میں دینی تعلیم کا اجراء اور سب سے بڑھ کر یہ ، کہ مسلمان و کلام اور علماء کی ایک اسمبلی کا قیام ، جسے قانونی اور آئینی حیثیت حاصل ہو اور جس کی منظوری لیے بغیر مسلمانوں کے شخصی قانون سے تعلق رکھنے والا کوئی بل پیش نہ ہو سکے ۔ ان نکات کا مقصد بھی یہی تھا کہ مستقبل کے بارے میں ان کے ذہن میں جو خاکہ موجود تھا ، اس پر عمل درآمد کے لیے ضروری وسائل مہیا ہو جائیں ۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے بعد ”جناح کے چودہ نکات“ کی تائید و حمایت کے پہلو بہ پہلو وہ وقتاً فوقتاً اپنے خطبات اور بیانات میں مسلمانوں کے حق خود ارادیت کا تذکرہ کرتے رہے۔

۱۹۳۵ء میں آئین حکومت ہند میں جب صوبائی خود مختاری کے ساتھ ساتھ یہ گنجائش بھی پیدا کی گئی کہ آنے والے فیڈرل نظام میں برطانوی ہند اور ریاستی ہند ، دونوں شامل ہوں ، تو انہوں نے محسوس کیا کہ اس میں مسلمانوں کی حیثیت میں کمی واقع ہو جائے گی ۔ دوسری طرف انہوں نے دیکھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو ایک تو مسلمانوں کی علیحدہ حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں ۔ دوسرے ، مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے ملحدانہ سوشلزم کی بناء پر مسلمان عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کر کے انہیں متحدہ قومیت کی طرف لا رہے ہیں ، تو ان کے سامنے دو راستے تھے ۔ اول : کھل کر علیحدہ مملکت کا تصور پیش کریں ۔ دوم : قائداعظم کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ علیحدہ مملکت کی سرپرستی کریں ۔ پہلے راستے پر چلنے سے مسلمانوں میں بھوت کا امکان تھا ۔ اس لیے انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور قائداعظم کے نام ”نجی اور خفیہ“ خطوط میں اس بات پر زور دیا کہ وہ علیحدہ مملکت کے تصور کو اپنائیں ۔ گویا وہ بیرون خانہ ”جناح کے چودہ نکات“ کے حامی تھے اور اندرون خانہ لیگ کو پاکستان کی طرف لانے کی جدوجہد کرتے تھے ۔

۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو کانگریس نے دہلی میں ایک کل ہند قومی کنونشن بلائی ، جس میں ہندوستان بھر کی صوبائی اسمبلیوں کے آٹھ سو کانگریسی رکن شامل ہوئے۔ ایسے میں پنڈت نہرو کا پھولے نہ مہانا حق بہ جانب تھا۔ کیونکہ یہ کنونشن سیاسی قوت کا ایک بڑا مظاہرہ تھی۔ لیکن ان میں خوشی کے ساتھ ساتھ غرور اور غرور کے پہلو بہ پہلو فرعونیت بھی آگئی۔ انہوں نے اپنے خطبے میں یہ تاثر دیا ، کہ اب کانگریس ہی سب کچھ ہے۔ باقی جماعتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور مسئلہ محض معاشی ہے، اس لیے مسلمان لیڈروں کے ساتھ بات چیت کے چکر میں پڑنا بے کار ہے۔ اور کانگریس کو چاہیے ، کہ وہ مسلمان عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ پیدا کرے۔ اس خطبے کی خبر ۲۰ مارچ کے اخباروں میں آئی۔ علامہ نے فوراً قائد اعظم کے نام ایک خط میں تجویز پیش کی کہ وہ بھی دہلی ہی میں ایک کل ہند مسلم کنونشن بلائیں۔ اور اس میں پارٹیوں کا لحاظ کئے بغیر صوبائی اسمبلیوں کے تمام مسلمان ارکان اور دوسرے نمایاں مسلمان رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دیں۔ گویا علامہ کا مقصد یہ تھا کہ قائد اعظم ایک طرح کی آل پارٹیز کنونشن بلائیں۔ علامہ نے لکھا : ”اس کنونشن میں آپ ، جتنا واشگاف اور پرزور انداز میں ممکن ہو ، ملک میں ایک منفرد سیاسی اکائی کی حیثیت سے مسلمانوں کا سیاسی نصب العین پیش کریں۔ ہندوستان کے اندر اور باہر کی دنیا کو یہ بتانا نہایت ضروری ہے کہ معاشی مسئلہ ملک کا واحد مسئلہ نہیں۔ زیادہ تر ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک اسلامی نقطہ نگاہ سے ثقافتی مسئلہ اس سے کہیں زیادہ اہم ہے اور بھر حال معاشی مسئلے سے کم اہم نہیں۔ اگر آپ ایسی کنونشن کر سکیں ، تو اس سے مجالس قانون ساز کے ان مسلمان

ارکان کی بھی آزمائش ہو جائے گی جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مقاصد اور آسنگوں کے منافی پارٹیاں بنا رکھی ہیں۔ ہندوؤں پر یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ کوئی سیاسی مشورہ، کوئی پُر فریب نعرہ مسلمانان ہند کو آن کے ثقافتی تشخص سے غافل نہیں کر سکتا۔ اسی خط کے آغاز میں علامہ نے بتایا کہ ہم ملک کی ترقی پسند پارٹیوں سے تعاون کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، کہ ایشیا میں ایک اخلاقی اور سیاسی قوت کے اعتبار سے اسلام کے پورے مستقبل کا دارومدار بہت بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ مسلمانان ہند مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ علامہ نے یہ بھی لکھا کہ میں چند روز کے اندر اندر دہلی آؤں گا۔ افغان قونصل خانے میں قیام ہو۔ آپ بھی وہاں آ جائیے تاکہ اس مسئلے پر تبادلہٴ خیالات ہو جائے۔

بہر حال جب علامہ دہلی پہنچے تو معدوم ہوا قائد اعظم وہاں سے پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ۲۲ اپریل کو علامہ نے ایک اور خط لکھا۔ اس میں پھر کنونشن کے انعقاد پر زور دیا۔ تاکہ مسلمانوں کا نقطہٴ نگاہ جلد از جلد سامنے آسکے۔ اس کے ساتھ علامہ نے بتایا کہ حالات ایک نئی گروٹ لیے رہے ہیں اور پنجاب کے مسلمان تیزی سے ساتھ کانگریس نواز ہو رہے ہیں۔ ۲۸ مئی کو علامہ نے ایک اور خط لکھا۔ یہ خط نہایت مفصل بھی تھا اور غیر معمولی طور پر اہم بھی۔ کیونکہ اس میں پاکستان کی تجویز پیش کی گئی اور اس پر نظریاتی استدلال بھی دیا گیا۔ اور اسی میں ایک دو ایک خالص عوامی جماعت بنانے پر زور دیا گیا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس خط کے مطالب اسی تفصیل سے پیش کر دیے جائیں۔ علامہ نے لکھا :

”لیگ کو قطعی فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا وہ بدستور مسلمانان ہند کے بالائی طبقات کی نمائندگی کرتی رہے گی یا مسلم عوام کی نمائندہ بنے گی۔ جنہوں نے اب تک صحیح وجوہ کی بناء پر اس میں دلچسپی نہیں لی۔ ذاتی طور پر میری رائے یہ ہے کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کا وعدہ نہیں کرتی، وہ عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔“

”نئے آئین کے تحت اعلیٰ ملازمتیں بالائی طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اولاد کو مل جاتی ہیں اور چھوٹی ملازمتیں وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کو۔ دوسرے معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ مسلمانوں کی بہتری کے لیے کیا کیا جائے۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز زیادہ پیچیدہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ وہ پچھلے دو سو سال سے نیچے ہی نیچے آ رہا ہے۔ عام طور پر اس کا خیال یہ ہے کہ اس کے افلاس کے لیے ہندو ساہوکارہ نظام یا ہندو سرمایہ داری ذمہ دار ہے۔ یہ تصور ابھی تک مکمل طور پر اس کے سامنے نہیں آیا کہ اس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی حصہ دار ہے۔ لیکن یہ تصور یقیناً سامنے آئے گا۔ جواہر لال نہرو کا ملحدانہ سوشلزم غالباً مسلمانوں کو اپنی طرف زیادہ متوجہ نہیں کر سکے گا۔ اس لیے سوال یہ ہے مسلمانوں کے افلاس کا مسئلہ حل کرنا کس طرح ممکن ہے؟ لیگ کے پورے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کس طرح سرگرم کار ہوتی ہے۔ اگر لیگ نے کوئی ایسے وعدے نہ کئے، تو مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام پہلے کی طرح اس سے اغماض برتیں گے۔ خوشی کی بات

یہ ہے کہ اس کا یہ حل موجود ہے - کہ اسلام کا قانون نافذ کیا جائے اور جدید تصورات کی روشنی میں اسے مزید نشوونما دی جائے - اسلامی قانون کے ایک طویل اور محتاط مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لیے کم از کم قوت لائٹوت کا حق محفوظ ہو سکتا ہے - لیکن اس ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ اور نشوونما اُس وقت تک ناممکن ہے ، جب تک ایک یا ایک سے زیادہ مسلمان ممکنات وجود میں نہیں آ جاتیں - سال ہا سال سے یہی میرا دیانت دارانہ عقیدہ رہا ہے اور میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ یہی وہ واحد راستہ ہے ، جس پر جل کر مسلمانوں کے لیے روٹی کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے اور ایک پر امن ہندوستان بھی حاصل ہو سکتا ہے - اگر ہندوستان میں ایسی چیز ناممکن ہے ، تو اس کا واحد متبادل خانہ جنگی ہے - جو حقیقت میں ہندو مسلم فسادات کی صورت میں کچھ عرصے سے جاری ہے - مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں ، مثلاً شمال مغربی ہند میں فلسطین کا عمل دہرایا جائے گا - اور یہ بات بھی ہے کہ ہندو مذہب کے سیاسی جسم میں جو اہر لال ل سوشلزم داخل ہوا تو خود ہندوؤں کے اندر بھی بہت خونریزی ہوگی - معاشرہ جمہوریت اور برہمن ازم کے درمیان مسئلہ برہمن ازم اور ہندو ازم کے درمیان مسئلے سے مختلف نہیں - میں نہیں کہہ سکتا کہ آریا سوشلزم کا وہی حشر ہونا جو ہندوستان میں بدہ ازم ل ہوا تھا - لیکن یہ بات میرے ذہن میں واضح ہے کہ اگر ہندو ازم معاشری جمہوریت قبول کرتا ہے ، تو وہ ہندو ازم کی حیثیت سے یقیناً ختم

ہو جائے گا۔ لیکن اگر اسلام کسی مناسب صورت میں اور اپنے قانونی اصول کے مطابق معاشری جمہوریت قبول کر لے، تو یہ ایک انقلاب نہیں ہونے، بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹنے کے مترادف ہو گا۔ پس جدید مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے کہیں زیادہ آسان ہے۔ لیکن جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، کہ اسلامی ہند میں ان مسائل کے حل کو ممکن بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی از سر نو تقسیم عمل میں لائی جائے۔ اور قطعی اکثریت کی حامل ایک یا ایک سے زیادہ مملکتیں وجود میں لائی جائیں۔ کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ ایسا مطالبہ کرنے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ غالباً آپ جواہر لال نہرو کے ملحدانہ سوشلزم کا یہی بہترین جواب دے سکتے ہیں“ ۳۔

علامہ نے قائد اعظم کو مشورہ دیا کہ وہ لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو تقریر کریں اس میں اس مطالبے کا تذکرہ کریں یا اجلاس میں جو مشاورتی مجالس ہوں، ان میں اسے زیر بحث لائیں۔ اسی خط کے نیچے ایک نوٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کا پہلے یہ خیال تھا کہ اس موضوع پر قائد اعظم کے نام اخبارات کی وساطت سے ایک مکتوب مفتوح لکھیں۔ لیکن پھر سوچا کہ اس مرحلے پر ایسا قدم اٹھانا مناسب نہیں۔

۲۱ جون ۱۹۴۷ء کو حضرت علامہ نے ایک اور ”نجی اور خفیہ“ مکتوب لکھا۔ یہ بھی طویل اور مفصل تھا۔ اس کے نمایاں نقوش یہ تھے:

۱۔ ہم خانہ جنگی کے نور سے گزر رہے ہیں۔ اور اگر پولیس اور فوج

نہ ہو، تو یہ خانہ جنگی سے گریز صورت اختیار کر سکتی ہے۔
 شمال مغربی ہند میں ایک طوفان آ رہا ہے، جو سارے ہندوستان کو
 اپنی لپیٹ میں لیے لیے لے گا۔ ان واقعات کا اصل سبب نہ مذہبی ہے نہ
 معاشی، یہ ایک خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ یعنی ہندوؤں اور سکھوں
 کی یہ آرزو، کہ وہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کو
 ڈرائیں اور دھمکائیں۔ آئین کی نوعیت ایسی ہے کہ مسلمان اپنے
 اکثریتی صوبوں میں بھی غیر مسلموں کے مزاج ہیں۔ اسے میں
 ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ مار نہیں۔ نہ اس آئین کو
 مسترد کر دیں۔

۲ - کمیونٹی ایوارڈ صرف مسلمانوں کے ایک وجود کو تسلیم کرتا ہے۔
 لیکن اگر یہ آئین ہمیں افلاس کا مسئلہ حل کرنے کے قابل نہیں
 بناتا، تو پھر اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ سائیکس پیکو ایک وجود
 تسلیم نہیں کرتی۔ ہندو مسلمانوں کے لیے زیادہ مرتبہ نہیں چلی
 ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم متعلقہ قومیت نامکان ہے۔ ان
 حالات میں ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے، وہ تو ہے مسابقت اور نسلی
 مماثلتوں کی بنا پر ملک کی از سر نو تقسیم عمل میں لائی جائے۔

۳ - بہت سے برطانوی سیاست دان بھی ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو
 ہندو مسلم فسادات نے یقیناً ان کی آنکھیں کھلی اور انھیں یہ یقین
 کی۔ لارڈ بوتھیان نے تو ۱۹۳۲ء میں ہم سے کہہ دیا تھا کہ
 ہندوستان کے مسئلے کا یہی واحد حل ہے۔

۴ - پنجاب کے بعض مسلمان تو چاہتے ہی سے یہ صوبہ ترک کر رہے ہیں۔
 شمال مغربی ہند مسلم کانفرنس بلائی جائے۔ مجھے اب سے الفاظ ہے

کہ یہ مرحلہ اس کے لیے مناسب نہیں - لیکن اس بات کی تو یقیناً ضرورت ہے کہ آپ لیگ سیشن میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران میں یہ اشارہ کر دیں کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو آخر کار کون سی راہ عمل اختیار کرنی ہوگی -

۵ - میرے نزدیک واحد ہندوستانی فیڈریشن کا حامل نیا آئین کاملاً ناقابل قبول ہے - اگر ایک پر امن ہندوستان مطلوب ہے اور مسلمانوں کو غیر مسلمانوں کے غلبے سے بچانا ہے ، تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ میری تجویز کے مطابق از سر نو بنائے ہوئے مسلم صوبوں پر مشتمل ایک الگ فیڈریشن بنائی جائے - آخر شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو کیوں نہ ایسی قومیں سمجھا جائے جنہیں ہندوستان کے اندر اور باہر کی دوسری قوموں کی طرح حق خود ارادیت حاصل ہو ؟

۶ - ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ اس وقت شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے - یہی وہ بہترین راستہ ہے جو مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی ، دونوں قسم کے صوبوں کے مفاد میں ہے - بہتر یہی ہے کہ آپ لیگ کا آنے والے سالانہ اجلاس کسی مسلم اقلیتی صوبے میں نہیں ، لاہور میں کریں -

ان دونوں مکاتیب کا تجزیہ کیجئے ، تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اقبال کے ذہن میں ایک یا ایک سے زیادہ آزاد مملکتوں کا تصور شروع سے چلا آ رہا تھا - لیکن قومی مصالح کے پیش نظر انہوں نے یہ بات واشگاف انداز میں کہی تو قائد اعظم کے نام ”نجی اور خفیہ“

خطوط میں - دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ خطبہ "اللہ آباد" میں علامہ نے ثقافتی پہلو پر زیادہ زور دیا اور ان خطوط میں معاشی پہلو پر - اور وہ جس پاکستان کا تصور پسند کرتے تھے ، اس میں اسلامی قدوروں کی روشنی میں ایک عادلانہ معاشی اور معاشرتی نظام کو ناگزیر قرار دیتے تھے - تیسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے اس انداز میں سوچتے رہے کہ مسلم اکثریتی صوبے اپنی تنظیم الگ بنیادوں پر کریں - کیونکہ ان کا نصب العین مسلم اقلیتی صوبوں کے مقاصد سے مختلف تھا - ۱۹۳۰ء میں اللہ آباد میشن سے پہلے انہوں نے اپر انڈیا مسلم کانفرنس کا ڈرل ڈالا اور ۱۹۳۷ء میں شمال مغربی ہند مسلم کانفرنس کا انعقاد چاہتے تھے - چونکہ وہ مستقبل شناس سیاستدان تھے ، اس لیے شاید ان کا مقصد یہ ہو کہ آخر کار مسلم لیگ کے دو حصے ہو جائیں - ایک مسلم اکثریتی صوبوں کی لیگ ، جو آزاد مملکت یا مملکتوں کے لیے جدوجہد کرنے - دوسری مسلم اقلیتی صوبوں کی لیگ ، جو باقی ہندوستان میں ایک اقلیت کی حیثیت سے تحفظات حاصل کرنے کی سعی کرنے -

حضرت علامہ کی توقع یہ تھی کہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے میشن میں فائدہ اعظم مسلمانوں کے لیے حق محدود ارادیت کا مطالبہ کریں گے - لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی - فائدہ اعظم ابھی اس قابل نہ ہوئے تھے - راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب اگست اور ستمبر ۱۹۳۷ء میں پنجاب مسلم سٹوڈینٹس فیڈریشن کے مسائل میں ہم طالب علم کارکن ان سے ملتے رہے تو یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ فیڈریشن کا نصب العین کیا ہونا چاہیے انہوں نے ایک ملاقات میں کہا ، کہ نوجوان ہو ، سیاسی جماعتوں پر تکیہ نہ کرو

اور اپنا نصب العین خود تجویز کرو۔ دوسری ملاقات میں جب ہم نے اصرار کیا کہ وہ نصب العین کے بارے میں مشورہ دیں۔ تو کہنے لگے کہ لیگ کے اکتوبر سیشن کا انتظار کیوں نہیں کر لیتے۔ یہ بات غالباً اس لیے کہی کہ وہ لیگ سیشن سے توقعات باندھے ہوئے تھے۔ جب راقم الحروف نے انہیں یاد دلایا کہ گذشتہ ملاقات میں انہوں نے سیاسی جماعتوں پر تکیہ نہ کرنے اور اپنے نصب العین کا فیصلہ خود کرنے کی تلقین فرمائی تھی اور اب لکھنؤ سیشن کا انتظار کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ تو آن کے چہرے پر ایک عجیب دلکش تاثر غالب آیا اور کہنے لگے، میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔ اس پر ہم نے کہا، ہمارے لیے نصب العین آپ تجویز کریں۔ چنانچہ وہیں یہ بات طے پا گئی کہ مسلم طلبہ کا نصب العین یہ ہوگا۔ شمال مغربی ہند میں مسلمانوں کے حق خود ارادیت کی بنیاد پر ایک ایسی مسلم نیشنل سٹیٹ کا قیام، جس میں پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور کشمیر شامل ہوں۔ یہ نصب العین ہماری جماعت کے آئین کا جزو بن گیا۔ بلکہ ہم نے سرحد، سندھ اور کشمیر کی شاخوں کا الحاق بھی قبول کر لیا۔

اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ حضرت قائد اعظم نے علامہ کے مکاتیب سے کیا اثر قبول کیا؟ بد قسمتی سے علامہ کے نام قائد اعظم کے خطوط نہایت پُراسرار حالات میں ایسے گم ہوئے کہ ان کا سراغ پھر کبھی نہ ملا۔ بہر حال ۱۹۴۳ء میں جب علامہ کے خطوط بنام قائد اعظم کا مجموعہ چھپا، تو اس کا پیش لفظ قائد اعظم نے لکھا۔ اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قائد اعظم پر ان خطوط کا کیا اثر پڑا۔ اس پیش لفظ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”میرے نزدیک یہ خطوط بہت بڑی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ بالخصوص وہ خطوط، جن میں تمہوں نے اسلامی ہند کے سیاسی مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات واضح اور واشگاف انداز میں پیش کئے۔ ان کے خیالات بہت بڑی حد تک میرے خیالات سے ملتے جلتے تھے۔ اور ان کے خیالات نے مجھے بھی ہندوستان کے انہی مسائل کے مطالعہ اور محتاط غور و فکر کے بعد انہی نتائج پر پہنچایا۔ اور یہی وہ خیالات تھے، جنہوں نے مسلمان ہند کی متحدہ مرضی کے مطابق آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کی صورت اختیار کی؟ جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو منظور ہوئی اور جسے عرف عام میں قرارداد پاکستان کہا جاتا ہے“۔ ۵

حوالے

- ۱۔ Iqbal's Letters to Mr. Jinnah - صفحات ۳ - ۱۰
- ۲۔ ایضاً - صفحات ۱۳ - ۱۴
- ۳۔ ایضاً - صفحات ۱۶ - ۱۷
- ۴۔ ایضاً - صفحات ۲۳ - ۲۴
- ۵۔ ایضاً - صفحات ۲۵ - ۲۶



•

سینتیسواں باب

عظمت موت کے دروازے پر

حضرت علامہ ۱۹۳۴ء سے بیمار چلے آتے تھے۔ وفات سے ایک سال پہلے ایک آنکھ میں موتیا آئر آیا، اس لیے مطالعہ بند ہو گیا۔ کیونکہ ایک آنکھ پہلے ہی بے کار تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ موتیا پک جائے گا تو اپریشن کیا جائے گا۔ لیکن بیماری بڑھتی چلی گئی، اور اپریشن تک نوبت نہ پہنچی۔ بینائی اتنی کم ہو چکی تھی، کہ ملاقاتی کو یا تو آواز سے پہچانتے، یا اس صورت میں کہ، وہ بالکل قریب آجاتا۔ اس کے باوجود ان کی علمی اور ادبی زندگی میں ہمہ بومی باقی رہی۔ وہ شعر بھی کہتے۔ علمی مسائل پر تبادلہٴ خیالات بھی کرتے۔ بلکہ مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ جو علمی معرکہ ہوا، وہ بھی شدید علالت کے دوران میں ہوا۔ اور انہوں نے اپنا مقالہ بھی املا کرایا اور اس سلسلے میں حضرت طالبوت کے ساتھ خط و کتابت بھی جاری رکھی۔ غلام رسول سہر لکھتے ہیں: ”مرض اگرچہ اندر ہی اندر بڑھ رہا تھا اور ان کی طبیعت کمزور ہو رہی تھی، لیکن ان کی گفتار و مکالمات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ اسی طرح باتیں کرتے، جس طرح اندرستی کے زمانے میں کرتے تھے۔ علمی اور سیاسی مباحث کا انداز بھی وہی تھا۔ نکتہ سنجیاں اور نکتہ طرازیوں بھی بدستور جاری تھیں۔ ان کی وفات سے ٹھوڑی دیر پیشتر ان کے پاس بیٹھ کر یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ دائمی مفارقت کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔“ - ۲

۱۹۳۸ء کے آغاز تک علامات کی کیفیت وہی تھی، جو مدت سے چلی آ رہی تھی۔ کہ کبھی طبیعت خوش و خرم ہے، کبھی علیل۔ کوئی ایسی کیفیت طاری نہ ہوئی جس سے غیر معمولی تشویش ہوئی اور نہ بہ ظاہر کوئی نیا مرض پیدا ہوا۔ چنانچہ نارمل بیماری کا علاج حکیم محمد حسن قرشی کرتے رہے۔ بہر حال یوم اقبال کے بعد علامات نے یک بیک ایک نیا پلٹا لٹھایا۔ ”علامہ“ کو ضیق النفس کے خفیف دورے شروع ہوئے۔ پچھلی رات بے خوابی ہونے لگی اور ایک دن نقرس کی بھی تکلیف رہی۔ ضیق النفس کے لیے حکیم قرشی صاحب نے ایک ہلکا سا جوشاندہ تجویز کر رکھا تھا۔ جس کے استعمال سے سکون ہو جاتا تھا۔ حکیم صاحب کی تشخیص یہ تھی کہ علامہ کو دسہ قلبی ہے۔ اور اس کی وجہ سے ضعف قلب ہے۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے بھی اس تشخیص کی تائید کی۔ ان دنوں ڈاکٹر علامہ بسگر پر بیٹھ کر تکیہ اپنے آگے رکھوا لیتے اور اس پر اپنا سر ٹیک دیتے۔ ۲۵ فروری کو دسہ کا دورہ ہوا۔ جوشاندہ پیا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ پھر ایلو پیتھک علاج شروع ہوا۔ جس میں دورے کو روکنے اور نیند لانے کی تدبیر کی جاتی تھی۔ چند دن ذرا آرام سے گذر گئے۔ ۳ مارچ کی شب کا ذکر ہے، علامہ پر ضعف قلب سے غشی طاری ہوئی۔ اور وہ اسی حالت میں پلنگ سے گر گئے۔ دوسرے دن حکیم قرشی صاحب نے آن کو دیکھا، تو ان کے نیاز مندوں کو بتا دیا کہ علامہ کا قلب نہایت ضعیف ہے۔ جگر اور گردے بھی ماؤف ہو چکے ہیں سگر اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ مناسب تدابیر اور احتیاط سے افاقہ ہو جائے گا۔

یلو پیتھی کے جن ڈاکٹروں نے علاج کیا، ان میں آس زمانے کے نامی گرامی ڈاکٹر شامل تھے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر الہی بخش،

ڈاکٹر جمعیت سنگھ اور ڈاکٹر یار محمد - ان میں ڈاکٹر محمد یوسف بتا چکے تھے کہ مرض لا علاج ہے - اور اس قسم کے مریض سات آٹھ مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہتے - اس لیے مناسب یہی ہے کہ آخری دنوں کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور خوشگوار بنانے کے لیے دوائیں کم دی جائیں اور غذا بہتر دی جائے - علامہ کو اس رائے سے آدہ نہیں دیا گیا - دوسرے ، اس بات کا خیال رکھا گیا کہ علامات کی خبر اخباروں میں نہ آئے - تاکہ علامہ کو بھی کبھی غیر معمولی پریشانی نہ ہو اور مزاج پُرسی کے لیے لوگوں کا ہجوم نہ بوجھائے - اور وہ آرام و سکون کے ساتھ بستر پر دراز رہیں - ڈاکٹر تو یہ بھی سمجھتے تھے کہ علامہ زیادہ غور و فکر نہ کریں - اور زیادہ باتیں بھی نہ کریں - لیکن جس شخصیت کی تمام عمر مختلف النوع مسائل پر غور و فکر میں گزری ہو ، اس سے یہ توقع رکھنا بے سود تھا کہ وہ اپنے دل و دماغ کے درمیان بند رکھنے پر قادر ہو - رہی باتیں ، تو علامہ ایک عظیم مہتمم تھے - اور جہاں احباب بیٹھے ہوں ، وہاں گفتگو بھی نہیں ہوتی ، ان کے پاس روتہ نہیں تھا - اس لیے وہ آخری وقت تک اپنے دماغ کے ساتھ سوجھے رہے اور نیازمندیوں کو علم گفتگو سے فیضیاب فرماتے رہے -

نیازمند علامہ سے مرض کی اصل کیفیت چھپانے کے لیے ڈاکٹر نے محسوس کر لیا تھا کہ موت فریب ہے - لیکن وہ بھی پتہ نہ چھپا سکتے تھے اور تیارداروں سے چھپاتے تھے - مسادا کہ وہ پرسن ہو جائیں - جب ڈاکٹر معائنہ کرتے اور اطمینان دلانے پر علامہ کہتے ، مجھے اطمینان دلانے کی چنداں ضرورت نہیں - تیارداروں سے پوچھنے نہ ان کی اطمینان ہوا ہے یا نہیں - اگر وہ مطمئن ہیں ، تو میں بھی مطمئن ہوں -

غلام رسول مہر رقمطراز ہیں کہ ”مارچ کی شام کو میں اور سالک صاحب حاضر خدمت ہوئے ، تو بہ ظاہر طبیعت کسی قدر بہتر معلوم ہوتی تھی ۔ وہ خود فرمانے لگے ، اب تو میں کمرے کے اندر تھوڑا بہت چل پھر بھی لیتا ہوں ۔ ہم نے عرض کیا ، خدا کے فضل سے چند روز میں اتنی صحت ہو جائے گی کہ آپ کوٹھی کے صحن میں چہل قدمی فرما لیا کریں گے ۔ مسکرا کر کہنے لگے ، میں موت سے نہیں ڈرتا ۔ بلکہ خندہ پیشانی کے ساتھ اس کی پیشوائی کے لیے تیار ہوں ۔ ساتھ ہی اپنا یہ شعر سنایا :

نشانِ مردِ مومن با تو گوئیم
چو مرگ آید تبسم برب اوست

حضرت علامہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ خیال کئی صاحبوں کے سامنے دہرایا ۔ انتقال سے چار روز پہلے ایک جرمن ملاقات کے لیے حاضر ہوا ، اس سے بھی یہی کہا تھا“ ۔ د

علامہ کے مزاج میں رقت تو ہمیشہ سے تھی ۔ لیکن جوں جوں دل کمزور ہوتا گیا ، رقت بھی بڑھتی گئی ۔ ایک دفعہ دیر تک رونے رہے ۔ احباب پریشان ہوئے ، لیکن کیا کر سکتے تھے ۔ جب یہ کیفیت باقی نہ رہی تو دریافت کیا کہ رقت کا سبب کیا تھا ۔ حضرت علامہ نے کہا ، بس یہ شعر یاد آ گیا تھا :

تہنیت گوئید مستان را کہ سنگِ محتسب
بر دل ما آمد و این آفت از مینا گذشت

ان دنوں احباب کی سعی یہی رہی کہ کوئی ایسی بات علامہ کے سامنے نہ کہی جائے، جس سے رقت طاری ہونے کا اندیشہ ہو۔

علامہ کا علاج ڈاکٹر بھی کرتے تھے اور طبیب بھی۔ حکیم نابینا کا علاج بھی رہا۔ لیکن حکیم محمد حسن قرشی نے زیادہ تسلسل کے ساتھ علاج کیا اور وہ بھی بڑی محبت کے ساتھ۔ وہ جانتے تھے کہ علامہ کڑوی کسبیلی دوائیں ناپسند کرتے ہیں اور ان سے مضطرب بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے حکیم قرشی نے ہمیشہ ایسی دوائیں تجویز کیں جو لذیذ بھی ہوں، مفرح بھی اور جن سے مرض میں بھی افاقہ ہو۔ انہوں نے علامہ کی خدمت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ دن میں دو تین بار آتے تھے اور شام کے چھ بجے سے قریب قریب نصف شب تک کا وقت تو دن علامہ کے ساتھ بسر کرتے رہے۔ اس سے ایک تو علامہ کا حوصلہ بڑھتا تھا۔ دوسرے، جب کوئی غیر معمولی پیچیدگی پیدا ہوتی، تو ازالے کی فوری صورت نکل آتی تھی۔

پھر حال علامہ کی کیفیت امید افزا نہیں تھی۔ بلکہ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" والا معاملہ تھا۔ مارچ کو مرض میں جو تھیں پیچیدگی پیدا ہوئی، اس نے نیاز مندوں کو مجبور کیا کہ اب علامہ سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہوں۔ میاں محمد شفیع ام۔ س نے مسندال طور پر جاوید منزل میں سکونت اختیار کر لی۔ چند گھنٹے کے لیے "سول اینڈ ملٹری آرٹ" میں فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے جاتے۔ باقی تمام وقت علامہ کی خبر گیری کرتے۔ اور راتوں کو آٹھ آٹھ گھنٹے در ادویات دیتے۔

چوہدری محمد حسین ، راجہ حسن اختر اور حکیم قرشی سے پہر کے بعد آتے۔
آدھی رات کے وقت جاتے۔ اور علامہ کو جی بہلاتے۔

اپریل کے وسط میں حضرت علامہ کی بائیں جانب ورم ہو گیا ، جس سے تشویش ہوئی۔ بلغم میں خون کی ہلکی سی آمیزش سے ڈاکٹروں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دل کی طرف جانے والی رگ میں انشقاق کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ یہ ایک خطرناک تبدیلی تھی۔ لیکن علامہ کو اس سے آگاہ نہ کیا گیا۔ ۱۸ اپریل کو ایک ملاقاتی نے علامہ سے کہا۔ کہ ابھی تو آپ کو حجاز جانا ہے۔ بولے ، سہارنپور سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ انہوں نے حرم کا طواف کرتے ہوئے دعا کی ہے کہ مجھے حرم شریف میں پہنچنا نصیب ہو۔ لیکن اب تو بد ظاہر ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دیکھیں خدا کو کیا منظور ہے۔ ۱۹ اپریل کی شام کو مسر و سالک مولانا غلام مرشد کی معیت میں حاضر ہوئے۔ مولانا مسر لکھتے ہیں : ”...چہرہ بدستور بشاش تھا اور اس پر ہلکی سی طبعی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ کسی حرکت سے تشویش ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ چہرے کو دیکھ کر یا باتیں سن کر خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ موت کا وقت اتنا قریب آ گیا ہے اور وہ بیش بہا زندگی ، دنوں کی نہیں ، محض گھنٹوں کی باقی رہ گئی ہے۔ زندگی میں یہ ان کی آخری زیارت تھی۔ میں دوسرے روز اسی وجہ سے نہ گیا۔ کہ طبعیت بہ ظاہر اچھی معلوم ہوتی تھی“ ۶۶

چند دن پہلے حکیم قرشی طبی بورڈ میں شرکت کے لیے راولپنڈی گئے تھے۔ ان کے پیچھے ہی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ انہیں واپسی کا تار دیا

گیا۔ آن کے پیچھے ڈاکٹروں کا ایک بورڈ علاج شروع کر چکا تھا، جس سے دو روز کچھ افاقہ ہوا۔ لیکن ۱۹ اپریل کی رات کو حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ حکیم قرشی ۲۰ اپریل کو پہنچے۔ حکیم صاحب نے ایک مقالے میں بتایا کہ شام کو میں نے اور تین چار ڈاکٹروں نے دیکھا تو حالت اطمینان بخش نہیں تھی۔ بہر حال حواس اسی طرح صحیح و سالم تھے اور ظاہری حالت میں کوئی خاص تغیر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ حکیم صاحب نصف شب تک بیٹھے رہے۔ چوبندری محمد حسین، سید نذیر نیازی، پروفیسر مظفر الدین اور محمد شفیع بھی موجود تھے۔ جب حکیم صاحب نے اجازت چاہی تو علامہ نے بیٹھنے کو کہا۔ اور علی بخش سے کہا کہ چائے بناؤ۔ چنانچہ سب نے چائے پی۔ علامہ نے ایک ڈاکٹری دوائی پینے کے بعد بہت بے چینی محسوس کی۔ فرمانے لگے، مجھے مٹی ہو رہی ہے۔ میں قے کرنا چاہتا ہوں۔ حکیم قرشی رقمطراز ہیں: "جونکہ خون آ رہا تھا اور خطرہ تھا کہ قے سے کوئی رگ نہ ٹوٹ جائے، میں نے گرم پانی اور نمک کے غرغرے کرنے اور دائہ الاٹچی جہانے کے لیے کہا۔ اس سے بے چینی کم ہوئی مگر فرمانے لگے کہ مٹی ابھی باقی ہے۔ پھر میں نے آکسیر عنبری دی تو اس سے مٹی رفع ہوئی۔ اس کے بعد ایک دوسری ڈاکٹری دوا پینی تھی مگر اس سے اندازہ نہ ہوا۔ اور فرمانے لگے، ڈاکٹری دوائیں خلاق انسانیت (INHUMAN) ہیں۔ کیونکہ ان میں مریض کے ذوق کا خیال نہیں ہوتا۔ پھر فرمانے لگے، مٹی کی سائینس کی سائینس معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ناسا ہے۔"

ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ خواب اور دوائیں ضرور لے لیجئے۔ علامہ فرمانے لگے، مجھے اس سے فائدہ نہیں آئی۔ ڈاکٹر نے کہا، اس

میں ایسے اجزا بھی شامل ہیں، جن سے شانے کے درد میں کمی ہوگی۔ علامہ نے فرمایا۔ اگر اس مکسچر سے دافع درد اجزاء کو الگ کر دیں تو پی لوں گا۔ رات کے ایک بجے موسم میں قدرے خُنکی پیدا ہوئی تو آن کی چار پائی اندر لائی گئی۔ اور وہ کچھ دیر بعد سو گئے۔ احباب چلے گئے اور گھر میں میاں مجد شفیع رہے اور ڈاکٹر قیوم اور علامہ کا پرانا ملازم علی بخش۔ ۲۰ اپریل کی سہ پہر کو ابھی حالت زیادہ متغیر نہیں ہوئی تھی کہ علامہ کے ایک پرانے جرمن دوست بیرن فان فلٹ ہائم ملنے کو آئے۔ وہ ہائڈل برگ میں آن کے ہم جماعت رہے تھے۔ آن کے ساتھ ایک پارسی دوست تھا۔ ان دونوں کے ساتھ علامہ نے جی بھر کر باتیں کیں۔ بالخصوص طالب علمی کے زمانے کو یاد کیا۔ یہ کسی بیرونی شخص سے علامہ کی آخری ملاقات تھی۔ ۸

احباب گئے، تو راجہ حسن اختر آ گئے۔ پچھلے بہر علامہ کی نیند کھلی تو بہت بے چین تھے۔ کہنے لگے، حکیم قرشی کو بلاؤ۔ راجہ صاحب نے کہا، کہ ابھی ایک بجے گئے ہیں۔ اس وقت شاید انہیں بلانا مناسب نہ ہو۔ اس پر علامہ نے فرمایا، کاش آن کو معلوم ہوتا کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے۔ اور پھر چند مہینے پہلے لکھی ہوئی یہ رباعی سنائی:

س۔رود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روز گارِ این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہہ ناید

راجہ صاحب سمجھ گئے کہ وہ گھڑی آن پہنچی ہے ، جس کا کھٹکا تھا ۔
کہنے لگے میں ابھی حکیم صاحب کو بلاتا ہوں ۔ پانچ بیج کر پانچ منٹ
پر جاوید منزل سے نکلے ۔ ان کی روانگی کے فوراً بعد علامہ نے کہا
پلنگ کے کمرے میں لے چلو ۔ جب اندر پلنگ لے گئے تو فرمایا ،
کندھا دبایا جائے ۔ علی بخش نے شانہ دبایا ۔ علامہ نے فرمایا ۔ دل پر
تکیف ہے ۔ اور اس کے ساتھ ہی پانچ بیج کر چودہ منٹ پر جان ہار دی ۔
وہ عظیم المرتبت شخصیت اس خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں جا پہنچی ،
جس کے پیغام کو پھیلانے میں اس نے عمر کا ایک ایک لمحہ صرف دیا ۔
اور جس کے بندوں کے ذہن کو بیدار کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں
مرتکز کر دی تھیں ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

یہ الم ناک خبر جنگ کی آک کی طرح بندی ۔ اخباروں نے ضمیمے
چھاپے ، سرکاری دفاتر بند ہو گئے ، اسلامی ادارے بند ہو گئے اور لوگ
گروہ در گروہ ہجوم در ہجوم جاوید منزل کا رخ کرنے لگے ۔ احباب اور
نیازمند ، بلکہ اجنبی لوگ بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے ۔ سب سے
باری آن کے چہرے کو دیکھ کر گزرتے جاتے تھے ۔ جس کے دل میں
تھا اور ہلکی سی مسکراہٹ بھی ۔

چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ تدفین کہاں ہو ۔ چوہدری شہ حسین
کی تجویز تھی کہ علامہ کو بادشاہی مسجد کے لسی حجرے میں دفن

کیا جائے۔ جنازہ چوہدری صاحب، سید محسن شاہ، خلیفہ شجاع الدین، خان سعادت علی خان، میان نظام الدین، میان اسیر الدین، مولانا غلام مرشد، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک بادشاہی مسجد گئے۔ اور دیکھ بھال کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ حجرے میں تدفین مناسب نہیں۔ بلکہ سیڑھیوں کی بائیں جانب کے خالی قطعہ زمین کو مدفن بنا لیا جائے تو اچھا ہوگا۔ تاکہ بعد میں ایک چھوٹا سا مقبرہ بھی تعمیر ہو سکے۔ اس کے لیے حکومت ہند کے محکمہ آثارِ قدیمہ کی منظوری ضروری تھی۔ سر مکندر کاکتہ گئے ہوئے تھے، اس لیے پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد نے گورنر پنجاب سر ہزی کریک سے ملاقات کی اور انہوں نے دوپہر تک اجازت دلا دی۔

اور اب حضرت علامہ کے آخری سفر کی روداد سالک کی زبانی

ملاحظہ ہو :

”شام کے پانچ بجے تک جاوید منزل پر ہزاروں مسلمانوں کا مجمع ہو گیا۔ اور پنجاب بھر کے عمائد و اکابر بلا امتیاز مذہب و ملت جمع تھے۔ وزراء نے حکومت، عدالت عالیہ کے جج، حکام اعلیٰ، وکلاء، شعراء، ادباء، اخبار نویس، کالجوں کے پروفیسر، طلبہ، سجادہ نشین، علماء، تجار، صنایع اور عام فرزندانِ اسلام جنازے کے ساتھ با چشم گریاں آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ اور رونے والوں کی آوازوں سے ہر طرف ایک کدھرام مچا ہوا تھا۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس مضبوطی سے باندھ دئے گئے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان کدھرا دے سکیں۔ گورنر پنجاب اور نواب بہاولپور کی طرف سے ان کے سیکرٹریوں نے پھولوں کی چادریں جنازے پر چڑھائیں۔

جنازے کے جلوس کے آگے پیدل اور سوار پولیس ، احرار کے
 سُرخ پوش رضا کار ، نیلی پوش والنمیر ، خاٹساروں کا جیش ، کامریڈ
 مسلم جیش ، المہلال پارٹی ، غرض متعدد جیوش اپنی اپنی وردیوں
 میں جنازے کے ہمراہ تھے ۔ جاوید منزل سے یہ عظیم الشان جلوس
 ریلوے سٹیشن اور ریلوے روڈ سے ہوا۔ اسلام آباد کانچ کے وسیع
 سبزہ زار میں پہنچا ۔ جہاں نماز جنازہ پڑھنے کے لیے کم و بیش
 بیس ہزار مسلمان موجود تھے ۔ لیکن جب جلوس براندہرتھ روڈ سے
 دہلی دروازے کی طرف چلا تو جنازے کے ساتھ دہلی پچاس ماٹھو
 ہزار مسلمان ، بندو اور سکھ ضرور ہوں گے ۔ مات بجے کے بعد جلوس
 شاہی مسجد پہنچا ۔ نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی بے پناہ
 کثرت کے باعث وضو اور ترتیب صفوں میں ایک گھنٹہ صرف ہوا ۔
 آٹھ بجے شب نماز جنازہ ادا کی گئی اور سونے دس بجے یہ عزیز و
 محبوب جسم سپرد خاک کر دیا گیا :

آہان تیری لحد پر شہم افشانی نہ کرے

سبزہ نورستہ اس گھر کی نکمہ ہستی کسرتے ۔

حوالے

- ۱ - "اقبال نامہ" (مرتبہ چراغ حسین حسرت - ص ۶۷ - ۶۸)
- ۲ - ایضاً - ص ۶۴ - ۶۵
- ۳ - "ذکر اقبال" - ص ۲۱۹ - ۲۲۰
- ۴ - "اقبال نامہ" (حسرت) صفحات ۶۵ - ۶۶
- ۵ - ایضاً - صفحات ۲۸ - ۲۹
- ۶ - "اوراقِ کم کشتہ" - ص ۳۹۴ - ۳۹۵

۷ - ”اقبال نامہ“ مرتبہ حسرت - حکیم قرشی صاحب کا مقالہ - صفحات
۵۴ - ۵۵ -

۸ - ”ذکرِ اقبال“ - صفحات ۲۲۱ - ۲۲۲ -

۹ - ایضاً - صفحات ۲۲۲ - ۲۲۳ -

”اقبال نامہ“ - صفحات ۵۶ - ۵۷ -

۱۰ - ”ذکرِ اقبال“ - صفحات ۲۲۳ - ۲۲۵ -

۷



اڑتیسواں باب

اقبال کے شب و روز

حضرت علامہ عابد شب زندہ دار بھی تھے اور رونق محفل بھی۔
نصف شب کے وقت سوتے اور تین گھنٹے کے بعد بیدار ہوتے۔ تہجد کی
نماز ادا کرتے۔ اس کے بعد تھوڑا سا آرام کرتے۔ اتنے میں نماز فجر کا
وقت آ جاتا۔ نماز ادا کرنے کے بعد قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے۔ جب
تک گلا خراب نہ ہوا، بہت صاف اور دلکش آواز میں تلاوت کرتے۔
علاقت کے بعد تلاوت تو جاری رہی لیکن زیر لب۔ قرآن حکیم کو حرز
جاں بنا رکھا تھا۔ اسی کے مطالعہ میں ایک عمر بسر ہو گئی۔ اسی کے
اسرار و رموز کی ترجمانی اپنے کلام میں فرمائی۔ اسی کو سیاست میں رہنا
بنایا اور اسی کو فلسفے کی باریکیاں سمجھنے میں اور نوح انسانی کے
مسائل سے آگہی میں ہدایت کا سرچشمہ پایا۔ جب فکر شعر کرتے،
قرآن حکیم پاس رکھتے۔ افسوس، زندگی نے اتنی مسہلت نہ دی کہ
قرآن کریم کے مطالب پر اپنی موعودہ کتاب لکھ لیتے۔ اقبال کو
حضور سرور کائنات سے غیر معمولی اور ولہبانہ عشق تھا۔ حضور را
ذکر آنا تو رفت طاری ہو جاتی اور لہجی زار و قطار رہتے تھے۔
اسی نے آن کی طبیعت میں گداز پیدا کیا اور یہی آواز آن کی ساعری اور
فکر میں رواں دواں ہے۔

علامہ نے ایک قلندرانہ اور درویشانہ مزاج پایا تھا۔ ابتدائی زندگی
میں یافت کے لیے بہت تک و دوئی لیکن ضروریات کو محدود رکھا۔

وکالت کے ابتدائی زمانے میں جب مہینے بھر کے لیے پانسو روپے کا کام مل جاتا ، مطمئن ہو جاتے اور مزید یافت کے لیے جدوجہد نہ کرتے ۔ جوں جوں مالی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوا ، مزید یافت کی جستجو ہوئی ۔ کچھ رائٹی کتابوں سے آنے لگی ۔ کچھ روپیہ امتحانی پرچے دیکھنے سے مل جاتا ۔ جن لوگوں کو امتحانی پرچے دیکھنے کا تجربہ ہے ، وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ یہ ایک آکٹا دینے والا کام ہے ۔ اور علامہ کو یہ کام آخری دم تک جاری رکھنا پڑا ۔ جناب ڈاکٹر صدر محمود نے انکم ٹیکس کے کاغذات کی چھان بین کر کے بتایا ہے کہ علامہ نے زندگی کے آخری بائیس سالوں میں دو لاکھ روپے سے کچھ کم رقم کمائی ۔ اس میں ایک لاکھ روپے سے زیادہ آمدنی وکالت سے ہوئی ، تریسٹھ ہزار روپے کتابوں کی رائٹی کے طور پر حاصل ہوئے اور تقریباً پینتیس ہزار روپے امتحانی پرچوں کو دیکھنے کے معاوضے کے طور پر ملے ۔ اس سے موصوف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علامہ مرفع الحال رہے ۔ لیکن اگر اس رقم کو بائیس سالوں پر پھیلا دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علامہ کی اوسط ماہانہ آمدنی ساڑھے سات سو روپے ماہانہ رہی ۔ اس عرصے کے دوران میں زندگی کا بیشتر حصہ میکوڈ روڈ کی کوٹھی میں گزارا ۔ جس کا ماہانہ کرایہ پونے دو سو روپے تھا ۔ اسی آمدنی سے کوٹھی بنوائی اور اسی آمدنی سے بچوں کے لیے کچھ اثاثہ جمع کیا ۔ اور اسی میں سے تقریباً دس ہزار روپے کی رقم انکم ٹیکس کی صورت میں ادا کی ۔ اب خود ہی تصور کر لیجئے کہ روزمرہ زندگی گزارنے کے لیے کتنی رقم بچتی ہوگی ؟ ڈاکٹر جاوید اقبال سے اس بات پر گفتگو ہوئی تو کہنے لگے ، رہن سہن کا انداز ہی ظاہر کرتا تھا کہ علامہ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور روپے کی کوئی ریل پیل نہیں تھی ۔

سانگی کی کیفیت یہ تھی کہ مہانوں انارکلی بازار کے ایک بالاخانے میں قیام رہا۔ ۱۹۲۲ء میں سیکورڈ روڈ پر ایک ہوسیدہ سی کوٹھی میں آگئے۔ والد مرحوم سالک نے پوچھا، حضرت! کیا لاہور میں اس کرائے پر اس سے بہتر کوٹھی نہیں ملتی تھی۔ یہ تو بہت ہی پرانی ہے۔ علامہ بنس کر فرمانے لگے، جی ہاں۔ یہ تو صرف میری دعاؤں کے سہارے کھڑی ہے۔ ورنہ اس میں قائم رہنے کی کوئی بات باقی نہیں۔ تیرہ سال بعد ۱۹۳۵ء میں اپنی کوٹھی جاوید منزل میں منتقل ہوئے۔ مجھے عنفوان شباب میں وہیں اگست ۱۹۳۷ء میں آن کی خدمت میں چند مرتبہ حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ اس کی سجاوٹ میں کوئی خاص تلافی نہیں برتا گیا تھا۔ میں نے دو کمرے دیکھے۔ ایک ڈرائنگ روم، جو نہایت سادہ تھا اور ایک اس سے مسجق کمرہ، جس میں سجاوٹ کا وجود ہی نہیں تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک چارپائی تھی۔ جس پر ایک صاف ستھرا بستر بچھا رہتا تھا۔ اسی پر علامہ کاؤ تکیے کے سہارے دراز ہوتے۔ اس پاس چند درمیاں تھیں۔ بیشتر لوگوں سے یہیں ملاقات رہتی اور ڈرائنگ روم نسبتاً کم استعمال ہوتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں علامہ عملاً یہیں تھے اور ڈرائنگ روم میں بیٹھنا دوپہر معلوم ہوتا تھا۔

کسی زمانے میں علامہ نے عدالت آنے جانے سے انکھی، کبھی نہ ہوتی تھی۔ لچھو عرس، کار بھی نہ لکھی لیکن یہ استعمال میں نہ آئی تھی۔ کیونکہ علامہ کبھی بھی جوتے کے زیادہ فائل میں تھے۔ کسے ہی ڈرائیور نے اپنے آپ کو بے کار بنا کر کوٹھی کے باہر خواجہ لگا لیا۔

وقت بھی گزرے اور یافت بھی ہو۔ علامہ سیر کے کبھی قائل نہیں ہوئے۔ جوانی میں ورزش کرتے تھے۔ بعد میں وہ بھی ختم ہو گئی۔ لاہور سے باہر جانا ہوتا یا کھوٹھی سے نکلنا ہوتا، علامہ انتہائی مجبوری کے عالم ہی میں نکلتے تھے۔ خانہ نشینی آن کی فطرت میں داخل ہو چکی تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملنے والے خود علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ سارا دن تانتا بندھا رہتا تھا۔ ان میں امیر بھی تھے، غریب بھی، سیاستدان بھی تھے اور دانش ور بھی۔ ملکی بھی تھے اور غیر ملکی بھی۔ سالک ”ذکر اقبال“ میں لکھتے ہیں ”علامہ اقبال . . . دور حاضر کے بہت بڑے مستکرم تھے۔ جس کو انگریزی میں (CONVERSATIONALIST) کہتے ہیں۔ صبح سے رات تک یہ مرد قلندر اپنے سادہ کپڑوں میں سیدھی سادھی چارپائی پر یا آرام کرسی پر بیٹھا رہتا اور آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ صوبے کے سیاسی اکابر، وکلاء، علماء، کالجوں کے پروفیسر، اخباروں کے ایڈیٹر، شعراء، ادباء، طالب علم، ان پڑھ عقیدت مند، فقیر اور درویش — غرض ہر قسم اور ہر طبقے کا انسان آن کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ معمولی معمولی جھگڑوں سے لے کر قانون، فلسفہ، سیاست، دین اور سائنس کے بلند ترین مسائل زیر بحث آتے۔ اقبال آن سب پر اپنی وسیع معلومات سے روشنی ڈالتے اور ہر شخص آپ کے علم و فضل سے مرعوب ہو کر جاتا۔ صوبے بھر کے تعلیم یافتہ حضرات اپنی ذہنی اور فکری الجھنیں علامہ کی خدمت میں پیش کرتے اور وہ انہیں سلجھا دیتے۔ آن کی مجلس میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز نہ تھا۔ معمولی سے معمولی آدمی بھی سیدھا آن کے گھر میں داخل ہو کر آن کے پاس بیٹھ جاتا اور جس وقت تک جی چاہتا، بیٹھا رہتا۔ علامہ صاف

صاف کہنا تو درکنار ، اپنی کسی حرکت سے بھی اکتاہٹ کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے ۔ علم و فکر کے اس دربار میں سر فضل حسین ، سکندر حیات خان ، جواہر لال نہرو ، قائد اعظم محمد علی جناح ، لارڈ لوتھیان ، ڈاکٹر سکارپا اور بے شمار دوسرے اکابر علم و سیاست حاضر ہوتے اور مستفیض ہو کر جاتے ۔ علامہ کو بعض سے سیاسی اختلافات تھے لیکن چونکہ خلوص و بے غرضی کا معاملہ تھا ، اس لیے کسی سے ناٹواری پیدا نہ ہوتی تھی ۔“

بہت سے لوگ مسلسل آن کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہے ۔ پہلے دور میں مرزا جلال الدین ، سر عبدالقادر ، سر شہاب الدین ، نواب ذوالفقار علی خان ، سر محمد شفیع ، سر فضل حسین ، سر جوگندر سنگھ ، سردار امراؤ سنگھ اور راجہ نریندر ناتھ ۔ دوسرے دور میں مولانا فقیر علی خان ، خلیفہ شجاع الدین ، اکبر علی ارسطو ، اور مہر و مالک ۔ موخر الذکر دو مدیر ۱۹۳۳ء تک تو ہر دوسرے تیسرے دن شام علامہ کے ہاں بسر کرتے ۔ جب انہوں نے مسلم ٹاؤن میں مکان بنا لیے ، تو فاصلے کے وجہ سے شام کی محفلیں ترک کر دیں ۔ بہر حال دن کے وقت اکثر حاضر ہوتے تھے اور یہ سلسلہ آخری دم تک جاری رہا ۔ آخری ایام میں حکیم محمد حسن قرشی ، راجہ حسن اختر ، خواجہ عبدالرحیم زیادہ آتے رہے ۔ میاں محمد شفیع (م ۔ ش) عملاً علامہ کے سیکرٹری کے فرائض ادا کرتے تھے ۔

نیازی علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مختلف النوع علمی مسائل اور مسائل کے تاثرات قدمبند کرتے تھے ۔ لیکن جو شخص ابتداء سے آخر تک جلسہ و ندیم رہا ، وہ چوہدری محمد حسین کی ذاتِ ارامی تھی ۔ ان سے علامہ کے نہایت گہرے تعلقات تھے ۔ یہ حیرت کا مقام ہے کہ ملاقاتوں اور دوستوں اور نیاز مندوں کی مسلسل اور طویل صحبتوں کے باوجود

حضرت علامہ کو فکرِ شعر کا وقت بھی بدرجہٴ وافر حاصل تھا۔ اور جدید ترین ادب کے مطالعہ کا موقع بھی مل جاتا تھا۔

علامہ احباب کو کلام سناتے تھے لیکن اپنی مرضی سے۔ انہیں اس بات سے خاصا حجاب تھا کہ فرمائش پر کلام سناتے۔ بعض لوگ انہیں اپنے گھر مدعو کرتے، بہت سے مہمان بلاتے اور اس خیال میں ہوتے کہ ان سے کلام بھی سنا جا سکے گا۔ لیکن علامہ نے شاذ ہی کلام سنایا۔ عہدِ شباب میں مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور ترمیم سے کلام سناتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ مشاعروں سے جی اچاٹ ہو گیا اور بے حد اصرار کے باوجود ایسی محفلوں میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔ کسی زمانے میں موسیقی میں دلچسپی لیتے تھے۔ موسیقی کی چند ایک محفلوں سے بھی لذت اندوز ہوئے۔ لیکن زندگی کے آخری آٹھ دس سالوں میں یہ دلچسپی بھی مفقود ہو گئی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ۱۹۳۴ء کے آغاز میں ان کا گلا بیٹھ گیا اور یہ صورتِ آخری دم تک جاری رہی۔ لیکن گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ ۱۹۳۷ء کے آخری پانچ مہینوں میں راقم الحروف کو ان کی خدمت میں پانچ مرتبہ حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ چار ملاقاتوں میں ان کی گفتگو خوب رہی۔ پانچویں ملاقات دسمبر کے وسط میں ہوئی۔ اس دن وہ باہر چارپائی پر دراز تھے۔ طبیعتِ علیل تھی اس لیے وہ زیادہ گفتگو نہ کر سکے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ سخت علالت کے زمانے میں بھی اور زندگی کے آخری چند دنوں میں بھی وہ اپنے نیاز مندوں سے گفتگو کرتے رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ملاقاتوں میں ایسے وقفے بھی آتے جب طبیعتِ نڈھال ہونے کے سبب سے وہ خاموش ہو جاتے اور سو بھی جاتے۔ لیکن جونہی نیند کھلتی، پھر ترو تازہ

اور شگفتہ ہو جاتے تھے۔ ممتاز حسن مرحوم کو علامہ کے ملازم علی بخش نے بتایا کہ پلاؤ، گھی میں پکی ہوئی ماش کی دال، قیمہ بھرا کریلا اور خشکہ چاول ان کے پسندیدہ کھانے تھے۔ اور سری پائے اور گوشت کے ساتھ پکے ہوئے ٹینڈے انہیں ناپسند تھے۔ اور رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے۔ سالک نے قدرے مختلف بیان دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”زندگی کے آخری سالوں میں اقبال کی خوراک بہت برائے نام رہ گئی تھی۔ لیکن اس سے قبل بھی کچھ یا باقر خانی حلوائے کے ساتھ کھا کر شامیری چائے پی لیا کرتے تھے۔ اور گرمی کے موسم میں چائے کی جگہ دہی کی لسٹی نوش فرماتے تھے۔ دوپہر کو سبزی گوشت اور ایک دو چپاتیاں۔ تیسرے پھر کچھ نہیں۔ رات کو پھر دہی سالن اور چپاتیاں۔ پلاؤ اور کباب بہت پسند تھے۔ لیکن کبھی کبھی کھاتے تھے اور دھا کرتے تھے کہ یہ (Pan-Islamic Dishes) ہیں۔ چین سے مراکش تک ہمیں چنے جاؤ، پلاؤ اور کباب ہر جگہ ملیں گے۔ دہی بھی بہت پسند تھا۔ دنیا دودھ ڈال کر اکثر کھا لیتے تھے۔ کبھی کبھی تیسرے پھر ایک چھوٹا سا چوزہ مسلم پکوا لیتے اور ایک چپاتی کے ساتھ دو تین گوشت کے ٹکڑے کھا کر دسترخوان بڑھوا دیتے۔ کھانا لیانے دعام انداز بہ تھا کہ علی بخش ایک سینی میں سالن کی ایک رکابی اور دو تین ہلکی سی چپاتیاں رکھ کر لے آیا۔ اقبال بستر پر سیدھے ہو بیٹھے۔ علی بخش نے بستر ہی پر ایک رومال بچھا کر سینی راند دی۔ علامہ کے ہاتھ دھوئے ہوئے دوستوں دو صلا دی اور کھانا شروع کیا۔ علی بخش پانی لے بیٹھا رہا۔ ایک ادھ چپاتی کھا کر علامہ نے فرمایا، آھاؤ۔ علی بخش نے سینی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ چلمچی آفتاب آئے در دیا اور علامہ کے ہاتھ دھلوا دیے۔“

رات کے وقت علامہ نمکین کشمیری چائے پیتے تھے۔ دن کے وقت بھی کبھی دورہ چلتا۔ جو احباب موجود ہوتے، وہ بھی اکثر اس میں شامل ہو جاتے۔ آخری سالوں میں رات کا کھانا ترک کر دیا لیکن چائے جاری رہی۔ علامہ کے دولت کدے پر غالباً کوئی رسمی ڈائننگ روم موجود نہیں تھا۔ اگر احباب کے ساتھ مل کر کھانا ہوتا تو ڈرائنگ روم میں قالین پر چادر بچھ جاتی اور سب فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ علامہ کو ام بے حد مرغوب تھے۔ اکثر کھاتے تھے۔ میاں امیرالدین کے والد میاں نظام الدین مرحوم ہر سال اپنے باغات میں آموں کی ایک محفل برپا کرتے۔ جس کی ”صدارت“ علامہ فرماتے اور آن کے گرد اہل علم کا ایک جمگھٹا ہوتا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا، تو والد مجھے بھی اس محفل میں لے گئے۔ باغ میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ چوبچوں میں مختلف اقسام کے آم تھے۔ ایک قسم کو ہاضمے کے آم کہا جاتا تھا جو آخر میں کھائے جاتے۔ میں نے حضرت علامہ کو اس محفل میں بہت شاداں و فرحاں پایا۔ اور دیکھا کہ وہ احباب کو پُر لطف گفتگو اور لطائف و ظرائف سے نواز رہے ہیں۔ آسوں سے پیار کا یہ عالم تھا کہ جب علالت کے دنوں حکیم نابینا نے آسوں کی مناسی کر دی، تو علامہ نے اصرار کے ساتھ ہر روز ایک آم کھانے کی اجازت لے لی۔ اور اس اجازت سے یہ ”ناجائز“ فائدہ اٹھایا کہ ہر روز کوئی سیر بھر کا وزنی ”بمبئی آم“ کھاتے۔ کڑوی دسیلی دواؤں سے آن کی طبیعت بہت جاتی تھی۔ چنانچہ اصرار کرتے کہ دوائیں خوش ذائقہ ہوں۔ چنانچہ حکیم نابینا اور آن کے بعد حکیم محمد حسن قرشی ان کے ذوق کی آسودگی کا سامان فراہم کرتے رہے۔ سالیک بتاتے ہیں کہ ”جب خمیرہ مرواریدی بہ ورقِ نقرہ

پیچیدہ ایک چھوٹی سی پرچ میں پیش کیا جاتا ، تو بہت خوش ہوتے اور کہتے ، ہاں - یہ ہے نا دوا - جس کو دیکھتے ہی مرض آدھا رہ جائے - مریض تو پہلے ہی تلخ کام ہوتا ہے - اس کو مزید تلخ کام کرنا کسی طرح مناسب نہیں -

علامہ نے یورپ میں اور وکالت کی زندگی میں رواج کے مطابق انگریزی لباس پہنا - کبھی تین "پیس" کا سوٹ ، کبھی واسکٹ کی جگہ جرسی ، کبھی نکٹائی اور کبھی کالی بو - بہر حال غالباً ہیٹ کبھی نہیں پہنا - بلکہ اپنی ایشیائی انفرادیت برقرار رکھنے کی خاطر ترکی ٹوپی یا کپاک کی ٹوپی پہنی - گویا لباس میں مشرق و مغرب کا امتزاج موجود تھا - ہائیدل برگ کی ایک تصویر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سوٹ کے ساتھ کبھی کبھی سلیم شاہی بھی پہن لیتے تھے - اس زمانے میں بہت سے شرفاء قمیص شلوار کے ساتھ چھوٹا کوٹ پہنتے تھے - علامہ بھی نجی تقریبات میں جاتے تو "سریرہ" ترکی یا کپاک ٹوپی ، سردیوں میں شاور پنک ، قمیص ، شلوار ، چھوٹا کوٹ ، پاؤں میں دیسی جوتا پہنتے - میں نے جب انہیں پہلک تقریبات میں دیکھا ، اسی لباس میں آیا - نیوڑا بہت اچکن کا بھی شوق تھا - جوانی میں بھی اور منسکی کے دوسرے مراحل میں بھی - گول میز کانفرنس کے دوران میں دو ایک بار لندن زیب تن فرمائی اور اس کے ساتھ بکڑی - اور بکڑی کا شوق ، یہاں تک رہا - لیکن دم دم - لہر آنے والی گرمیوں کے موسم میں صرف بنیان اور تہمد پہنتے اور سردیوں میں قمیص بھی پہن جاتی - اس کے اوپر پشمینے کا ایک دھسدا اوڑھ لیتے - لہر میں عنقوان بہاب سے مادم - مرک یہی لباس ہوتا تھا - اور علامہ کو اس بات کی حمداں مروا نہیں ہوتی تھی کہ کوئی بڑی شخصیت بنیان اور تہمد کو دل میں

کیا سوچے گی - چنانچہ قائد اعظم بھی ملنے کے لیے آئے - تو علامہ نے یہی لباس پہن رکھا تھا -

برقی پنکھا پسند نہیں تھا - سخت سے سخت گرمی میں بھی پسینے میں شرابور ہونے کے باوجود پنکھے کے سامنے نہیں بیٹھتے تھے - "ایک چھوٹی سی پنکھیا پاس بڑی رہتی تھی کبھی کبھی اٹھا کر ذرا ما جھل لیتے اور بس" - بہر حال ملاقاتیوں کے لیے ٹیبل فین منگوا لیتے - لیکن اس کا رخ اپنی طرف نہ ہونے دیتے - گھر میں نشست و برخاست کی کیفیت یہ تھی کہ جب تک علیل نہ ہونے ، عدالت سے آتے ، کپڑے بدلتے ، کھانا کھاتے اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتے اور مطالعہ فرماتے - جب شعر کہنا ہوتا تو بیاض ، پنسل اور قرآن مجید طلب کر لیتے - دوپہر کا قیلولہ کبھی کبھار کرتے وہ بھی مختصر - عدالت نے زیادہ دامن پکڑا تو پھر بستر کے ہو رہے - وہیں ملاقاتیوں سے باتیں کرتے - جب طبیعت ٹھیک ہوتی اور جی چاہتا تو ڈرائیونگ روم میں بھی بیٹھ جاتے - لیکن صوفہ کرسی پر ٹانگیں لٹکا کر نہیں ، بلکہ چوکڑی نما انداز میں بیٹھ جاتے - اس میں بے تکلفی کا پہلو بھی تھا اور آرام بھی ملتا تھا - ویسے بستر پر دراز ہوتے یا آرام کرسی پر بیٹھتے ، اکیلے ہوتے یا احباب کی صحبت میں ، حقمہ ضرور پاس ہوتا - کیونکہ اس کے بغیر آن کا گزارہ نہیں ہوتا تھا -

علامہ کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو جلد فوت ہو گئی - اور ایک فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے - جنہوں نے بیرسٹری بھی کی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا - چونکہ پہلی بیوی سے نباہ نہ ہو سکا ، اس لیے فریقین میں اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی - علامہ چاہتے تھے کہ آفتاب اقبال آن کے پاس رہیں - لیکن ننھیال نے ایسا نہ ہونے دیا اور

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باپ بیٹے میں بھی 'دوری ہوتی چلی گئی'۔ جس نے انقطاع کی صورت لے لی۔

۱۹۱۳ء میں جس خاتون سے علامہ نے شادی کی، ان کے بطن سے ۱۹۲۳ء میں جاوید اقبال پیدا ہوئے اور چند سال بعد منیرہ اقبال۔ ان دونوں بچوں سے علامہ کو بے حد لگاؤ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب والدہ جاوید کا انتقال ہوا اور علامہ خود بھی علیل تھے، تو انہوں نے مناسب سمجھا کہ وصیت کا عمل پورا کر دیا جائے۔ جاوید منزل تو وہ پہلے ہی جاوید اقبال کے نام کر چکے تھے اور خود کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ وصیت نامے میں حضرت علامہ نے لکھا کہ اگر میرے وفات کے وقت بچے نابالغ ہوں تو ان کے ولی یہ ہوں گے۔ بچوں کے ماسوں خواجہ عبدالغنی، برادر زادہ شیخ اعجاز احمد، چوہدری نور حسین اور منشی طاہر الدین، جو کئی سال علامہ کے ٹرک رہے تھے اور جن کی شرافت و دیانت پر انہیں اعتماد تھا۔ علامہ نے لکھا کہ ولی حضرات نثر رائے سے فیصلہ کیا کریں گے اور اگر کسی مسئلے پر اتفاق نہ ہو سکے، تو انجمن حمایت اسلام کے صدر کی رائے آخری اور قطعی سمجھی جائے گی۔ بہر حال حوض جاوید اقبال بالغ ہوں گے اور وہ خود اپنی بہن کے ولی ہوں گے۔ علامہ نے اپنے لقب خانے کی یہ چیزیں جاوید اقبال کو بطور یادگار دے دیں۔ اپنی تصانیف کے مطبوعہ نسخے اور ان کے دستخط مشنوی مولانا روم، فارسی انگریزی، مرتبہ ڈاکٹر حسین، مشنوی عبدالقادر بیدل قلمی، مشنوی مراد معنوی (مولانا روم، مطبوعہ حیات آباد) اپنے بڑھنے کا قرآن شریف اور دوسرے مسودات اور تصانیف۔ یہ سب وصیت کی رقم باقی تمام لقب اسلام آباد، لاہور کی لائبریری کے سرورڈر دی جائیں۔ پھرنے کے لبروں کے بارے میں لکھا، کہ انہیں غریب

میں بانٹ دیا جائے۔ وصیت نامے کے ضمیمے میں یہ عبارت درج تھی :
 ”اگر نابالغاں کے فائدے کی خاطر یا جائداد کے انتظام یا کسی اور جائداد
 کی خرید وغیرہ کے لیے اولیاء کو روپے کی ضرورت ہو، تو وہ کثرت رائے
 سے بینک سے روپیہ نکالنے کے متعلق فیصلہ کریں۔ دیگر میرے مذہبی
 اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو
 ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں۔ عملی اعتبار سے
 حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مقلد ہوں۔ بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں
 میرے ورثاء کا اور اولیاء مقرر کردہ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا پورا
 لحاظ کریں اور رشتے ناطے میں شرافت اور دین داری کو علم و دولت
 اور ظاہری وجاہت پر مقدم سمجھیں۔“

وصیت نامہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو لکھا اور چار دن بعد ایک اور تحریر
 تیار کی، جس میں خاص طور پر جاوید اقبال سے ان الفاظ میں خطاب کیا :
 ”جاوید کو میری عام وصیت یہی ہے کہ وہ دنیا میں شرافت اور
 خاموشی کے ساتھ اپنی عمر بسر کرے۔ اپنے رشتے داروں کے ساتھ
 ہمیشہ خوشگوار تعلقات رکھے۔ میرے بڑے بھائی کی اولاد سب
 آس سے بڑی ہے، ان کا احترام کرے۔ اور اگر ان کی طرف سے کبھی
 سختی بھی ہو تو برداشت کرے۔ دیگر رشتہ داروں کو اگر اس
 سے مدد کی ضرورت ہو اور آس میں ان کی مدد کی توفیق ہو تو
 اس سے کبھی دریغ نہ کرے۔ جو لوگ میرے احباب ہیں ان
 کا ہمیشہ احترام ملحوظ رکھے اور ان سے اپنے معاملات میں
 مشورہ لیا کرے۔“

”باقی دینی معاملے میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں
 اپنے عقائد میں، بعض جزوی مسائل کے سوا، جو ارکان دین میں

سے نہیں ہیں ، سلف صالحین کا پیرو ہوں - اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے - جاوید کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اسی راہ پر گامزن رہے اور اس بد قسمت ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی نے جو دینی عقائد کے نئے فرقے مختص کر لئے ہیں ، ان سے احتراز کرے -

”بعض فرقوں کی طرف لوگ محض اس واسطے مائل ہوتے ہیں کہ ان فرقوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے دنیوی فائدہ ہے - میرے خیال میں بڑا بد بخت ہے وہ انسان ، جو صحیح دینی عقائد کو مادی منافع کی خاطر قربان کر دے - غرض یہ ہے ، کہ طریقہ حضرات اہل سنت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن رہنا چاہیے - اور آئمہ اہل بیت کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہیے -

حوالے

اس باب میں دیدہ و دانستہ حوالے رسمی انداز میں نہیں دئے گئے ، کیونکہ آن کی فہرست زیادہ طویل ہونے کا اندیشہ تھا - بہر حال مجموعی طور پر معلومات کے مآخذ یہ تھے : ”ذکر اقبال“ (صفحات ۲۲۷ - ۲۴۳) - روزِ در فقیر - جلد دوم - صفحات ۵۵ - ۵۹) - ”اوراقِ کم گشتہ“ میں ممتاز حسین اور عبداللہ قریشی کی تخریریں صفحات بالترتیب ۳۰۵ - ۳۱۰ - ۳۶۷ - ۳۶۸) اور ذاتی مشاہدات - نیز ڈاکٹر جاوید کوٹ سے ایک ملاقات -

•

کتابیات

۱۔ علامہ اقبال کی تصانیف :

۱۔ عام الاقتصاد ۱۹۰۳ء :

۲۔ اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء

۳۔ رموزِ بے خودی ۱۹۱۸ء

۴۔ پیامِ مشرق ۱۹۲۳ء

۵۔ بانگِ درا ستمبر ۱۹۲۳ء

۶۔ زبورِ اعجم جون ۱۹۲۰ء

۷۔ جاوید نامہ ۱۹۳۲ء

۸۔ بالِ جبریل جنوری ۱۹۳۵ء

۹۔ مسافر ۱۹۳۶ء

۱۰۔ بس چہ باید کرد ان اقوامِ مشرق ۱۹۳۶ء

۱۱۔ ضربِ دیم جولائی ۱۹۳۶ء

۱۲۔ ارمغانِ حجاز نومبر ۱۹۳۸ء

Reconstruction of Religious Thought in Islam : - ۱۳
Second Edition : Lahore, 1951.

Abul's Letters to Jinnah - Lahore, 1943. - ۱۴

(ب)۔ اخباری فائل :

۱۵۔ روزنامہ ”انقلاب“ کے فائل - ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک

(ج)۔ انگریزی زبان کی کتب :

16. Abdul Hamid
Lahore 1971.

Muslim Separatism in India,

17. Abdullah Anwar Beg : The Poet of the East, Lahore, 1939.
18. Abdul Wahid, Syed : Thoughts and Reflections of Iqbal, Lahore 1973, Second Edition.
19. Abdul Wahid, Syed : Glimpses of Iqbal. Karachi 1974.
20. Arastu, Akbar Ali : Iqbal, His Poetry and Message, Lahore, 1948.
21. Akbar Muhammad : The Punjab Under the Mughals, Lahore 1948.
22. Dar, Bashir Ahmad : Letters and Writings of Iqbal, Karachi 1967.
23. Hafeez Ma'lik : Iqbal, Poet-Philosopher of Pakistan, New York 1971.
24. Latif, Syed Muhammad : Lahore, its History, architectural remains and antiquities, Lahore 1893.
25. Pirzada, Sharifuddin : Evolution of Pakistan, Karachi 1963.
26. Rahman, S. A. : Iqbal and Socialism, Karachi 1974.
27. Tariq, A. R. : Speeches and Statements of Iqbal, Lahore, 1973.
28. Zulfiqar Ali Khan : A Voice from the East, Second Edition 1966.

(د) - اردو کتب :

- ۲۹ - احمد شجاع ، حکیم - خوں بہا - لاہور ۱۹۴۳
- ۳۰ - اعجاز الحق قدوسی - اقبال کے محبوب صوفیہ - لاہور
۱۹۷۷ء
- ۳۱ - الطاف حسین حالی - حیات جاوید - (لاہور ایڈیشن) -
۱۹۵۷ء
- ۳۲ - انٹر کالجیٹ مسلم پرائیڈ - مقالاتِ یومِ اقبال -
لاہور ۱۹۳۸ء

۳۳ - بشیر احمد ڈار - انوارِ اقبال - کراچی ۱۹۶۷ء
۳۴ - حنیف شاہد - اقبال اور انجمنِ حمایتِ اسلام - لاہور
۱۹۷۶ء

۳۵ - حسین احمد مدنی - متحدہ قومیت اور اسلام - لاہور
۱۹۷۵ء

۳۶ - خالد نظیر صوفی - اقبال ، درونِ خانہ - لاہور ۱۹۷۱ء

۳۷ - خلیفہ عبدالحکیم - فکرِ اقبال - لاہور سالِ اشاعت
درج نہیں

۳۸ - رحیم بخش شاہین - اوراقِ تم گشتہ - لاہور ۱۹۷۵ء

۳۹ - رفیع الدین ہاشمی - خطوطِ اقبال - لاہور ۱۹۷۶ء

۴۰ - رفیق افضل - گفتارِ اقبال - لاہور ۱۹۷۶ء

۴۱ - نذیر نیازی - مکتوباتِ اقبال - کراچی ۱۹۷۵ء

۴۲ - نذیر نیازی - اقبال کے حضور - اجندہ اول - کراچی ۱۹۷۱ء

۴۳ - نذیر نیازی - اقبال کا مطالعہ - لاہور ۱۹۷۰ء

۴۴ - نور احمد ، سید - مارشل لاء سے مارشل لاء تک -
لاہور ۱۹۷۵ء

۴۵ - وحید قریشی - کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ - لاہور
۱۹۷۵ء

۴۶ - طاہر فاروقی ، نند - سیرتِ اقبال - لاہور ۱۹۷۹ء

۴۷ - عابد علی عابد - شعرِ اقبال - لاہور ۱۹۷۵ء

۴۸ - عاشق حسین بنالوی - اقبال اور تحریکِ پاکستان -
لاہور ۱۹۷۶ء

- ۴۹ - عاشق حسین بٹالوی - اقبال کے آخری دو سال - کراچی
۱۹۶۱ء
- ۵۰ - عبدالسلام خورشید - صحافت ، پاکستان و ہند میں -
پہلا ایڈیشن - لاہور ۱۹۶۳ء
- ۵۱ - عبدالسلام ندوی - اقبال کامل - طبع دوم - اعظم گڑھ
۱۹۶۳ء
- ۵۲ - عبداللہ قریشی ، مجدد - مکاتیب اقبال بنام گرامی -
کراچی ۱۹۶۹ء
- ۵۳ - عبداللہ ملک - پنجاب کی سیاسی تحریکیں - لاہور ۱۹۷۱ء
- ۵۴ - عبدالمجید سالک - ذکر اقبال - لاہور ۱۹۵۵ء
- ۵۵ - عبدالمجید سالک - سرگذشت - دوسرا ایڈیشن - لاہور
۱۹۶۶ء
- ۵۶ - عبدالواحد معینی ، سید - مقالات اقبال - لاہور ۱۹۶۳ء
- ۵۷ - عطاء اللہ شیخ - اقبال نامہ - حصہ اول - لاہور تاریخ
درج نہیں
- ۵۸ - عطاء اللہ شیخ - اقبال نامہ - حصہ دوم - لاہور ۱۹۵۱ء
- ۵۹ - غلام عباس چوہدری - کشمکش - لاہور ۱۹۵۰ء
- ۶۰ - فقیر سید وحید الدین - روزگار فقیر - جلد اول - چھٹا
ایڈیشن - کراچی ۱۹۶۶ء
- ۶۱ - فقیر سید وحید الدین - روزگار فقیر - جلد دوم - دوسرا
ایڈیشن - کراچی ۱۹۶۵ء
- ۶۲ - کلیم اختر - شیر کشمیر - لاہور ۱۹۶۳ء
- ۶۳ - گوہر نوشاہی - اقبال کا مطالعہ - لاہور ۱۹۷۱ء

۶۴ - غلام دستگیر ، رشید - آثارِ اقبال - حیدرآباد دکن -
۱۹۴۴ء

۶۵ - محمد احمد خاں - اقبال کا سیاسی کارنامہ - کراچی ۱۹۵۲ء

۶۶ - محمود نظامی - ملفوظاتِ اقبال - طبعِ ثانی - لاہور
۱۹۴۹ء

۶۷ - چراغِ حسن حسرت - اقبال نامہ - لاہور ۱۹۴۹ء

(۵) - رسائل :

۶۸ - صحیفہ - اقبال نمبر - حصہ اول - شمارہ ۶۵ - اکتوبر
۱۹۷۳ء

۶۹ - صحیفہ - اقبال نمبر - حصہ دوم - شمارہ ۶۶ - جنوری
۱۹۷۵ء

۷۰ - "المعارف" - جلد ۱۰ - شمارہ ۵ - مئی ۱۹۷۷ء

۷۱ - اقبال ریویو - اپریل ۱۹۷۶ء

نوٹ : کتابیات کی یہ فہرست مکمل نہیں - ان ماخذ کے علاوہ بہت سے
اور ماخذ کی بھی چھان بین کی - لیکن ان کی چٹیں تیار کرنے میں
کوٹاہی ہوئی -

اشاریہ

آ

آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس

۸۵، ۸۳

آل پارٹیز کانفرنس ۲۳۸، ۲۳۱،

۲۳۳، ۲۳۳

آل پارٹیز مسلم کانفرنس ۲۳۳،

۲۳۵، ۲۳۷، ۲۶۹، ۲۹۸،

۳۰۰، ۳۰۸، ۳۱۲، ۳۱۶،

آل انڈیا مسلم کانفرنس ۲۹۸،

۳۳۲، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۵۱،

۳۵۵، ۳۶۶، ۳۶۹، ۳۷۳،

۳۷۷، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۹۱،

۳۹۳ - ۳۹۵، ۳۹۷ - ۴۰۰،

۴۰۳، ۴۰۷، ۴۰۹، ۴۱۳،

۵۱۳، ۵۲۲

آل انڈیا مسلم لیگ ۸۷، ۸۷،

۹۳، ۱۱۹، ۱۳۵، ۱۳۶،

۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۳،

۲۹۲، ۳۰۲، ۳۰۹، ۳۱۶،

۳۲۰، ۳۲۷، ۳۳۲، ۳۸۲،

۳۹۳، ۴۰۳، ۴۰۹، ۴۱۳،

۵۰۷، ۵۰۹ - ۵۱۱، ۵۱۳،

۵۱۵ - ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۳۳،

۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۸، ۵۴۱،

۵۴۳

آبنائے درہ دانیال ۱۳۸

آدم علیہ السلام ۲۰

آدوٹن ۳

آذربائیجان ۲۹

آرمینیا ۱۳۸

آرنلڈ، پروفیسر ۲۹، ۳۰، ۳۵،

۳۱، ۳۳، ۵۰، ۵۸ - ۶۰،

۶۳، ۶۷

آسام ۵۲۱

آسٹریا ۶۸، ۷۰، ۱۰۹، ۱۱۰،

آغا خان، سر ۸۷، ۲۳۳ - ۲۳۵،

۲۹۷، ۲۹۸، ۳۵۶، ۳۶۰،

۳۶۵، ۳۶۸

آفتاب اقبال ۷۱، ۵۶۶

آفریدی، فضل رسول خان ۳۳۱

آکسفورڈ ۳۳۳، ۳۶۰

آکسفورڈ یونیورسٹی ۷۵

آگرہ ۳۰۷، ۳۳۱، ۴۱۲

آل انڈیا خلافت کمیٹی ۱۳۲

۱۳۵، ۱۳۶، ۲۳۱، ۲۳۳،

۲۴۴، ۲۵۵، ۲۹۳، ۴۰۳

آل انڈیا کشمیر کمیٹی ۳۸۰ -

۳۸۶، ۳۸۷، ۴۲۹، ۴۳۰،

۴۳۳، ۴۶۶

۳۷۷ - ۳۸۰ ، ۳۸۳ ، ۳۹۳ -
 ۳۹۵ ، ۳۵۵ ، ۳۵۶ ، ۳۵۸ ،
 ۳۷۰ ، ۵۱۸ ، ۵۲۰ ، ۵۲۱ ،
 ۵۳۳ ، ۵۳۹
 آلسیمس لورین ۶۹
 آئینگر ، سری نوامس ۲۲۳ ، ۲۳۷

آل انڈیا نیشنل کانگریس ۸۶ ، ۸۹ ،
 ۱۱۹ ، ۱۲۰ ، ۱۳۵ ، ۱۳۶ ،
 ۲۲۳ ، ۲۲۴ ، ۲۳۱ ، ۲۳۷ ،
 ۲۳۸ ، ۲۳۳ ، ۲۳۴ ، ۲۳۷ ،
 ۲۹۲ - ۲۹۵ ، ۲۹۷ ، ۳۲۷ ،
 ۳۳۷ ، ۳۵۶ ، ۳۶۶ ، ۳۶۷

الف

اٹلی ۵۳ ، ۶۸ - ۷۰ ، ۱۱۰ ،
 ۱۳۸ ، ۳۱۰ ، ۳۱۹ ، ۳۲۰ ،
 ۳۲۳ ، ۳۳۵ ، ۳۷۹
 آجٹل سنگھ ، سردار ۲۱۶ ، ۵۰۶
 اجمل خان ، حکیم ۱۳۵
 احرار دیکھیے مجلس احرار اسلام
 احسان (اخبار) ۳۷۱ ، ۳۷۳ ،
 ۳۷۵
 احمد آباد ۲۱۵
 احمد دین ، مولوی ۸۵ ، ۱۸۱
 احمد شاہ بابا ۳۳۷
 احمد شاہ خان ۳۳۳
 احمد شجاع ، حکیم ۳۵ ، ۱۸۶ ،
 ۳۸۷
 احمدیت ۳۹۶
 اخبار عام ۳۳
 ادارہ معارف اسلامیہ ۳۹۰ ، ۳۹۱
 ادرنہ ۱۱۳ ، ۱۱۳ ، ۱۳۸
 اردو بازار ، لاہور ۷۵
 اردو سوسائٹی ۲۶۳
 ارسٹوٹیلین سوسائٹی ، لندن ۲۶۲
 ارسطو ۳۳

ابدالی ، احمد شاہ ۳۳۱ ، ۳۳۶
 ابراہیم میر سیالکوٹی دیکھیے
 سیالکوٹی ، ابراہیم میر
 ابن بدرون ۷۲
 ابن جوزی ۳۹۲
 ابن خلدون ۲۶۰
 ابن سعود ، سلطان ۱۵۳ - ۱۵۵ ،
 ۱۸۸ ، ۱۸۹ ، ۱۹۱ ، ۲۵۹ ،
 ۲۶۱
 ابوالکلام آزاد ۱۱۲ ، ۱۱۹ ،
 ۱۳۳ ، ۱۷۶ - ۱۸۰ ، ۲۳۳
 ابوجہل ۳۶۰
 ابوحنیفہ ، امام ۵۶۸
 ابو عبد اللہ غلام حسین دیکھیے
 غلام حسین ، ابو عبد اللہ
 ابھیانکر ، پروفیسر جی - آر ۳۲۸
 اہرانڈیا مسلم کانفرنس ۳۰۲ ،
 ۳۰۹ ، ۳۲۷ ، ۳۳۰ - ۳۳۲ ،
 ۵۳۱
 اہرسٹا ، پروفیسر ۳۷۰
 اتاترک ، مصطفیٰ کمال ۱۳۸ ،
 ۲۵۹ ، ۳۸۷ ، ۳۵۳ ، ۳۸۶

- اسطو ، اکبر علی ۳۸۷ ، ۵۶۱
 ارون ، لارڈ ۲۹۲ ، ۳۳۷
 ارشد گورگانی ۳۶
 ارمغانِ حجاز ۳۷۵ ، ۵۲۷
 ارمنستان ۲۹۰
 اریٹریا ۶۹
 ازبکستان ۲۹۰
 استنبول ۱۱۴
 اسرارِ خودی ۷ ، ۲۴ ، ۱۲۴ -
 ، ۱۲۶ ، ۱۲۸ ، ۱۳۲ ، ۱۳۴ ،
 ، ۱۶۲ ، ۳۶۱ ، ۳۱۶ ، ۳۱۹ ،
 ۳۹۱ ، ۳۹۰
 اسرائیل ۳۸۴
 اسلام ۶۰ ، ۶۱ ، ۷۱ ، ۸۹ ،
 ، ۹۰ ، ۹۳ ، ۹۷ - ۱۰۱ ،
 ، ۱۰۴ ، ۱۰۵ ، ۱۰۷ ، ۱۰۸ ،
 ، ۱۱۰ ، ۱۱۵ ، ۱۱۶ ، ۱۲۷ ،
 ، ۱۵۲ ، ۱۵۴ ، ۱۶۳ ، ۱۶۶ ،
 ، ۱۶۷ ، ۱۷۱ ، ۱۹۳ ، ۲۰۵ ،
 ، ۲۰۶ ، ۲۰۹ ، ۲۵۱ - ۲۵۳ ،
 ، ۲۵۵ - ۲۵۸ ، ۲۶۰ ، ۲۶۱ ،
 ، ۲۶۴ ، ۲۶۵ ، ۲۶۹ ، ۲۷۰ ،
 ، ۲۷۵ ، ۲۸۰ ، ۲۷۷ ، ۲۸۵ ،
 ، ۳۰۳ ، ۳۱۰ ، ۳۱۱ ، ۳۱۳ ،
 ، ۳۱۹ ، ۳۲۰ ، ۳۲۶ - ۳۲۸ ،
 ، ۳۵۰ ، ۳۵۲ ، ۳۵۷ ،
 ، ۳۷۱ ، ۳۷۳ ، ۳۷۵ ، ۳۷۹ -
 ، ۳۸۲ ، ۳۹۸ ، ۴۰۹ ، ۴۱۰ ،
 ، ۴۱۹ - ۴۲۲ ، ۴۲۴ ، ۴۲۶ ،
 ، ۴۵۱ ، ۴۵۴ ، ۴۶۷ ، ۴۶۸ ،
- ۳۷۱ ، ۳۷۷ ، ۳۷۷ ، ۳۸۱ ، ۳۸۷ ،
 - ۳۹۱ ، ۳۹۲ ، ۳۹۳ ، ۳۹۶ ،
 ۳۹۸ ، ۵۰۱ ، ۵۲۶
 اسلام اور ڈیوائن کامیڈی ۳۱۶
 اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۳۸۷ -
 ۳۸۹ ، ۳۹۱
 اسلامیہ کالج ، پشاور ۳۴۴
 اسلامیہ کالج ، لاہور ۳۱ ، ۳۴ ،
 ، ۳۵ ، ۱۲۳ ، ۱۳۳ ، ۱۶۹ ،
 ، ۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۵۰۸ ، ۵۲۶ ،
 ۵۵۵
 اسماعیل خان ، نواب ۲۲۴ ، ۲۹۸
 اشبیلیہ ۳۱۹
 اشتراکیت ۱۶۶ ، ۱۷۰ ، ۳۷۷
 اصلاح (اخبار) ۲۸۲
 اطالوی صومالی لینڈ ۳۲۰
 اعجاز احمد ، شیخ ۶ ، ۱۸۱ ،
 ۵۶۷
 اعظم ، خواجہ ۴
 اعلانِ بالفور ۲۸۲ ، ۳۵۷ ،
 ۳۳۵
 افغان بے ۳۵۷
 افغانستان ۱۶۲ ، ۱۶۵ ، ۱۶۶ ،
 - ۲۷۸ ، ۲۸۲ ، ۲۸۸ ، ۳۵۲ ،
 ۳۳۶ ، ۳۳۹ - ۳۴۷ ، ۳۷۹
 افغانی ، سید جمال الدین ۳۹ ، ۷۱ ،
 ، ۲۵۶ ، ۳۳۸ ، ۳۳۵ ، ۳۴۱ ،
 ۳۸۱
 افریقہ ۶۹ ، ۲۵۳ ، ۲۵۸ ، ۳۸۰ ،
 ۳۸۷

- افریقہ ، شاہی ۳۸۰
افضل حق ، چوہدری ۲۱۳ ،
۲۷۳ ، ۲۷۵ ، ۵۱۶
افلاطون ۳۳
اقبال اکیڈمی ۲۰۳
اقبال درون خانہ (کتاب) ۱۳۹
اقبال کا مطالعہ (کتاب) ۳۵۱
اقبال کی شاعری (کتاب) ۱۸۱
اقبال لٹریچر ایسوسی ایشن ۳۶۰ ،
۵۱۳
اقبال منزل ۱۳ ، ۲۵
اکبر الہ آبادی ۷۸ ، ۱۱۰ ،
۱۲۶ ، ۱۳۳ ، ۱۳۰ ، ۱۸۶ ،
۱۸۷ ، ۳۶۸ ، ۳۹۲
اکبر حیدری ، سر ۱۸۲ ، ۲۶۶ ،
۵۲۷
اکبر ، شیخ ۵ ، ۶ ، ۸
الحمرا ۳۱۸
الہ آباد ۲۳۸ ، ۳۰۲ ، ۳۲۳ ،
۳۳۱ ، ۳۹۳ ، ۳۹۷ ، ۳۹۸
الفضل (رسالہ) ۱۳۱
الاسلام (کتاب) ۱۵۴
الانسان الكامل فی معرفت الاواخر و
الاولئ (کتاب) ۳۲
البانیہ ۳۵۷
الجهاد فی الاسلام (کتاب) ۳۹۹
الجبلی ، عبدالکریم ۳۱ ، ۳۲ ،
۵۹
المراغی ، علامہ مصطفیٰ ۵۰۰ ،
۵۰۱
- الور ۷۷
البلاغ (رسالہ) ۱۷۷
الہلال (رسالہ) ۱۱۲ ، ۱۱۹ ،
۱۷۷
الہلال پریس ۱۷۸
الہی بخش ، ڈاکٹر ۵۳۶
الیاس آفندی ۱۶۵
امام بی بی ۸ ، ۹
امام حسین ۵
امان اللہ خان ، غازی ۲۷۸ - ۲۸۰ ،
۳۳۹ ، ۳۴۱
اسبید کر ، ڈاکٹر ۳۱۲
اسپیریل قانون ساز مجلس ۱۳۸
امجد علی ، سید ۳۱۰ ، ۳۱۱ ،
۳۱۹ ، ۳۶۱
امداد امام ، نواب ۳۵۴
امر القیص ۱۲۸ ، ۱۲۹
امراؤ سنگھ ، مردار ۸۲ ، ۳۷۰ ،
۳۱۰ ، ۵۶۱
امرتسر ۸۳ ، ۱۳۸ ، ۱۴۱ ،
۱۴۵ ، ۱۴۶
امریکہ ۱۴۳ ، ۱۵۴ ، ۲۱۵ ،
۳۵۷ ، ۳۷۸ ، ۳۷۰ ، ۳۸۳
امیر الدین ، میان ۸۵ ، ۵۵۴ ،
۵۶۴
امیر علی ، سید ۳۲ ، ۶۰ ، ۶۱
امین الحسینی ، مفتی اعظم ۳۷۵
امین الدین ، حکیم ۳۵
اناطولیہ ۱۴۸
انارکلی ۲۳ ، ۲۷ ، ۷۶ ، ۱۳۹ ،
۵۵۹

انصاری ، ڈاکٹر مختار احمد ۱۱۲ ،
 ۲۲۴ ، ۲۲۲ ، ۲۲۸ ، ۳۳۹ ،
 ۳۶۶ ، ۳۶۷ ، ۳۰۳ ،
 انقلاب (اخبار) ۲۴۳ ، ۲۸۹ ،
 ۲۹۲ ، ۲۹۸ ، ۲۹۹ ، ۳۰۱ ،
 ۳۰۲ ، ۳۲۵ ، ۳۲۸ ، ۳۲۹ ،
 ۳۴۲ ، ۳۴۵ ، ۳۵۵ ،
 انقلاب (رسالہ) ۱۶۹ ،
 انگلستان ۳ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۶۰ ،
 ۱۰۱ ، ۱۳۷ ، ۲۱۳ ، ۲۳۱ ،
 ۲۳۳ ، ۲۹۳ ، ۳۵۶ ، ۳۶۲ ،
 ۳۰۷ ، ۳۱۰ ، ۳۷۰ ،
 انوار اقبال (کتاب) ۲۰۳ ،
 انیس ۳۶ ،
 اودھ ۵۱۵ ،
 اوڈ واٹر ، مائیکل ۱۲۱ ، ۱۳۳ ،
 اورنگزیب ۳۲۵ ،
 اورینٹل کالج ، لاہور ۲۷ ، ۲۸ ،
 ۳۱ ، ۱۳۳ ،
 اوشر ، جی - بی ۲۸ ،
 ایدورڈز کالج ، شاہور ۱۶۹ ،
 ایران ۶۶ ، ۱۰۳ ، ۱۰۷ ، ۱۰۹ ،
 ۱۲۶ ، ۲۱۲ ، ۲۹۰ ، ۳۶۳ ،
 ۲۷۹ ، ۳۴۸ ، ۳۵۶ ، ۳۶۹ ،
 ۳۲۰ ، ۳۶۸ ، ۳۷۹ ،
 ایشیا ۸۹ ، ۱۰۶ ، ۱۵۲ ، ۱۵۳ ،
 ۱۸۶ ، ۲۵۳ ، ۲۶۳ ، ۲۸۰ ،
 ۳۱۱ ، ۳۱۸ - ۳۲۰ ، ۳۷۸ ،
 ۳۳۶ ، ۳۳۰ ، ۳۳۱ ، ۳۳۳ ،
 ۳۳۶ ، ۳۷۳ ، ۳۷۸ ، ۳۷۹ ،
 ۳۸۵ ، ۳۸۷ ، ۵۲۵ ،

انبالہ ڈویژن ۳۱۴ ، ۳۱۷ ، ۳۶۸ ،
 انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ ۵۲۵ ،
 انٹر نیشنل مسلم ایسوسی ایشن
 ۴۶۱ ،
 انجمن اتحاد ۳۵ ،
 انجمن اتحاد و ترقی ۱۰۴ ، ۱۰۷ ،
 ۱۰۹ ، ۱۱۰ ، ۳۵۱ ،
 انجمن ادبی کابل ۳۳۳ ، ۳۳۵ ،
 انجمن اسلام ۶۰ ، ۳۰۷ ،
 انجمن اسلامیہ پنجاب ۱۵۶ ،
 انجمن اسلامیہ میان میر ۲۰۳ ،
 انجمن ترقی اردو ۲۶۳ ،
 انجمن حمایت اسلام ۳۲ ، ۳۷ ،
 ۳۹ ، ۸۵ ، ۱۲۳ ، ۱۳۳ ،
 ۱۹۱ ، ۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۳۹۰ ،
 ۳۹۱ ، ۳۶۰ ، ۳۵۹ ، ۵۶۷ ،
 انجمن خادم المسلمین ۳۸۶ ،
 انجمن خواتین اسلام ۲۶۳ ،
 انجمن کشمیری مسلمانان پنجاب
 ۸۳ ،
 انجمن کشمیری مسلمانان لاہور ۸۴ ،
 انجمن کشمیری مسلمانان ہند ۳۶ ،
 انجمن ہلال احمر ۲۶۳ ،
 انجیل ۳۵ ، ۳۹۵ ،
 اندلس ۳۱۶ ، ۳۱۸ ،
 انڈیا سوسائٹی ۴۵۸ ،
 انڈین ڈیلی میل (اخبار) ۳۲۳ ،
 انسائیکلو پیڈیا اطالیانہ ۳۷۰ ،
 انشاء اللہ خان ، مولوی ۸۵ ،
 انصاری ایوب ۱۱۳ ،

ایشیائے کوچک ۱۴۲

۵۰۴ ، ۴۶۸

اینی بیسنٹ ۱۲۰ ، ۱۴۵

ایمرسن ، سر ہربرٹ ۴۵۹ ، ۴۶۷

ب

بحر الکابل ۶۹

بابا لولی حج — دیکھیے لولی حج ،

بحرہ ایجیٹن ۱۴۸

بابا

بحرہ روم ۵۴ ، ۷۲ ، ۳۵۳

بابا نصیرالدین — دیکھیے

۳۷۲

نصیرالدین ، بابا

بحرہ مردار ۳۵۶

بابر (بادشاہ) ۴۴۶ ، ۴۴۷

بخاری ، سید عطاء اللہ شاہ ۲۴۳

بایت ۱۶۵ ، ۴۲۱

۲۷۳

بادشاہی مسجد ، لاہور ۲۷۴

بدایوں ۳۰۷ ، ۴۸۹

۵۵۳ ، ۵۵۳ ، ۵۰۸ ، ۴۵۰

بدھ ازم ۵۳۷

بارہ مولا ۴۲۳

براؤن ، پروفیسر ۵۸ ، ۴۴۸

بازار حکیمان ، لاہور ۳۵ ، ۴۰۴

برائٹ ، جان ۴۱۱ ، ۴۱۲

بال جبریل ۴۷۷ ، ۴۷۸

برٹش میوزیم ۶۱

۴۸۷

برطانوی دارالعوام ۴۱۱

بالشویزم ۱۶۶ ، ۱۶۷ ، ۱۶۹

برطانوی خبر رساں ادارہ ۳۷۳

۱۷۱ ، ۱۷۲ ، ۳۴۶ ، ۳۴۷

برطانیہ ۶۰ ، ۶۱ ، ۶۸ ، ۶۹

۳۶۱ ، ۴۲۰ ، ۴۳۵

۱۰۴ ، ۱۰۹ ، ۱۴۲ ، ۱۴۳

بالشویک ۱۶۶

۱۴۶ - ۱۴۸ ، ۱۵۵ ، ۱۶۲

بانگِ درا ۱۳۴ ، ۱۸۰ ، ۱۸۲

۲۱۵ ، ۲۱۹ ، ۲۲۸ ، ۲۴۴

۱۸۳ ، ۴۴۳ ، ۴۷۷

۲۷۸ ، ۲۸۰ ، ۲۸۳ ، ۲۹۲

بائبل — دیکھیے انجیل

۲۹۷ ، ۳۲۳ ، ۳۲۸ ، ۳۲۹

بائرن ۵۸

۳۳۲ ، ۳۳۷ ، ۳۴۶ ، ۳۴۹

بٹالوی ، ڈاکٹر عاشق حسین ،

۳۵۱ ، ۳۶۶ ، ۳۷۴ ، ۳۷۵

۲۰۹ ، ۲۱۰ ، ۴۰۷ ، ۵۰۹

۳۷۷ ، ۳۸۲ ، ۳۸۸ ، ۳۹۶

۵۱۳ ، ۵۱۹

۴۱۵ ، ۴۲۱ ، ۴۳۴ ، ۴۳۵

بچہ ستہ ۲۷۹ ، ۲۸۰ ، ۴۴۱

۴۳۹ ، ۴۶۸ ، ۴۷۹ ، ۴۸۴

۴۴۲

۵۱۴

بحرہ احمر ۳۵۳

۲۳۵ ، ۳۰۰ ، ۳۰۸ ، ۳۲۳

۳۵۲ ، ۳۰۰ ، ۳۰۲ ، ۳۱۲

۳۳۲ ، ۳۹۳ ، ۵۱۵ ، ۵۱۷

بمبئی کرائیکل ۳۳۷ ، ۳۹۳

بمبئی کونسل ۳۰۱

بنارس ۳۳۱

بنگال ۸۶ ، ۸۸ ، ۱۲۰ ، ۲۲۳

۲۳۳ ، ۲۳۷ ، ۲۳۹ ، ۲۳۰

۲۳۳ ، ۲۹۶ ، ۳۰۱ ، ۳۰۳

۳۰۸ ، ۳۱۳ ، ۳۱۳ ، ۳۵۲

۳۹۳ ، ۳۹۵ ، ۳۰۰ ، ۳۰۱

۳۰۳ ، ۵۱۳ ، ۵۱۸ ، ۵۲۱

۵۳۱ ، ۵۳۰

بنگال پروجا پارٹی ۵۱۸

بنڈلور ۲۶۵

بوٹا سنگھ ، سردار ۵۰۶

بوڈا پست ۳۰۹

بوستان ۱۳

بو سینا ۱۰۹

بہار مشہدی ۳۳۳

بہایت ۳۶۸

بیدل ۳۳۷

بیک ، مس ۶۲

بیکن ۵۷ ، ۹۰

بیگم شاہ نواز ۵۲۰

بیگم شیخ عطا محمد ۱۵ ، ۱۶

بین الاقوامی سوشلسٹ ۵۰۵

۳۰۷

بہائی دروازہ ۳۳ ، ۳۵ ، ۳۹

بھٹناگر ، ڈاکٹر تمائی سروپ

۳۸۷

بغداد ۷۲ ، ۱۰۷

برکت علی اسلامیہ ہال ، لاہور

۲۸۲ ، ۲۹۳ ، ۳۰۰ ، ۵۰۹

برکت علی ، ملک ۲۳۳ ، ۳۳۰

۵۰۹ ، ۵۱۰ ، ۵۱۹ ، ۵۲۰

برکن ہیڈ ، لارڈ ۲۳۱ ، ۲۳۸

برگساں ۳۱۰ ، ۳۱۵ ، ۳۱۶

برلین ۳۰۹

بروس ، جے - ایف ۳۸۸ ، ۳۸۹

برہمن ازم ۵۳۷

بسارک ۶۹

بشیر الدین محمود احمد ، مرزا

۳۳۵ ، ۳۸۵ ، ۳۸۶ ، ۳۲۹

۳۶۶

بلال ۵۳

بلجیم ۶۹

بلغاریہ ۱۱۰ ، ۱۱۲ ، ۱۱۳

بلغرامی ، سید حسن ۶۱

بلغرامی ، عبدالقادر ۳۰۷

بلغرامی ، سید علی ۵۹ ، ۶۲

بلغرامی ، وزیر علی ۸ ، ۹

بلغرامی ، سید ہاشم ۱۳۰

بلوچستان ۲۳۵ ، ۲۹۰ ، ۲۹۶

۲۹۹ ، ۳۰۰ ، ۳۰۲ ، ۳۰۸

۳۱۳ ، ۳۱۶ ، ۳۲۷ ، ۳۳۰

۳۳۳ ، ۳۱۳ ، ۳۱۵ ، ۳۲۸

۵۳۲ ، ۵۳۱

ببوق ، ولایت علی ۳۰۷

بمبئی ۳۲ ، ۵۲ ، ۱۲۰ ، ۱۹۸

۲۲۳ ، ۲۲۳ ، ۲۳۸ ، ۲۳۹

۵۰۶ ، ۵۰۵ ، ۴۹۸ ، ۴۵۴
 بھوپالی ، مولوی برکت اللہ ۸۶

بھڑے ، جسٹس ۵۰۷
 بھوپال ، ۴۳۹ ، ۴۵۰ ، ۴۵۳

پ

۳۰۸ ، ۳۱۳ ، ۳۲۷ ، ۳۲۷

۳۳۰ ، ۳۳۱ ، ۳۳۳ ، ۳۴۱

۳۴۳ ، ۳۵۲ ، ۳۶۸ ، ۳۸۰

۳۸۰ ، ۳۹۳ ، ۳۹۵ ، ۳۹۶

۳۹۹ ، ۴۰۰ ، ۴۰۳ ، ۴۰۹

۴۳۵ ، ۴۵۹ ، ۴۶۰ ، ۴۶۷

۵۰۰ ، ۵۰۳ ، ۵۱۵ ، ۵۱۶

۵۲۱ - ۵۲۳ ، ۵۳۱ ، ۵۳۵

۵۳۹ ، ۵۴۲ ، ۵۵۴

دی پنجاب آبزرور (اخبار) ۴۴

پنجاب خلافت کمیٹی ۲۰۲ ، ۲۰۳

۲۷۳

پنجاب کونسل ۱۹۹ ، ۲۰۹

۲۱۰ ، ۲۱۸ ، ۳۰۱ ، ۳۹۵

۳۶۱ ، ۳۹۶

پنجاب لیجسلیٹو کونسل دیکھئے

پنجاب کونسل

پنجاب لیگ پارلیمانی بورڈ ۵۱۷

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن

۵۰۹ ، ۵۱۱ ، ۵۲۱ ، ۵۳۱

پنجاب ہائی کورٹ ۱۶۱ ، ۵۰۷

پنجاب یونیورسٹی ۲۷ ، ۱۳۳

۱۹۲ ، ۳۸۸

پنکھڑ ، مسٹر ۳۵۷

پنکھڑ ، مسز ۳۵۷

پرسانند ، بھائی ۳۲۸

پاکستان ۱۵۲ ، ۲۱۱ ، ۲۱۸

۲۳۹ ، ۲۹۱ ، ۳۰۲ ، ۳۰۷

۳۲۳ ، ۳۱۵ ، ۴۴۷ ، ۵۱۰

۵۳۳ ، ۵۳۵ ، ۵۴۱

پال ، محمد مسیح ۲۱

پال ، مولوی سراج دین ۱۲۶

پان اسلامک سوسائٹی ۶۰

پانی پت ۴۵۴

پاؤنیر (اخبار) ۳۲۴

پٹنہ ۴۵۰

پٹھان کوٹ ۴۹۹

پرتاپ (اخبار) ۲۹۱ ، ۳۲۵

پریشیا ۶۹

پریوی کونسل ۵۰۹ ، ۵۱۰

پشاور ۲۹۵ ، ۴۴۲

پلاسیوز ، آمین ۴۱۶

پنجاب ۲ ، ۹ ، ۱۰ ، ۲۱ ، ۳۶

۸۳ ، ۸۸ ، ۱۲۰ - ۱۲۲

۱۳۰ ، ۱۳۳ ، ۱۳۸ ، ۱۴۱

۱۵۲ ، ۱۶۲ ، ۱۶۳ ، ۱۶۵

۱۶۹ ، ۱۸۷ ، ۱۹۷ ، ۲۱۲

۲۱۳ ، ۲۱۵ ، ۲۱۶ ، ۲۱۸

۲۲۴ ، ۲۳۴ ، ۲۳۷ ، ۲۳۹

۲۴۴ ، ۲۷۰ ، ۲۷۲ ، ۲۷۷

۲۹۰ ، ۲۹۱ ، ۲۹۶ ، ۲۹۹

۳۰۰ ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ ، ۳۰۴

پیرون ۲۱۲	پورٹ سعید ۵۳ ، ۳۵۲ ، ۳۵۳
پیسہ اخبار ۳۳ ، ۳۴ ، ۸۵ ، ۸۶	پیامِ مشرق ۱۳۹ ، ۱۶۴ ، ۱۶۸
پیغامِ صلح (رسالہ) ۱۳۲	۱۲۰ ، ۱۸۳ ، ۱۸۳ ، ۱۸۶
پین اسلامزم ۶۰ ، ۳۳۳ ، ۳۳۸	۳۲۹ ، ۲۷۸
۳۱۳ ، ۳۳۵ ، ۳۳۶	پرس ۱۳۳ ، ۲۸۱ ، ۳۷۰
پہلواری ، شاہ سلیمان ۳۹۱	۳۱۰ ، ۳۱۱ ، ۳۱۵ ، ۳۳۲
	۳۵۱ ، ۳۵۳

ت

تحریکِ کشمیر (جماعت) ۳۶۶	تاریخِ کشمیر ۴
تحریکِ ہجرت ۳۳۹	تائیر ، محمد دین ۳۸۷
تذکرہ (کتاب) ۱۷۸ ، ۱۸۰	تائب ، غلام مصطفیٰ ۳۲۱
ترجمان القرآن (رسالہ) ۳۹۹	تبریز ۳
ترکمانستان ۲۹۰	تبسم ، صوفی غلام مصطفیٰ
ترکیہ ۱۰۳ ، ۱۰۷ ، ۱۱۰ -	۳۸۷ ، ۳۹۳
۱۱۲ ، ۱۱۳ ، ۱۱۹ ، ۱۳۴	تلبیسِ ابلیس (کتاب) ۳۹۲
۱۳۷ ، ۱۴۱ ، ۱۴۳ - ۱۴۶	تجاویزِ دہلی ۲۲۴ - ۲۲۶ ، ۲۳۱ -
۱۳۹ ، ۱۵۳ ، ۱۶۵ ، ۲۵۹	۲۳۳ ، ۲۳۷ ، ۲۳۸ ، ۲۴۰
۲۶۰ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹	۲۴۴
۳۸۷ ، ۳۳۳ ، ۳۳۵ ، ۳۵۱	تحریکِ احمدیت ۳۸۵ ، ۳۲۹
۳۵۳ ، ۳۷۹	۳۶۹
ترمذی ، سید محسن ۳۱	تحریکِ ترکِ موالات ۱۳۷ ، ۱۳۹ -
تشکیلِ جدیدِ الہیاتِ اسلام	۱۵۱ ، ۱۹۲ ، ۲۲۳ ، ۲۳۵
۱۰۶ ، ۲۵۱ ، ۲۵۲ ، ۲۶۲	۳۲۷
۲۶۹ ، ۳۰۹ ، ۳۶۷ ، ۳۹۴	تحریکِ خلافت ۱۳۷ ، ۱۳۹
۳۹۶ ، ۳۹۸ ، ۵۳۱	۱۹۲ ، ۲۳۵ ، ۲۷۸ ، ۳۲۷
تشنہ ۳۶	تحریکِ شہید گنج ۵۰۵ ، ۵۱۱
تصرف ۷ ، ۱۵ ، ۳۵ ، ۴۲	۵۱۵
۵۸ ، ۱۲۴ - ۱۲۶ ، ۳۹۱	تحریکِ کشمیر ۳۳۱ ، ۳۳۲
۳۹۲	۵۰۵ ، ۳۳۳

تیرتھ رام ، پنڈت ۱۷
 تیسری افغان جنگ ۲۷۸ ، ۲۸۱
 تیمور (بادشاہ) ۱۸۴
 تھامپسن ، پروفیسر ایڈورڈ - ۳۳۲
 ۳۳۴
 تھریس ۱۳۲

تلک ، بال گنگا دھر ۱۳۵
 تمدنِ عرب (کتاب) ۵۹
 تمدنِ ہند (کتاب) ۵۹
 تنظیم (جماعت) ۱۵۰
 تنگ ، ماؤسی ۳۸۰
 تہران ۳۸۶

ٹ

ٹوانہ ، سلک خضر حیات ۳۶۰
 ۳۲۵
 ٹوانہ ، سر عمر حیات ۳۶۰
 ٹوانہ ، سلک مبارز ۸۹
 ٹونکی ، مولانا عبداللہ ۸۲
 ٹیپو سلطان ۲۶۶
 ٹیگور ، رابندرا ناتھ ۱۶۲ ، ۳۳۳
 ۳۳۳
 ٹینی سن ۵۸

ٹالسٹائی ۳۶۰
 دی ٹائمز (اخبار) ۲۲۸ ، ۳۳۲ ،
 ۳۳۴ ، ۳۳۴
 ٹائمز آف انڈیا ۳۲۴ ، ۳۲۶
 ٹرنٹی کالج ۵۷ ، ۵۸
 ٹریبیون (اخبار) ۳۳ ، ۲۷۹ ،
 ۳۳۵ ، ۳۳۴
 ٹریسٹ ۷۰
 ٹرینٹینو ۷۰

ج

جاوید منزل ۵۴۹ ، ۵۵۳ - ۵۵۵
 ۵۶۷ ، ۵۵۹
 جاوید نامہ ۳۵۶ ، ۳۵۹ ، ۳۸۷
 ۳۴۱ ، ۳۴۴ ، ۳۸۱
 جداگانہ انتخاب ۲۲۳ - ۲۲۶
 ۲۳۰ ، ۲۳۲ ، ۲۳۵ ، ۲۴۰ -
 ۲۴۲ ، ۲۴۵ ، ۲۴۹ ، ۲۵۲
 ۲۶۹ ، ۲۹۸ ، ۲۹۹ ، ۳۰۳
 ۳۰۸ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹ ، ۳۹۹
 ۳۰۱ ، ۳۰۲ ، ۳۰۹ ، ۳۱۰
 ۳۵۸ ، ۵۱۴ ، ۵۳۱

جاپان ۶۹ ، ۸۶ ، ۲۱۵ ، ۳۳۸ ،
 ۳۷۰ ، ۳۷۹ ، ۳۸۰
 جارج ، لائیڈ ۱۳۲ ، ۱۳۳
 جامعہ ازہر ۳۷۳ ، ۵۰۰
 جامعہ عثمانیہ ۲۶۶
 جامعہ ملیہ اسلامیہ ۳۸۷ ، ۳۵۱ -
 ۳۵۳
 جامع مسجد دہلی ۴۶
 جامی ، عبدالرحمان ۱۴
 جاوید اقبال ۲۳ ، ۸۱ ، ۳۵۰ -
 ۳۵۲ ، ۵۲۸ ، ۵۵۸ ، ۵۶۷ -
 ۵۶۹

جناح ، محمد علی ، ۱۲۰ ، ۲۲۳ ،
 ۲۲۹ ، ۲۳۲ - ۲۳۳ ، ۲۳۱ ،
 ۲۳۴ ، ۲۳۵ ، ۲۳۷ ، ۲۳۸ ،
 ۳۵۱ ، ۳۹۳ ، ۵۰۶ ، ۵۰۷ ،
 ۵۱۰ ، ۵۱۳ - ۵۱۵ ، ۵۱۹ ،
 ۵۲۲ - ۵۲۵ ، ۵۳۱ ، ۵۳۳ ،
 ۵۳۵ ، ۵۳۸ ، ۵۴۰ ، ۵۴۲ ،
 ۵۶۱ ، ۵۶۶

جنٹیلی ، پروفیسر ، ۳۷۰

جنرل نادر خان دیکھیے

نادر شاہ غازی

جینوا ، ۳۸۳ ، ۳۸۶

جوگندر سنگھ ، سردار ، ۸۲ ، ۳۹۹

۵۶۱

جوہر ، مولانا محمد علی ، ۹۰ ، ۱۱۲

۱۱۹ ، ۱۳۲ ، ۱۳۵ ، ۱۳۶ ،

۱۸۰ ، ۲۲۳ ، ۲۳۱ ، ۲۳۳ ،

۲۳۵ ، ۳۰۷

جیا رام ، لالہ ، ۲۸

جیمز ، پروفیسر ، ۷۷

جلد ، ۱۵۵ ، ۳۳۵

جربنی ، ۶۳ ، ۶۴ ، ۶۸ ، ۶۹ ،

۱۰۱ ، ۱۰۹ ، ۱۱۹ ، ۱۸۳ ،

۱۸۳ ، ۲۷۹

جلال آباد ، ۳۳۳

جلال الدین ، مرزا ، ۶۰ ، ۷۵ ،

۷۷ ، ۸۲ ، ۹۰ ، ۱۲۲ ،

۱۳۵ ، ۱۶۱ ، ۱۶۳ - ۱۶۵ ،

۱۸۷ ، ۲۱۱ ، ۵۶۱

جلیانوالہ باغ ، ۱۳۸

جمال الدین ، فقیر سید ، ۳۲

جمال دین ، شیخ ، ۶ ، ۷

جموں ، ۳۳۳

جمیعت الاسلام ، ۳۷۳ ، ۳۷۷

جمیعت العلمائے ہند ، ۱۳۲ ، ۱۹۳ ،

۲۳۳

جمیعت اقوام — دیکھیے لیگ آف

نیشنز

جمیعت سنگھ ، ڈاکٹر ، ۵۳۷

جناح لیگ ، ۲۳۲ ، ۲۳۳ ، ۲۳۷ ،

۲۳۸ ، ۲۳۹ ، ۲۴۰ ، ۲۴۱ ،

۵۱۳

ج

جوری جوڑا ، ۱۳۹

جرکو سلووا لید ، ۲۹۰

جین ، ۶۶ ، ۲۶۳ ، ۲۷۹ ، ۳۳۱ ،

۳۸۰ ، ۳۷۹ ، ۳۸۰ ، ۵۵۳

جینی ٹر اسٹان ، ۳۳۳

جہپن فی صد کمیٹی ، ۷۷

جہتاری ، نواب احمد سعید ، ۳۵۳

چراہ

چشتی ، حکیم فقیر محمد ، ۲۰۳

چشتی ، محرم علی ، ۳۲ ، ۲۰۱

چغتائی ، ڈاکٹر عبداللہ ، ۳۱۳

چکو ، ۳

چمن ، ۳۳۶

چنتا منی ، ۱۹۸

۵۱۳

چھوٹو رام ، چوہدری ، ۵۱۳

ح

حسن محمد حیات ۱۳۶

حق نواز ، میاں ۳۰۰

حکیم نابینا ۴۵۰ - ۴۵۳ ، ۵۳۹

۵۶۳

حمید اللہ خان ، نواب ۳۳۸

۳۳۹ ، ۳۸۳ ، ۳۸۵ ، ۳۵۳

۵۲۷ ، ۳۵۵

حمید احمد خان ، پروفیسر ۳۱۸

حیات جاوید ۳۷

حیدرآباد دکن ۲۲ ، ۵۹ ، ۱۳۰

۱۳۱ ، ۱۸۱ ، ۲۵۲ ، ۲۶۶

۳۹۹ ، ۵۲۷ ، ۵۶۷

حیدر ، جسٹس آغا ۳۸۷

حیدر عصمت بے ۱۶۵

حیدر علی ۲۶۶

حیرت ، غلام مصطفیٰ ۲۷۷

حافظ ۶۲ ، ۱۲۵ ، ۱۲۶ ، ۱۳۱

۱۸۳ ، ۱۸۳ ، ۳۳۷

حالی ۳۶ ، ۳۹ ، ۳۵۳

حائری ، سید علی ۲۰۳

حبشہ ۳۷۹ ، ۳۸۵

حبیب اللہ خان ، سردار ۳۰۰

حبیب ، مولانا سید ۲۹۸ ، ۳۰۰

۳۰۲ ، ۳۳۰ ، ۳۹۹ ، ۵۰۵

حجاز ۳ ، ۷۱ ، ۱۵۳ ، ۱۵۳

۱۸۸ ، ۲۶۳

حسام الدین ، شیخ ۲۷۳ ، ۵۱۶

حسرت موہانی ۱۱۹ ، ۲۳۲ ، ۲۳۳

۲۳۵ ، ۳۰۷ ، ۳۹۷

حسن اختر ، راجہ ۵۵۰ ، ۵۵۲

۵۵۳ ، ۵۶۱

حسن ریاض ، سید ۳۳۹

حسن شمس الدین ۱۶۹

خ

۳۲۰ ، ۳۲۳ - ۳۲۵ ، ۳۲۸

۳۳۱ ، ۳۳۲ ، ۳۳۳ ، ۳۵۶

۳۶۹ ، ۳۷۷ ، ۳۱۰ ، ۳۱۳

۵۳۱ ، ۵۳۲

خلافت کمیٹی دیکھیے آل انڈیا

خلافت کمیٹی

خلجی ، علاؤ الدین ۳۳۱

خوارج ۱۰۶

خالد نظیر صوفی ۱۵

خالده ادیب خانم ۳۵۳

خدا بخش ۲۷۶

خضیری محمود ۳۱۷

خطبات مدارس دیکھیے تشکیل

جدید الہیات اسلامیہ

خطبہ المآباد ۱۲۲ ، ۲۸۹

۳۰۳ ، ۳۰۹ ، ۳۱۳ ، ۳۱۹

خیرالدین ۳۰۰
خیری برادران ۳۰۷

خورشید انور ، سید ۳۳
خیام ، عمر ۵۸

د

دریائے کیم ۵۷ ، ۶۳
دلیپ سنگھ ، جسٹس ۲۷۳
دولتانہ ، میان احمد یار ۵۰۶ ،
۵۱۶

دہلی ۲۳ ، ۵۱ ، ۸۷ ، ۸۸ ،
۱۳۳ ، ۲۲۵ ، ۲۳۳ ، ۲۳۸ ،
۲۴۳ ، ۲۴۵ ، ۲۴۸ ، ۲۴۷ ،
۳۵۱ ، ۳۵۲ ، ۳۸۷ ، ۳۹۳ ،
۳۵۰ ، ۳۵۱ ، ۳۵۲ ، ۳۵۳

۵۰۵ ، ۵۳۴ ، ۵۳۵
دیدار علی شاہ ، ابو محمد سید ۱۸۸ ،
۱۸۹ ، ۱۹۱

دین خند ، جسٹس ۵۰۷ ، ۵۰۸
دین خند ، منشی ۱۳۰
دیوان مرزا عبدالقادر بیدل ۵۶۷
دیوان مغرب ۱۶۳

ڈرڈ یکنیز ۱۳۸
ڈونلڈ ٹاؤن ۲۷
ڈیوائن کامیلٹی ۳۵۹
ڈیرہ اسماعیل خان ۳۰۷
ڈعا کہ ۸۳ ، ۸۷

ذکی شاہ ، سید ۳۷
ذوالفقار علی خان ، نواب ۳۸ ،

دارالاشاعت پنجاب ۱۸۲
دارالسلام ۳۹۹
دارالشکوہ ۵۲
دارالمصنفین ۱۳۳

داس کبھی ٹال (کتاب) ۶۶
داغ ۲۱ ، ۲۲ ، ۳۰ ، ۳۶
داؤدی ، مولوی شفیع ۲۲۳ ،
۳۵۶ ، ۳۸۶ ، ۳۹۷

دبیر ۳۶
در دانیال ۷۰
درانی ، شہزادہ احمد علی خان
۳۳۳

درانی ، فضل کریم خان ۵۱۳
درد ، عبدالرحیم ۳۶۶
دریا بادی ، مولانا عبدالرحیم ۱۶۰ ،
۳۳۹

ڈ

ڈاکٹر انصاری دیکھیے انصاری ،
ڈاکٹر مختار احمد
ڈالنجر ، پی - جی ۲۸
ڈانٹے ۳۵۹

ذ

ذاکر علی ۳۹۹
ذکر اقبال (کتاب) ۵۶۰

۵۶۱

ذوالقرنین (رسالہ) ۳۰۷

' ۱۶۲ ، ۱۳۵ ، ۱۳۴ ، ۸۲

' ۲۳۱ ، ۲۲۳ ، ۱۹۲ ، ۱۹۱

' ۲۹۵ ، ۲۹۳ ، ۲۳۳ ، ۲۳۲

ر

۵۵۷

رضا شاہ ۳۵۶ ، ۳۸۶

رموز بے خودی ۱۲۸ ، ۱۳۳

۱۳۳ ، ۳۹۰ ، ۳۹۱

رنگیلا رسول (کتاب) ۲۷۳

روڈز ٹرسٹ ۳۹۳

روس ۶۸ ، ۱۰۹ ، ۱۶۶ ، ۱۶۷

' ۲۱۳ ، ۲۳۷ ، ۲۷۸ ، ۲۷۹

' ۳۳۷ ، ۳۲۱ ، ۳۳۵ ، ۳۷۸

۳۸۰ ، ۳۸۱

روسو ۳۱۰

رولٹ ایکٹ ۱۳۸

رولٹ بل ۱۳۹

روم ۳ ، ۳۶۲ ، ۳۷۰ ، ۳۷۱

۳۱۹ ، ۳۲۰

روسی ۳۵۹ ، ۳۶۱ ، ۳۷۷

رؤف بے ۳۸۷ ، ۳۸۸

ریاست الوریہ ۳۸۷ ، ۳۸۶

ریاست بھوپال ۳۹۵ ، ۳۹۶

ریاست جموں و کشمیر ۳ ، ۳۱۳

' ۸۳ ، ۸۳ ، ۳۳۲ - ۳۳۵

' ۳۷۷ ، ۳۸۲ ، ۳۸۳ ، ۳۸۵

' ۳۲۲ ، ۳۲۸ ، ۳۳۱ ، ۳۳۳

۳۳۳ ، ۵۳۲

راجپال ۲۷۳ ، ۲۷۶

راجن شاہ ، سید ۲۳۱

رامس ، سر ڈینی من ۳۵۷

' ۳۳۶-۳۳۲ ، سر مسعود ،

۳۵۵ ، ۳۹۵ ، ۳۹۶ ، ۵۲۷

راشد ، عبدالرزاق ۱۸۱ ، ۱۸۲

راغب احسن ۳۳۱

راگھون ۳۳۵

رام پرشاد ، لالہ ۱۸۶

رامائن ۳۹۲

ران ، پروفیسر ۶۶

رانچی ۱۷۸

راولپنڈی ۵۵

رائل اکیڈمی (اٹلی) ۳۶۹ ، ۳۷۰

' ۳۶۰ ، رحمت علی ، چوہدری

۳۶۱ ، ۳۷۵

رحیم بخش ، حاجو ۳۹۵ ، ۳۵۷

رچرڈ سوم ۳۳

رسل ، برٹریٹڈ ۲۱۳

رسول اللہ ﷺ ۱۹ ، ۲۰ ، ۳۵

' ۱۰۰ ، ۱۲۸ ، ۱۲۹ ، ۱۳۰

' ۱۳۲ ، ۱۷۱ ، ۱۹۳ ، ۲۰۳

' ۲۳۶ ، ۲۵۳ ، ۲۵۵ ، ۲۷۳

' ۲۷۵ ، ۲۶۰ ، ۳۱۵ ، ۳۲۱

ز

زمیندار (اخبار) ۱۱۲ ، ۱۱۹ ،	زاہد علی ۳۵۶
۱۵۹ ، ۱۶۹ ، ۱۷۰ ، ۱۹۳	زبور عجم ۲۸۳
زمیندار لیگ ۵۲۳	زردشت نے یوں کہا (کتاب) ۳۹۵

س

سٹاک ہوم ۳۰۷	سارلی ، ڈاکٹر ۳۶۱
سٹیشنرین (اخبار) ۹۶	سالک ، مولانا عبدالمجید ۱۳
سربیا ۷۰ ، ۱۱۲	۳۷ ، ۸۲ ، ۱۱۷ ، ۱۲۱
سرحد دیکھنے صوبہ سرحد	۱۲۲ ، ۱۳۵ ، ۱۳۹ ، ۱۵۰
سردار (والدہ جاوید) ۱۳۹	۱۵۹ ، ۱۶۱ ، ۱۶۵ ، ۱۶۶
سرمید احمد خان ، دیکھنے سید	۱۷۸ ، ۱۸۰ ، ۱۸۸ ، ۲۰۱
احمد خان ، سر	۲۳۲ ، ۲۴۷ ، ۲۹۱ ، ۲۹۲
سر فضل حسین دیکھنے فضل حسین	۲۹۸ ، ۳۰۰ ، ۳۵۵ ، ۳۸۵
سیاں	۳۰۳ ، ۳۶۹ ، ۳۹۵ ، ۳۹۷
سرور ، پروفیسر آل احمد ۳۲۳	۵۱۰ ، ۵۳۸ ، ۵۵۰ ، ۵۵۳
سرپنڈ ۳۵۱ ، ۳۵۲	۵۵۹ - ۵۶۱ ، ۵۶۳ ، ۵۶۴
سری نگر ۵ ، ۱۸۳ ، ۳۳۰ ، ۳۳۳	سائمن ، سرجان ۲۲۸ ، ۲۳۰
۳۸۳ ، ۳۳۳	سائمن کمیشن ۲۲۸ ، ۲۳۰ -
سلی ۷۲	۲۳۲ ، ۲۳۷ ، ۲۳۸ ، ۲۳۹
سعادت علی خان ۳۰۳ ، ۳۰۴	۲۹۲ ، ۲۹۳ ، ۳۰۱ ، ۳۳۰
۵۵۰	سائمن کمیشن رپورٹ ۲۹۵ ، ۲۹۷
سعدی ، سر ۵۲۱	۳۳۳
سعدی ۷۵	سبھرائن ، ڈاکٹر پی ۲۶۳
سعودی عرب ۲۵۹ ، ۳۳۶	سپرو ، مرتیج بہادر ۳۶۰
۳۷۳ ، ۳۷۹	سپین ۱۰۷ ، ۳۳۱ ، ۳۳۶ ، ۳۱۷
سکاج مشن کالج ۱۵	۳۱۹ ، ۳۸۳
سکاج مشن ہائی سکول ۱۳	ستاروں میں زندگی (کتاب) ۳۳۶
سڈانا ، ڈاکٹر ۳۷۰ ، ۵۶۱	ستارہ صبح (رسالہ) ۱۲۸ ، ۱۷۵

سوری ، شیر شاہ ۴۴۱

سوشکی ، بیل ۱۸۳

سوشلزم ۱۶۷ ، ۱۶۹ ، ۲۳۷

۳۷۲ ، ۳۳۶ ، ۳۲۱ ، ۳۵۵

۳۵۶ ، ۳۸۰

سوشلسٹ پارٹی ۳۵۵ ، ۳۵۶

سول اینڈ ملٹری گزٹ (اخبار) ۳۳

۳۳۶ ، ۳۹۶ ، ۵۳۹

سوویٹ یونین دیکھیے روس

سوئٹزر لینڈ ۳۵۶

سوئز ۵۳

سہارنپور ۵۵۰

سہارنپوری ، پیرزادہ محمد صدیق

۱۸۹

سہروردی ، عبداللہ ۶

سیارہ (رسالہ) ۵۰۰

سیاشت (اخبار) ۲۰۳ ، ۲۹۸

۳۳۰

سیالکوٹ ۳ ، ۵ ، ۶ ، ۸ - ۱۰

۱۳ - ۱۵ ، ۱۷ ، ۲۱ ، ۲۵

۲۷ ، ۳۷ ، ۷۵ ، ۸۳ ، ۳۳۳

سیالکوٹی ، ابراہیم میر ۱۰

سیالکوٹی ، سید انعام اللہ شاہ ۱۳۱

سیالکوٹی ، ملا عبدالحکیم ۱۰

سید احمد ، شمس العلاء بولانا ۵۱

سید احمد خان ، سر ۳۷ ، ۳۹

۹۳ ، ۲۳۶ ، ۳۲۱

سید حسین ۱۳۶

سیرے نائیکہ ۱۱۰

سین ، سن یاٹ ۳۸۰

سکندر جناح پیکٹ ۵۲۵

سکندر حیات خان ، سر ۵۰۹ -

۵۱۱ ، ۵۱۳ ، ۵۱۷ ، ۵۲۱ -

۵۲۶ ، ۵۵۳ ، ۵۶۱

سکندر نامہ ۱۴

ساجوقی ، سردار صلاح الدین ۳۵۲

۳۴۳ ، ۳۵۳

سلطان احمد ۶

سلیمان اعظم ۵۳

سلیم اللہ ، خواجہ ۸۳

سلیم ، ایس - ایم ۳۳۱

سلیمان ندوی ، سید ۱۳۳ ، ۱۳۶

۱۳۷ ، ۱۴۵ ، ۱۴۸ ، ۱۷۹

۱۸۸ ، ۳۳۲ - ۳۳۶ ، ۳۳۹

۳۸۹

سپورن سنگھ ، سردار ۵۰۶

سمرنا ۱۳۲ ، ۱۳۸

سنائی ، حکیم ۱۲۷ ، ۳۳۶ ، ۳۳۷

سنٹرل محمدن ایسوسی ایشن ۳۲

سندھ ۲۲۳ ، ۲۲۵ ، ۲۳۹ ، ۲۴۵

۲۹۰ ، ۲۹۶ ، ۲۹۹ ، ۳۰۰

۳۰۲ ، ۳۰۸ ، ۳۱۳ ، ۳۱۶

۳۲۷ ، ۳۳۰ ، ۳۳۳ ، ۳۳۱

۳۰۰ ، ۳۰۳ ، ۳۰۹ ، ۳۱۳

۵۱۳ ، ۵۳۱ ، ۵۴۲

سندھی ، شیخ عبدالعجید ۳۰۲

سن کھترا ۵ ، ۶

سنگھٹن ۱۳۷ ، ۱۵۰ ، ۲۲۳

۲۶۹

سوراج پارٹی ۱۹۸

سینے مثل ۶۴

سینا ۱۷۷

سینٹ پیٹرز برگ ۱۰۶

ش

شفیع ایگ ۲۳۲ ، ۲۳۳ ، ۲۳۵ ،

۲۳۰ ، ۲۳۱ ، ۲۳۳ ، ۲۳۸ ،

۵۱۴

شکری ۱۱۳

شکیب ارسالان ۳۵۲

شہال مغربی سرحدی صوبہ دیکھئے

صوبہ سرحد

شمس الدین ، حاجی میر ۱۶۵ ،

۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۲۰۲ ، ۲۰۰ ،

شمس ۳۳۹ ، ۳۹۷ ، ۳۹۸ ،

شور محشر (رسائل) ۳۵

شوکت علی ، مولانا ۱۱۹ ، ۱۲۲ ،

۱۳۲ ، ۱۳۵ ، ۱۸۰ ، ۲۳۱ ،

۲۳۲ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹ ، ۳۵۶ ،

۴۰۲

شہاب الدین ، چوہدری ۲۲۱ ،

۵۶۱

شہید گنج مصالحتی پورہ ۵۰۰

شیخ الہیر - دیکھئے : الہیر شیخ

شیدائی ، قبیل ۳۷۰

شیراز ۳ ، ۷۲

شیرانی ، حافظ محمود ۷۰

شیخ ربک ، خالد ۳۶ ، ۱۰۱ ،

شیو نارائن ، پنڈت ۷۶

شاہستری ، محمود ۲۸۴

شاد ، سرکشن پرشاد ۷۶ - ۷۸ ،

۸۱ ، ۹۰ ، ۱۲۵ ، ۱۳۰ ،

۱۳۱ ، ۱۳۱ ، ۲۶۶ ، ۲۶۷ ،

۳۹۲

شادی لال ۷۶ ، ۱۶۱ ، ۱۸۷ ،

۱۸۸

شاردا بل ۲۷۷

شاطر مدراسی ۷۶

شام ۲۶۴ ، ۳۳۹ ، ۳۷۲ ، ۳۷۴ ،

۳۸۰ ، ۳۸۳ ،

شاہجہان (بادشاہ) ۱۰ ، ۵۰۳

شاہ دین ، میان ۳۳ ، ۷۶

شاہ نواز ، میان ۲۹۳ ، ۵۲۷ ،

۵۲۸

شاہ ہمدان دیکھئے ہمدانی ، سید علی

شہلی نعمانی ۳۰ ، ۳۳ ، ۱۳۳

شجاع الدین ، خلیفہ ۳۳ ، ۲۹۳ ،

۳۰۰ ، ۳۹۵ ، ۵۵۴ ، ۵۶۱ ،

شجاع الدین محمد ۳۵

شدھی ۱۳۷ ، ۱۵۰ ، ۲۲۳ ،

۲۶۹

شردھانند ، سوامی ۲۶۹ ، ۲۷۰ ،

شرر ، عبد الجلیم ۳۰۷

شرق اردن ۳۴۹

شروانی ، تصدق احمد خان ۳۳۸ ،

۳۳۹ ، ۴۰۳

ص

۲۹۹ ، ۳۰۰ ، ۳۰۲ ، ۳۰۸	صدیق جہا ، حضرت ابوبکر ۔۔۔
۳۱۳ ، ۳۱۶ ، ۳۲۷ ، ۳۳۰	صدیق محمد ، حاجی حکیم ۳۵۳
۳۳۳ ، ۳۳۱ ، ۳۳۲ ، ۳۵۳	صرف بہائی ۱۴
۳۷۷ ، ۳۸۲ ، ۳۸۳ ، ۳۹۹	صرف میر ۱۴
۴۰۰ ، ۴۰۹ ، ۴۱۳ ، ۴۳۱	صدر محمود ۵۵۸
۵۱۳ ، ۵۳۱ ، ۵۴۲	صلح کانفرنس ، پیرس ۱۴۳
صوبہ ، سہر ۲۰۱	صوبہ سرحد ۲۲۳ ، ۲۲۵ ، ۲۳۹
صومالی لینڈ ۶۹	۲۳۵ ، ۲۹۰ ، ۲۹۵ ، ۲۹۶
صومالیہ ۴۲۰	

ض

ضرب کیم ۳۷۷ ، ۳۷۸ ، ۳۸۷

ط

طرابلس ۱۱۰ ، ۱۱۱	طالوت ۳۷۳ ، ۳۷۴ ، ۵۳۵
طایطہ ۴۱۹	طاہر الدین ، منشی ۷۵ ، ۵۶۷
طوسی ، نصیر الدین ۴۱۷	طباطبائی ، سید ضیاء الدین ۳۵۶

ظ

۲۳۳ ، ۲۷۱ ، ۲۷۳ ، ۲۷۵	ظاہر شاہ (بادشاہ) ۳۷۶ ، ۳۷۷
۲۹۳ ، ۳۳۸ ، ۵۰۳ ، ۵۰۵	ظفر اللہ ، سر ۳۹۳
۵۰۸ ، ۵۱۱ ، ۵۱۵ ، ۵۱۶	ظفر علی خان ، مولانا ۸۶ ، ۹۹
۵۲۰ ، ۵۲۱ ، ۵۶۱	۱۱۲ ، ۱۱۹ ، ۱۲۸ ، ۱۳۱
	۱۳۵ ، ۱۵۹ ، ۲۳۳ ، ۲۳۱

ع

عبداللہ ۳۰۰	عابد نظامی ۵۰۰
عبداللہ انور بیگ ۶۰	عالمگیر اعظم — دیکھیے
عبداللہ خان ۴۴۵	اورنگ زیب عالمگیر

عبدالقدیر ۳۳۲
 عبدالقیوم ، صاحبزادہ سر ۲۲۳
 ۵۱۳ ، ۲۳۱
 عبدالکریم الجیلی - دیکھیے :
 الجیلی ، عبدالکریم
 عبدالمجید آفندی ۱۵۳
 عبدالمجید خان ۱۵۳
 عثمان ۱۱۰
 عثمان علی خان ، میر ۲۶۶
 عدن ۵۲ ، ۵۳ ، ۳۵۲
 عراق ۳۳۹ ، ۳۷۳ ، ۳۷۹
 عرفی ۱۷۷ ، ۳۵۵
 عزیزالدین ، میر ۳۰۰
 عزیز گل ، مولانا ۱۱۹
 نشانی ، خواجہ غلام احمد ۳۳۳
 عشرت رحمانی ۱۷۹ ، ۳۸۹
 عطا محمد خان ، ڈاکٹر ۱۷
 عطا محمد ، شیخ ۱۱۰ ، ۱۱۱ ، ۵۱۰
 ۸۰
 عظیم بیگم ۶۱ ، ۶۶ ، ۷۸ ، ۷۹
 ۳۱۷ ، ۳۵۲ ، ۸۱ ، ۸۱
 عظیم حسین ، میان ۲۲۱
 علامہ الدین ۲۷۶
 علم الدین شہید کھیتی ۲۷۶
 علی امام ، سر ۷۷ ، ۲۲۹
 ۲۳۸
 علی امام ، سر ۳۵۳ ، ۳۵۵
 علی نقی شاہ ۱۶۳
 علی بخش ۳۵۰ ، ۵۵۱ ، ۵۵۳
 ۵۶۳

عبداللہ شاہ ۲۶۱
 عبداللہ ، شیخ ۳۵۲
 عبداللہ ہارون ، سیٹھ ۳۳۱ ، ۵۱۳
 عبداللہ ، مولوی ۱۰
 عبداللہ یوسف علی ۳۶۰
 عبدالحکیم ، خلیفہ ۱۸۲
 عبدالحمید ، ڈاکٹر ۲۹۷ ، ۳۰۳
 عبدالحمید ، سلطان ۱۰۳ ، ۱۰۹
 ۳۳۵
 عبدالحی ، میان ۲۳۱
 عبدالرحیم ، خواجہ ، ۳۶۱ ، ۵۶۱
 عبدالرحیم ، سر ۲۲۳
 عبدالرب ۳۳۱
 عبدالرحمان خان ، امیر ۳۳۱
 عبدالرحمان ، شیخ ۶
 عبدالرحمان ، ڈاکٹر شیخ ۹۹
 عبدالرحمان ، غازی ۲۷۳
 عبدالسلام ندوی ۳۱۹
 عبداللطیف ، ڈاکٹر سید ۵۲۸
 عبدالعزیز ۲۷۶
 عبدالعزیز ٹھیکیدار ۵۲۰
 عبدالعزیز ، میان ۱۶۵ ، ۱۹۹
 ۲۷۱ ، ۲۹۳ ، ۳۶۱ ، ۵۰۶
 ۵۲۰ ، ۵۱۶
 عبدالغفار خان ۲۹۵ ، ۳۸۳
 عبدالغنی ، خواجہ ۵۶۷
 عبدالقادر ، پروفیسر سید ۲۷۷
 عبدالقادر ، سر ۲۱ ، ۳۰ ، ۳۷
 ۳۳ ، ۳۸ ، ۵۵ ، ۵۷ ، ۶۲
 ۶۶ ، ۶۷ ، ۲۳۷ ، ۲۷۱
 ۲۷۳ ، ۳۶۰ ، ۵۶۱

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس
یونین ۳۹۳
عمر بن العاص ۳۵۲
عمر فاروق اعظم ۲۸۳ ، ۳۳۰
عنترہ ۱۲۹

علی گڑھ ۹۹ ، ۱۲۲ ، ۲۵۲
۳۵۲ ، ۳۰۷
علی گڑھ کالج ۲۹ ، ۳۰ ، ۱۰۳
۱۲۲

غ

غلام حسین ، پروفیسر ۱۶۹
غلام حسین ، خواجہ ۵۱۶
غلام رسول پیرسٹر ۵۱۰
غلام عباس ، جوہدری ۳۳۳
غلام محمد ، شیخ ۷
غلام مرتضیٰ ، مولوی ۱۰
غلام مرشد ، مولانا ۵۵۰
۵۵۳
غوری ، محمد (بادشاہ) ۳۳۱

غالب ۵۱
غرناطہ ۷۲ ، ۳۱۹
غرناطہ یونیورسٹی ۳۱۹
غزنی ۳۳۶ ، ۳۳۷
غزنوی ، مولانا داؤد ۳۳۱
غزنوی ، سلطان محمود ۳۲۵
۳۳۶ ، ۳۳۷
غزنوی ، مولوی عبداللہ ۱۸۷
غضنفر علی خان ، راجہ ۵۱۶
۵۱۹ ، ۵۲۰
غلام حسین ، ابو عبداللہ ۱۰
۱۳

ف

فاطمہ العابد ۳۵۷
فنز جیرالڈ ۵۸
فرانس ۵۳ ، ۶۸ ، ۶۹ ، ۱۳۸
۱۶۸ ، ۲۱۲ ، ۳۳۹ ، ۳۷۳
۳۷۰
فراؤ لائن ران ۶۶
فرعون ۳۵۹
فسطاط ۳۵۲
فضل الحق ، مولوی ۲۳۳ ، ۵۱۳
۵۲۱

فارابی ۱۷۷
فاربس ، روزیٹا ۳۵۸
فارقوہرسن ، مس مارگریٹ ۳۶۰
۳۱۵
فارموسا ۶۹
فاروق (بادشاہ) ۲۶۱
فاشزم ۳۷۲ ، ۳۲۰ ، ۳۲۲
فاشسٹ پارٹی ۳۲۰
فاطمہ بنت عبداللہ ۱۱۱ ، ۱۱۲

فلسطین ۱۵۵ ، ۲۸۲ ، ۲۸۳
 ۳۳۹ ، ۳۵۷ ، ۳۷۱ ، ۳۷۲
 ۳۲۲ ، ۳۳۵ ، ۳۷۹ ، ۳۸۳
 ۳۸۳ ، ۵۳۷
 فارمن کرسچین کالج ، لاہور ۲۷
 فوق ، محمدالدین ۳۶ ، ۱۸۷
 فیروز ، کرنل ۳۵۸
 فیروزالدین ، میان ۳۰۰ ، ۵۰۵
 فیصل (بادشاہ) ۱۵۵

فضل الدین احمد ۱۷۸ ، ۱۷۹
 فضل الدین ، مولوی ۳۰۰
 فضل حسین ، میان ۷۶ ، ۸۵
 ۱۳۳ ، ۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۲۰۹
 ۲۱۰ ، ۲۱۹ ، ۲۲۱ ، ۲۷۶
 ۳۳۵ ، ۳۵۹ ، ۳۶۰ ، ۵۱۳
 ۵۱۷ ، ۵۶۱
 فضل کریم ۳۰۰
 فلٹ ہاٹم ، بیرن فان ۵۵۲

ق

قریشی ، شعیب ۲۳۸ ، ۳۳۸
 ۳۳۹
 قزلباش ، نواب فتح علی خان ۸۵
 قسطنطنیہ ۱۱۳ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳
 ۳۳۸
 قصیر زہرا ۳۱۸
 قصور ۱۳۱
 قصوری ، مولانا عبداللہ ۲۷۳
 قصوری ، مولانا عبدالقادر ۳۳۱
 ۲۳۳ ، ۲۹۳ ، ۵۰۶ ، ۵۱۶
 قصوری ، مولانا غلام شیخ
 ۸۹ ، ۱۹۳ ، ۲۹۳ ، ۳۰۰
 ۳۹۵
 قفقاز ۲۹۰
 قلات ۳۱۳
 قلعا ، جہاں پور ۳۹۹
 قندھار ۳۰۶ ، ۳۳۷
 قندھار ، ڈاکٹر ۳۰۵

قادیان ۱۳۱ ، ۱۳۲
 قاہرہ ۳۷۱
 قائد اعظم - دیکھیے جناح ،
 محمد علی
 قدوری ۱۳
 قرآن ۱۸ ، ۲۱ ، ۳۵ ، ۳۷
 ۳۵ ، ۱۰۶ ، ۱۲۳ ، ۱۷۰
 ۱۷۲ ، ۱۸۶ ، ۲۵۳ ، ۲۵۵
 ۲۵۸ ، ۲۶۵ ، ۳۱۲ ، ۳۳۱
 ۳۳۲ ، ۳۳۷ ، ۳۵۲ ، ۳۵۳
 ۳۵۸ ، ۳۰۹ ، ۳۳۳ ، ۳۵۳
 ۳۷۱ ، ۳۷۲ ، ۳۷۳ ، ۳۸۱
 ۳۹۰ ، ۳۹۳ ، ۳۹۶ ، ۵۵۷
 ۵۶۷ ، ۵۶۶
 قرشی ، عبدالمجید ۲۷۷
 قرشی ، حکیم محمد حسن ۵۳۶
 ۵۳۹ ، ۵۵۳ ، ۵۶۱ ، ۵۶۳
 قرطبہ ۳۱۹
 قریشی ، ڈاکٹر وحید ۲۹

قیصر وایم ۱۱۳ ، ۱۳۳ ، ۱۶۸ ، ۲۷۶ ، ملک لال دین ، ۲۷۶ ، ۵۰۵ ، ۲۷۷

ک

کریک ، سرپنری ۵۵۴

کرشن ، مہاشے ۲۹۱

کشمیر کمیٹی - دیکھیے آل انڈیا

کشمیر کمیٹی

کشمیری گزٹ ۴۴

کعبہ ۳۶۰

کلکتہ ۸۶ ، ۸۸ ، ۲۳۳ ، ۲۳۳

۲۳۵ ، ۳۳۰ ، ۳۱۱ ، ۳۶۹

۵۵۴

کلکتہ لیگ - دیکھیے جناح لیگ

کلیاتِ اقبال ۱۸۱ ، ۱۸۲

کمال ، مولانا ۱۰

کمیونزم ۱۶۵ ، ۱۶۹ ، ۳۲۰

۳۲۱

کمیونل ایوارڈ ۳۹۹ ، ۳۰۱

۳۰۴ ، ۳۵۷ ، ۳۵۸ ، ۵۱۸

۵۳۹

کیریا ۶۹

کولمبس ۳۳۵

کنزالدقائق ۱۳

کونت ۱۶۸

کوئٹہ ۳۳۶

کیسری (اخبار) ۳۳۳

کیمبرج ۵۷ ، ۵۹ ، ۶۱ ، ۶۲

۳۶۰ ، ۳۶۱ ، ۳۶۵

کابل ۲ ، ۲۷۹ ، ۲۸۲ ، ۳۳۲

۳۳۳

کابل (رسالہ) ۳۳۲ ، ۳۳۷

کابل یونیورسٹی ۳۳۲

کاربٹ ، سر جعفرے ۳۶۸

کارل مارکس ۱۶۶ ، ۱۶۹

کچلو ، ڈاکٹر سیف الدین ۲۰۱

۲۰۲ ، ۲۳۲ ، ۲۳۳ ، ۲۳۷

۵۲۰

کچز ۳۵۹

کراچی ۳۷۳

کافیہ ۱۳

کالون ، کرنل ۳۳۲

کامریڈ (رسالہ) ۱۱۲ ، ۱۱۹

۳۰۷

کانپور ۹۰ ، ۲۱۵ ، ۳۳۱ ، ۳۵۰

کانپور ریلیف فنڈ ۳۳۱

کانٹ ۳۱۸

کانگریس - دیکھیے آل انڈیا

نیشنل کانگریس

کانگو ۶۹

کائی شیک ، چیانگ ۳۸۰

گردستان ۱۳۸

کرزن ، لارڈ ۲۱۲

کرشک پروجا پارٹی ۵۱۳

- گابا ، خالد لطیف ۵۲۰
 گاندھی ارون سمجھوتہ ۳۳۷
 ۳۳۱
 گاندھی جی ۱۳۱ ، ۱۳۵ ، ۱۳۹
 ۱۵۱ ، ۱۹۳ ، ۲۳۷ ، ۲۳۳
 ۲۹۲ ، ۲۹۳ ، ۳۰۷ ، ۳۳۷
 ۳۳۹ ، ۳۳۶ ، ۳۵۶ ، ۳۶۰
 ۳۶۵ ، ۳۶۸ ، ۳۰۱ ، ۳۰۲
 ۳۱۶
 گجرات ۷ ، ۱۷
 گراسی ۱۳۰ ، ۱۳۱ ، ۱۶۰
 ۱۶۱ ، ۲۸۵ ، ۳۹۰ ، ۳۹۳
 گلاب دین ، شیخ ۳۳ ، ۸۵
 گل خان ، سردار ۳۰۷
 گلستان (کتاب) ۱۳
- گلشنِ راز (کتاب) ۲۸۳
 گائینسی کمیشن ۳۸۵ ، ۳۲۸
 ۳۳۲
 گورداسپور ۸۳
 گوردوارہ ایکٹ ۵۰۳
 گوردوارہ پر بندھک کمیٹی ۵۰۳
 گوردوارہ شہید گنج ۵۱۰
 گورنمنٹ کالج ، لاہور ۲۷ ، ۲۹
 ۳۳ ، ۳۱ ، ۳۵ ، ۷۷
 ۱۳۰ ، ۱۸۶
 گوکھلے ۸۹
 گوہر رحمان ، قاضی ۳۸۵
 گوٹھے ۱۶۳ ، ۱۸۳ ، ۱۸۴
 گویا ، سرور خان ۳۳۳
 گیلائی ، سید زین العابدین ۵ ، ۶

- لاجپت رائے ، لالہ ۷۶ ، ۲۳۱
 ۲۳۰ ، ۳۰۷ ، ۳۲۸
 لال چند ، چوہدری ۲۱۰
 لال خان ، ملک ۵۰۵
 لاہور ۱۰ ، ۱۵ ، ۲۲ ، ۲۳
 ۲۵ ، ۳۰ ، ۳۳ ، ۳۷ ، ۳۸
 ۵۹ ، ۷۱ ، ۷۵ ، ۷۸ ، ۸۰
 ۸۶ ، ۸۹ ، ۱۳۱ ، ۱۳۳
 ۱۳۸ ، ۱۴۱ ، ۱۴۳ ، ۱۴۵
 ۱۵۳ ، ۱۵۴ ، ۱۶۳ ، ۱۶۵
 ۱۶۹ ، ۱۷۲ ، ۱۹۹ ، ۲۰۳
 ۲۰۳ ، ۲۰۷ ، ۲۱۷ ، ۲۱۹
- لاہور لیگ - دیکھیے شفیق لیگ
 لاء سکول ، لاہور ۲
 لائبریری ، اسلامیہ کالج لاہور
 ۵۶۷

لوٹھین ، لارڈ ۳۱۵ ، ۳۹۳ ،
 ۵۳۹ ، ۵۶۱
 لوچر ۳
 لولی حج ، بابا ۳ ، ۵
 لیبر پارٹی ۲۳۳ ، ۲۹۷ ، ۳۷۷ ،
 ۳۹۵
 لیڈر (اخبار) ۳۲۳
 لیگ آف نیشنز ۳۲۸ ، ۳۳۳ ،
 ۳۷۶ ، ۳۸۲ ، ۳۷۹ ، ۳۷۸
 لیمنگٹن ، لارڈ ۳۱۵
 لینن ۱۶۷ ، ۱۶۸
 لینن ازم ۳۸۰
 لیوی ، پروفیسر ۳۶۱

لیبان ۳۳۹ ، ۳۷۲ ، ۳۷۳ ،
 ۳۸۳ ، ۳۸۰
 لیبیا ۱۱۰ ، ۳۲۰
 لس بیلہ ۳۱۳
 لکھنؤ ۱۲۰ ، ۲۳۰ ، ۲۳۲ ،
 ۳۳۰ ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ ، ۳۰۹ ،
 ۵۰۷ ، ۵۲۱ ، ۵۳۱
 لندن ۵۷ ، ۶۲ ، ۶۷ ، ۲۹۲ ،
 ۳۲۳ ، ۳۵۱ ، ۳۵۵ ، ۳۵۶ ،
 ۳۶۰ ، ۳۶۲ ، ۳۹۳ ، ۳۰۹ ،
 ۳۱۱ ، ۳۱۳ ، ۳۱۹ ، ۳۸۳ ،
 ۳۹۳ ، ۵۱۳
 لندن یونیورسٹی ۲۵۸ ، ۵۹

م

مثنوی مولانا روم ۳۵۷ ، ۵۶۷
 مجلس اتحاد ملت ۵۱۵ ، ۵۱۶ ،
 ۵۱۹ ، ۵۲۰
 مجلس احرار اسلام ۳۸۵ ، ۳۹۳ ،
 ۳۶۶ ، ۳۶۷ ، ۵۰۵ ، ۵۱۱ ،
 ۵۱۵ ، ۵۱۶ ، ۵۱۹ ، ۵۲۰
 مجلس کبیر ملی ۱۵۳
 مجلس الاعلیٰ و الاسلامی ۳۸۰
 مجید ملک ۲۹۸ ، ۳۰۰ ، ۳۰۲ ،
 ۳۳۰
 محبوب الہی ۳۰۰
 محبوب عالم ، مولوی ۸۵ ، ۱۶۵
 محروم ، تلوک چند ۷۶
 محسن شاہ ۲۹۳ ، ۳۰۰ ، ۳۳۳ ،
 ۳۹۵ ، ۵۵۳

ماڈرن افغانستان (کتاب) ۳۳۰
 ماڈرن ریویو (رسالہ) ۳۶۹
 مارکس ازم ۳۸۰
 مارلے مثنوی اصلاحات ۸۷
 مانتی نیگرو ۱۱۲
 مانچوریا ۶۹
 مارٹن ، ہنری ۱۹۳
 مارسیلز ۵۳
 مالٹا ، ۳۱۱ ، ۳۷۹
 مائٹیگو چمسفورڈ اصلاحات ۱۳۷ ،
 ۱۳۶
 مانسہروی ، مولانا محمد اسحاق
 ۵۱۶
 مٹھا ، سردار سلیمان قاسم ۳۰۲
 مثنوی مرآة معنوی ۵۶۷

محمد علی ، مولانا دیکھیے جوہر ،
مولانا محمد علی

محمد علی ، مواوی ۲۳۱ ، ۳۰۰

محمد یعقوب ، سر ۲۲۳ ، ۲۳۳

محمد یوسف ، میر واعظ ۳۳۳

محمود ، ڈاکٹر سید ۵۰۵

محمود الحسن ، مولانا ۱۱۹

مخزن (رسالہ) ۳۵-۳۷

مخلوط انتخاب ۲۲۳ ، ۲۲۶ ، ۲۲۹

۲۳۲ ، ۲۳۹ ، ۲۴۰ ، ۲۴۲

۲۳۵ ، ۳۲۵ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹

۳۰۳ ، ۳۲۸ ، ۳۲۸

مدراس ۲۶۳ ، ۲۶۵ ، ۲۶۶

۳۱۲

مدراس مسلم ایسوسی ایشن ۲۵۲

مدنی ، مولانا حسین احمد ۱۱۹

۳۷۰ ، ۳۷۲ ، ۳۷۳ ، ۳۷۵

مدینہ ۵۲

مڈل ٹیمپل ۵۹ ، ۶۸

مراتب علی شاہ ۳۰۰

مراکش ۲۶۰ ، ۵۶۳

مرتضی احمد خان ، مولانا

میکش ، مولانا ، مرقی احمد

مرزا پور ۳۵۱

مرزا صاحب دیکھیے بشیر الدین

محمود احمد ، مرزا

مرکزی مجلس قانون نماز ۳۹۹

مزیل ، مولوی ۱۰

مسافر (کتاب) ۳۳۶

مسجد اقصیٰ ۲۱۳ ، ۲۱۷

محمد اسد ۳۹۹

محمد اکرام ، شیخ ۳۱۸

محمد تقی ، سید ۲۲ ، ۲۳

محمد دین ، خان بہادر ملک ۲۰۰

۲۰۲

محمد دین ، ملک ۳۰۰

محمد دین مولوی ۲۸

محمد حسین ، چوہدری ۳۵۰ ، ۵۵۰

۵۵۱ ، ۵۵۲ ، ۵۵۳ ، ۵۶۱

۵۶۷

محمد حسین ، ملک ۲۰۰ ، ۲۰۲

محمد سعید ، مولوی ۳۳۳

محمد شریف ، حکیم ۳۰۰

محمد شفیع ، سرمیاں ۷۶ ، ۸۱

۱۸۷ ، ۲۲۳ ، ۲۲۷ ، ۲۳۰

۲۳۲ ، ۲۳۳ ، ۲۳۳ ، ۲۳۵

۲۳۷ ، ۲۳۹ ، ۲۵۶ ، ۲۹۳

۲۹۸ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹ ، ۳۶۸

۵۶۱

محمد شفیع میاں (م - ش) ۳۹۶

۳۹۸ ، ۵۳۹ ، ۵۵۱ ، ۵۵۲

۵۶۱

محمد رفیق ، شیخ ۶ ، ۷

محمد رمضان ، شیخ ۶

محمد عالم ، ڈاکٹر ۲۳۳ ، ۲۹۳

محمد عبداللہ ، ڈاکٹر سید ۳۸۷

محمد عبداللہ ، شیخ ۶ ، ۳۳۳

۳۳۳ ، ۳۸۵

محمد عرفان ، مولانا ۲۱۹

- معاہدہ سپورے ۱۳۸ ، ۱۳۹ ،
 ۱۵۳
 معاہدہ عمرانی (کتاب) ۳۱۰
 معاہدہ لوزان ۱۳۹
 معراج بیگم ۱۷
 مغربی دیوان ۱۸۳
 مغلیہ پورہ انجنیرنگ کالج ۳۳۰
 مغل پورہ کالج ایچی ٹیشن ۳۳۹
 مقبرہ جہانگیر ۱۶۳
 مکتوبات اقبال (کتاب) ۳۵۱
 مکہ ۳۳۵
 ملا عبدالحکیم سیالکوٹی دیکھیے
 سیالکوٹی ، ملا عبدالحکیم
 ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر ۹۹
 ملٹن ۳۹۳
 ملوجا (جہاز) ۳۵۳ ، ۳۵۳
 ممتاز حسن ۵۶۲
 ممتاز علی ، شمس العلماء ۱۸۲
 منگولیا ۶۹
 منو سمرق ۲۱۲
 منیرہ اقبال ۸۱ ، ۵۶۷
 مودودی ، مولانا سید ابوالاعلیٰ
 ۳۹۹
 موسیٰ علیہ السلام ۱۸۹
 موصل ۱۳۲
 مولانا روم دیکھیے رومی
 مہاراجہ انور ۷۷ ، ۳۸۶ ، ۳۸۷
 مہاراجہ کشمیر دیکھیے ہری سنگھ
 مہاراجہ
 مہاراجہ محمود آباد ۲۲۳
 مسجد شاہ چراغ ۵۰۴
 مسجد شہید گنج ۵۰۳ ، ۵۰۵
 ۵۱۱ ، ۵۰۹ ، ۵۰۷
 مسجد عبداللہ خان ۵۰۳
 مسجد قرطبہ ۳۱۸
 مسجد وزیر خان ۱۸۸ ، ۱۹۱
 مسلم آؤٹ لک (اخبار) ۱۵۳ ،
 ۲۷۱ ، ۲۹۸ ، ۲۹۹ ، ۳۳۰
 مسلم ٹاؤن ، لاہور ۵۶۱
 میک ٹاگرٹ ۵۸
 مسلم کانفرنس (جموں کشمیر)
 ۳۳۳ ، ۳۳۳
 مسلم کانفرنس دیکھیے آل انڈیا
 مسلم کانفرنس
 مسلم لیگ دیکھیے آل انڈیا
 مسلم لیگ
 مسولینی ۳۱۹ ، ۳۲۰ ، ۳۲۲ ،
 ۳۲۳ ، ۳۳۵ ، ۳۸۵
 مسیح جہانگیری ۳۹۲
 مشرق وسطیٰ ۶۰ ، ۳۷۵
 مشرقی تھریس ۱۳۸
 مصر ۱۰۷ ، ۲۶۰ ، ۳۵۲ ، ۳۵۳ ،
 ۳۷۱ ، ۳۷۳ ، ۳۵۲ ، ۳۷۹
 مصطفیٰ دیکھیے اتاترک ، مصطفیٰ
 کمال
 مظفر الدین ، پروفیسر ۵۵۱
 مظہر الدین ، مولانا ۳۹۰
 معارف (رسالہ) ۱۳۷ ، ۳۵۳
 معاہدہ ، پیرس ۳۷۸
 معاہدہ سعد آباد ۳۷۹

- مہاراجہ میسور ۲۶۵
 مہر ، مولانا غلام رسول ۱۱۶ ،
 ۲۰۳ ، ۲۹۲ ، ۲۹۸ ، ۳۰۰ ،
 ۳۵۵ ، ۳۵۸ ، ۳۶۵ ، ۳۷۱ ،
 ۳۹۹ ، ۵۳۵ ، ۵۳۸ ، ۵۵۰ ،
 ۵۶۱ ، ۵۶۳
 مہذب (رسالہ) ۳۰۷
 مؤتمر عالم اسلامی ۳۷۱ - ۳۷۳ ،
 ۳۷۵
 مشاق لکھنؤ ۱۲۰ - ۱۲۲ ، ۱۳۷ ،
 ۲۲۳ ، ۲۳۹ ، ۲۴۰ ، ۲۹۶ ، ۵۱۸ ،
 میڈرڈ ۳۱۶ ، ۳۱۷ ، ۳۱۹ ،
 میڈرڈ یونیورسٹی ۳۱۶
 میر پور ۳۴۲
- میر حسن ، مولانا ۱۰ ، ۱۳ ، ۱۴ ،
 ۱۷ ، ۱۸ ، ۲۲ ، ۳۰ ، ۳۵ ،
 ۳۷ ، ۱۶۳ ،
 میسی نیوں ۳۱ ، ۳۱۱ ،
 میسور ۲۶۵ ، ۲۶۶ ،
 میسور یونیورسٹی ۲۶۵ ، ۲۶۶ ،
 میکڈانلڈ ، ریمزے ۳۲۳ ، ۳۹۳ ،
 ۳۹۵
 میکش ، مولانا مرتضیٰ احمد خان
 ۲۸۹ ، ۲۹۱ ، ۲۹۲ ،
 میٹھیلن ، سر ایدورڈ ۱۶۲ ،
 میونپل گزٹ (اخبار) ۱۳۰ ،
 میونخ ۶۶
 میونخ یونیورسٹی ۵۹

ن

- نادر شاہ ، غازی ۲۸۱ ، ۲۸۲ ،
 ۳۳۱ - ۳۳۷ ، ۳۸۶ ،
 نادر علی ، وکیل ۳۰۷
 ناظم ، ناظر حسین ۳۶
 نائیکی ، پروفیسر ۳۷۰
 نامق کمال ۳۳۳
 نائک چند ، پنڈت ۲۱۳ ، ۵۰۶ ،
 نائیڈو ، مسز سروجی ۳۵۸ ، ۳۶۰ ،
 نیواین ۱۸۳ ، ۳۱۰ ،
 نشے ۳۵۹ ، ۳۹۵ ،
 نبد ۱۵۳
 نرنجین داس ۱۷
 نرنڈرناتھ ، راجہ ۳۵۳ ، ۵۰۶ ،
 ۵۶۱
- نسیم ۳۶
 نشتر ، سردار عبدالرب ۱۷۵
 نصیر الدین ، بابا ۵ ،
 نظام دیکھیے عثمان علی خان ، سر
 نظام الدین اولیاء ۵۱
 نظام الدین میان ۲۲ ، ۸۵ ، ۵۵۲ ،
 ۵۶۳
 نظامی ، خواجہ حسن ۵۱ ، ۱۲۶ ،
 ۳۹۱
 نقیب (رسالہ) ۳۹۰
 نلسن ، پروفیسر ۵۸ ، ۱۶۲ ،
 ۳۶۰ ، ۳۶۱ ، ۵۶۷ ،
 نواب صاحب بیوپال دیکھیے
 حمید اللہ خان ، نواب

- نیاز محمد خان ۳۶۰ ، ۳۶۱
 نیاز محمد شیخ ۲۹۳
 نیاز علی خان، چوہدری ۳۹۹ ، ۵۰۰
 نیازی ، مولانا عبدالسلام ۲۴
 نیازی ، سید نذیر ۵ ، ۲۳ ، ۳۲۷
 ۳۳۱ ، ۳۵۱ ، ۳۵۳ ، ۳۵۵
 ۳۹۹ ، ۵۰۸ ، ۵۲۷ ، ۵۲۸
 ۵۵۱ ، ۵۶۱
 نیشنل لیگ ۳۱۳ ، ۳۱۵ ، ۳۳۵
 نیرنگ خیال (رسالہ) ۳۸۷
 نیرنگ ، غلام بھیک ۳۳ - ۳۵
 ۵۱ ، ۱۵۹ ، ۳۹۲
 نیوٹن ۵۷
- نواب صاحب چھتاری دیکھیے
 چھتاری ، احمد سعید
 نورالدین ولی ۵
 نور محمد ، شیخ ۱ ، ۳ - ۱۱
 ۱۳ ، ۱۴ ، ۲۳
 نون ، ملک فیروز خان ۲۳۲
 ۲۳۷ ، ۳۶۱
 نہرو ، جواہر لال ۲۳۷ ، ۳۶۷
 ۳۶۹ ، ۵۳۳ ، ۵۳۴ ، ۵۳۶
 ۵۳۷ ، ۵۳۸ ، ۵۶۱
 نہرو ، رپورٹ ۲۳۹ - ۲۴۴
 ۲۳۷ ، ۲۶۹ ، ۲۸۹ ، ۲۹۲ ، ۲۹۲
 نہرو ، ہوتی لال ۱۳۵ ، ۲۳۸ ، ۲۴۴

و

- وطن (اخبار) ۸۵
 ولسن ، پریذیڈنٹ ۱۳۳ ، ۱۳۵
 ولسن ، ایف ، ڈبلیو ۳۲۳
 ولی اللہ ، شاہ ۲۵۶
 وہبی ، ڈاکٹر بہجت ۳۵۱
 وی آنا ۱۰۹
 ویگے نامٹ ، پروفیسر ۶۴ ، ۶۵
 وینس ۳۱۰
- وارڈ ، پروفیسر ۵۸
 وائٹ ہیڈ ، پروفیسر ۵۸
 وائیکر ، کیپٹن ۳۴۰
 وحید احمد ۴۹
 وحیدالدین ، خلیفہ ۱۵۳
 وحیدالدین ، فقیر ۶ ، ۱۶۱ ، ۲۰۳
 ورجل ۳۵۹
 وزیر علی بلگرامی دیکھیے بلگرامی ،
 وزیر علی

ہ

- ہجویری ، علی ۴۴۶
 ہدایت حسین ، خان بہادر ۳۵۴
 ہدایۃ النجوم
 ہرنام سنگھ ۱۷
- ہارٹوگ کمیٹی ۳۸۱
 ہائیڈل برگ ۶۱ ، ۶۳ ، ۵۵۲
 ۵۶۵
 ہائٹا ۱۸۳

۳۳۵ ، ۳۳۷ ، ۳۳۸ ، ۳۳۱ ،
 ۳۳۴ ، ۳۳۶ ، ۳۵۲ ، ۳۵۳ ،
 ۳۵۸ ، ۳۶۱ ، ۳۶۵ ، ۳۶۷ ،
 ۳۶۹ ، ۳۷۰ ، ۳۷۸ ، ۳۸۰ ،
 ۳۸۹ ، ۳۹۰ ، ۳۹۶ ، ۳۹۹ ،
 ۴۰۸ ، ۴۰۹ ، ۴۱۱ ، ۴۱۲ ،
 ۴۱۵ ، ۴۱۶ ، ۴۲۷ ، ۴۳۱ ،
 ۴۳۲ ، ۴۳۳ ، ۴۳۴ ، ۴۳۵ ،
 ۴۵۶ ، ۴۵۷ ، ۴۷۳ ، ۴۷۸ ،
 ۵۱۰ ، ۵۲۶ ، ۵۲۸ ، ۵۳۲ ،
 ۵۳۳ ، ۵۳۷ ، ۵۳۹ - ۵۴۱ ،
 ۵۴۳ ، ۵۶۹

ہندوستان ریویو (رسالہ) ۹۶ ، ۱۰۰

ہنگری ۶۸ ، ۷۰

ہندی پرچاری سبھا ۲۶۳

پور ، سر سیموئل ۳۰۷

ہوم رول لیگ ۲۰

ہیڈن ، لارڈ ۲۵۷

ہیکل سائینی ۲۸۳

ہنگ ، ڈاکٹر ۱۳۳

ہنگ ۴۲

ہروی ، علامہ عبدالعلی ۱۶۵

ہری منگھ ، سہاراجہ ۳۳۲ ، ۳۸۵

ہسپانیہ دیکھیے سپین

ہالیہ ۳۸ ، ۳۸۵

ہایوں (بادشاہ) ۵۲

ہمدانی ، سید علی ۳۳۱

ہمدام (اخبار) ۳۳۰

ہندو سہاسبھا ۲۲۳ ، ۲۳۱ ، ۲۳۶

۲۳۸ ، ۳۵۶ ، ۳۵۸ ، ۵۳۱

ہندوستان ۳ ، ۲۴ ، ۳۶ ، ۵۳

۶۵ ، ۷۲ ، ۸۷ ، ۹۸ ، ۱۱۵

۱۲۰ - ۱۲۳ ، ۱۵۰ - ۱۵۲

۱۶۲ ، ۱۷۲ ، ۱۸۰ ، ۱۹۰

۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۱۹۸ ، ۲۰۱

۲۰۲ ، ۲۰۷ ، ۲۱۲ ، ۲۱۸

۲۲۷ ، ۲۲۸ - ۲۳۱ ، ۲۳۳

۲۳۸ - ۲۴۰ ، ۲۴۲ ، ۲۴۶

۲۶۰ ، ۲۶۳ ، ۲۶۹ ، ۲۷۰

۲۷۷ ، ۲۷۹ ، ۲۸۹ ، ۲۹۲ -

۲۹۴ ، ۳۰۱ ، ۳۰۳ ، ۳۰۷ -

۳۱۲ ، ۳۱۳ - ۳۱۶ ، ۳۱۸ -

۳۲۰ ، ۳۲۶ ، ۳۳۱ ، ۳۳۳

ی

یار محمد ، ڈاکٹر ۵۳۷

یروشلیم ۱۲۶ ، ۲۸۳ ، ۳۰۱

۳۷۰ ، ۳۷۳

یمن ۳۳۹ ، ۳۷۹

ینگ ، جسٹس ۷۰

ینگ مین محمدن ایسوسی ایشن ۳۳

ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن ۳۰۳

ینگ ہسپتال ، سر فرانسس ۳۵۸

ینگسٹن ، جان - گیارہویں

یورپ ۵۰ ، ۶۰ ، ۶۱ ، ۶۸ ، ۷۲

۷۹ ، ۸۱ ، ۸۹ ، ۹۳ ، ۱۱۱ -

۱۱۴ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ ، ۱۳۶

یونان ۱۴۲ ، ۱۴۸	۱۵۲ ، ۱۷۱ ، ۱۷۲ ، ۱۸۵
یونائیٹڈ پارٹی ۵۱۳	۲۸۰ ، ۳۴۴ ، ۳۵۲ ، ۳۵۴
یونینسٹ پارٹی ۲۰۹ ، ۲۱۰	۳۵۹ ، ۳۶۱ ، ۳۷۲ ، ۳۷۳
۲۲۰ ، ۲۲۱ ، ۳۱۰ ، ۳۵۹	۳۷۵ ، ۳۱۱ ، ۳۱۵ ، ۳۱۶
۳۶۰ ، ۵۱۰ ، ۵۱۳ ، ۵۱۶ -	۳۱۸ ، ۳۲۱ ، ۳۲۳ ، ۳۲۴
۵۲۰ ، ۵۲۲ ، ۵۲۳	۳۵۴ ، ۳۷۹ ، ۵۶۵
	یوسف زلیخا (کتاب) ۱۴

*

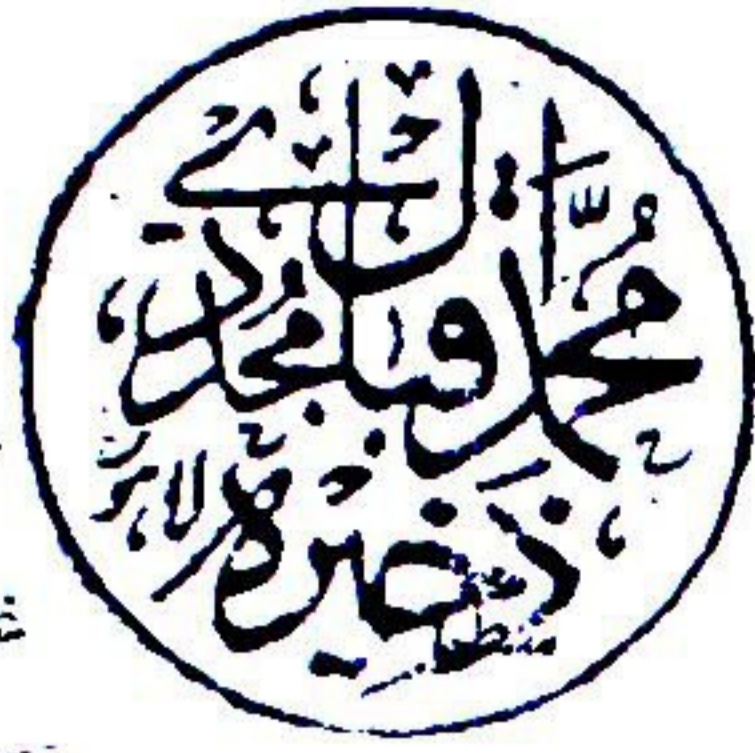
*

*

‘

اغلاط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
ت	الف	گار نامہ	کار نامہ
ج (فہرست مضامین)	۲۳	۹۳	۳۹
ج	۲۳	۰۳	۳۰
ج	۲۴	۱۳	۳۱
۱۳	۱۰	سنکدر نامہ	سکندر نامہ
۲۸	۸	تحفص	تخصّص
۲۸	۱۷	تحفے	تمغے
۳۲	۱	مجلد	مجلتہ
۶۹	۲	انیسویں	انیسویں صدی
۷۵	۱۷	ماہر الدین	طاہر الدین
۱۰۱	۲	منحوم	مفہوم
۱۰۳	۱	ا	اور
۱۱۶	۳	یہی	بھی
۱۲۳	۲۳	ساعی	ساعی
۱۳۰	۶۷	صفت	صنعت
۱۳۳	۳	طلباء	طالبہ
۱۳۴	۲۱	اثری	پڑھی
۱۳۶	۹	زغن	زغن
۱۴۷	۱۶	تنگ	تنگ
۱۶۸	۱۲	جرن	جرمن
۱۹۳	۳	فیصلیے	فصلیے
۱۹۴	۱۵	مسئلے	مسئلے
۱۹۴	۱	فصلہ	فصلہ



صحیح	غلط	صفحہ
کشمکش	کشمش	۱۹۷
”انوارِ اقبال“	”انورِ اقبال“	۲۰۳
”سیاست“	سیاست	۲۰۳
الزامات	الزومات	۲۰۳
حکیمان	حیکہاں	۲۰۳
علامہ	عملاہ	۲۰۷
کرنے کے لیے	کرنے لیے	۲۲
اچنبھے	اچھنبھے	آخری سطر
کشمکش	کشمش	۲۲۶
اپنی	اپی	۲۳۰
مالک خود بنتے	مالک خود	۲۳۰
متوازن	متوازی	۲۳۰
ایغدو	ایفوا	۲۶۳
مضطرب	مضطراب	۲۸۳
مفصل	متصل	۲۹۲
بست و کشاد	بسمت و کشاء	۲۹۲
تعصب	تصب	۳۲۷
دس	اس	۳۳۸
انتخابات	انتخاباب	۳۳۹
روزیٹا	روزیٹا	۳۵۸
لیبر پارٹی	لیبر پارٹی	۳۷۷
تعصب	تصب	۴۱۰
دے دیں	دے دے	۴۶۹
عکاسی	عکاس	۴۷۸
زیرِ نگین	زیرِ تعین	۴۷۸
دو نیم	دوم	۴۸۶
شرق	مشرق	۴۸۶
اوقاف	اوقات	۵۱۹

صفحہ	مطر	غلط	صحیح
۵۲۷	۴	توشترے	توشے
۵۳۰	۱۷	والجے	والا
۵۳۱	۱۸	اس قابل	اس کے قائل
۵۵۱	۵	صحیح و سلیم	صحیح و سالم
۵۵۷	۱۳	ونلمہانہ	والمہانہ
۵۶۹	۱۷	قرشی	قریشی
۵۷۱	۱۷	مشرق	شرق
۵۷۳	۶	۷۱۷۷۱	۷۱۹۷۱
۵۷۳	۱۷	مظالعہ	مطالعہ
۵۷۳	۱۸	فقیر	فقیر

*

*

*